



تخریج شدہ ایڈیشن

مُسِنِ انسانیت کی سیرت پُمنفرد اسلوب کی خالی ایک جامع کتاب



سیاستِ الرسول

تألیف

علّامہ شبیل عمانی

علّامہ سید عباین ندوی

www.KitaboSunnat.com

بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ

معزز قارئین توجہ فرمائیں!

کتاب و سنت ذات کام پر دستیاب تمام الیکٹرانک کتب

عام قاری کے مطالعے کے لیے ہیں۔ ←

مجلس التحقیق الاسلامی (Upload) کے علمائے کرام کی باقاعدہ تصدیق و اجازت کے بعد آپ لوڈ

کی جاتی ہیں۔ ←

دعویٰ مقاصد کی خاطر ڈاؤن لوڈ، پرنٹ، فوٹو کاپی اور الیکٹرانک ذرائع سے محض مندرجات نشر و اشاعت کی مکمل اجازت ہے۔ ←

☆ تنبیہ ☆

کسی بھی کتاب کو تجارتی یا مادی نفع کے حصول کی خاطر استعمال کرنے کی ممانعت ہے۔ ←

ان کتب کو تجارتی یا مادی مقاصد کے لیے استعمال کرنا اخلاقی، قانونی و شرعی جرم ہے۔ ←

«اسلامی تعلیمات پر مشتمل کتب متعلقہ ناشرین سے خرید کر تبلیغ دین کی کاؤشوں میں بھرپور شرکت اختیار کریں»

نشر و اشاعت، کتب کی خرید و فروخت اور کتب کے استعمال سے متعلقہ کسی بھی قسم کی معلومات کے لیے رابطہ فرمائیں۔ ←

kitabosunnat@gmail.com

www.KitaboSunnat.com



﴿ مُحْسِنٌ انسانیت کی یہ رشت پر منفرد اسلوب کی خالیں ایک جامع کتاب ہے۔ ﴾

اس میں عبارات مثلاً نماز، اوقات نماز، رکوہ، حج، جہاد، تقویٰ، اخلاق، توکل، صبر اور شکر جیسے اہم امور کو موضوعی بحث بنایا گیا ہے۔

www.KitaboSunnat.com

تألیف

علامہ شبیل نعماں

علامہ سید عیاذ ندوی

مکتبہ علمیہ

جُمِلَ حقوقِ بحْثِ ناشر محفوظ ہیں

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

کتاب

تالیف علامہ شبیل بن عفانی، علامہ سید علی بن ندوی

ناشر محمد رضا جعفری

اشاعت اکتوبر 2012ء

قیمت

ملنے کا پتا

مکتبہ اسلامیہ

بالمقابل رہمان مارکیٹ غلی سریت اردو بازار لاہور۔ پاکستان فون: 042-37232369 فیکر: 042-37244973

بسم اللہ سست جینک بال مقابل شیل پڑوں پچ کوتوال روڈ، فصل آباد۔ پاکستان فون: 041-2631204، 2034256

E-mail: mакtabaislamiapk@gmail.com

فہرست مضمایں سیرۃ النبی صَلَّی اللہُ عَلَیْہِ وَاٰلَہٖ وَسَلَّمَ حصہ پنجم

صفحہ نمبر	مضمایں	صفحہ نمبر	مضمایں
	تجدد، ترکِ لذائذ، ریاضت اور تکالیف شاقہ	13	دیباچہ طبع دوم
34	عبادت نہیں	14	دیباچہ
40	عزالت نشیش اور قطعِ علاقہ عبادت نہیں	14	موضوع
41	اسلام میں عبادت کا سچے مفہوم	14	ان جملوں کا سیرت سے تعلق
47	عبادات چہارگانہ اعمال چہارگانہ کا عنوان ہیں	15	سن قبول
50	نماز	16	امراۓ اسلام کی امداد
55	توحید کے بعد اسلام کا پہلا حکم	18	عمل صالح
57	اسلام میں نماز کا مرتبہ	18	ایمان کے بعد عمل صالح کی اہمیت
58	نماز کی حقیقت	23	امال صالحی کی تفصیل
61	نماز کی روحرانی غرض و معایت	23	عبادات
63	نماز کے لیے کچھ آداب و شرائط کی ضرورت	23	اخلاق
65	ذکر و دعا و تسبیح کے وظائف	23	معاملات
65	نماز تحدیہ طریق عبادت کا نام ہے	24	عبادات
66	نماز میں نظام و صفت کا اصول	24	اسلام اور عبادات
66	نماز میں جسمانی حرکات	24	اسلامی عبادات کی خصوصیات
67	ارکان نماز	28	صرف ایک خدا کی عبادت
68	ان ارکان کی ترتیب	29	خارجی رسوم کا وجوہ نہیں
68	صحب سابقہ میں نماز کے ارکان	30	در میانی آدمی کی ضرورت نہیں
68	قیام	30	خارجی کشش کوئی چیز نہیں
68	ركوع	30	مکان کی قید نہیں
69	سجدہ	31	انسانی قربانی کی ممانعت
73	نماز تام جسمانی احکام عبادات کا مجموعہ ہے	32	حیوانی قربانی میں اصلاح
74	نماز کی دعا	33	مشکانہ قربانیوں کی ممانعت

صفحہ نمبر	مضامین	صفحہ نمبر	مضامین
110	رکعتوں کی تعداد		اک دعا نے محدث علیہ السلام کا مساواز نہ دوسرے انجیاء کی منحصروں سے
112	نماز کے آداب باطنی	77	حضرت موسیٰ علیہ السلام کی نماز کی دعا
113	اقامت صلاة	78	زیور میں حضرت ابو داؤد علیہ السلام کی نماز کی دعا
113	توت	78	انجیس میں نماز کی دعا
113	خشوع	79	
114	تجھل	81	نماز کے لیے تعقین اوقات کی شرورت
114	تضرع	82	نماز کے اوقات دوسرے نہ ہوں میں
115	اخلاص	83	نماز کے لیے مناسب فطری اوقات
115	ذکر	84	اسلامی اوقات نماز میں ایک نکتہ
115	فہم و مدد بر	85	اسلام میں طریق و اوقات نماز
120	نماز کے اخلاقی، تمدنی اور معاشرتی قابلے	86	نمازوں کی پابندی و نگرانی
120	ستر پوشی	86	نماز کے اوقات مقرر ہیں وہ اوقات کیا ہیں؟
121	طہارت	87	
121	صفائی	90	اوقات کی تکمیل
122	پاہنچ و وقت	90	نماز کے اوقات کی تدریجی تکمیل
123	صحیح نہیں	94	ایک نکتہ
123	خدا کا خوف	94	جمع میں الصوتین
124	ہشیاری	94	اوقات شیخ کا نہ اور آیت اسراء
124	مسلمان کا امتیاز کی نشان	95	دو لوگ کی تحقیق
125	جنگ کی تصویر	98	اوقات نماز کا ایک اور راز
126	داغی تعبید اور بیداری	98	اوقات جنگ کا ایک ایک اور آیت
126	الفت و محبت	99	اطراف النہار کی تحقیق
127	غم خواری	99	ایک اور طریقہ ثبوت
127	اجتماعیت	100	نماز جنگ کا حادیث و سنت میں
128	کاموں کا تنوع	102	تہجد نسل بھوگی لیکن کیوں؟
128	ترہیت	103	قبلہ

صفحہ نمبر	مضامین	صفحہ نمبر	مضامین
160	رکوٹہ کے مقاصد، فوائد اور اصلاحات	129	نظم جماعت
160	ترکیبِ نفس	129	مسادات
162	باعی اعانت کی عملی تدبیر	130	مرکزی اطاعت
164	دولت مندی کی بیماریوں کا علاج	130	معیارِ فضیلت
171	اشتراکیت کا علاج	130	روزانہ کی مجلسِ عمومی
172	اقتصادی اور تجارتی فائدے	132	عرب کی روحانی کا یاپٹ
173	فقراء کی اصلاح	137	رکوٹہ
176	صدقہ اور رکوٹہ کو خالصہ لوجہ اللہ ادا کیا جائے	137	رکوٹہ کی حقیقت اور مفہوم
178	صدقہ چھپا کر دیا جائے	137	رکوٹہ گزشتہ مذاہب میں
179	بلند سمتی اور عالی خیالی	139	اسلام کی اس راہ میں تکمیل
180	فقراء اور مساکین کی اخلاقی اصلاح	139	اسلام میں رکوٹہ کی اہمیت
183	روزہ	141	رکوٹہ کا آغاز اور تدریجی تکمیل
183	روزہ کا مفہوم	145	رکوٹہ کی مدت کی تعیین
183	روزہ کی ابتدائی تاریخ	146	رکوٹہ کی مقدار
184	روزہ کی مذہبی تاریخ	146	اتفاق
186	روزہ کی حقیقت	146	رکوٹہ
188	رمضان کی حقیقت	147	نکتہ
190	فرضیتِ صائم کا مناسب موقع ۲۵	149	جانوروں پر رکوٹہ
191	ایامِ روزہ کی تحدید	151	نصابِ مال کی تعیین
193	ایک نکتہ	152	رکوٹہ کے مصارف اور ان میں اصلاحات
194	معدودوں	155	و ضرورت مندوں میں ترجیح
197	روزہ پر اعتراض اور اس کا جواب	157	اسلام میں رکوٹہ کے مصارف، شہنگانہ
198	روزہ میں اصلاحات	158	مسکینوں، فقیروں اور معدودوں کی امداد
201	روزہ کے مقاصد	158	غایمی کا انسداد
202	حامل قرآن کی پیروی	158	مسافر
203	شکریہ	159	جماعتی کاموں سے اخراجات کی صورت

صفحہ نمبر	مضامین	صفحہ نمبر	مضامین
240	مرکزیت	203	تقویٰ
244	رزق شرات	210	حج
245	قربانی کی اقتصادی حیثیت	210	مکہ
245	ابراہیمی دعا کی مقبولیت	211	بیت اللہ
245	تجارت	212	حضرت امام علی (علیہ السلام) کی قربانی اور اس کے شرائط
246	روحانیت	213	ملہت ابراہیمی کی حقیقت قربانی ہے
248	تاریخیت	214	اسلام اور کعبہ
249	خلص روحانیت	215	یہ قربانی کہاں ہوئی؟
249	حج مبرور	217	مکہ اور کعبہ
254	جہاد	219	حج ابراہیمی یادگار ہے
254	لفظ جہاد کی تعریج	223	حج کی حقیقت
256	جہاد کی دو تسمیں	225	حج کی اصلاحات
257	جہاد اکابر	230	حج کے اركان
257	جہاد بالعلم	230	احرام
258	جہاد بالمال	231	طواف
260	ہر یہ کام جہاد ہے	231	حج اسرود کا اسلام
260	جہاد بالنفس	232	صفاوی و مروہ کے درمیان دوزنا
262	دواجی جہاد	233	وقوف عرفہ
263	عبداتِ قلبی	233	قیامِ هر دفعہ
263	تقویٰ	234	منی کا قیام
263	اخلاص توکل	234	قربانی
263	صبر	235	حلق رأس
263	شکر	235	رمی جمار
264	تقویٰ	236	ان رسم کی غایت
264	تقویٰ سارے اسلامی احکام کی غایت ہے	237	حج کے آداب
265	اہل تقویٰ تمام اخروی فہلوں کے مستحق ہیں	238	حج کی مصلحتیں اور حکمتیں

صفحہ نمبر	مضامین	صفحہ نمبر	مضامین
287	بے قرار نہ ہونا	266	کامیابی اہل تقویٰ کے لیے ہے
288	مشکلات کو خاطر میں نہ لانا	267	اہل تقویٰ اللہ کے محبوب ہیں
289	درگز رکنا	267	معیتِ الہی سے سرفراز ہیں
291	ثابتِ قدی	267	قبولیتِ اہل تقویٰ ہی کو حاصل ہے
295	ضبط نفس	268	تقویٰ والے کون ہیں؟
295	ہر طرح کی تکلیف اٹھا کر فرض کو ہمیشہ ادا کرنا	269	تقویٰ کی حقیقت کیا ہے؟
298	صبر کے فضائل اور انعامات	271	اسلام میں برتری کا معیار
299	فتح مشکلات کی کنجی صبر اور دعا	272	اخلاص
301	شکر	272	اخلاص کا مفہوم
301	شکر کی تعریف	276	توکل
301	لفظِ افسوس کی تشریع	276	توکل کے غلط معنی
302	شکرِ حاصلِ ایمان ہے	276	توکل کے حقیقی معنی اور قرآنی تشریع
303	حمد	285	صبر
304	جسمانی نعمتوں کا شکریہ	285	صبر کے لغوی معنی
307	مالی نعمتوں کا شکریہ	286	وقت مناسب کا انتفار کرنا
307	احسان کا شکریہ احسان ہے		

فہرست مضمایں سیرۃ النبی صَلَّی اللہُ عَلٰیْہِ وَاٰلِہٖہ وَسَلَّمَ حصہ ششم

صفحہ نمبر	مضایں	صفحہ نمبر	مضایں
342	بے غرضی	315	دینا پڑھنے کا نامی
343	نیت	316	دینا پڑھنے
345	فلسفہ اخلاق کی تائید	318	تعلیمات نبوی کا تیرسا باب اخلاق
345	اخلاق کے لیے ایمان کی شرط	318	اسلام اور اخلاق حسنہ
346	غرض و غایت	320	ترتیک
347	ضمر کی آواز	321	حکمت
350	سرت و انبساط	322	حقوق عباد کی اہمیت
351	رضائے الٰہی	323	اسلام کے ارکان پیش گانہ اور اخلاق
354	ذہب میں اخلاق کا بنیادی اصول	324	اخلاقی حسنہ اور ایمان
358	خوف و رجا	325	اخلاقی حسنہ اور تقویٰ
361	اخلاق اور بہانیت		اخلاقی حسنہ اور خدا کے نیک بندے ہونے کا
363	امر بالمعروف و نهى عن المنکر	325	شرف
366	اس کے چند شرائط	326	اہل ایمان کے اخلاقی اوصاف
367	تجسس اور غیبیت کی ممانعت	328	اخلاقی حسنہ کا درجہ اسلام میں
368	توسط اور اعتدال	331	ایمان کے اوصاف و لوازم
369	عدل اور احسان	332	اخلاقی حسنہ صفات الٰہی کا سایہ ہیں
370	قانون اور اخلاق		اخلاقی معلوموں میں آنحضرت صَلَّی اللہُ عَلٰیْہِ وَاٰلِہٖہ وَسَلَّمَ کا
371	عنفو اور انتقام	334	امتیاز
376	عنفو و درگزدگی کی تعلیم	335	بے پردہ زندگی
378	برائی کی جگہ نیکی	336	قول کے ساتھ عمل
382	اسلام کی اخلاقی تعلیم کا تکمیلی کارنامہ	338	کامل و تکمیل
382	تفصیل اور بہسہ یگری	338	تعلیم اخلاق کا تنوع
384	اخلاقی تعلیمات کا احاطہ	340	اسلام کا فلسفہ اخلاق

صفحہ نمبر	مضامین	صفحہ نمبر	مضامین
417	نہیں	384	تورات کے اخلاقی احکام
419	ترک بھوی	385	انھیل کے اخلاقی احکام
420	اخلاق اور رحیم اللہ	385	اسلام میں اخلاقی احکام کا استقصاء
423	تعلیم اخلاق کے طریقے اور اسلوب	386	قرآنی اخلاقی کی فہرست
432	اخلاقی تعلیمات کی قسمیں	387	احادیث کی اخلاقیات کی فہرست
432	حقوق اور فرائض	388	اخلاقی جزئیات کا استقصاء
432	فضائل اخلاق اور رذائل اخلاق	392	مکرات کی حرمت میں جزئیات کا احاطہ
432	آداب	395	سودی کی حرمت میں جزئیات کا احاطہ
433	حقوق و فرائض	395	رشتہ کی حرمت میں استقصاء
433	حقوق کے معنی	395	مسکنی اخلاق کی کمزوری
434	حقوق کی وسعت	395	نرم و گرم اخلاق
436	حقوق کی ترتیب	396	بیش کا اعتراض مسکنی اخلاق پر
438	والدین کا حق	396	اسلامی اخلاق کا اعتدال
447	اولاد کا حق	396	نفوس کا اختلاف استعداد
447	اصول تعلیم	397	ہر شخص کی حب ضرورت اصلاح
448	اولاد کشی کا انسداد	398	قوت غصب اور قوت شہوت میں تعدیل
454	رضااعت و حضانت	398	مسکنی اخلاق کی کمزوریاں
455	تعلیم و تربیت	398	لیکن کا اعتراض مسکنی اخلاق پر
458	حقوق زوجین	399	اسلام اور بلند اخلاق
	مرد کو کس عورت کے مارنے کا اختیار دیا گیا	399	تقدیر، توکل، صبر اور شکر
467	ہے	400	اپنے دشمنوں کو پیار کرو
471	اہل قرابت کے حقوق	402	کفار و مشرکین سے عدم موالات
475	بمسایہ کے حقوق	405	بحق کا جائز موقع
480	تیبیوں کے حقوق	411	خدا کے لیے مجتہ اور خدا کے لیے ناراضی
485	بیوہ کے ساتھ حسن سلوک	415	اسلام میں کسی سے دائی یا مورثی نفرت کی تعلیم

صفحہ نمبر	مضامین	صفحہ نمبر	مضامین
615	خوش کلامی	488	حاجت مندوں کے حقوق
617	ایثار	491	بیمار کے حقوق
619	اعتدال اور میانہ روی	494	غلاموں کے حقوق
621	خودداری اور عزت نفس	497	مہمان کے حقوق
628	شجاعت اور بہادری	500	مسلمانوں کے باہمی حقوق
631	تعداد کی قلت و کثرت	508	انسانی برادری کا حق
633	موت کا وقت مقرر ہے	512	جانوروں کے حقوق
635	شہادت اور غزاہ کا رتبہ	517	فضائل اخلاق
639	استقامت	518	فضائل کی مختصر فہرست
645	حق گوئی	523	صدق
647	استغنا	527	زبان کی سچائی
650	رذائل	528	دل کی سچائی
650	رذائل کے معنی	534	خواوت
650	رذائل کے قرآنی نام	547	عفت و پاک بازی
651	فشا، مکر اور بھی	560	دیانت داری اور امانت
652	فشا کے معنی	566	شرم و حیا
652	مکر کے معنی	571	رحم
653	بھی کے معنی	575	عدل و انصاف
654	اخلاقی ذمیہ برے کیوں ہیں؟	583	عہد کی پابندی
654	رذائل کی ترتیب	589	احسان یعنی بھلائی کرنا
655	جهوٹ	596	عفو و درگزر
663	جهوٹی قسمیں کھانا	603	حلم و بردباری
669	وعدہ خلافی	607	رفق و لطف
670	خیانت اور بدرویانی	612	تواضع و خاک ساری
673	غداری اور دغاہاڑی		

صفحہ نمبر	مضامین	صفحہ نمبر	مضامین
745	خود بیتی اور خود نہماںی	675	بہتان
747	فضول خرچی	678	چغل خوری
749	حد	682	نیبیت اور بدگوئی
754	فتش گوئی	687	دور خاپن
760	رذائل پر مختصر تبصرہ	688	بدگمانی
761	آداب	689	مداعی اور خوشامد
762	فطری آداب	691	بخل
764	طہارت اور اس کے آداب	699	حرص و طمع
769	کھانے پینے کے آداب	702	بے ایمانی
773	آداب مجلس	705	چوری
776	آداب ملاقات	708	ناپ تول میں کمی بیشی
783	آداب گفتگو	711	چھپا کر لینا
787	باہر نکلنے اور چلنے پھرنے کے آداب	713	رشوت
789	آداب سفر	716	سودخوری
791	آداب خواب	719	شراب خوری
794	آداب لباس	723	غیظ و غضب
798	آداب سرت	726	بغض و کینہ
803	آداب ماتم	728	ظلم
806	متفرق آداب	732	فخر و غرور
809	حکمتِ رباني کا پھنسہ نور	741	ریا

فہرست مضاہین سیرۃ النبی صَلَّی اللہُ عَلَیْہِ وَاٰلِہٖہ نَسْکٍ حصہ ہفتہم

مضاہین	صفحہ	مضاہین	صفحہ	مضاہین
پیش لفظ از مولا ناسید ابو الحسن علی ندوی محدث	813	فاطری حقوق و معاملات کی کیسانی	825	فاطری حقوق و معاملات کی کیسانی
اطہار بجز از سید صباح الدین عبدالرحمن محدث	818	قانون کا بنیادی تخلی	826	قانون کا بنیادی تخلی
مقدمہ معاملات	819	قانون الہی کی بنیاد اور اس کی عمومیت	826	قانون الہی کی بنیاد اور اس کی عمومیت
ساتویں جلد کا موضوع، معاملات	819	ایک اصولی فرق	827	ایک اصولی فرق
معاملات کے حدود	819	اسلام میں حکومت و حیثیت و اہمیت	828	اسلام میں حکومت و حیثیت و اہمیت
معاملات سے ہماری مراد	820	عہد نبوی میں نظام حکومت	852	عہد نبوی میں نظام حکومت
اس کام کا اشتکال	821	سلطنت اور دین کا تعلق	886	سلطنت اور دین کا تعلق
دیگر مذاہب اور معاملات	821	لفظ رعیت	893	لفظ رعیت
معاملات کے تأخذ	822	سلطنت و ملکیت کی حقیقت	897	سلطنت و ملکیت کی حقیقت
قانون سازوں کی بے چارگی	822	اسلام نے ملکیت کے الفاظ ترک کر دیے	897	اسلام نے ملکیت کے الفاظ ترک کر دیے
جمهوریت کی ناکامی	822	لفظ ملک الملوك کی ممانعت	898	لفظ ملک الملوك کی ممانعت
صحیح و عادلانہ قانون سے انسانیت کی ناچارگی	822	امت مسلمہ کی بعثت	909	امت مسلمہ کی بعثت
قانون الہی کی ضرورت	823	توتِ عالمہ یا قوت آمرہ	921	توتِ عالمہ یا قوت آمرہ
کتاب اور سیزان	823	اسلامی روایات کی دوسری بنیادی اصل	925	اسلامی روایات کی دوسری بنیادی اصل
قانون الہی کی دائمی کیسانی	825	حاکمِ حقیق صرف اللہ تعالیٰ ہے	925	حاکمِ حقیق صرف اللہ تعالیٰ ہے

بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ

دیباچہ طبع دوم

سیرۃ النبی ﷺ کی یہ پانچویں جلد رجب ۱۳۵۲ھ میں یہی تقطیع پڑھی تھی، اس وقت سے لوگوں کا تقاضا تھا کہ اس کی چھوٹی تقطیع بھی جلد شائع ہو، مگر نظر ثانی کے لیے مجھے وقت نہیں ملتا تھا، اس لیے یہ کام جلد از جلد انجام نہ پاسکا، اب جب اس سے فرصت ملی اور بعض دوستوں نے اس کام میں میرا بات تحریک بنا دیا، تو تم برس میں یہ کام انجام کو پہنچا، بعض فروگر اشیں جو طبع اول میں ہو گئی تھیں، ان کی اصلاح کردی گئی ہے پھر بھی عصمت کا دعویٰ کون کر سکتا ہے۔

اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ میری لغزشوں سے درگزر فرمائے اور میری لغزشوں کو دوسروں کی لغزشوں کا سبب نہ بنائے۔

رَبَّنَا لَا تُؤْمِنُنَا إِنْ تَسْمِنَا أَوْ أَخْطَانَا

دائی

سَيِّدُ الْعَمَانِ مُذْكُورٌ

دارِ مَعْنَى، عَظِيمٌ بَرَّه

۲۳/ جمادی الاولی ۱۳۵۲ھ

بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ

سُبْحَانَ رَبِّكَ رَبِّ الْعِزَّةِ عَمَّا يَصِفُونَ وَسَلَامٌ عَلَى الْمُرْسَلِينَ وَالْحَمْدُ لِلَّهِ
رَبِّ الْعَالَمِينَ -

دیباچہ

سیرۃ النبی ﷺ کی چوتھی جلد ریجع الاول ۱۳۵ھ میں شائع ہوئی تھی، آج تین سال کے بعد اس کی پانچویں جلد آپ کی خدمت میں پیش کی جا رہی ہے۔ یہ اللہ تعالیٰ کا فضل ہے کہ وہ اپنے ایک گناہ گار بندہ سے اپنے دین کا ایک کام لے رہا ہے اور اپنے بندوں کے دلوں کو اس کے حسن قبول کے لئے کھول دیا ہے۔

اس جلد کا موضوع عبادت ہے، اس میں عبادت کی وہ حقیقت اور اسلام میں اس کے وہ اقسام و انواع اور ان میں سے ہر ایک کی وہ مصلحت و حکمت اور اس باب میں گزشتہ مذاہب کے اسباق کی وہ تجھیل جو زات پاک محمد رسول اللہ ﷺ کے ذریعہ دنیا پر ظاہر ہوئی، ایک خط کار قلم نے لکھی اور بیان کی ہے۔ اپنی کوشش تو یہی رہی ہے کہ قدم اس راستے سے نہ ہٹے جو صراط مستقیم ہے اور وہ سر رشتہ ہاتھ سے نہ چھوٹے جو ہر مسلمان کا عروۃ الوضقی ہے۔ بتا ہم وہی کہتا ہوں جو بعض صحابہ رضی اللہ عنہم اور اکابر نے (خدا ان سے راضی ہو) فرمایا کہ ”جبات کی گئی ہے، اگر صحیح ہے تو وہ خدا کی طرف سے ہے اور غلط ہے تو نفس خط کار کا قصور ہے۔“

ان جملوں کا سیرت سے تعلق

ہر چند کہ اس کتاب کے ضمن میں یہ بات کئی دفعہ ہرائی گئی ہے کہ اس سلسلہ کا تعلق صرف مجازی اور سیرت کے واقعات سے نہیں، جن کو عام طور سے سیرت کہتے ہیں۔ بلکہ اسلام کے پیغام اور اسلام کے پیغام لانے والے دونوں سے یکساں ہے، صاف لفظوں میں یوں کہنا چاہیے کہ اس سلسلہ کا مقصد ان دوسوالوں کا جواب ہے، اسلام کا پیغمبر کون تھا؟ اور وہ کیا لایا تھا؟ سیرت کی شروع کی تین جلدیں پہلے سوال کا جواب تھیں اور باقی جلدیں دوسرے سوال کا جواب ہیں۔ اس سلسلہ کی ترتیب اور تجھیل میں میں نے امکان بھراں خاکہ کی پیروی کی ہے جس کا خیال حضرۃ الاستاد علامہ شبی نعمانی ۃ رشیدۃ کو تھا۔ ان زبانی بیانوں اور تلقینیوں کے علاوہ جو اپنی مجلس کی گفتگو میں فرمایا کرتے تھے، وہ خود اینے مکتوبات میں لکھتے ہیں:

”چاہتا ہوں کہ ہر قسم کے مباحثت سیرت میں آ جائیں۔ یعنی تمام مہمات مسائل پر بیویو، قرآن مجید پر پوری نظر، غرض سیرت نہ ہو بلکہ انسان کی بویزیا اور نام بھی دائرۃ المعارف الم gio یہ موزوں ہو گا۔ گولبا سے اور بھی میں نے فیصلہ نہیں کیا۔“ (بنا مولا تا حبیب الرحمن خان شیر و انی صفحہ نمبر ۱۰۷)

سیرہ جلد اول کے مقدمہ میں انہوں نے ان حصول کا عنوان منصب نبوت رکھا تھا اور لکھا تھا: دوسرا حصہ منصب نبوت کے متعلق ہے۔ نبوت کا فرض تعالیٰ عقائد اور امر و نواہی اصلاح اعمال اور اخلاق ہے۔ اس بنا پر منصب نبوت کے کاموں کی تفصیل اس حصہ میں کی گئی ہے، اس حصہ میں فرائض خنسہ اور تمام اور نواہی کی ابتداء اور تدریجی تغیرات کی مفصل تاریخ اور ان کے مصالح اور حکم اور دیگر مذاہب سے ان کا مقابلہ اور موازنہ ہے۔ اسی حصہ میں نہایت تفصیل سے بتایا گیا ہے کہ عرب کے عقائد اور اخلاق و عادات پہلے کیا تھے اور ان میں کیا کیا اصلاحیں عمل میں آئیں۔ نیز یہ کہ تمام عالم کی اصلاح کے لئے اسلام نے کیا قانون سرتباً کیا اور کیونکر وہ تمام عالم کے لئے کافی ہو سکتا ہے۔“ (بلد اول طبع اول صفحہ ۷۶ طبع دوم صفحہ ۷۶)

گزشتہ چوتھی جلد یا پانچویں جلد اور آئینہ دو جلدیں درحقیقت اسی منصب نبوت کے مباحثت کی تفصیل و تشریع ہیں۔ منصب نبوت، عرب کی گزشتہ حالت اور تعالیٰ عقائد چوتھی جلد کا موضوع تھی اور فرائض خنسہ، ان کی مصلحتیں اور حکمتیں اس جلد کا عنوان ہیں۔ اخلاق و معاشرت کے نقطوں کے لئے چھٹی جلد اور بقیہ اور نواہی کے لئے جو معاملات سے متعلق ہیں ساتویں جلد ہوگی۔ ان میں سے ہر موضوع کی تفصیل و تشریع میں منصف اول کے ایما کے مطابق قرآن مجید پر پوری نظر رکھی جاتی ہے، ان کی تدریجی تاریخ پیش نظر ہتی ہے۔ ان کی مصلحتیں اور حکمتوں سے پرداہ اٹھایا جاتا ہے، دوسرے مذہبوں سے مناظرانہ پہلو کو بجا بجا کر مقابلہ اور موازنہ کیا جاتا ہے اور ہر ایک بحث کے متعلق بتایا جاتا ہے کہ اسلام نے اس باب میں کیا تعلیم پیش کی ہے اور وہ کیوں کہ تمام عالم کی اصلاح کے لئے کافی ہے:

حد پس آذینہ طوطی صفتمن داشته اند آنچہ استاد ”مرا“ گفت بسم می گویم
حسن قبول

اللہ پاک کا ہزار بڑا شکر ہے کہ اس نے اس سلسلہ کو حسن قبول کی سند عطا فرمائی:

ع قبول خاطر دلہا خداداد است می دانم

اس کتاب کی پہلی ہی جلد شائع ہوئی تھی کہ ایک مقدس بزرگ نے جن کے ساتھ مجھے پوری عقیدت تھی اور جن کی زبان سے اس تھاق کے باوجود کبھی مدد عیناً نہ فقرہ نہیں تکا، مجھے سے فرمایا: ”یہ کتاب وہاں قبول ہو گئی۔“ ان کے ارشاد کی تصدیق زمانہ کے واقعات سے ہو گئی۔ علاوہ اس کے کہ اس کی ہر جلد کے کئی کئی ایڈیشن شائع ہو چکے۔ ہندوستان اور بیرون ہندوستان کے مسلمانوں میں اس کے ساتھ خاص شیفگی اور عقیدت پیدا ہو گئی۔ ترکی میں اس کی تین جلدیں کا ترجمہ قسطنطینیہ سے شائع ہوا۔ فارسی میں اس کی چند جلدیں کابل میں ترجمہ کی گئیں اور اب تک منتظر طبع ہیں اور سب سے بڑھ کر یہ کہ عربی میں مکہ مظہمہ میں اس کے ترجمہ کا خیال

پیدا ہوا ہے۔ اس کی قبولیت کی بڑی دلیل یہ ہے کہ اس کی پہلی اشاعت کے وقت سے لے کر آج تک اس زبان میں جس میں اس موضوع پر کوئی قابل توجہ کتاب نہ تھی، چھوٹی بڑی سینکڑوں کتابیں نئے نئے دعووں کے ساتھ اس وسائط رکھ رکھ کر لوگ لکھ رہے ہیں اور سیرت کا ایک عظیم الشان ذخیرہ ہماری زبان میں محمد اللہ پیدا ہو گیا ہے اور اس کی تعلیم و مطالعہ اور اشاعت کی طرف مسلمانوں کا عام رجحان ہو گیا ہے۔

امراءِ اسلام کی امداد

اس کتاب کے حسن قبول کی ایک اور دلیل یہ ہے کہ مصنف مرحوم نے اس کی تصنیف کا خاکہ جو نبی شائع کیا اس کی خدمت کے لئے بیک کی سب سے پہلی آواز اس محرّمہ کی زبان سے نکلی، جس کا ہر تاریخ محبّت رسول ﷺ کے دامن سے وابست تھا، یعنی ملت محمدی کی خادمه اور امّت محمدی کی مخدومت اُنّاں البندنواب سلطان جہاں بیگم سراج فرمازوائے شور بھوپال (خدا ان پر اپنی رحمتوں کے پھول بر سارے) نومبر ۱۹۱۳ء میں مصنف کی وفات پر خیال گزر اک شاید یہ توجہ ہمایونی باقی نہ رہے۔ مگر فرمایا کہ یہ کام اس مصنف کے لئے نہ تھا جو مر چکا۔ بلکہ اس خدا کے لئے تھا جس کو موت نہیں۔ اس لئے اپنی شابانہ ماہوار امداد برابر باری رکھی۔ مصنف نے سیرت کی تصنیف کے متعلق ایک قطعہ لکھا تھا:

— مصارف کی طرف سے مطمئن ہوں میں ہر صورت کے ابر فیض سلطان جہاں بیگم زر افتخار ہے رہی تالیف و تنقید روایت بائی تاریخی تو اس کے واسطے حاضر میراول ہے میری جا ہے عرض دو باتھ ہیں اس کام کے انجام میں شامل کہ جن میں اک فقیر بے نوا ہے ایک سلطان ہے جب اس ”فقیر بے نوا“ کی وفات ہوئی تو سرکار عالیہ نے بڑے درد سے فرمایا تھا کہ ”فقیر بے نوا تو چل بسا۔ اب سلطان کی باری ہے۔“ آخر یہ سلطان بھی چل بسی اور تالیف و تنقید روایت کے ساتھ ساتھ زر افتخاری کے کام کی ناتمامی کا خطہ بھی پیدا ہو گیا۔ مگر خدا کا شکر ہے کہ فردوس مکانی نے اپنا سچا جا شیش یادگار چھوڑا، وہ تاج و تخت ایک ایسے جو اس بخت کے سپرد کر گئیں، جس نے فرائض حکومت کی گرانباری کے ساتھ ساتھ ان کے ناتمام کارناموں کی تکمیل کا بوجھ بھی اختالیا اور سیرۃ النبی ﷺ کی تالیف کی امداد میں وہی توجہ مبذول رکھی۔ سکندر صولت افخیار الملک حضور نواب حاجی حمید اللہ خاں بہادر فرمازوائے بھوپال کی عمر و دولت و اقبال میں اللہ بتا کر و تعالیٰ شانہ برکت عطا فرمائے کہ ان کے زیر سایہ امت و ملت کی سینکڑوں آرزوں میں پروش پا رہی ہیں۔ خلد اللہ ملکہ

۱۹۱۵ء (۱۳۳۴ھ) میں سیرت کی پہلی جلد جب چھپ کر شائع ہوئی تو جامع نے اس کا ایک نسخہ اعلیٰ حضرت آصفجاہ سالیح مظفر الملک والحمد للہ نظام الدولہ نظام الملک سلطان دکن خلد اللہ ملکہ پیشگاہ خرسوی میں

پیش کیا۔ حضور مددوح کو اپنے مولیٰ و آقا حضرت سرور کائنات فخر موجودات سید المرسلین محبوب العلمین احمد مجتبی محترم صطفیٰ علیہ الوفی الحیات والصلوٰت کی ذات قدسی آیات سے والہانہ عقیدت ہے۔ سیرت کی پہلی جلد پڑھ کر بہت سرور و محتظوظ ہوئے اور دوسرا جلد وہ کے جلد چھپ جانے کی غرض سے دودو برس کے لئے تین دفعہ اور تین برس کے لئے ایک دفعہ دوسرا ہوا رجارتی فرمائے، جن سے پچھلے برسوں میں جب ملک کی اقتصادی حالت نے ہم کو خطرہ میں پھنسا دیا تھا، یہ مدد ملی۔ اللہ تبارک و تعالیٰ کی بارگاہ بے نیاز میں التجا۔ یہ کہ وہ باقی جلد وہ کی جلد تکمیل کی تو توفیق عطا فرمائے۔ عمر کارہوار زندگی کی چچاں سے زیادہ منزلیں طے کر چکا جو پچھلے باقی ہے دعا ہے کہ وہ بھی اسی سفر میں گزر جائے اور آخر میں خوش قسم سعدی کی طرح ہمیں بھی یہ کہنے کا موقع ملے۔

منزل تمام گشت وبہ پایاں رسید عمر
ماہم چنان دراول وصف تو ماندہ ایم

مؤلف

سید علیمان ندوی
شبلی منزل، اعظم گڑھ

۶۱۳۵۴ رب جمادی ۲۳

بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ

عَمَلُ صَالِحٍ

﴿الَّذِينَ أَمْنَوْا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ﴾ (١٠٣ / العصر: ٣)

محمد رسول اللہ ﷺ جس تعلیم کو لے کر آئے۔ اس کا بیان کی مسئلہ یہ ہے کہ انسان کی نجات دو چیزوں پر موقوف ہے۔ ایک ایمان اور دوسرا عمل صالح۔ کتاب سیرۃ النبی ﷺ کی گزشتہ پوچھی جلد ایمان کی شرح و توضیح میں تھی۔ اب یہ پیش نظر حصہ عمل صالح کی تشریح دیا میں ہے۔ ایمان بیادی اصولوں پر یقین کامل رکھنے کا نام ہے اور عمل صالح ان اصولوں کے مطابق عمل کا، کسی بات کا تہبا علم و یقین کامیابی کے لئے کافی نہیں۔ جب تک اس علم و یقین کے مطابق عمل بھی نہ ہو۔ اسلام نے انسان کی نجات اور فلاح کو ان ہی دو چیزوں پر تھی ایمان و عمل صالح پر بنی قرار دیا ہے۔ لیکن افسوس ہے کہ عوام میں ایمان کو جواہیت حاصل ہے، وہ عمل صالح کو نہیں۔ حالانکہ یہ دونوں لازم و ملزم کی حیثیت سے عملًا یکساں اہمیت رکھتے ہیں۔ فرق صرف اتنا ہے کہ ایمان بیاد ہے اور عمل صالح اس پر قائم شدہ دیوار یا ستون جس طرح کوئی عمارت بیاد کے بغیر قائم نہیں رہ سکتی، اسی طرح وہ دیوار یا ستون کے بغیر کھڑی بھی نہیں ہو سکتی۔

ان دونوں کی بہترین مثال اقلیدیں کے اصول اور اشکال کی ہے۔ ایمان کی حیثیت اصول موضوعہ اور اصول متعارف کی ہے جن کو صحیح مانے بغیر اقلیدیں کی شکلوں کا اصول محال ہے۔ لیکن اگر صرف اصول موضوعہ اور اصول متعارف کو تسلیم کر لیا جائے اور ان کے مطابق شکلوں کا عمل نہ کیا جائے تو فتن تعمیر و ہندسہ اور مساحت و پیمائش میں اقلیدیں کافن ایک ذرہ کار آمد نہیں ہو سکتا اور نہ اس سے انسان کو وہ فائدے حاصل ہو سکتے ہیں جو اس فن سے اصل مقصود ہیں۔ عوام کی اس غلط فہمی کو دور کرنے کے لئے ضرورت ہے کہ اس بارہ میں قرآن پاک کی تعلیم کو تفصیلاً پیش کیا جائے۔ قرآن پاک نے انسان کی فلاح و کامیابی کے ذریعہ کو بیسیوں آیتوں میں بیان کیا ہے۔ مگر ہر جگہ بلا استثناء ایمان اور عمل صالح دونوں پر اس کوئی قرار دیا ہے اور ہر جگہ ایمان کو پہلی اور عمل صالح کو دوسرا مگر ضروری حیثیت دی ہے۔ فرمایا:

﴿وَالْعَصْرِ إِنَّ الْإِنْسَانَ لَكُنْ خُرِّيٌّ إِلَّا الَّذِينَ أَمْنَوْا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ﴾

(١٠٣ / العصر: ٣)

”زمانہ (مع اپنی پوری انسانی تاریخ کے) گواہ ہے کہ انسان گھائے میں ہے۔ لیکن وہ جو ایمان لائے اور اچھے کام کیے۔“

زمانہ کی پوری انسانی تاریخ اس حقیقت پر شاہدِ عدل ہے کہ انہیں افراد اور قوموں پر فوز و فلاح اور

کامیابی کے دروازے کھلے ہیں۔ جنہیں رب اُن تھا کا یقین تھا اور اس یقین کے مطابق ان کے عمل بھی یہ کہ ہوتے رہے۔ ایک دوسری آیت میں فرمایا:

﴿لَقَدْ خَلَقْنَا الْإِنْسَانَ فِي أَحْسَنِ تَقْوِيمٍ ثُمَّ رَدَدْنَاهُ أَسْعَلَ سَفِيلِينَ إِلَّا الَّذِينَ أَمْنَوْا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ فَلَهُمَا جُرْجُرٌ غَيْرُ مَمْنُونٌ ۚ﴾ (۹۵/التین: ۶-۴)

”بے شک ہم نے انسان کو بہترین حالت درستی میں پیدا کیا۔ پھر اس کو سب سے نیچوں کے نیچے لوٹا دیا۔ لیکن جو ایمان لائے اور اچھے کام کئے تو ان کے لئے نہ ختم ہونے والی مردودی ہے۔“

اس آیت میں انسانی فطرت کی بہترین صلاحیت کو پھر خود انسانوں کے ہاتھوں سے اس کی بدترین منزل تک پہنچ جانے کو بیان کیا گیا ہے۔ لیکن اس بدترین منزل کی پستی سے کون لوگ بچائے جاتے ہیں۔ وہ جن میں ایمان کی رفتہ اور عمل صالح کی بلندی ہے۔ یہود سے جن کو یہ دعویٰ تھا کہ بہشت انہیں کے نمیکد میں ہے، یہ فرمایا:

﴿وَالَّذِينَ أَمْنَوْا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ أُولَئِكَ أَصْحَبُ الْجَنَّةِ﴾ (۸۲/ البقرۃ: ۲)

”اور جو ایمان لائے اور نیک عمل کیے وہی جنت والے ہیں۔“

یعنی جنت کا حصول نسل اور قومیت پر موقوف نہیں۔ بلکہ ایمان اور عمل صالح پر ہے۔ جو شخص جنت کی یہ قیمت ادا کرے گا وہ اسی کی ملکیت ہے فرمایا:

﴿إِنَّ الَّذِينَ أَمْنَوْا وَالَّذِينَ هَادُوا وَالظَّمِينُونَ وَالثَّارِي مَنْ أَمَنَ بِاللَّهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ وَكَمْلَ صَالِحًا فَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزُنُونَ ۝﴾ (۶۹/ المائدۃ: ۵۵)

”بے شک جو مسلمان ہیں اور جو یہود ہیں اور صائمین اور نصاریٰ جو کوئی اللہ پر اور پچھلے دن پر ایمان لائے اور اچھے کام کرے نہ تو ان پر ڈر ہے، نہ وہ غم کھائیں گے۔“

اس آیت کا منشائی بھی یہی ہے کہ فلاح و نجات کا حصول کسی نسل و قومیت پر موقوف نہیں اور نہ کسی نمہب و ملت کی طرف رکی نسبت پر ہے بلکہ احکام الہی پر یقین لانے اور ان کے مطابق عمل کرنے پر ہے۔ عدم ایمان اور بدکاری کا نتیجہ دنیا اور آخرت کی تباہی اور ایمان اور نیکوکاری کا نتیجہ دین و دنیا کی بہتری، اللہ تعالیٰ کا وہ طبعی قانون ہے جس میں نہ کبھی بال بر بر فرق ہوا اور نہ ہوگا۔ چنانچہ ذوالقرنین کی زبانی یہ فرمایا:

﴿قَالَ أَمَّا مَنْ ظَلَمَ فَسُوفَ تَعَذِّبُهُ ثُمَّ يُرَدُّ إِلَى رَبِّهِ فَيُعَذِّبُهُ عَذَابًا أَنْكَرَاهُ وَأَمَّا مَنْ أَمْنَى وَعَمِلَ صَالِحًا فَلَهُ جَزَاءٌ حُسْنِيٌّ ۝﴾ (۱۸/ الکھف: ۸۷-۸۸)

”اس نے کہا جو کوئی گناہ کا کام کرے گا تو ہم اس کو (دنیا میں) سزا دیں گے پھر وہ اپنے رب

کے پاس لوٹا کر جائے گا تو اس کو بری طرح سزادے گا اور جو کوئی ایمان لا لیا اور نیک عمل کیے تو اس کے لیے بھلائی کا بدلہ ہے۔

﴿فَمَنْ يَعْمَلْ مِنَ الصَّالِحَاتِ وَهُوَ مُؤْمِنٌ فَلَا كُفَّارَ لِسَعْيِهِ وَإِنَّا لَهُ لَكَلِبُونَ﴾۔

(۹۴/الانبیاء)

”تو جو کوئی نیک عمل کرے اور وہ مومن بھی ہو تو اس کی کوشش اکارت نہ ہوگی اور ہم اس کے (نیک عمل) کو لکھتے جاتے ہیں۔“

﴿خَلَفَ مِنْ بَعْدِهِمْ خَلْفٌ أَضَاعُوا الصَّلَاةَ وَأَشْبَعُوا الشَّهَوَاتِ فَسَوْفَ يُلْقَوْنَ حَيَّاً إِلَّا مَنْ تَابَ وَأَمَنَ وَعَمِلَ صَالِحًا فَأُولَئِكَ يَدْخُلُنَ الْجَنَّةَ وَلَا يُظْلَمُونَ شَيْئًا﴾۔

(۱۹/مریم)

”تو ان کے بعد ان کے ایسے جانشین ہوئے جنہوں نے نماز کو برداشت کیا اور نفسانی خواہشوں کی پیروی کی تو وہ گمراہی سے ملیں گے۔ لیکن جس نے تو پر کی اور ایمان لا لیا اور نیک کام کیے تو وہی لوگ جنت میں داخل ہوں گے اور ان کا ذرا ساقط بھی مارنا نہ جائے گا۔“

اس سے اور اسی قسم کی دوسری آیتوں سے یہ بات ثابت ہے کہ جنت کا استحقاق دراصل انہی کو ہے جو ایمان اور پھر ایمان کے مطابق عمل سے بھی آراستہ ہیں اور جو عمل سے محروم ہیں، وہ اس استحقاق سے بھی محروم ہیں۔ الآیہ کہ اللہ تعالیٰ بخشش فرمائے:

﴿وَالَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ فِي رُوضَتِ الْجَنَّةِ لَهُمْ مَا يَشَاءُونَ عِنْدَ رَبِّهِمْ طَلِيكَ هُوَ الْفَضْلُ الْكَبِيرُ﴾۔ ذلیکَ الَّذِی يُبَشِّرُ اللَّهُ عِبَادُهُ الَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ

(۴۲/الشوری)

”اور جو ایمان لا لے اور نیک کام کیے وہ جنت کے باغوں میں ہوں گے، ان کے لیے ان کے پروردگار کے پاس وہ ہے جو وہ چاہیں۔ یہی بڑی مہربانی ہے یہی وہ ہے جس کی خوبخبری اللہ اپنے ان بندوں کو دیتا ہے جو ایمان لا لے اور نیک عمل کیے۔“

دوسری جگہ فرمایا:

﴿إِنَّ الَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ كَانُوا لَهُمْ جَنَّتُ الْفِرْدَوْسِ نُزُلًا﴾۔

(۱۸/الکھف)

”بے شک جو ایمان لا لے اور نیک عمل کیے ان کی مہربانی کے لیے باغ فردوس ہیں۔“

پھر آگے چل کر فرمایا:

﴿فَمَنْ كَانَ يَرْجُو الْقَاءَ رَبِّهِ فَلْيَعْمَلْ عَمَلاً صَالِحاً وَلَا يُشْرِكْ بِعِبَادَةِ رَبِّهِ أَحَدًا﴾

(۱۸) / الكھف:

”تو جس کو اپنے پروردگار سے ملنے کی امید ہو تو چاہیے کہ وہ نیک عمل کرے اور کسی کو اپنے پروردگار کا شریک نہ بنائے۔“

ایمان کے ہوتے عمل سے محروم تو محض فرض ہے، ورنہ حقیقت تو یہ ہے کہ جہاں عمل کی کمی ہے، اسی کے بغیر ایمان میں بھی کمزوری ہے، کسی چیز پر پورا پورا یقین آ جانے کے بعد اس کے برخلاف عمل کرنا انسانی فطرت کے خلاف ہے۔ آگ کو جلانے والی آگ یقین کر لینے کے بعد پھر کون اس میں اپنے ہاتھ کو دالنے کی جرأت کر سکتا ہے۔ لیکن نادان بچہ جو ابھی آگ کو جلانے والی آگ نہیں جانتا وہ بارہا اس میں ہاتھ دلانے کو آمادہ ہو جاتا ہے۔ اس لیے عمل کا قصور ہمارے یقین کی کمزوری کا راز فاش کرتا ہے۔

بھی سبب ہے کہ تھا ایمان یا تنہا عمل کو نہیں، بلکہ ہر جگہ دونوں کو ملا کر نجات کا ذریعہ بتایا ہے:

﴿فَالَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّلِحَاتِ فِي جَنَّتِ النَّعِيْمِ﴾ (۵) (الح: ۲۲)

”تو جو ایمان لائے اور نیک عمل کیے وہ آرام کے باعوں میں ہوں گے۔“

اسی طرح قرآن پاک میں تھوڑے تھوڑے تغیر سے ۲۵ موقعوں پر یہ آیت ہے:

﴿أَلَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّلِحَاتِ﴾

”جو ایمان لائے اور انہوں نے اچھے کام کیے۔“

اس سے قطعی طور پر یہ ثابت ہوتا ہے کہ اسلام کی نظر میں ایمان اور عمل باہم ایسے لازم و ملزم ہیں جو ایک دوسرے سے الگ نہیں ہو سکتے اور نجات اور فوز و فلاح کا مدار ان دونوں پر یکساں ہے۔ البتہ اس قدر فرق ہے کہ رتبہ میں پہلے کو دوسرے پر تقدیم حاصل ہے۔ جن مسلمانوں سے اللہ تعالیٰ نے دنیاوی حکومت و سلطنت کا وعدہ فرمایا ہے وہ بھی وہی ہیں، جن میں ایمان کے ساتھ عمل صالح بھی ہو:

﴿وَعَدَ اللَّهُ الَّذِينَ آمَنُوا هِنَّكُمْ وَعَلِمُوا الصَّلِحَاتِ لَيَسْتَخْلِفَنَّهُمْ فِي الْأَرْضِ﴾

(۵۵) (السور: ۲۴)

”تم میں سے جو ایمان لائے اور نیک کام کیے خدا نے وعدہ کیا کہ ان کو زمین کا مالک بنائے گا۔“

آخرت کی مغفرت اور روزی کا وعدہ بھی انہیں سے تھا:

﴿وَعَدَ اللَّهُ الَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّلِحَاتِ مِنْهُمْ مَغْفِرَةً وَآجِرًا عَظِيمًا﴾ (۶)

(۴۸) / الفتح:

”اللہ نے ان میں سے جو ایمان لائے اور نیک کام کیے بخشش اور بڑی روزی کا وعدہ کیا۔“

بعض آئیوں میں ایمان کے بجائے اسلام یعنی اطاعت مندی اور عمل صالح کی جگہ احسان یعنی نیکوکاری کو جگدی لگتی ہے مثلاً: ایک آیت میں یہود و نصاریٰ کے اس دعویٰ کی تردید میں کہ بہشت میں صرف وہی جائیں گے، فرمایا:

﴿بَلِّيٰ مَنْ أَسْلَمَ وَجْهَهُ لِلّٰهِ وَهُوَ حُسْنٌ فَلَهُ أَجْرٌ عِنْدَ رَبِّهِ وَلَا كَحْوٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَكْحُزُونَ﴾ (۱۱۲ / البقرة)

”کیوں نہیں جس نے اپنے آپ کو اللہ کے نالج کیا اور وہ نیکوکار ہے تو اس کی مزدوری اس کے پرو ر دگار کے پاس ہے۔ نذر ہے ان کو اور نہ غم۔“

ان تمام آئیوں سے یہ اصول ثابت ہوتا ہے کہ نجات کا مدار صرف ایمان پر نہیں بلکہ ایمان کے ساتھ عمل صالح پر ہے اور یہی وہ سب سے بڑی صداقت ہے، جس سے اسلام سے پیشتر مذاہب میں افراط اور تفریط نمایاں تھی۔ عیسائیوں میں جیسا کہ پال کے خطوط میں ہی صرف ایمان پر نجات کا مدار ہے اور بودھ و ہر میں صرف نیکوکاری سے نزاں کا درجہ ملتا ہے اور کہیں صرف گیان اور دھیان کو نجات کا راستہ بتایا گیا ہے۔ مگر پیغمبر اسلام ﷺ کے پیغام نے انسان کی نجات کا ذریعہ تھی (ایمان) اور جسمانی (عمل صالح) دونوں اعمال کو ملا کر قرار دیا ہے۔ یعنی پہلی چیز یہ ہے کہ ہم کو اصول کے صحیح ہونے کا یقین ہواں کو ایمان کہتے ہیں۔ پھر یہ کہ ان اصولوں کے مطابق ہمارا عمل درست اور صحیح ہو، عمل صالح ہے اور ہر قسم کی کامیابیوں کا مدار انہی دو باتوں پر ہے۔ کوئی مریض صرف کسی اصول طبق کو صحیح مانتے سے بیماریوں سے نجات نہیں پا سکتا، جب تک وہ ان اصولوں کے مطابق عمل بھی نہ کرے۔ اسی طرح صرف اصول ایمان کو تسلیم کر لینا انسانی فوز و فلاح کے لیے کافی نہیں۔ جب تک ان اصولوں کے مطابق پورا پورا عمل بھی نہ کیا جائے:

﴿قَدْ أَفْلَحَ الْمُؤْمِنُونَ ۗ الَّذِينَ هُمْ فِي صَلَاتِهِمْ خَشِعُونَ ۗ وَالَّذِينَ هُمْ عَنِ اللَّغْوِ مُعْرِضُونَ ۗ وَالَّذِينَ هُمْ لِلرِّكُونَةِ فَلِعُولَوْنَ ۗ وَالَّذِينَ هُمْ لِفَرْوَجِهِمْ حَفِظُونَ ۗ إِلَّا عَلَىٰ أَزْوَاجِهِمْ أَوْ مَا مَلَكُتُ أَيْمَانُهُمْ فَإِنَّهُمْ غَيْرُ مُلْكُومِينَ ۗ فَمَنِ ابْتَغَ وَرَأَءَ ذَلِكَ فَأُولَئِكَ هُمُ الْعُدُوْنَ ۗ وَالَّذِينَ هُمْ لِأَمْرِنَا مُهَمَّ وَعَهْدُهُمْ رُعُونَ ۗ وَالَّذِينَ هُمْ عَلَىٰ صَلَاتِهِمْ يَحْكَمُونَ ۗ أُولَئِكَ هُمُ الْوَرُثُونَ ۗ﴾ (۱۰ / المؤمنون)

”وہ ایمان والے مراد کو پہنچے جو نماز میں عاجزی کرتے ہیں، جو کئی باتوں کی طرف رخ نہیں کرتے، جو زکوٰۃ دیتے ہیں، جو اپنی شرم گاہوں کی حفاظت کرتے ہیں اور جو اپنی امامتوں اور اپنے عہد کا پاس کرتے ہیں جو اپنی نمازوں کے پابند ہیں، یہی بہشت کے وارث ہیں۔“

اس دنیا میں اللہ تعالیٰ نے ہر شے کو ہمارے مادی علل و اسباب کے تابع فرمایا ہے۔ یہاں کی کامیابی اور فوز و فلاح بھی صرف ذہنی عقیدہ اور ایمان سے حاصل نہیں ہو سکتی۔ جب تک اس عقیدہ کے مطابق عمل بھی نہ کیا جائے۔ صرف اس یقین سے کہ روٹی ہماری بھوک کا قطعی علاج ہے۔ ہماری بھوک درفع نہیں ہو سکتی۔ بلکہ اس کے لیے ہم کو جدوجہد کر کے روٹی حاصل کرنا اور اس کو چباؤ کر اپنے پیٹ میں لے گنا بھی پڑے گا۔ اس عقیدہ سے کہ ہم کو ہماری ناگزینی ایک جگہ سے دوسری جگہ لے جاتی ہیں، ہم ایک جگہ سے دوسری جگہ پہنچ نہیں سکتے۔ جب تک اس یقین کے ساتھ ہم اپنی ناگلوں کو بھی خاص طور سے حرکت نہ دیں۔ یہی صورت ہمارے دوسرے دنیاوی اعمال کی ہے۔ اسی طرح اس دنیا میں عمل کے بغیر تہبا ایمان کامیابی کے حصول کے لیے بیکار ہے۔ البتہ اس قدر صحیح ہے کہ جوان اصولوں کو صرف صحیح باور کرتا ہے وہ اس سے بہر حال بہتر ہے۔ جوان کو سرے سے نہیں مانتا کیوں کہ اول الذکر کے بھی نہ کبھی راہ راست پر آ جانے اور نیک عمل بن جانے کی امید ہو سکتی ہے اور دوسرے کے لیے تو اول پہلی ہی منزل باقی ہے۔ اس لیے آخرت میں بھی وہ منکر کے مقابلہ میں شاید اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم کا زیادہ مستحق قرار پائے کہ کم از کم وہ اس کے فرمان کو صحیح باور تو کرتا تھا۔

اعمال صالحی کی فضیلیں

”عمل صالح“ کا مفہوم بہت وسیع ہے، اس کے اندر انسانی اعمالی خیر کے تمام جزئیات داخل ہیں، تاہم ان کی جملی تقسیمات حسب ذیل ہیں۔ عبادات، اخلاق، معاملات۔ اسلام میں لفظ عبادت کو بڑی وسعت حاصل ہے۔ اس کے اندر ہر وہ کام داخل ہے، جس کی غرض خدا کی خوننووی ہو۔ اس لیے اخلاق و معاملات بھی اگر اس خوش نیتی کے ساتھ کیے جائیں تو وہ عبادات میں داخل ہیں۔ مگر فقہا نے اصطلاحاً یہ تین الگ الگ اور مستقل ابواب قرار دیے ہیں۔ جن کی تفصیل یوں کی جاسکتی ہے کہ اولاً اعمال صالحی کی وفضیلیں ہیں۔ ایک وہ جس کا تعلق خاص خدا سے ہے، اس کو عبادت کہتے ہیں۔ دوسری وہ جس کا تعلق بندوں سے ہے، اس کی بھی دو فضیلیں ہیں، ایک وہ جس کی حیثیت صرف انسانی فرض کی ہوتی ہے اور دوسری وہ جس میں قانونی ذمہ داری کی حیثیت ملاحظہ ہوتی ہے۔ پہلے کا نام اخلاق اور دوسرے کا معاملات ہے۔

اعمال صالحی کی انہیں تیوں قسموں کی تفصیل و تشریح سیرۃ النبی ﷺ کی موجودہ اور آیندہ جلدوں کا موضوع ہے۔

عبدات

﴿يَا أَيُّهَا النَّاسُ اعْبُدُوا رَبَّكُمْ﴾ (٢١/البقرة)

عبدات کے معنی عام طور سے وہ چند مخصوص اعمال سمجھے جاتے ہیں، جن کو انسان خدا کی عظمت اور کبریائی کی بارگاہ میں بجا لاتا ہے۔ لیکن یہ عبدات کا نہایت نگف مفہوم ہے۔ اس سلسلہ میں اللہ تعالیٰ نے محمد رسول اللہ ﷺ کے ذریعے سے انسانوں پر جو حقیقت ظاہر فرمائی۔ اس کا اصل جو ہر یہ نہیں ہے کہ گزشتہ مذاہب کی عبدات کے طریقوں کے بجائے اسلام میں عبدات کے دوسرے طریقے مقرر ہوئے۔ بلکہ یہ ہے کہ انسانوں کو یہ بتایا گیا کہ عبدات کی حقیقت اور غایت کیا ہے۔ ساتھ ہی عبدات کے گزشتہ تا قص طریقوں کی تجھیں بھیم بیانات کی تشریح اور محل تعلیمات کی تفصیل کی گئی۔ اہل عرب جہاں آسمانی مذہب کی دوسری حقیقوں سے بے نظر تھے۔ وہاں عبدات کے مفہوم و معنی اور اس کے صحیح طریقوں سے بھی نادا قف تھے۔ عرب میں جو یہود اور عیسائی تھے، وہ بھی اس کے متعلق اپنے عمل اور تعلیم سے کوئی واضح حقیقت ان کے سامنے پیش نہ کر سکے تھے۔ اس عہد میں جو عیسائی فرقے عرب میں تھے۔ عقائد میں ان کا سب سے بڑا کارنامہ یہ تھا کہ وہ حضرت مسیح علیہ السلام کی الوہیت کو تسلیم کرتے تھے اور عبدات میں یہ تھا کہ تمام دنیا کے عیش و آرام اور لذتوں کو اپنے اور پر حرام کر کے عرب کے سنسان بیباپا نوں اور پہاڑوں میں انہوں نے اپنی عبدات کا ہیں اور خلافتیں بنالی تھیں اور ان میں بیٹھ کر تمام دنیا کی جدوجہد اور سعی و کوشش کے میدانوں سے ہٹ کر مجردا اور متفقانہ زندگی برسر کرتے تھے۔ اسی لیے عربوں کی شاعری میں عیسائیت کا خیل ایک ”راہب مختل“ کی صورت میں تھا۔ عرب کا سب سے بڑا شاعر امراء القیس کہتا ہے:

ع منارة ممسى راهب مبتلٰ ﴿ دنیا سے الگ تھلگ زندگی بس رکنے والے راہب کے نام کا چراغ۔﴾

عرب میں یہودا پر اخلاقی اور مذہبی بد عملیوں کے سبب سے سخت بدنام تھے۔ ان میں روحانی خلوص و ایشارا اور خدا پرستی نام کون تھی۔ وہ صرف سبت (سپنجر) کے دن تورات کے حکم کے مطابق تقطیل منانا اور اس دن کوئی کام نہ کرنا بڑی عبدات سمجھتے تھے۔ قرآن پاک نے ان دونوں فرقوں کی اس حالت کا نقشہ کھینچا ہے۔ یہودیوں پر اس نے بے حکمی، نافرمانی، اکل حرام اور طاغوت کی پرستش کا اور عیسائیوں پر غلوتی الدین کا صحیح ازالہ قائم کیا ہے۔ یہودی جادو نکا اور عملیات کے توبات میں گرفتار تھے اور جب کبھی موقع ملتا غیر قوموں کے بتوں کے سامنے بھی سر جھکا لیتے تھے۔ عیسائی حضرت مریم علیہ السلام اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام اور سیخ اولیا اور شہیدوں کی تصویریوں، مجسموں، یادگاروں اور مقبروں کو پوچھتے تھے۔ انہوں نے راہبانہ عبدات کے نئے

* دیوان امراء القیس، ص: ۱۷ دار المعارف الفاہرۃ۔ * دیکھوہ / المائدة: ۶۲-۷۷، اور ۵۷ / الحدید: ۱۶۔

نئے اور جسم کو خست تکلیف اور آزار پہنچانے والے طریقے ایجاد کیے تھے اور ان کا نام انہوں نے دینداری رکھا تھا۔ سورہ حدید میں قرآن پاک نے یہود اور نصاریٰ دونوں کو فاسق کہا ہے، لیکن ان دونوں کے فتن میں نہایت نازک فرق ہے۔ یہود کا فتنہ دین میں کی اور سنتی کرنا اور نصاریٰ کا فتنہ دین میں زیادتی اور غلوکرنا تھا اور خدا کے شروع دین میں کی اور زیادتی دونوں گناہ ہیں۔ اسی لیے قرآن نے دونوں کو برابر کا فتنہ قرار دیا:

﴿وَلَقَدْ أَرْسَلْنَا نُوحًا وَإِبْرَاهِيمَ وَجَعَلْنَا فِي ذُرِّيَّتِهِمَا التُّبُوّةَ وَالْكِتَابَ فِيهِمُ مُهَتَّدٌ وَكَثِيرٌ
قِنْهُمْ فُسُوقُونَ ۝ ۸۷﴾ فَقَيْنَاءَ عَلَىٰ إِثْرِهِمْ بِرْ سِينَاءَ وَقَيْنَاءَ بَعِيسَىٰ إِنْ مَزِيدٌ وَأَتَيْنَاهُ الْأَخْيَلَهُ
وَجَعَلْنَا فِي قُلُوبِ الَّذِينَ ابْعَدُوهُ رَافِهَهُ وَرَحْمَهُ طَ وَرَهْبَانِيَهُ إِنْتَ عُوْهَمَا مَا كَتَبْنَاهُ عَلَيْهِمُ الْأَ
إِنْتَعَاءَ رِضْوَانَ اللَّهِ فَمَا رَعُوهَا حَقَّ رِعَايَتِهَا فَاتَّيْنَا الَّذِينَ آمَنُوا مِنْهُمْ أَجْرَهُمْ وَكَثِيرٌ
قِنْهُمْ فُسُوقُونَ ۝﴾ (۵۷/ الحدید: ۲۶-۲۷)

”اور ہم نے نوح اور ابراہیم ﷺ کو بھیجا اور ان کی نسل میں نبوت اور کتاب رکھی تو ان میں سے کچھ راہ پر ہیں اور اکثر نافرمان ہیں۔ پھر ان کے بعد ان کے پیچھے ہم نے اپنے اور پیغمبر پیچھے اور مریم کے بیٹے عیسیٰ کو بھیجا اور ان کو اخیل عنایت فرمائی اور جنہوں نے عیسیٰ کی پیروی کی ان کے دل میں نزی اور رحمدی بنائی اور ایک رہبانیت انہوں نے نئی چیز نکالی جو ہم نے ان پر نہیں لکھی تھی۔ لیکن خدا کی خوشنودی حاصل کرنا تو انہوں نے اس رہبانیت کو بھی جیسا بنانا چاہیے تھا نہیں بنایا۔ تو ان میں جو ایماندار تھے ان کو ہم نے ان کی مزدوری دی اور ان میں بہت سے نافرمان ہیں۔“

ان آئیوں سے معلوم ہوا کہ عیسائی دین میں اضافہ اور افراط کے مرتكب ہوئے۔ اسی لیے قرآن نے ان کو بار بار کہا:

﴿لَا تَقْلُوْنَ فِي دِينِكُمْ﴾ (۴/ النساء: ۱۷۱ و ۵/ المائدۃ: ۷۷)

”اپنے دین میں غلوت کرو۔“

ان کا سب سے بڑا غلوت تھا کہ حضرت عیسیٰ ﷺ کو جن کو صرف رسول اللہ مانے کا حکم دیا گیا تھا۔ وہ ابن اللہ مانے لگے اور یہود کا یہ حال تھا کہ وہ خدا کے رسولوں کو رسول بھی ماننا نہیں چاہتے تھے۔ بلکہ ان کو قتل کرتے تھے ﴿وَيَقْتُلُونَ التَّيِّنَ﴾ (۲/ بقرۃ: ۶۱، ۳/ آل عمران: ۲۱) ساتھ ہی وہ خدا نے برحق کو چھوڑ کر بت پرست ہمسایہ قوموں کے بتوں کو پوچھنے لگے تھے۔ چنانچہ تورات میں یہودیوں کی بت پرستی اور غیر خداوں کے آگے سر جھکانے کا بار بار نہ کرہے اور قرآن میں ان کے متعلق ہے:

﴿وَعَبَدَ الطَّاغُوتَ ۝﴾ (۵/ المائدۃ: ۶۰)

”اور جہنوں نے شیطان کو (یا بتوں کو) پوجا۔“

آنحضرت ﷺ نے عیسائیوں کو تسلیح کی:

﴿مَا أَمْسِكُمْ أَنْفُسُكُمْ إِلَّا رَسُولٌ قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِهِ الرُّسُلُ وَأَقْمَهُ صِدِّيقَةٌ كَانَا يَأْكُلُنَ الظَّعَامَ أَنْظَرَ كَيْفَ نَبْيَنُ لَهُمُ الْآيَتِ تَمَّ انْظَرَ إِلَيْهِمْ يُوقَنُونَ قُلْ أَعْبُدُونَ مِنْ دُوْنِ اللَّهِ مَا لَا يَمْلِكُ لَكُمْ ضَرًّا وَلَا نَعْمَالُ اللَّهُ هُوَ السَّمِيمُ الْعَلِيمُ فَلْ يَأْهُلَ الْكِتَابَ لَا تَغُوا فِي دِينِكُمْ غَيْرُ الْحُقْقِ وَلَا تَتَّسِعُوا أَهْوَاءُ قَوْمٍ قَدْ ضَلَّلُوا مِنْ قَبْلٍ وَأَضَلُّوا كَثِيرًا وَأَضَلُّوا عَنْ سَوَاءِ السَّبِيلِ﴾ (٥/٧٥-٧٧) المائدۃ

”مریم کا بینا تھج ایک بیشتر ہے اور اس سے پہلے اور پیغمبرگر پہلے اور اس کی ماں ولی تھی دونوں (انسان تھے) کھانا کھاتے تھے (خدا نے تھے) دیکھ بھم ان (عیسائیوں) کے لیے اس طرح کھول کر دیلیں بیان کرتے ہیں، پھر بھی دیکھو دکھرا لئے جاتے ہیں۔ (ان سے) کہہ کہ کیا تم خدا کو چھوڑ کر ان (انسانوں) کو پوچھتے ہو جن کے ہاتھ میں نقصان ہے نفع، اللہ ہی سنتے والا اور جاننے والا ہے جو نفع نقصان پہنچا سکتا ہے۔ کامے کتاب والو! اپنے دین میں ناجی زیادتی نہ کرو اور ان لوگوں کے خیال پر نہ چلو جو بہک گئے اور بہتوں کو بہکایا اور سیدھے راستے سے بہک گئے۔“

ان کی حالت یہ تھی:

﴿إِنَّمَا أَنْهَى هُمْ وَرَبِّهِمْ مَا رَأَيَا بَاقِيَنَ مُؤْمِنَوْنَ اللَّهُ﴾ (٩: ٣١) التوبۃ

”خدا کو چھوڑ کر اپنے عالموں اور درویشوں کو خدا بنا لیا تھا۔“

اس زمانہ میں عیسائیوں کے جو گرجے اور پرستش گاہیں عرب میں اور خصوصاً ملک جہش میں تھیں، ان میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام حضرت مریم علیہ السلام اور حواریوں، ولیوں اور شہیدوں کی تصویریں اور مجسمے نصب تھے۔ عبادات گزاران کے آگے وہیان اور مراقبہ میں رسم بخوبی درہتے تھے۔ صحابہ میں سے جن لوگوں کو عجیشہ کی بھرت کے اشنا میں ان معبدوں کے دیکھنے کا اتفاق ہوا تھا۔ ان میں سے شاید بعض یہیوں کی نگاہ میں ان بزرگوں کی تعلیم و تکریم کی یہ مناسب صورت معلوم ہوتی تھی۔ چنانچہ آنحضرت ﷺ کے مرض الموت میں بعض ازواج مطہرات نے آپ سے اس کا تذکرہ کیا اور ان کی تصویریں اور مجسموں کے صحن و خوبی کو بیان کیا۔ آنحضرت ﷺ نے فرمایا: ”خدا یہود و نصاریٰ پر لعنت بھیجے، انہوں نے اپنے پیغمبروں کی قبروں کو عبادات کاہ بنالیا۔ تم ایسا نہ کرنا ان میں سے جب کوئی نیک آدمی مر جاتا تھا تو وہ اس کی قبر کو عبادات کاہ بنالیتے تھے اور اس میں اس کی تصویریں کھڑی کر رہتے تھے۔“

* صحيح مسلم، كتاب المساجد، باب النهى عن بناء المساجد على القبور. ١١٨١ - ١١٨٨.

ایڈورڈ گلین نے تاریخ ترقی دژوال روم کی متعدد جلدیوں کے خاص ابواب میں عیسوی مذہب کے عبادات کے جو حالات بیان کیے ہیں، وہ تمام تر حدیث مذکور کی تصدیق و تائید میں ہیں۔ خصوصاً تبریزی اور پانچ بیس جلد میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام، حضرت مریم علیہ السلام، سینٹ پال اور متعدد ولیوں اور شہیدوں کی پرستش کی جو کیفیت درج ہے، وہ بالکل اس کے مطابق ہے اور آج تک رہمن کی تھولک اور قدیم سیکی فرقوں کی پرستش گاہوں کے درود یا وار سے قرآن پاک کی صداقت کی آوازیں آ رہی ہیں اور آج بھی دین دار عیسائی دن رات موئی تیوں کی روشنی میں ان کے آگے مراقبوں اور تبعیجوں میں سرگوشی نظر آتے ہیں۔ روم (المی) کے تاریخی گرجاؤں میں یہ منظر میں نے خود اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے اور اس وقت محمد رسول اللہ علیہ السلام کی اس حدیث کی اصلی تقریح میری آنکھوں کے سامنے تھی۔ یہودیوں اور عیسائیوں کو چھوڑ کر خاص عرب کے لوگ اللہ نام ایک ہستی سے واقف ضرور تھے۔ مگر اس کی عبادات اور پرستش کے مفہوم سے بے خبر تھے۔ لات، عزیٰ، ہبل اور اپنے اپنے قبیلے کے جن بتوں کو حاجت روا اور پرستش کے مقابل سمجھتے تھے۔ ان پر جانور کی قربانی کرتے اور اپنی اولادوں کو بھینٹ چڑھاتے تھے۔ سال کے مختلف اوقات میں مختلف بت خانوں کے میلوں میں شریک ہوتے تھے اور پھر وہ بڑیوں کے سامنے بعض مشرکانہ درسم ادا کرتے تھے۔ خانہ کعبہ یعنی خلیل علیہ السلام شکن کا معبد تین سو سالہ بتوں کا مرکز تھا اور ان کی نماز یہ تھی کہ خانہ کعبہ کے گھن میں جمع ہو کر سیٹی اور تالی بجا بجا کر بتوں کو غوش اور راضی رکھیں۔ قریش کا موحد زید بن عمرو جو آنحضرت علیہ السلام کی نبوت سے پہلے بت پرستی سے تائب ہو چکا تھا۔ وہ کہا کرتا تھا کہ ”اے خدا مجھے نہیں معلوم کہ میں تھوڑا کوئی طرح پوچھوں اگر جانتا تو اسی طرح عبادت کرتا۔“ *

ایک صحابی شاعر عاصم بن اکوع خیر کے سفر میں ترانہ نگار ہے تھے اور آنحضرت علیہ السلام سن رہے تھے:

وَاللَّهُ لَوْلَا أَنْتَ مَا اهْتَدِيْنَا وَلَا تَصْدِقَنَا وَلَا صَلِّيْنَا

”خدا کی قسم! اگر تو نہ ہوتا تو نہ ہم راست پاتے نہ خیرات کرتے اور نہ نماز پڑھتے۔“

اس شعر میں اس حقیقت کا اظہار ہے کہ وہ محمد رسول اللہ علیہ السلام ہی کی تعلیم تھی، جس نے اہل عرب کو عبادت کے صحیح طریقوں سے آشنا کیا۔

عرب سے باہر بھی کہیں خداۓ واحد کی پرستش نہ تھی۔ بت پرست یونانی اپنے باوشا ہوں اور ہیرودوس کے محسے اور ستاروں کے ہیکل پوجتے تھے۔ روم، ایشیائے کوچک، یورپ، افریقہ، مصر، بربر، جبše وغیرہ عیسائی ملکوں میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام حضرت مریم علیہ السلام اور سینکڑوں ولیوں اور شہیدوں کی مورتیاں اور ہدیاں اور ان کی مصوی یادگاریں پوجی جا رہی تھیں۔ زردشت کی مملکت میں آگ کی پرستش جاری تھی۔ ہندوستان سے لے کر کابل و ترکستان اور چین اور جزائر ہند تک یودھ کی مورتیوں، سادھوں اور اس کی جلی ہوئی ہدیوں کی راکھی کی پوجا

سیرۃ ابن هشام ذکر ورقہ و زید بن عمر، ج ۱، ص: ۱۴۴۔

* صحیح مسلم، کتاب الجهاد والسبیر، باب غزوہ خیر، ۶۶۹۔

ہو رہی تھی۔ جیسیں کے کنفوش اپنے باپ وادوں کی مورتوں کے آگے خم تھے۔ خاص ہندوستان میں سورج دیوتا گنگا مائی اور اواتاروں کی پوجا ہو رہی تھی۔ عراق کے صابی سبع سیارہ کی پرستش کی تاریکی میں بتلاتھے۔ باقی تمام دنیا درختوں، پتھروں، جانوروں، بھوتوں اور دیوتاؤں کی پرستش کر رہی تھی۔ غرض یعنی اس وقت جب تمام دنیا خداۓ واحد کو چھوڑ کر آسمان سے زمین تک کی مخلوقات کی پرستش میں مصروف تھی۔ ایک بے آب و گیاہ ملک کے ایک گوشے سے آواز آئی:

﴿يَا أَيُّهَا النَّاسُ اعْبُدُوا رَبَّكُمُ الَّذِي خَلَقَكُمْ وَالَّذِينَ مِنْ قَبْلِكُمْ﴾ (۲۱: البقرة)

”لوگو! اپنے اس پروردگار کی پرستش کرو، جس نے تم کو اور تم سے پہلوں کو پیدا کیا۔“

سابق کتب الہی کے ایمان داروں کو آواز دی گئی:

﴿يَا أَهْلَ الدِّينِ تَعَالَوْا إِلَى كَلِمَةٍ سَوَاءٌ يَسِّنَا وَبَيْنَمَا أَلَا نَعْبُدُ إِلَّا اللَّهُ﴾

(آل عمران: ۶۴)

”اے کتاب والو! آؤ ہم تم اس بات پر عملًا متحد ہو جائیں، جس میں ہم تم عقیدہ متفق ہیں کہ ہم خداۓ برحق کے سوا کسی اور کی پرستش نہ کریں۔“

مگر یہ آواز ریگستان عرب کے صرف چند حق پرستوں نے سن اور پکارا تھے:

﴿رَبَّنَا إِنَّا سَمِعْنَا مُنَادِيًّا يَنْادِي لِلْأَنْبِيَانَ أَنْ أَمْنُوا بِرَبِّكُمْ فَإِمَّا ذَاقَ رَبِّنَا فَأَغْفِرْنَاهُ إِنَّا ذُوْنَبِنَا﴾

(آل عمران: ۱۹۳)

”خداوند! ہم نے ایمان کی منادی کی آواز سنی کہ اپنے پروردگار پر ایمان لاو تو ہم ایمان لے آئے تو اے پروردگار ہمارے گناہ معاف کر۔“

ان واقعات کو سامنے رکھ کر آنحضرت ﷺ کی اس دعا کی صداقت کا اندازہ کرو جو بدر کے امتحان گاہ میں آپ کی زبان عبودیت ترجمان سے بارگاہ الہی میں کی گئی تھی:

”یا الٰہی! اتیرے پوچنے والوں کی یہ مٹھی بھر جماعت آج تیرے لیے ہوئے پرآمادہ ہے۔ الٰہی! آج اگر یہ مٹھی تو پھر زمین میں تیری کبھی پرستش نہ ہوگی۔“ *

خدانے اپنے نبی ﷺ کی دعا سنی اور قبول فرمائی کیوں کہ خاتم الانبیاء کے بعد کوئی دوسرا آنے والا نہ تھا۔ جو غافل دنیا کو خدا کی یاد دلاتا اور خدا کی سچی اور مخلصانہ عبادت کی تعلیم دیتا۔

صرف ایک خدا کی عبادت

نہ ہب کی تکمیل اور اصلاح کے سلسلہ میں بہت محمدی ﷺ کا پہلا کارنا مہیہ ہے کہ اس نے دنیا کے

* صحیح مسلم، کتاب الجهاد، باب الامداد بالملائكة فی غزوۃ بدر: ۴۵۸۸؛ جامع ترمذی، کتاب التفسیر، ومن سورة الانفال: ۳۰۸۱؛ مسند احمد، ج ۱، ص: ۳۰، ۳۲، ۳۰۔ ۱۱۷

عبدول سے تمام باطل معبودوں کو باہر نکال کر بچینک دیا۔ باطل معبودوں کی عبادت اور پرستش یک قلم محو کر دی اور صرف اس ایک خدا کے سامنے خدا کی تمام مخلوقات کی گردئیں جھکا دیں اور صاف اعلان کر دیا کہ

﴿إِنَّ كُلُّ مَنْ فِي السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ إِلَّا أَنَّ الرَّحْمَنَ عَنْهُمْ عَنِيدٌ﴾ (۱۹ / مریم: ۹۳)

”آسمان و زمین کی تمام مخلوق اس مہربان خدا کے سامنے غلام ہی بن کر آنے والی ہے۔“

خدا کے سوانح تو آسمان میں نہ زمین میں نہ آسمان کے اوپر اور نہ زمین کے نیچے کوئی ایسی چیز ہے جو انسان کے سجدہ اور کوع و قیام کی مستحق ہے اور نہ ہی اس کے سوا کسی اور کے نام پر کسی جاندار کا خون بھایا جاسکتا ہے اور نہ اس کی پرستش کے لیے گھر کی کوئی دیوار اٹھائی جاسکتی ہے اور نہ اس کی نذر مانی جاسکتی ہے اور نہ اس سے دعائیں جاسکتی ہے۔ ہر عبادت صرف اسی کے لیے اور ہر پرستش صرف اسی کی خاطر ہے:

﴿إِنَّ صَلَاتِي وَسُكُونِي وَحَمْنَىٰي وَمَمَائِي بِلِلَّهِ رَبِّ الْعَالَمِينَ﴾ (۶ / الانعام: ۱۶۲)

”بے شہری نماز اور میری قربانی اور میری زندگی اور میری موت سب اسی ایک عالم کے پروردگار اللہ کے لیے ہے۔“

کفار کو نتوں، دیوتاؤں، ستاروں اور دوسری مخلوقات کی پرستش سے ہر طرح منع کیا گیا اور انہیں ہر دلیل سے سمجھایا گیا کہ خدائے برحق کے سوا کسی اور کی پرستش نہیں، لیکن جب ان پر اس سمجھانے بجھانے کا کوئی اثر نہ ہوا تو اسلام کے بغیر کو اس انقلاب کے اعلان کا حکم ہوا:

﴿فَلَمْ يَأْكُلُهَا الْكُفَّارُونَ لَا أَعْبُدُ مَا تَعْبُدُونَ وَلَا أَنْتُمْ عِبْدُونَ مَا أَعْبُدُ وَلَا أَنَا عَابِدٌ مَا عَبَدْتُهُمْ وَلَا أَنْتُمْ عِبْدُونَ مَا أَعْبُدُ لَكُمْ دِيَنُكُمْ وَلِيَ دِيَنِ﴾ (۹ / الکفرنون)

”اے کافرو! جس کو تم پوچھتے ہو اس کو میں نہیں پوچھتا اور نہ تم اس کو پوچھنے والے ہو، جس کو میں پوچھتا ہوں اور نہ میں اسکو پوچھنے والا ہوں، جس کو تم نے پوچھا اور نہ تم اس کو پوچھنے والے ہو، جس کو میں پوچھتا ہوں، تمہارے لیے تمہارا دین ہے اور میرے لیے میرا دین ہے۔“

خارجی رسوم کا وجود نہیں

خدا کی عبادت اور پرستش کے وقت جسم و جان سے باہر کی کسی چیز کی ضرورت نہیں۔ نہ سورج کے نکلنے اور اس کی طرف دیکھنے کی حاجت، نہ دریا میں جا کر اس کاپانی اچھائی سے مطلب ۱ نہ سامنے آگ کا الاؤ جلانے کی ضرورت ۲ نہ دیوتاؤں، دیوبیوں، بزرگوں اور ولیوں کے مجسموں کو پیش نظر رکھنے کی اجازت ۳ نہ سامنے موسم تیوں کے روشن کرنے کا حکم ۴ نہ گھننوں اور ناقوں کی ضرورت نہ لوپاں اور دوسرے بخورات جلانے کی رسم، نہ سونے چاندی کے خاص خاص ظروف اور برتوں کے رکھنے کا طریقہ، نہ کسی خاص قسم کے

۵ جیسا کہ بندوں میں ہے۔ ۶ جیسا کہ پارسیوں میں ہے۔

۷ جیسا کہ بندوں، عام بہت پرستوں اور دومن کی تھوڑک میں ہے۔

۸ جیسا کہ دومن کی تھوڑک عیسائیوں میں ہے۔

کپڑوں کی قید ॥ ان تمام یہودی رسم و قواد سے اسلام کی عبادت پاک اور آزاد ہے۔ اس کے لیے صرف ایک پاک ستر پوش لباس، پاک جسم اور پاک دل کی ضرورت ہے، اگر جسم ولباس کی پاکی سے کبھی مجبوری ہو جائے تو یہ بھی معاف ہے۔

در میانی، آدمی کی ضرورت نہیں

اسلام میں عبادت کے لیے خدا اور بندہ کے درمیان کسی خاص خاندان اور کسی خاص شخصیت کی وساطت اور درمیانی کی حاجت نہیں۔ محمد رسول اللہ ﷺ کے دین میں ہندوؤں کی طرح نہ برہمن ہیں، نہ پروہت ہیں، نہ پچاری ہیں۔ نہ یہودیوں کی طرح کاہن ہیں نہ ربی ہیں۔ نہ حاخام ہیں نہ حضرت ہارون علیہ السلام کے خاندان کی وساطت کی قید ہے، نہ عیسائیوں کی طرح عبادتوں کی بجا آوری کے لیے پادریوں اور مختلف مذہبی عہدہ داروں کی ضرورت ہے اور نہ پارسیوں کی طرح دستوروں اور موبدوں کی حاجت۔ یہاں ہر بندہ اپنے خدا سے آپ مخاطب ہوتا ہے، آپ باتیں کرتا ہے، آپ عرض حال کرتا ہے، ہر مسلمان اپنا آپ برہمن، اپنا آپ کاہن، اپنا آپ پاری اور اپنا آپ دستور ہے، یہاں یہ حکم ہے کہ تم مجھے برہا راست پکارو میں جواب دوں گا:

(اَذْعُونَىٰ اَسْتَجِبْ لَكُمْ) (۶۰ / المؤمن: ۴۰)

”تم مجھے پکارو میں تم کو جواب دوں گا۔“

خارجی کشش کی کوئی چیز نہیں

اکثر نماہب نے اپنی عبادتوں کو دلکش لفیریب موثر اور بار عب بنانے کے لیے خارجی تاثیرات سے کام لیا تھا۔ کہیں ناقوس اور قرنا کی پر رعب آوازیں تھیں، کہیں ساز و ترنم اور نغمہ و بربط کی دلکش صدائیں تھیں، کہیں جرس اور گھنٹے کا غنغلہ انداز شور لیکن دین محمدی ﷺ کی سادگی نے ان میں سے ہر ایک سے احتراز کیا اور انسانی قلوب کو متاثر کرنے کے لیے دل کے ساز اور روح کی صدائے سو ایسی اور خارجی اور بناؤنی تدبیر کا سہارا نہیں لیا، تاکہ خدا اور بندہ کا راز و نیاز اپنی اصلی اور فطری سادگی کے ساتھ خلوص و اثر کے مناظر پیدا کرے۔

مکان کی قید نہیں

ہر نہ ہب نے اپنی عبادت کو ایسٹ اور جو نے کی چہار دیواری میں محدود کیا ہے۔ بت خانوں سے باہر پوچھنیں۔ آتش خانوں سے الگ کوئی نماز نہیں، گرجوں کے سوا کہیں دعائیں اور صوموں سے نکل کر کوئی پرستش نہیں۔ لیکن محمد رسول اللہ ﷺ کے طریقہ میں نہ کسی درود یا وار کی ضرورت نہ محраб و منبر کی حاجت، وہ دری و حرم، معبد و صومعہ اور مسجد و کنیس سب سے بے نیاز ہے۔ زمین کا ہر گوشہ بلکہ پہنانے کی گناہ کا ہر حصہ اس کا معبد اور عبادت خانہ ہے۔ آنحضرت ﷺ نے ارشاد فرمایا: ”مجھے اللہ تعالیٰ نے بعض ایسی خصوصیتیں عنایت کیں جو مجھے سے پہلے پیغمبروں کو نہیں دی گئیں، مجملہ ان کے ایک یہ ہے:

● یہ چیزیں یہودیوں کے ہاں ہیں پارسیوں میں سفید کپڑوں کی اکثر ضرورت ہے۔

(و جعلت لی الارض مسجدا))

”او ریمرے لیے تمام روئے زمین سجدہ گاہ بنادی گئی۔“

تم سوار ہو کہ پیدا ہو، گلکشت چمن میں ہو کہ ہنگامہ کارزار میں، خشکی میں ہو کہ تری میں، ہوا میں ہو کہ زمین پر، جہاز میں ہو کہ دلیل پر ہر جگہ خدا کی عبادت کر سکتے ہو اور اس کے سامنے سجدہ نیاز بجالا سکتے ہو۔ یہاں تک کہ اگر تم کسی غیر مذہب کے ایسے معبد میں ہو، جس میں سامنے بت اور مجسمے نہ ہوں تو وہاں بھی اپنا فریضہ عبادت ادا کر سکتے ہو۔ ﴿ خاص خاص عبادتوں کے وقت مختلف سمتتوں اور چیزوں کی طرف رخ کرنا بھی ہر مذہب میں ضروری سمجھا جاتا ہے۔ چنانچہ تمام مسلمانوں کو ایک واحد رخ پر مجمع کرنے کے لیے، تاکہ ان میں وحدت کی شان نمایاں ہو، مسلمانوں کے لیے بھی کسی ایک سمت خاص کی حاجت تھی اور اس کے لیے اسلام میں مسجد ابراہیم کی تخصیص کی گئی ہے کہ وہ دنیا میں خدائے واحد کی پرستش کا پہلا مقام ہے۔ لیکن اس کی حیثیت وہ نہیں قائم کی گئی جو دوسرے نماہب کے قبلوں کی ہے۔ اسلام کا قبلہ شمال و جنوب اور مشرق و مغرب کی حدود سے پاک ہے۔ وہ ستاروں کے رخ یا چاند اور سورج کے موجہ کا قائل نہیں اور دنیا کے مختلف ملکوں کے مسلمان ہر سمت اور ہر جہت سے اس کی طرف رخ کرتے ہیں۔ مغرب سے بھی مشرق سے بھی شمال سے بھی اور جنوب سے بھی کسی ایک سمت کی تخصیص نہیں اور خود خانہ کعبہ کے صحن میں یہک وقت ہر جہت اور ہر سمت سے اس کی طرف رخ کیا جاتا ہے۔ اگر کسی سبب سے اس رخ کا بھی پتہ نہ لگ سکے تو جدھر بھی رخ کروادھر ہی خدا ہے۔ چنانچہ کسی چلتی ہوئی سواری پر سفر کرنے کی حالت میں اور عامنفل نمازوں کی درستی کے لیے قبلہ کی بھی تخصیص نہیں۔ جدھر سواری کا رخ ہوا جھر ہی سجدہ کیا جا سکتا ہے۔ لڑائیوں میں ہر رخ پر نماز برابر ادا کی جاسکتی ہے۔ اگر خدا نخواست کعبہ کی عمارت باقی نہ رہے تب بھی اس رخ کھڑا ہو جانا کافی ہے۔ کعبہ کے اندر کھڑے ہو کر جدھر چاہو سر جھکا دو۔

انسانی قربانی کی ممانعت

بعض نماہب میں خدا کی سب سے مرغوب عبادت یہ صحیح جاتی تھی کہ انسان اپنی یا اپنی اولاد کی جان کو خواہ گلا کاٹ کر یاد ریا میں ڈبا کر یا آگ میں جلا کر کیا کسی اور طرح بھینٹ چڑھا دے۔ اسلام نے اس عبادت کا قطعی استیصال کر دیا اور بتایا کہ خدا کی راہ میں اپنی جان قربان کرنا اصل میں یہ ہے کہ کسی چاقی کی حمایت میں یا کمزوروں کی مدد کی خاطر اپنی جان کی پرواہ کرے اور مارا جائے، نہیں ہے کہ اپنے ہاتھ سے اپنا گلا کاٹ لیا جائے یا دریا میں ڈوب مرا جائے یا آگ میں اپنے کو جلا دیا جائے۔ آپ ﷺ نے فرمایا کہ ”جو شخص جس چیز سے اپنے آپ کو قتل کرے گا، اس کو جہنم میں اسی چیز سے سزا دی جائے گی۔“

1- صحیح بخاری، کتاب الصلوٰۃ باب قول النبی ﷺ: ((جعلت لی الارض مسجدا و طهورا)) : ۴۳۸۔

2- صحیح بخاری، کتاب الصلوٰۃ باب الصلوٰۃ فی البيعة رقم الباب: ۵۴۔

3- صحیح بخاری، کتاب الادب، باب من اکفر اخاه بغیر تأویل فهو كما قال: ۶۱۰۵۔

حیوانی قربانی میں اصلاح

کسی حیوان کی قربانی کر کے خدا کی خوشنودی حاصل کرنے کا طریقہ اکثر مذاہب میں رائج تھا۔ عرب میں اس کا طریقہ یہ تھا کہ لوگ جانور ذبح کر کے بتوں پر چڑھادیتے تھے۔ کبھی یہ کرتے تھے کہ مردہ کی قبر پر کوئی جانور لارکا بندھ دیتے تھے اور اس کو چارہ گھاس نہیں دیتے تھے، وہ اسی طرح بھوک اور پیاس سے ترپ ترپ کر مر جاتا تھا۔ اہل عرب یہ سمجھتے تھے کہ خداخون کے نذر ان سے خوش ہوتا ہے۔ چنانچہ قربانی ذبح کر کے بعد کی دیوار پر اس کے خون کا چھاپ دیتے تھے۔ یہودیوں میں یہ طریقہ تھا کہ جانور قربانی کر کے اس کا گوشت جلا دیتے تھے اور اس کے متعلق وہ جو رسوم ادا کرتے تھے ان کی تفصیل صفحوں میں بھی نہیں سامنکتی۔ ان کا یہ بھی عقیدہ تھا کہ یہ قربانی خدا کی غذا ہے۔ ﴿بعض مذاہب میں یہ تھا کہ اس کا گوشت بیل اور کوؤں کو کھلادیتے تھے۔ پیغمبر محمد ﷺ نے ان سب طریقوں کو منادیا۔ اس نے سب سے پہلے یہ بتایا کہ اس قربانی سے مقصود خون اور گوشت کی نہیں، بلکہ تمہارے دلوں کی غذا مطلوب ہے۔ فرمایا:

﴿لَكُنْ يَتَّسَأَ اللّٰهُ لُحُومُهَا وَلَا دَمًا وَهَا وَلِكُنْ يَتَّسَأَ اللّٰهُ التَّقْوَىٰ مِنْكُمْ ط﴾ (الحج: ٣٧)

”اللہ کے پاس قربانی کے جانور کا گوشت اور خون نہیں پہنچتا، بلکہ تمہارے دل کی پرہیز گاری پہنچتی ہے۔“

اسلام نے تمام عبادات میں صرف ایک حج کے موقع پر قربانی واجب کی ہے اور اہل استطاعت کے لیے جو موقع حج پر نہ گئے ہوں، مقام حج کی یاد کے لیے قربانی مسنون کی گئی ہے، تاکہ اس واقعہ کی یاد تازہ ہو جب ملتِ حنفی کے سب سے پہلے داعی نے اپنے خواب کی تعبیر میں اپنے اکلوتے بیٹے کو خدا کے سامنے قربان کرنا چاہا تھا اور خدا نے اس کو آزمائش میں پورا ہوتا دیکھ کر اس کی چھری کے نیچے بیٹے کی بجائے دنبے کی گردن رکھ دی اور اس کے پیروؤں میں اس عظیم الشان واقعہ کی سالانہ یادگار قائم ہو گئی۔

اسی کے ساتھ پیام محمد ﷺ نے یہ تعلیم دی کہ اس قربانی کا منشاء ارواح کو خوش کرنا، مصیبتوں کو دور کرنا، جان کا ندیہ دینا اور صرف خون کا بہانا اور گردن کا کائنات نہیں، بلکہ اس سے وہ مقصود ہیں، ایک یہ کہ اللہ تعالیٰ کے اس احسان کا شکر ادا کیا جائے کہ اس نے جانوروں کو ہماری ضرورتوں میں لگایا اور ان کو ہماری غذا کے لیے مہیا کیا اور دوسرا یہ کہ ان کا گوشت غریبوں اور فقیروں کو کھلا کر خدا کی خوشنودی حاصل کی جائے۔ چنانچہ فرمایا:

﴿وَلِكُلِّ أُمَّةٍ جَعَلْنَا مِنْكُمْ كَيْذِرُوا السَّمَاءَ اللَّوْ عَلٰى مَارِزَ قَهْمَدْ مِنْ يَهِيمَةَ الْأَنْعَامَ طَ فَالْفَلْكُمْ ط﴾

﴿اللّٰهُ وَاحِدٌ فَلَهُ أَسْلَمُوا طَ وَبَشَرُ الْحَنْتَيْنِ ط﴾ (الحج: ٣٤)

”ہم نے ہر قوم کے لیے قربانی مقرر کی، تاکہ وہ ان جانوروں پر خدا کے نام کی یاد کریں، جو ہم نے ان کو روزی کی تو تمہارا خدا ایک خدا ہے، اسی کے آگے سر جھکاؤ اور عاجزی کرنے والے

بندوں کو خوشخبری سنادے۔“

﴿وَالْبُدْنَ جَعَلْنَا لَكُمْ قِنْ شَعَابِرَ اللَّهُ لَكُمْ فِيهَا خَيْرٌ فَإِذْكُرُوا السَّمَاءَ اللَّهُ عَلَيْهَا صَوَافٌ فَإِذَا وَجَئْتَ جُنُوبِهَا فَخُلُوٌّ مِنْهَا وَأَطْعِمُوا الْقَانِيَةَ وَالْمَعْتَزَ لَذِكْرِكَ سَخَرِنَاهَا لَكُمْ لَعْلَكُمْ تَشَدُّونَ﴾ (۲۲/الحج)

اور قربانی کے جانور کو خدا کی نشانیاں بنایا ہے۔ تمہارے لیے ان میں بہت فائدے ہیں، ان کو قطار میں کھڑا کر کے تم ان پر خدا کا نام لو توجہ وہ پہلو کے بل جھکیں (یعنی ذبح ہو جکیں) تو ان میں سے کچھ خود کھاؤ اور باقی قناعت پسند فقیروں اور محتاجوں کو کھلا رو، اسی طرح ہم نے ان جانوروں کو تمہارے کام میں لگایا ہے کہ خدا کا شکر ادا کرو۔“

یہی وجہ ہے کہ خدا کے نام کے سوا کسی اور کے نام پر اگر جانور کو ذبح کیا جائے تو محمد رسول اللہ ﷺ کی شریعت میں یہ قتل شرک اور ایسے جانور کا گوشت کھانا حرام ہے۔ (وَمَا أَهْلَ يَهٰءِ اللَّهُ عَرْبَ مِنْ دَسْتُورٍ تَحَاكَرَ خَاصَ رَجْبَ كَمِيَّةٍ مِنْ قَرْبَانِيَّةٍ كَرْتَ تَحْتَهُ۔) اسلام کے بعد لوگوں نے اس کے متعلق آپ سے پوچھا آپ ﷺ نے فرمایا: ”خدا کے نام سے جس مہینہ میں چاہو ذبح کرو، نیک کام خدا کے لیے کرو اور (غیر یوں کو) کھلاؤ۔“ غرض قربانی کی یہی وحیتیں ہیں۔ صرف خون بہانے کے لیے خون بہانا قربانی کی حقیقت نہیں اور نہ یہ خون بہانا مشکر کوں کی دیوبیوں اور دیوتاؤں کی طرح اسلام کے خدا کو خوش آتا ہے۔
بشر کا نہ قربانیوں کی ممانعت

اسی لیے وہ تمام مشرکانہ قربانیاں جو عرب میں جاری تھیں بند کر دی گئیں۔ عرب میں جانوروں کے قربانی کرنے اور ان کو بتوں پر چڑھانے کے مختلف طریقے تھے۔ اونٹی کا پہلا بچہ جو پیدا ہوتا تھا، بتوں کے نام پر عموماً اس کی قربانی کر دیتے تھے اور اس کی کھال کو درخت پر لٹکا دیتے تھے۔ اس قسم کے بچے کو فرع کہتے تھے۔ رجب کے پہلے عشرہ میں ایک قسم کی قربانی کی جاتی تھی۔ جس کا نام عتیرہ تھا اسلام نے ان دونوں قربانیوں کو ناجائز قرار دیا اور رجب کی تخصیص باطل کر دی۔

قال: ((لَا فَرْعَ وَلَا عَتِيرَة))

آپ ﷺ نے فرمایا: ”فرع اور عتیرہ جائز نہیں ہے۔“

بتوں کے نام پر مختلف ناموں سے زندہ جانور چھوڑے جاتے تھے اور ان کو کوئی شخص کسی دوسرے کام میں استعمال نہیں کر سکتا تھا۔ چنانچہ قرآن مجید میں اس کے متعلق خاص طور پر ایک آیت نازل ہوئی:

﴿مَا جَعَلَ اللَّهُ مِنْ تَحْيِيَةً وَلَا سَأْلَيْةً وَلَا وَصِيلَةً وَلَا حَافِلًا﴾ (۵/المائدۃ: ۱۰۳)

ابوداؤد، کتاب الضحايا، باب فی العتیرة: ۲۸۳۰۔

ایضاً: ۲۸۳۱۔

”نَّهُو خَدَانِي بِخَيْرٍ، نَّهُ سَابِقٌ، نَّهُ وَصِيلَةٌ اُوْرَه حَامٌ بَنَايَا۔“

مردوں کی قبر کے پاس گائے یا بکری ذبح کرتے تھے لیکن اسلام نے مراسم ماتم کی جو اصلاحیں کیں اس کے سلسلہ میں اس کو بھی ناجائز قرار دیا۔ فرمایا:

(لا عفر فی الاسلام) ﴿۱﴾

”اِسْلَامُ مِنْ قَبْرِكَ پَاسْ جَانُورُوْنَ كَاذْبَعَ كَرْنَا جَانُرْنَبِيْنِ۔“

عرب جالمیت میں یہ بھی دستور تھا کہ لوگ اپنی فیاضی و سخاوت کی نمائش اس طرح کرتے تھے کہ دو آدمی مقابل ہو کر جانوروں کے ذبح کی بازی لگاتے تھے۔ اپنا ایک اونٹ یہ ذبح کرتا پھر اس کے مقابل میں دوسرا ذبح کرتا۔ اسی طرح یہ مقابلہ قائم رہتا جس کے اونٹ ختم ہو جاتے یا ذبح کرنے سے انکار کر دیتا ہے اور جاتا۔ اسلام نے اس جان و مال کے ائتلاف کو روک دیا۔ ﴿۲﴾

تجزد، ترک لذاند، ریاضات اور تکالیف شاقہ عبادت نہیں

عام خیال یہ تھا کہ بندہ جس قدر اپنے اوپر تکلیف اختاہتا ہے۔ اسی قدر خدا خوش ہوتا ہے اور وہ اس کی بڑی عبادت شمار ہوتی ہے۔ اسی لیے لوگ اپنے جسم کو بڑی بڑی تکلیفیں دیتے تھے اور سمجھتے تھے کہ جس قدر جسم کو آزار زیادہ دیا جائے گا اسی قدر روح میں زیادہ صفائی اور پاکیزگی آئے گی۔ چنانچہ یونانی فلاسفوں میں اشراقت، عیسائیوں میں رہبانیت اور ہندوؤں میں جوگ اس اعتقاد کا نتیجہ تھا۔ کوئی گوشت نہ کھانے کا عہد کر لیتا۔ کوئی بھتے میں یا چالیس دن میں ایک دفعہ غذا کرتا تھا۔ کوئی سرتاپ برہمنہ رہتا اور ہر قسم کے لباس کو قدس کا نگ سمجھتا تھا۔ کوئی چلہ کی سردی میں اپنے بدن کو نگار کھاتا تھا۔ کوئی عمر بھر یا سالہا سال تک اپنے کو کھڑا رکھتا تھا یا بیٹھا رہتا تھا اور سونے اور لینٹے سے قطعاً پر ہیز کرتا تھا۔ کوئی اپنا ایک ہاتھ کھڑا رکھتا کہ سوکھ جائے، کوئی عمر بھر تاریک تھا خانوں اور غاروں میں چھپ کر خدا کی روشنی تلاش کرتا تھا۔ کوئی تجرد اور ترک دنیا کر کے اہل و عیال اور زن و فرزند کے تعلق سے نفرت رکھ کر خدا کی محبت کا غلط مدعا بنتا تھا۔ لیکن نبوت محمدی ﷺ نے راز آشکار کیا کہ ان میں سے کوئی چیز عبادت نہیں، نہ ترک لذاند سے حق کی لذت ملتی ہے، نہ ہماری غمگینی خدا کی خوشنودی کا باعث ہے اور نہ بندوں کی اس غیر معمولی تکلیف سے خدا کو آرام ملتا ہے، نہ زن و فرزند کی نفرت سے خدا کی محبت نصیب ہوتی ہے، نہ ترک دنیا سے دین کی دولت ملتی ہے۔ خدا کا دین اتنا ہی ہے جو بندہ کی استطاعت کے اندر ہے۔ اس نے کہا:

﴿لَا يَكْلُفُ اللّٰهُ نَفْسًا إِلَّا وُسْعَهَا﴾ (۲/ البقرة: ۲۸۶)

”خدا کسی کو اس کی گنجائش سے زیادہ کی تکلیف (کا حکم) نہیں دیتا۔“

﴿ابوداؤد، کتاب الجنائز، باب کراہیۃ الذبح عند القبر: ۳۲۲﴾

﴿ابوداؤد، کتاب الا ضاحی، باب ما جاء فی اکل معافرة الاعراب: ۲۸۲۰﴾

اسلام میں روزہ ایک ایسی چیز تھی جس کو بعضوں کے لیے غیر معمولی تکلیف کہہ سکتے ہیں۔ اسلام نے اس میں متعدد آسانیاں پیدا کر کے کہا:

﴿يُرِيْدُ اللّٰهُ يَكُمُ الْيُسْرَ وَلَا يُرِيْدُ يَكُمُ الصُّرْتَ﴾ (۲/ البقرة: ۱۸۵)

”خدا تمہارے ساتھ آسانی چاہتا ہے تھی نہیں۔“

جو بھی سب لوگوں پر مشکل تھا تو ساتھ ہی فرمادیا:

﴿مَنْ أَسْتَطَعَ اِلَيْهِ سَيْلَاطٌ﴾ (۳/آل عمران: ۹۷)

”جس کو (زادراہ اور چلن کی) استطاعت ہوا سی پر حج فرض ہے۔“

﴿وَمَا جَعَلَ عَنِّكُمْ فِي الدِّيْنِ مِنْ حَرَجٍ﴾ (۲۲/ الحج: ۷۸)

”تمہارے لیے دین میں اس (خدانے) تنگی نہیں کی۔“

آنحضرت ﷺ نے ارشاد فرمایا:

((ان هذا الدين يسر ولن يشاد الدين احد الا غلبه)) ﴿٤﴾

”یہ دین آسان ہے جو کوئی شخص دین سے سختی میں مقابلہ کرے گا تو دین اس کو مغلوب کر دے گا۔“

اور فرمایا:

((انما انا بعثت بالملة السمحۃ او السهلة الحنفية البيضاء)) ﴿٥﴾

”میں تو سہل اور آسان روشن حلپنی دین دے کر بھیجا گیا ہوں۔“

ندھب میں رہبانیت اور جوگ کا جو طریقہ ایجاد کیا خواہ وہ کتنی ہی خوش نیت سے کیا گیا ہو، تاہم وہ دین حق کی اصلی تعلیم تھی، اسی لیے اسلام کے صحیفے اس کو بدعت تے تبیر کیا اور کہا:

﴿وَرَهْبَانِيَّةً إِبْتَدَأَ عَوْهَا مَا كَتَبْنَاهَا عَلَيْهِمُ الْأَيْمَانَ صُوَانِ اللّٰهِ فَمَا عَوْهَا حَقُّ رِعَايَتِهَا﴾

(۲۷/ الحدید: ۵۷)

”اور عیسائیوں نے ایک رہبانیت کی بدعت نکالی اور ہم نے ان کو خدا کی خوشنودی حاصل کرنے کے سواں کا حکم نہیں دیا تھا تو جیسا چاہیے اس رہبانیت کا حق ادا شکیا۔“

ان لوگوں سے جنہوں نے اچھے کھانوں اور زیب وزینت کی جائز چیزوں کو بھی اس لیے اپنے اور حرام کر لیا تھا کہ اس سے خدا خوش ہوگا۔ یہ سوال کیا:

﴿فَلَمَنْ حَرَمَ زِينَةَ اللّٰهِ الَّتِي أَخْرَجَهُ لِيَعْلَمَهُ وَالظَّبَابُ مِنَ الْيَرْقَ﴾ (۲۲/ الاعراف: ۷)

”پوچھاے پیغمبر ﷺ! کہ اس زیب وزینت اور رزق کی اچھی چیزوں کو جن کو خدا نے اپنے

۱ جمع الفوائد طبع میرته، ج ۱، ص: ۲ باب الاقتصاد في الاعمال بحواله صحيح بخاري، كتاب اليمان، باب الدين يسر: ۳۶، نسائي: ۳۷۔ ۲ مسنند احمد، ج ۵، ص: ۲۶۶ الفاظ قادرے مختلف ہیں۔

بندوں کے لیے بنایا، کس نے حرام کیا؟“

اسلام نے اس مسئلہ میں یہاں تک تھی کہ ایک دفعہ آنحضرت ﷺ نے بعض بیویوں کی خوشبوی مزاج کے لیے شہدنا کھانے کی تحریم کھالی تھی، اس پر عتاب آیا۔ خدا نے فرمایا:

﴿يَا أَيُّهَا النَّبِيُّ لَا تُحِمِّلْ مَا أَكَلَ اللَّهُ أَكَلَ وَلَا تَعْنِي مَوْضَاتَ آذِوَاجِكَ طَوَّافُ رَجِيمٍ﴾^۱

(۶۶/ التحریم: ۱)

”اے پیغمبر ﷺ! خدا نے جس چیز کو تیرے لیے حلال کیا تو اس کو اپنی بیویوں کی خوشی کی خاطر اپنے اوپر حرام کیوں کرتا ہے اور خدا بخششے والا ہم بان ہے۔“

صحابہؓ میں بعض ایسے لوگ تھے جو عیسائی را ہوں کے اڑیا ذاتی میلان طبع کے سبب سے تجوہ، ترک لذا انہ اور ریاضات شاقد کی زندگی بس رکنا چاہتے تھے۔ آنحضرت ﷺ نے ان کو اس سے باز رکھا اور فرمایا کہ ”میں یہ شریعت لے کر نہیں آیا۔“ قدماءہ بن مظعون رض اور ان کے ایک رفیق نے دربار رسالت میں حاضر ہو کر عرض کی کہ یا رسول اللہ اہم میں سے ایک نے عمر بھر مجرم رہنے اور شادی نہ کرنے کا اور دوسرا نے گوشت نہ کھانے کا ارادہ کیا ہے۔ آپ ﷺ نے فرمایا: ”میں تو دونوں باتیں کرتا ہوں۔“ یعنی کر دنوں صاحب اپنے ارادہ سے باز رہے۔ ❷

حضرت عبد اللہ بن عمر رض نے جو ایک نہایت عابد و زاہد صحابی تھے، یہ عہد کر لیا تھا کہ وہ ہمیشہ دن کو روزے رکھیں گے اور رات بھر عبادت کریں گے۔ آنحضرت ﷺ کو خبر ہوئی تو آپ نے ان سے فرمایا کہ ”اے عبد اللہ! تم پر تمہارے جسم کا بھی حق ہے۔ تمہاری آنکھ کا بھی حق ہے، تمہاری بیوی کا بھی حق ہے، مہینہ میں تین دن روزے رکھ لیتا کافی ہے۔“ ❸ اسی قسم کی نصیحت آپ ﷺ نے ایک دسرے تقتفی پسند صحابی حضرت عثمان بن مظعون رض کو فرمائی۔ آپ کو ان کی نسبت معلوم ہوا کہ وہ شب و روز عبادت میں مصروف رہتے ہیں۔ بیوی سے کوئی تعلق نہیں رکھتے، دن کو روزے رکھتے ہیں، رات کو سوتے ہیں۔ آپ نے ان کو بلا کر پوچھا کہ ”کیوں عثمان! تم میرے طریقہ سے ہٹ گئے؟ عرض کی، خدا کی قسم ایں نہیں ہٹا ہوں، میں آپ ہی کے طریقہ کا طلب گار ہوں۔“ فرمایا: ”میں سوتا بھی ہوں اور نماز بھی پڑھتا ہوں، روزہ بھی رکھتا ہوں اور افطار بھی کرتا ہوں اور عروقوں سے نکاح بھی کرتا ہوں اے عثمان! خدا سے ڈرو کہ تمہارے اہل و عیال کا بھی تم پر حق ہے، تمہارے مہمان کا بھی حق ہے، تمہاری جان کا بھی تم پر حق ہے، تو روزے بھی رکھو، افطار بھی کرو نماز بھی پڑھو اور سو بھی۔“ ❹
قبیلہ بالله کے ایک صحابی جب اسلام لا کر اپنے قبلیہ میں واپس گئے تو انہوں نے دن کا کھانا چھوڑ دیا

❷ فتح الباری، کتاب النکاح، باب ترغیب النکاح، ج ۹، ص: ۱۳۲ طبع دارالسلام۔

❸ صحیح بخاری، کتاب الصوم، باب حق الجسم فی الصوم ۱۹۷۵۔

❹ ابو داود، کتاب التطوع، ما يؤمر به من القصد فی الصلوة: ۱۳۶۹۔

اور مسلم روزے رکھنے لگے۔ ایک سال کے بعد جب وہ پھر خدمتِ اقدس میں حاضر ہوئے تو ان کی صورت اتنی بدل گئی تھی کہ آپ ﷺ ان کو پیچا نہ سکے۔ انہوں نے اپنا نام بتایا تو فرمایا: ”تم خوش رو تھے تمہاری صورت کیوں ایسی ہو گئی؟“ عرض کی، یا رسول اللہ ﷺ! جب سے آپ سے مل کر گیا ہوں متصل روزے رکھتا ہوں۔ فرمایا: ”تم نے اپنی جان کو کیوں عذاب میں ڈالا رمضان کے علاوہ ہر مہینہ میں ایک روزہ کافی ہے۔“ انہوں نے اس سے زیادہ کی طاقت خاہبر کی تو آپ نے مہینہ میں دو روزوں کی اجازت دی۔ انہوں نے اس سے بھی زیادہ اضافہ کی۔ زیادہ کی اجازت چاہی تو آپ نے مہینہ میں تین روزے کر دیے۔ انہوں نے اس سے بھی زیادہ اضافہ کی درخواست کی، تو آپ نے ماہ حرام کے روزوں کی اجازت دی۔ * ایک دفعہ چند صحابہ رضی اللہ عنہم نے ازواج مطہرات رضی اللہ عنہم کی خدمت میں حاضر ہو کر آپ ﷺ کی دن رات کی عبادات و ریاضت کا حال دریافت کیا وہ سمجھتے تھے کہ رسول خدا ﷺ کو دن رات سو عبادات کے اور کوئی کام نہ ہو گا۔ انہوں نے آپ کی عبادات کا حال سناتے ہوئے ہم کو رسول اللہ ﷺ سے کیا نسبت؟ آپ تو معصوم ہیں، ان میں سے ایک صاحب نے کہا، میں تو رات بھرنماز میں پڑھوں گا۔ دوسرا صاحب بولے، میں عمر بھر روزے رکھوں گا۔ تیسرا صاحب نے اپنا ارادہ یہ ظاہر کیا کہ میں عمر بھر مجرم رہوں گا۔ کبھی نکاح شکریوں گا۔ آنحضرت ﷺ ان کی یہ گفتگوں رہے تھے۔ ان کو خطاب کر کے فرمایا: ”خدا کی قسم! میں تم سے زیادہ خدا سے ڈرتا ہوں، تاہم میں روزہ رکھتا ہوں اور اظفار بھی کرتا ہوں۔ راتوں کو نماز بھی پڑھتا ہوں اور سوتا بھی ہوں اور عورتوں سے نکاح بھی کرتا ہوں جو میرے طریقہ پڑھیں چلتا، وہ میری جماعت میں نہیں۔“ *

بعض صحابہ رضی اللہ عنہم نے جو افلاس اور غربت کی وجہ سے شادی نہیں کر سکتے تھے اور ضبط نفس پر بھی قادر نہ تھے چاہا کہ اپنا عضو قطع کر دیں۔ انہوں نے آنحضرت ﷺ سے اس رہنمائی کی اجازت چاہی تو آپ نے سخت برہمی ظاہر فرمائی، حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ وغیرہ صحابہ کہتے ہیں، اگر حضور اس کی اجازت دیتے تو بہت سے لوگ اس پر عمل کرنے کے لیے تیار تھے۔ * ان واقعات سے اندازہ ہو گا کہ آپ نے کس اهتمام بلیغ کے ساتھ لوگوں کو عبادات کا صحیح مفہوم و مقصود تعلیم فرمایا۔

آپ نے کبھی کبھی بذات خاص کئی کئی دن تک متصل روزے رکھے۔ صحابہ نے بھی آپ کی پیروی میں اس قسم کے روزے رکھنے چاہے آپ نے منع فرمایا۔ لیکن وہ یہ سمجھے کہ آپ صرف اپنی شفقت کی بنا پر منع فرماتے ہیں۔ اس لیے انہوں نے اظفار نہ کیا آپ نے دو دن روزے رکھے تھے کہ اتفاق سے چاند نکل آیا

* ابو داود، کتاب الصیام، باب صوم اشهر الحرم: ۲۴۲۸۔

* صحيح بخاری، کتاب النکاح، باب ترغیب النکاح: ۵۰۶۳۔ * صحيح بخاری، کتاب النکاح، باب ما یکرہ من النکاح والخصاء: ۵۰۷۳؛ مسلم، کتاب النکاح: ۳۴۰۴، ۳۴۰۵۔

آپ نے اظفار کر لیا اور فرمایا: ”اگر ہم یہ بڑھ سکتا تو میں اتنے روزے رکھتا کہ ان مذہب میں غلوکرنے والوں کا سارا غلوہ جاتا۔“ صحابہ ﷺ نے عرض کی کہ یا رسول اللہ ﷺ! پھر آپ کیوں کئی کئی دن کے روزے رکھتے ہیں؟ فرمایا: ”تم میں سے کون میری طرح ہے، مجھے تو میرا رب کھلاتا پلاتا رہتا ہے۔“ ۴۱ اسی لیے اسلام میں عام امت کے لیے یہ روزے نہیں ہیں۔

ایک دفعہ ایک مسجد میں آپ کا گزر ہوا دیکھا، تو ایک ستون میں ایک رسی لٹک رہی ہے، دریافت کیا تو لوگوں نے کہا یہ زینب نے باندھی ہے۔ رات کو نماز میں جب وہ کھڑی تھک جاتی ہیں تو اسی کے سہارا کھڑی ہوتی ہیں، یہ بن کر آپ ﷺ نے فرمایا: ”یہ کھول دلوگو! تم اسی وقت تک نماز پڑھو، جب تک تم میں نشاط باقی رہے۔ جب کوئی تھک جائے تو بیٹھ جائے۔“ ۴۲

ایک دفعہ ایک عورت سامنے سے گزری حضرت عائشہؓ نے کہا، یہ خوالاء ہے، لوگ کہتے ہیں کہ یہ رات بھرنیں سوتی اور عبادت میں مصروف رہتی ہے۔ فرمایا کہ ”یہ رات بھرنیں سوتی! لوگو اسی قدر کرو جتنی طاقت ہے۔“ ۴۳ جو لوگ اپنی قوت اور استطاعت سے زیادہ رات بھرنمازوں میں مشغول رہتے تھے، ان کو مخاطب کر کے فرمایا:

((اکلفوا من العمل ماتطیقون فان الله لا يملّ حتى تملوا فان احب العمل الى الله ادومه وان قل)) ۴۴

”اتنے ہی کام کی تکلیف اٹھاؤ جس کو کرسکو۔ کیونکہ جب تک تم نہ اکتا جاؤ خدا نہیں اکتا تا، خدا کے نزدیک سب سے پسندیدہ وہی کام ہے جس کو تم ہمیشہ کرسکو اگرچہ وہ تھوڑا ہی ہو۔“

حج میں رہبانیت کی بہت سی باتیں عرب میں جاری تھیں۔ بعض حاجی یہ عہد کر لیتے تھے کہ وہ اس سفر میں زبان سے کچھ نہ بولیں گے یا سواری کی استطاعت کے باوجود وہ پیادہ سفر کریں گے اور کسی سواری پر نہ چڑھیں گے یا اس سفر میں کسی سایہ کے بغیر دھوپ ہی میں چلیں گے۔ بعض لوگ اپنی گنہگاری کے اظہار کے لیے اپنی ناک میں نکلی ڈال کر طواف کرتے تھے اور اس کو ثواب جانتے تھے۔ اسلام نے ان تمام طریقوں کو منسوخ کر دیا کہ خواہ خواہ کی تکلیف خدا کی خوشنودی کا باعث نہیں۔ حضرت عقبہ بن عامرؓ کی بہن نے یہ نذر مانی تھی کہ وہ پیدل حج کریں گی۔ عقبہ نے آ کر آنحضرت ﷺ سے تو قی پوچھا، آپ نے جواب دیا: ”خدا کو تمہاری بہن کی اس نذر کی حاجت نہیں۔ ان سے کہو کہ وہ سوار ہو کر حج کریں۔“ ۴۵ اسی طرح آپ

صحیح مسلم، کتاب الصیام، باب النہی عن الوصال: ۲۵۶۶۔ ۴۶ بخاری، کتاب التهجد، باب ما یکره من التشدد فی العبادة: ۱۱۰، مسلم، کتاب صلوٰۃ المسافرین، باب فضیلۃ العمل الدائم: ۱۸۳۱۔ سانی، کتاب قیام اللیل: ۱۶۴۴۔ ۴۷ بخاری، ایضاً: ۱۱۵۱، مسلم، ایضاً: ۱۸۳۳، ۱۸۳۴، سانی: ۱۶۴۳۔ ۴۸ ابو داود، کتاب التطوع، باب ما یؤمر به من القصد: ۱۳۶۸۔ ۴۹ ابو داود، کتاب الایمان والندور، باب من رأى عليه كفارة: ۳۲۹۳، و مسنند ابن جاردن کتاب الایمان والندور۔

نے ایک اور شخص کو دیکھا کہ قربانی کے اونٹ ساتھ ہونے کے باوجود پیدل چل رہا ہے۔ آپ نے اس کو سوار ہونے کا حکم دیا۔ اس نے معدرت کی کہ یہ قربانی کا اونٹ ہے۔ آپ ﷺ نے فرمایا: ”میں یہ جانتا ہوں کہ یہ قربانی کا جانور ہے، لیکن تم اس پر سوار ہو لو۔“ ❸ ایک دفعہ حج کے سفر میں آپ نے ایک بڑھے کو دیکھا جو خود نہیں چل سکتا تھا، اس کے بیٹھے اس کو دونوں طرف سے پکڑ کر چلا رہے تھے، آپ ﷺ نے دریافت فرمایا تو معلوم ہوا کہ اس نے پیدل حج کی نیت کی ہے۔ فرمایا: ”خدا کو اس کی حاجت نہیں کہ یہ اپنی جان کو اس طرح عذاب میں ڈالے اس کو سوار کر دو۔“ ❹ ایک دفعہ آپ خطبہ دے رہے تھے دیکھا کہ ایک شخص چلچلا تی ہوئی وہ پر میں نگئے سر کھڑا ہے۔ آپ ﷺ نے پوچھا: یہ کون شخص ہے اور اس کی یہ کیا حالت ہے؟ لوگوں نے بتایا کہ اس کا نام ابو سرائیل ہے۔ اس نے نذر مانی ہے کہ وہ کھڑا رہے گا بیٹھے گا نہیں اور نہ سایہ میں آرام کرے گا اور نہ بات کرے گا اور برابر روزے رکھے گا۔ آپ ﷺ نے فرمایا: ”اس سے کہو کہ باتیں کرے، بیٹھے، سایہ میں آرام لے اور انہار روزہ پورا کرے۔“ ❻ حج میں دیکھا کہ ایک شخص اپنی ناک میں نکیل ڈالے ہوئے ہے اور دوسرا اس کو جانور کی طرح اس کی نکیل پکڑ کر کھینچ رہا ہے، آپ نے جا کر نکیل کاٹ دی اور فرمایا کہ ”اگر ضرورت ہو تو ہاتھ پکڑ کر اس کو طواف کر او۔“ ❼

اس قسم کی غیر ضروری ریاضتوں کے متعلق عیسائی راہبوں کی ناگفتہ بہ حالت دیکھ کر آپ ﷺ نے فرمایا: ((لا تشددوا على انفسكم فانما هلك من كان قبلكم بتشديدهم على

انفسهم و ستجدون بقایا هم في الصوامع والديارات)) ❽

”اپنی جانوں پر ختنی نہ کرو کہ تم سے پہلی تو میں اپنی جانوں پر ختنی کرنے سے تباہ ہوئیں اور ان کی بقیہ نہیں آج بھی گرجوں اور دیروں میں تم کو ملیں گی۔“

خاتم الانبیاء ﷺ نے عبادت کے ان تمام غلط راہبانہ طریقوں کا اپنے ایک مختصر فقرہ سے ہمیشہ کے لیے خاتمه کر دیا، آپ ﷺ نے فرمایا:

((لا صرورة في الإسلام)) ❾

”اسلام میں رہبانیت نہیں۔“

❶ صحیح بخاری، کتاب الحج، باب رکوب البدن: ۱۶۸۹ - ۱۶۹۰۔

❷ ابو داود، کتاب الایمان والندور، باب من رأى كفارة...؛ ترمذی، ابواب الایمان والندور، باب ما جاء فيمن يحلف بالمشي ولا يستطبع: ۳۳۰؛ ۴۶۷۰.

❸ صحیح بخاری، کتاب الایمان والندور، باب التذر فيما لا يملك: ۴۶۷۰؛ ابو داود، کتاب الایمان، والندور، باب التذر في المعمصية: ۳۲۰؛ حبیب بخاری، ایضاً: ۶۷۰۳۔

❹ طبرانی اوسط: ۳۰۷۸؛ ابو داود، کتاب الادب: ۴۹۰۴۔

❺ ابو داود، کتاب المناسك، باب لامرورة في الإسلام: ۱۷۲۹۔

عزالت نشینی اور قطعِ علاقہ عبادت نہیں

اکثر مذاہب نے دیداری اور خدا پرستی کا کمال یہ سمجھا تھا کہ انسان کسی غار، گوہ یا جنگل میں بیٹھ جائے اور تمام دنیا سے کنارہ کشی اختیار کر لے۔ اسلام نے اس کو عبادت کا صحیح طریقہ نہیں قرار دیا۔ عبادت درحقیقت خدا اور اس کے بندوں کے حقوق کے ادا کرنے کا نام ہے۔ جیسا کہ آگے پہل کر معلوم ہوا کہ اس بنا پر وہ شخص جو اپنے تمام جنسوں سے الگ ہو کر ایک گوشہ میں بیٹھ جاتا ہے، وہ درحقیقت اپنے جنس کے حقوق سے قادر رہتا ہے۔ اس لیے وہ کسی تعریف کا مستحق نہیں۔ اسلام کا صحیح تبلیغ یہ ہے کہ انسان تعلقات کے اڑدھام اور علاقہ کے بھوم میں گرفتار ہو کر ان میں سے ہر ایک کے متعلق جو اس کا فرض ہے اس کو بخوبی ادا کرے، جو شخص ان تعلقات و علاقوں اور حقوق و فرائض کے بھوم سے گھبرا کر کسی گوشہ عافیت کو تلاش کرتا ہے، وہ دنیا کے کارزار کا نامرد اور بزدل سپاہی ہے۔ اسلام اپنے پیروؤں کو جوانمرد سپاہی دیکھنا چاہتا ہے۔ جوان سب جھمیلوں کو اٹھا کر بھی خدا کو نہ بھولیں۔ غرض اسلام کے نزدیک عبادت کا مفہوم ترک فرض نہیں، بلکہ ادائے فرض ہے۔ ترک عمل نہیں بلکہ عمل کچھ نہ کرنا نہیں بلکہ کرنا ہے۔ ابھی تم اوپر پڑھ چکے ہو کہ آنحضرت ﷺ نے بعض ان صحابہ کو جو اہل و عیال اور دوست و احباب سب کو چھوڑ کر دن بھر روزہ رکھتے تھے اور راتوں کو عبادت کرتے تھے۔ فرمایا：“اے فلاں تم ایسا نہ کرو کہ تم پر تمہاری بیوی بچوں کا بھی حق ہے۔ تمہارے مہمان کا بھی حق ہے، تمہاری جان کا بھی حق ہے، تمہاری آنکھ کا بھی حق ہے۔” اس سے ظاہر ہوا کہ اسلام کی نظر میں عبادت ان حقوق کو بجا لانا ہے۔ ان حقوق کو ترک کر دینا نہیں۔ چنانچہ ایک دفعہ کسی غزوہ میں ایک صحابی کا گزر ایک ایسے مقام پر ہوا۔ جس میں موقع سے ایک غار تھا۔ قریب ہی پانی کا چشمہ بھی تھا۔ آس پاس کچھ جنگل کی بویاں بھی تھیں۔ ان کو اپنی عزلت نشینی کے لیے یہ جگہ بہت پسند آئی۔ خدمت باہر کرت میں آ کر عرض کی، یا رسول اللہ ﷺ نے مجھ کو ایک غار با تھا آ گیا ہے۔ جہاں ضرورت کی سب چیزیں ہیں جی چاہتا ہے کہ وہاں گوشہ گیر ہو کر ترک دنیا کر لوں۔ آپ ﷺ نے فرمایا：“میں بیوویت اور عیسائیت لے کر دنیا میں نہیں آیا ہوں، میں آسان اور سہل اور روشن ابرا ہیں مذہب لے کر آیا ہوں۔” ﴿

اسلام سے پہلے آنحضرت ﷺ غار حرا میں کئی کئی دن جا کر رہا کرتے تھے اور عبادت الہی میں مصروف رہتے تھے۔ لیکن جب سے وحی کا پہلا یام آپ کے پاس آیا اور دعوت و تبلیغ کا بار آپ کے مبارک کندھوں پر رکھا گیا۔ شب و روز میں رات کی چند ساعتیں اور سال میں رمضان کے چند آخر دن، گوشہ عزلت اور روزاویتھائی میں بسر ہوتے تھے، ورنہ تمام دن پوری جماعت کے ساتھ مل کر غالقی کی عبادت اور پھر حقوق کی خدمت میں صرف ہوتے تھے اور یہی تمام خلافاً اور عام صحابہؓ کا طرز عمل رہا اور یہی اسلام کی عملی اور سیدھی

سادی عبادت ٹھی۔

اسلام میں عبادت کا مفہوم

اوپر کی تفصیلات سے یہ واضح ہوا ہو گا کہ اسلام میں عبادت کا وہ تنگ مفہوم نہیں، جو دوسرے مذہبوں میں پایا جاتا ہے۔ عبادت کے لفظی معنی اپنی عاجزی اور دماندگی کا اظہار ہے اور اصطلاح شریعت میں خداۓ عزوجل کے سامنے اپنی بندگی اور عبودیت کے نذر ان کو پیش کرنا اور اس کے احکام کو بجالانا ہے۔ اسی لیے قرآن پاک میں عبادت کا مقابل اور بالا مذکور اصطلاح اور غرور استعمال ہوا ہے:

﴿إِنَّ الَّذِينَ يَسْتَكْبِرُونَ عَنْ عِبَادَتِنَا سَيَدُّ الْخُلُقَنَ حَمَّمَ دَخْرِيْنَ﴾ (٤٠ / المؤمن: ٦٠)

”جو میری عبادت سے غرور کرتے ہیں وہ جہنم میں جائیں گے۔“

فرشتون کے متعلق فرمایا:

﴿وَمَنْ عِنْدَهُ لَا يَسْتَكْبِرُونَ عَنْ عِبَادَتِهِ﴾ (٢١ / الانبیاء: ١٩)

”جو اس کے پاس ہیں وہ اس کی عبادت سے غرور نہیں کرتے۔“

سعادت مند اور با ایمان مسلمانوں کے متعلق فرمایا:

﴿إِنَّمَا يُؤْمِنُ بِأَيْتَنَا الَّذِينَ إِذَا ذَكَرُوا يَهُمْ كَرُّوا سُجَّدًا وَسَجَّلُوا إِحْمَادًا وَهُمْ لَا

Islam میں گوشہ گیری اور عزلت شنی کی اجازت صرف دو موقعوں پر ہے ایک اس شخص کے لیے جس میں فطرہ بدی ہے جس کی سرست دوسروں کو فتح پہنچانا نہیں بلکہ تکلیف دینا ہے۔ آنحضرت ﷺ نے اس کو برائی سے بچنے کی تدبیر یہ تائی ہے کہ لوگوں سے قطع تعلق کر لے۔ صحیح بخاری میں ہے کہ ایک بدو نے آنحضرت ﷺ سے ریافت کیا کہ سب سے بہتر شخص کون ہے؟ فرمایا: ”ایک توہ جو اپنی جان و مال کو خدا کی راہ میں قربان کرتا ہے دوسرے وہ جو کسی گھانی میں بیٹھ کر اپنے رب کی عبادت کرے اور لوگوں کو اپنے شر سے محفوظ رہنے دے۔“ (صحیح بخاری، کتاب الادب، باب العزلة راحة من خلاط السوء: ٦٤٩٤) اس تعلیم نبوبی نے انسانوں کی دو تسمیں کر دیں، ایک وہ جن کو علّق اللہ کی ہدایت اور خدمت کی فطری توفیق ملی ہے تو ان پر یہ فرض ہے کہ وہ مجتمع اور جموم میں رہ کر ان کی بھلائی کا فرض انجام دیں، یہاں تک کہ اس راہ میں ان کی دولت بھی خرچ ہو جائے اور ان کی جان بھی کام آجائے، دوسرے وہ لوگ ہیں جن میں طبعاً مردم آزاری اور دوسروں کو نقصان پہنچانے کا مادہ ہے ان کی اخلاقی اور روحانی اصلاح اسی میں ہے کہ وہ اپنے کو مجتمع سے الگ رکھ کر خدا کی عبادت میں اپنا وقت صرف کریں، تاکہ وہ گناہ کے بارے اور لوگ ان کے آزار سے محفوظ رہیں۔ دوسرا موقع جس میں آنحضرت ﷺ نے عزلت شنی کی اجازت دی ہے وہ ہے جب مجمع و آئا قوم و ملک میں قتنہ فساد کا باز اس طرح گرم ہو کر وہ اس کی روک تھام سے عاجز اور اس کی اصلاح سے قاصر ہو تو ایسے موقع پر اس کے لیے پسندیدہ ہیں ہے کہ وہ جماعت سے بہت کر گوشہ گیر ہو جائے، چنانچہ آپ ﷺ نے صحابہ سے فرمایا کہ ”ایک ایسا زمانہ لوگوں پر آئے گا جس میں ایک مسلمان کی بہترین دولت بکری ہوگی جس کو لے کر وہ مارش کی جھوپوں اور پہاڑوں کی گھانیوں کو ٹھاش کرے گا، تاکہ وہ اپنے دین و ایمان کو نتوں سے چاکے۔“ (صحیح بخاری، کتاب الادب، باب العزلة راحة من خلاط السوء: ٦٤٩٥) گوشہ گیری اور عزلت کے یہ دو موقع بھی درحقیقت نہیں بھیج اصول پر ہیں، پہلے موقع میں ایسے فرد کا جس سے جماعت اور مخلوق کو فائدہ کے بجائے نقصان کا اندر یہ ہو، الگ رہنا جماعت اور فردوں کے لیے فائدہ مند ہے اور دوسرے موقع پر جب کہ جماعت کا نظام اپنہ ہو گیا ہو اور کوئی فرد جو بجائے خود نیک اور سعید ہو، لیکن اپنی کمروری کے باعث وہ اس جماعت کی اصلاح پر قادر نہ ہو تو اس کے لیے جماعت کے دائرہ اثر سے اپنے کو باہر رکھ کر ہی اپنی تیکی اور سعادت کی تکمیل مناسب ہے۔

﴿يَسْتَكْلِمُونَ﴾ (١٥) / السجدة

”میری آئیوں پر وہی ایمان لاتے ہیں، جن کو ان آئیوں سے سمجھایا جائے تو وہ مجددہ میں گر پڑتے ہیں اور اپنے پروردگار کی پاکی بیان کرتے ہیں اور غرور نہیں کرتے۔“

اس قسم کی اور آیتیں بھی قرآن پاک میں ہیں، جن سے ظاہر ہوتا ہے کہ عبادت اور غرور و اشکار باہم مقابل کے متضاد معنی ہیں۔ اس بنا پر اگر غرور و اشکار کے معنی خدا کے مقابلہ میں اپنے کو برا سمجھنا، اپنی بستی کو بھی کوئی چیز جانتا اور خدا کے سامنے اپنی گردن جھکانے سے عار کرنا ہے تو عبادت کے معنی خدا کے آگے اپنی عاجزی و بندگی کا اظہار اور اس کے احکام کے سامنے اپنی گردن اطاعت کشم کرنا ہے، اس بنا پر صحیفہ محمدی ﷺ کی زبان میں عبادت بندہ کا ہر ایک وہ کام ہے جس سے مقصود خدا کے سامنے اپنی بندگی کا اظہار اور اس کے احکام کی اطاعت ہو۔ اگر کوئی انسان بظاہر کیسا ہی اچھے سے اچھا کام کرے۔ لیکن اس سے اس کا مقصود اپنی بندگی کا اظہار اور خدا کے حکم کی اطاعت نہ ہو تو وہ عبادت نہ ہو گا۔ اس سے ثابت ہوا کہ کسی اچھے کام کو عبادت میں داخل کرنے کے لیے پاک اور خالص نیت کا ہونا شرط ہے اور یہی چیز عبادت اور غیر عبادت کے درمیان امر فارق ہے۔ قرآن پاک میں یہ نکتہ جا بجا داہوا ہے:

﴿وَسَيَجِدُهَا الْأُنْتَقِيُّ الَّذِي يُؤْتَى مَالَهُ يَرْتَقِيُّ وَمَا لِأَحَدٍ عِنْهُ مِنْ نَعْلَةٍ تُجَزِّيُّ إِلَّا أَنْتَفَاعَ وَجْهُ رَبِّهِ الْأَعْلَى وَلَسْوَفَ يَرْضَى﴾ (٩٢) / اللیل: ٢١-١٧

”دوزخ سے وہ پرہیز کا رپچالیا جائے گا جو اپنامال دل کی پاکی حاصل کرنے کو دیتا ہے۔ اس پر کسی کا احسان باقی نہیں۔ جس کا بدله اس کو دینا ہو۔ بلکہ صرف خدائے برتر کی ذات اس کا مقصود ہے وہ خوش ہو گا۔“

﴿وَمَا تُنْفِقُونَ إِلَّا يُنْفَعُكُمْ وَجْهُ اللَّهِ طَ﴾ (٢) / البقرة: ٢٧٢

”صرف خدا کی ذات کی طلب کے لیے جو تم خرچ کرو،“

﴿إِنَّمَا تُطْعِمُمُ لِوَجْهِ اللَّهِ﴾ (٩) / الدہر: ٧٦

”ہم تو صرف خدا کے لیے تم کو کھلاتے ہیں۔“

﴿فَوَيْلٌ لِلْمُصَلِّيْنَ الَّذِيْنَ هُمْ عَنْ صَلَاتِهِمْ سَاهُونَ الَّذِيْنَ هُمْ يَرْأُونَ﴾

”۱۰۷ / الماعون: ۶۴۔“

”پہنچا رہا نمازوں پر جو اپنی نماز سے غافل رہتے ہیں اور جو دکھاوے کے لیے کام کرتے ہیں۔“

قرآن کی ان آئیوں کی جامع و مانع تفسیر آنحضرت ﷺ نے ان مختصر لیکن بلغ فقردوں میں فرمادی ہے کہ

((انما الا عمال بالنيات)) ﴿١﴾

”اعمال کا ثواب نیت پر موقوف ہے۔“

اسی کی تشریع آپ ﷺ نے ان لوگوں سے کی جو اپنا گھر بارچھوڑ کر بھرت کر کے مدینہ منورہ آ رہے تھے:

((لکل امرء مانوی فمن کانت هجرته الى الله و رسوله فاجرہ علی الله و من

کانت هجرته الى دنیا یصیبہا او امرأة ینکحها فهجرته الى ما هاجر اليه)) ﴿٢﴾

”ہر شخص کو وہی ملے گا، جس کی اس نے نیت کی۔ اگر بھرت سے مقصود خدا اور رسول تک پہنچتا

ہے تو اس کا ثواب خدا دے گا۔ اگر کسی دنیاوی غرض کے لیے ہے یا کسی عورت کے لیے ہے تو

اس کی بھرت اسی کی طرف ہے، جس کی نیت سے اس نے بھرت کی۔“

اس تشریع سے یہ ثابت ہو گا کہ آنحضرت ﷺ نے عبادت کا جو مفہوم دنیا کے سامنے پیش کیا ہے، اس میں پہلی چیز دل کی نیت اور اخلاص ہے۔ اس میں کسی خاص کام اور طرز و طریقہ کی تخصیص نہیں ہے۔ بلکہ انسان کا ہر وہ کام جس سے مقصود خدا کی خشونتوں اور اس کے احکام کی اطاعت ہے، عبادت ہے، اگر تم اپنی شہرت کے لیے کسی کو لاکھوں دے ڈالو تو وہ عبادت نہیں، لیکن خدا کی رضا جوئی اور اس کے حکم کی بجا آوری کے لیے چند کوڑیاں بھی کسی کو دو تو یہ بڑی عبادت ہے۔ تعلیمِ محمدی ﷺ کی اس نکتہ سی نے عبادت کو درحقیقت دل کی پاکیزگی، روح کی صفائی اور عمل کے اخلاص کی غرض و غایت بنادیا ہے اور یہی عبادت سے اسلام کا اصلی مقصود ہے:

﴿يَا أَيُّهَا النَّاسُ اعْبُدُوا رَبِّكُمُ الَّذِي خَلَقَهُمْ وَالَّذِينَ مِنْ قَبْلِكُمْ لَعَلَّهُمْ يَتَّقَوُنُ﴾

(٢١) البقرة

”اے لوگو! اپنے اس پروردگار کی عبادت کرو جس نے تم کو اور تم سے پہلوں کو پیدا کیا، تاکہ تم کو تقویٰ حاصل ہو۔“

اس آیت سے ظاہر ہوا کہ عبادت کی غرض و غایت محض حصول تقویٰ ہے۔ تقویٰ انسان کے قلب کی وہ کیفیت ہے، جس سے دل میں تمام نیک کاموں کی تحریک اور برے کاموں سے نفرت ہوتی ہے۔ آپ نے ایک دفعہ سینہ کی طرف اشارہ کر کے فرمایا کہ ”تقویٰ کی جگہ یہ ہے۔“ ﴿٣﴾ اور قرآن نے بھی 『تفوی القلوب』 ﴿٤﴾ ”لوگوں کا تقویٰ“ کہہ کر اسی نکتہ کو کھولا ہے۔ اسی کیفیت کا پیدا کرنا اسلام میں عبادت کی اصلی غرض ہے۔ نماز روزہ اور تمام عبادتیں سب اسی کے حصول کی خاطر ہیں۔ اس بنا پر انسان کے وہ تمام مشروع افعال و اعمال جن سے شریعت کی نظر میں یہ غرض حاصل ہو، سب عبادت ہیں۔ اسی مفہوم کو ہم دوسری عبارت میں یوں ادا کر سکتے ہیں کہ پہلے عام طور پر یہ سمجھا جاتا تھا کہ عبادت صرف چند ان مخصوص اعمال کا نام ہے، جن کو انسان خدا کے لیے

﴿١﴾ صحیح بخاری، کتاب بدء الوحی، باب کیف کان بدء الوحی: ۱۔ ﴿٢﴾ ایضاً۔

﴿٣﴾ مسلم، کتاب البر والصلة، باب تحریر ظلم المسلم: ۶۵۴۱۔ ۳۲- ۲۲/ الحج: -

کرتا ہے، مثلاً نماز دعا قربانی لیکن محمد رسول اللہ ﷺ کی تعلیم نے اس سلسلہ کو بیحد و سعی کر دیا۔ اس تعلیم کی رو سے ہر ایک وہ نیک کام جو خاص خدا کے لیے اور اس کی مخلوقات کے فائدہ کے لیے ہو اور جس کو صرف خدا کی خوشنودی کے حصول کے لیے کیا جائے عبادت ہے۔ اسلام میں خدا کے لیے کسی کام کے کرنے کا مفہوم یہ ہے کہ وہ کام خواہ خدا کی براہی اور پاکی کے لیے ہو یا کسی انسان یا حیوان کے فائدہ کے لیے ہو، لیکن اس کام کے کرنے سے اس کام کے کرنے والے کا مقصود نمائش، دکھاوا، حصول شہرت یا دوسروں کو احسان مند بنانا غیرہ کوئی دنیاوی اور مادی غرض نہ ہو، بلکہ حض خدا کی محبت، خوشنودی اور رضا مندی ہو۔ اس تشریح کی رو سے وہ عظیم الشان تفرقة جو دین اور دنیا کے نام سے مذاہب نے قائم کر رکھا تھا۔ محمد رسول اللہ ﷺ کی تعلیم نے اس کو دفعۃ منادیا۔ دین اور دنیا کی حیثیت اسلام میں دو حریف کی نہیں رہتی، بلکہ دو دوست کی ہو جاتی ہے۔ دنیا کے وہ تمام کام جن کو دوسرے مذاہب دنیا کے کام کہتے ہیں، اسلام کی نظر میں اگر وہ کام اسی طرح کیے جائیں، لیکن ان کی غرض و غایت کوئی مادی خود غرضی و نمائش نہ ہو، بلکہ خدا کی رضا اور اس کے احکام کی اطاعت ہوتا ہو وہ دنیا کے نہیں دین کے کام ہیں، اس لیے دین اور دنیا کے کاموں میں کام کا تفرقة نہیں، بلکہ غرض و غایت اور نیت کا تفرقة ہے۔ تم نے اپر پڑھا کہ آنحضرت ﷺ نے ان صحابہ کو جو دن رات خدا کی عبادت میں مصروف رہتے تھے۔ فرمایا کہ ”تمہارے جسم کا بھی تم پر حق ہے کہ اس کو آرام دو، تمہاری آنکھ کا بھی تم پر حق ہے کہ اس کو کچھ دیر سونے دو۔ تمہاری بیوی کا بھی حق ہے کہ اس کی تسلی کرو اور تمہارے مہمان کا بھی حق ہے۔“ ^۱ کہ اس کی خدمت کے لیے کچھ وقت نکالو۔“ غرض ان حقوق کو بھی ادا کرنا خدا کے احکام کی اطاعت اور اس کی عبادت ہے۔ چنانچہ پاک روزی کھانا اور اس کا شکر ادا کرنا بھی عبادت ہے:

﴿يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا إِذْلُوكُمْ مِّنْ طَهْرَتْ مَارِزَقْنَاهُمْ وَأَشْكُرُوا لِلَّهِ إِنْ كُنْتُمْ إِيمَانَهُ تَعْبُدُونَ﴾

(البقرة: ۱۷۲)

”اے ایمان والو! ہم نے جو تم کو پاک اور سਤਹی چیزیں روزی کی ہیں ان کو کھاؤ اور خدا کا شکر ادا کرو، اگر تم اسی کی عبادت کرتے ہو۔“

اس آیت سے معلوم ہوا کہ پاک روزی ڈھونڈھنا اور کھانا اور اس پر خدا کا شکر ادا کرنا عبادت ہے، ایک اور آیت میں توکل یعنی کاموں کے لیے کوشش کر کے نتیجہ کو خدا کے پرد کر دینا بھی عبادت قرار دیا گیا ہے۔ فرمایا:

﴿فَاعْبُدُهُ وَتَوَكَّلْ عَلَيْهِ﴾ (۱۱/ہود: ۱۲۳)

”اس کی عبادت کر اور اس پر بھروسہ رکھو۔“

اسی طرح مشکلات میں صبر و استقلال بھی عبادت ہے۔ فرمایا:

﴿فَاعْبُدُهُ وَاصْطَبِرْ﴾ (۱۹/مریم: ۶۵)

¹ صحیح بخاری، کتاب الادب، باب حق الفیف: ۶۱۳۴۔

”اس کی عبادت کر اور صبر کر۔“

کسی شکست دل سے اس کی تسلیم و تشفی کی بات کرنا اور کسی گناہ گار کو معاف کرنا بھی عبادت ہے۔ ارشاد ہے:

﴿فَوَّ مَعْرُوفٍ وَّمَغْفِرَةً خَيْرٌ مِّنْ صَدَقَةٍ يَتَبَعَهَا أَذًى﴾ (۲/ البقرة: ۲۶۳)

”ابھی بات کہنا اور معاف کرنا اس خبرات سے ہتر ہے جس کے پیچے ستانا ہو۔“

اسی آیت پاک کی تشریح محمد رسول اللہ ﷺ نے ان الفاظ میں فرمائی ہے:

((کُلُّ مَعْرُوفٍ صَدَقَةٌ)) ﴿۱﴾

”ہر نکی کا مام خیرات ہے۔“

((بِسْمِكَ فِي وِجْهِ أخِيكَ صَدَقَةٌ))

”تمہارا کسی بھائی کو دیکھ کر مسکراتا بھی خیرات ہے۔“

((وَامَّا طَةُ الْأَذِي عَنِ الطَّرِيقِ صَدَقَةٌ)) ﴿۲﴾

”راستے کی تکلیف دہ چیز کا ہٹاندا بھی خیرات ہے۔“

غیریب اور یوہ کی مدد بھی عبادت، بلکہ بہت سی عبادتوں سے بڑھ کر ہے، فرمایا:

((الساعی عَلَى الْأَرْمَلَةِ وَالْمَسْكِينِ كَالْمُجَاهِدِ فِي سَبِيلِ اللَّهِ وَكَالَّذِي يَصُومُ

النَّهَارَ وَيَقُومُ اللَّيلَ)) ﴿۳﴾

”بیوہ اور غریب کے لیے کوشش کرنے والے کا مرتبہ خدا کی راہ میں جہاد کرنے والے کے

برابر ہے اور اس کے برابر ہے جو دن بھر روزہ رکھے اور رات بھرنماز پڑھتا ہو۔“

بامیں لوگوں کے درمیان سے بعض و فساد کے اسباب اور کرنا اور محبت پھیلانا یہی عبادت ہے، جس کا

درج نماز، روزہ اور زکوٰۃ سے بڑھ کر ہے، آپ ﷺ نے ایک دن صحابہ رضی اللہ عنہم سے فرمایا:

((الا اخْبَرَ كُمْ بِأَفْضَلِ مِنْ دَرْجَةِ الصِّيَامِ وَالصَّلَاةِ وَالصَّدَقَةِ))

”کیا میں تم کروزہ، نماز اور زکوٰۃ سے بھی بڑھ کر درجہ کی چیز نہ تاؤں؟“

صحابہ رضی اللہ عنہم نے عرض کی، یا رسول اللہ! ارشاد فرمائیے۔ فرمایا:

((اصلاح ذات البین)) ﴿۴﴾

”وہ آپ کے تعلقات کا درست کرنا ہے۔“

حضرت سلمان فارسی رضی اللہ عنہ، ایک دوسرے صحابی حضرت ابو درداء رضی اللہ عنہ سے ملنے گئے تو دیکھا کہ ان کی

¹ صحیح بخاری، کتاب الادب، باب کل معروف صدقۃ: ۶۰۲۱۔ ² ترمذی، ابواب البر والصلة، باب

ما جاء في صنائع المعروف: ۱۹۵۶۔ ³ بخاری، کتاب الادب، باب الساعی على الارملة: ۶۰۰۶۔

⁴ سنن ابی داود، کتاب الادب، باب فی اصلاح ذات البین: ۴۹۱۹۔

بیوی نہایت معمولی اور میلے کپڑے پہننے ہیں۔ حضرت سلمان رضی اللہ عنہ نے وجہ دریافت کی تو بولیں کہ تمہارے بھائی کو دینا کی خواہ نہیں ہے۔ اس کے بعد مہمان کے لیے کھانا آیا تو ابو دراء رضی اللہ عنہ نے کہا، میں روزے سے ہوں۔ حضرت سلمان رضی اللہ عنہ نے کہا، میں تو تمہارے بغیر نہیں کھاؤں گا۔ آخراں ہوں نے افطار کی اساتھ ہوئی تو ابو دراء رضی اللہ عنہ نماز کو کھڑے ہونے لگے حضرت سلمان رضی اللہ عنہ نے کہا، ابھی سور ہو۔ پچھلی پھر کو حضرت سلمان رضی اللہ عنہ نے ان کو جکایا اور کہا اب نماز پڑھو۔ چنانچہ دونوں نے تجدید کی نماز ادا کی پھر حضرت سلمان رضی اللہ عنہ نے ان سے کہا، اے ابو دراء رضی اللہ عنہ! تمہارے رب کا بھی تم پر حق ہے اور تمہاری جان کا بھی تم پر حق ہے۔ تمہاری بیوی کا بھی تم پر حق ہے تو جس جس کا حق تم پر ہے سب کو ادا کرو۔ حضرت ابو دراء رضی اللہ عنہ نے آنحضرت علیہ السلام کی خدمت میں آ کر حضرت سلمان رضی اللہ عنہ کی یہ تعریف لیکل کی۔ آپ نے فرمایا کہ ”سلمان نے قہ کہا۔“ * لوگوں نے آنحضرت علیہ السلام سے دریافت کیا کہ یا رسول اللہ تمام کاموں میں سب سے بہتر کوئا کام ہے؟ فرمایا: ”خدا پر ایمان لانا اور اس کی راہ میں جہاد کرنا۔“ لوگوں نے پوچھا کس غلام کے آزاد کرنے میں زیادہ ثواب ہے؟ ارشاد ہوا: ”جس کی قیمت زیادہ ہو اور جو اپنے مالک کو زیادہ پسند ہو۔“ انہوں نے کہا، اگر یہ کام تم سے نہ ہو سکے تو؟ فرمایا: ”پھر ثواب کا کام یہ ہے کہ کام کرنے والے کی مد کرو یا جس سے کوئی کام بن نہ آتا ہو۔ اس کا کام کر دو۔“ پھر سوال ہوا کہ اگر یہ بھی نہ ہو سکے؟ فرمایا: ”تو پھر یہ کہ لوگوں کے ساتھ کوئی برائی نہ کرو۔ یہ بھی ایک قسم کا صدقہ ہے جو خود تم اپنے اوپر کر سکتے ہو۔“ *

ایک دفعہ آپ علیہ السلام نے صحابہ رضی اللہ عنہم سے فرمایا: ”خدا اپنے بندوں سے کہے گا کہ میں نے تم سے کھانا مانگا تم نے نہ کھلایا۔ وہ عرض کریں گے، خداوند! تو نے کیسے کھانا مانگا تو تو خود تمام جہان کا پروردگار ہے۔ فرمائے گا، کیا تم کو معلوم نہیں کہ میرے فلاں بندے نے تم سے کھانا مانگا تم نے کھانا اس کو نہ کھلایا، اگر تم اس کو کھلاتے تو اس کو تم میرے پاس پاتے۔ اے اہن آدم! میں نے تجھ سے پانی مانگا تو نے مجھے پانی نہ پلاایا وہ کہے گا کہ اے پروردگار! میں تجھ کو کیسے پانی پلااؤں تو تو خود تمام جہان کا پروردگار ہے۔ وہ فرمائے گا، تم کو معلوم نہ تھا کہ میرے فلاں بندے نے پیاس میں تجھ سے پانی مانگا تو نے اس کو پانی نہ پلاایا۔ اگر پلاتا تو اس کو میرے پاس پاتا۔ اے اہن آدم! میں بیمار ہوا تو نے میری بیمار پرسی نہ کی وہ کہے گا، اے پروردگار! میں کیوں کر تیری بیمار پرسی کروں، تو تو خود تمام جہان کا پروردگار ہے۔ فرمائے گا، تجھ کو خبر نہ ہوئی کہ میرا فلاں بندے بیمار تھا تو نے اس کی عیادت نہ کی، اگر کرتا تو تو اس کو میرے پاس پاتا یا مجھے اس کے پاس پاتا۔“ * اس موثر طریقہ ادا نے خدا شناسی اور خدا آگاہی کے کتنے تو پر تو پرے چاک کر دیے اور کھادیا کہ خدا کی عبادت اور اس کی خوشنودی کے حصول کے کیا طریقے ہیں؟ حضرت سعد رضی اللہ عنہ جو چاہتے تھے کہ اپنی کل دوست خدا کی راہ میں دے دیں

* صحیح بخاری، کتاب الادب، باب صنع الطعام و التکلف للضیف: ٦١٣٩۔

* ادب المفرد امام بخاری، باب معونة الرجل اخاه: ٢٢٠۔ * ایضاً، باب عبادة المرتضى: ٥١٧۔

آپ ﷺ نے انہیں بتایا کہ ”اے سعد! جو کچھ اس نیت سے خرچ کرو کہ اس سے خداوند تعالیٰ کی ذات مطلوب ہے۔ اس کا تم کو ثواب ملے گا، یہاں تک کہ جو لقہ تم اپنی بیوی کے منہ میں بھی دو، اس کا بھی ثواب ہے۔“ * ابو سعید النصاری رضی اللہ عنہ سے ارشاد فرمایا: ”مسلمان اگر ثواب کی نیت سے اپنی بیوی کا نفقہ پورا کرے تو وہ بھی صدقہ ہے۔“ * غریب و نادر صحابہ رضی اللہ عنہم نے دربار رسالت میں ایک دن شکایت کی کہ یا رسول اللہ ﷺ! دولت مند لوگ ثواب میں بڑھ گئے۔ ہماری طرح وہ بھی نماز پڑھتے ہیں، وہ بھی روزے رکھتے ہیں، ان کے علاوہ وہ مالی عبادات بھی بھالاتے ہیں، جو تم نہیں بھال سکتے۔ فرمایا: ”کیا تم کو اللہ نے وہ دولت نہیں دی ہے جس کو صدقہ کر سکو، تمہارا سبحان اللہ اور محمد اللہ کہنا بھی صدقہ ہے۔ یہاں تک کہ جو کوئی اپنی نفسانی خواہش کو جائز طریقہ سے پوری کرتا ہے وہ بھی ثواب کا کام کرتا ہے۔“ لوگوں نے کہا، یا رسول اللہ ﷺ! اور تو اپنی نفسانی غرض کے لیے یہ کرتا ہے۔ فرمایا کہ ”اگر وہ ناجائز طریقہ سے اپنی ہوس پوری کرتا تو کیا اس کو گناہ نہ ہوتا؟ پھر اسکو جائز طریقہ سے پورا کرنے کا ثواب کیوں نہ ملے گا۔“ * محمد رسول اللہ ﷺ کی ان تعلیمات سے اندازہ ہو گا کہ حسن عمل ثواب اور عبادات کے مفہوم میں اسلام نے کتنی وسعت پیدا کی ہے اور کتنی تو برتو انسانی غلطیوں کا ازالہ کیا ہے، اس تشریح کے بعد روشن ہو جائے گا کہ وحی محمدی نے بالکل صحیح طور سے خلقت انسانی کی غرض و غایت عبادات الہی قرار دی ہے:

﴿وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْإِنْسَ إِلَّا لِيَعْبُدُونَ﴾ (٥٦: الذاريات)

”میں نے انسانوں کو اور جنوں کو اسی لیے پیدا کیا ہے کہ وہ میری عبادت کریں۔“

اس آیت پاک میں عبادات کا وہ تنگ مفہوم نہیں ہے جو عام طور سے سمجھا جاتا ہے، بلکہ وہ تمام نیک اعمال اور اچھے کاموں تک وسیع ہے، جن کے کرنے کا مقصد خدا کے سامنے اپنی بندگی کا اظہار، اس کی اطاعت اور اس کی خوشنودی کی طلب ہو۔ اس وسعت کے اندر انسان کی پوری زندگی کے کام داخل ہیں۔ جن کے بخوبی و خوبی انجام دینے کے لیے اس کی خلقت ہوئی ہے۔ یہ روحانیت کا دہ راز ہے جو صرف محمد رسول اللہ ﷺ کے ذریعہ سے دنیا کو معلوم ہوا۔ عام طور سے مشہور ہے کہ شریعت میں چار عبارتیں فرض ہیں، یعنی نماز، روزہ، زکوٰۃ اور حج۔ اس سے یہ شبہ ہے کہ ان فرائض کی تخصیص نے عبادات کے وسیع مفہوم کو محدود کر دیا ہے۔ درحقیقت یہ چاروں فرائیض عبادات کے سینکڑوں وسیع معنوں اور ان کے جزئیات کے بے پایاں فنرتوں کو چار مختلف بازوں میں تقسیم کر دیتے ہیں۔ جن میں سے ہر ایک فرائیض عبادات اپنے افراد اور جزئیات پر مشتمل اور ان سب کے بیان کا مختصر عنوان باب ہے۔ جس طرح کسی وسیع مضمون کو کسی ایک مختصر سے لفظ یا فقرنوں میں ادا کر کے اس وسیع مضمون کے سرے پر لکھ دیتے ہیں۔ اسی طرح یہ چاروں فرائض درحقیقت انسان کے تمام نیک اعمال اور اچھے

۱ ادب المفرد، باب یو جرفی کل شیء: ۷۵۲۔ ۲ صحیح بخاری، کتاب التغقات، باب فضل التغقة

۳ ادب المفرد امام بخاری، باب ان کل معروف صدقہ: ۲۲۷۔

کاموں کو چار مختلف عنوانوں میں الگ الگ تقسیم کر دیتے ہیں، اس لیے ان چار فرضوں کو بجا طور سے انسان کے پچھے اعمال اور کاموں کے چار اصول ہم کہہ سکتے ہیں:

① بندوں کے وہ تمام اچھے کام اور نیک اعمال جن کا تعلق تنہا غالق اور مخلوق سے ہے۔ ایک مستقل باب ہے جس کا عنوان نماز ہے۔

② وہ تمام اچھے اور نیک کام جو ہر انسان دوسرے کے فائدہ اور آرام کے لیے کرتا ہے۔ صدقہ اور زکوٰۃ ہے۔

③ خدا کی راہ میں ہر قسم کی جسمانی اور جانی قربانی کرنا، کسی اچھے مقصد کے حصول کے لیے تکلیف اور مشقت جھینلنا اور نفس کو اس تن پروری اور مادی خواہشوں کو محاسن اور آلوگی سے پاک رکھنا جو کسی اعلیٰ مقصد کی راہ میں حاصل ہوتی ہیں۔ روزہ ہے یا یوں کہو کہ ایثار و قربانی کے تمام جزئیات کی سرفہرستی روزہ ہے۔

④ دنیا کے اسلام میں ملت ابراہیم کی برادری اور اخوت کی جسمی تسلیم و تنظیم، مرکزی رشتہ اتحاد کا قیام اور اس مرکز کی آبادی اور کسب روزی کے لیے ذاتی کوشش اور محنت کے باب کا سرعنوان جج ہے۔

غور کر کے دیکھو انسان کے تمام اعمال اور اچھے کام انہی اصول چہار گانہ کے تحت میں داخل ہیں، ان لیے آنحضرت ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ ”اسلام کی بنیاد پانچ ستونوں پر قائم ہے (۱) توحید و رسالت کا اقرار کرنا (۲) نماز پڑھنا (۳) روزہ رکھنا (۴) زکوٰۃ دینا (۵) حج کرنا۔“ پہلی چیز میں عقائد کا تمام دفتر سست جاتا ہے اور بقیہ چار چیزوں ایک مسلمان کے تمام نیک اعمال اور اچھے کاموں کو محیط ہیں۔ انہی ستونوں پر اسلام کی وسیع اور عظیم الشان عمارت قائم ہے۔ اس تقریر کا مفہوم یہ نہیں ہے کہ یہ چاروں فرض عبادتیں نماز زکوٰۃ، روزہ اور حج اصل مطلوب بالذات نہیں ہیں، بلکہ یہ مقصد ہے کہ یہ چاروں عبادتیں اپنے تمام جزئیات باب اور محنتیات کے ساتھ فرض ہیں۔ جو شخص صرف ان چاروں فرائض کو جو عنوان باب ہیں ادا کرتا ہے اور اس باب کے نیچے کے مندرجہ جزئیات سے پہلو تھی کرتا ہے، اس کی عبادت ناقص اور اس کی اطاعت ناکمل ہے اور اس کے لیے دین و دنیا کی وہ فلاح و کامیابی جس کا خداۓ تعالیٰ نے وعدہ فرمایا ہے، مشکوک ہے، بیہمیں سے یہ شبہ زائل ہوتا ہے کہ ہماری نمازیں ہم کو برائیوں سے کیوں بازنہیں رکھتیں، ہمارے روزے ہم کو تقویٰ کی دولت کیوں نہیں بخشنے، ہماری زکوٰۃ ہمارے دلوں کو پاک و صاف کیوں نہیں کرتی۔ ہمارا حج ہمارے گناہوں کی مغفرت کا باعث کیوں نہیں بنتا اور قرن اول کی طرح ہماری نمازیں ملکوں کو فتح اور ہماری زکوٰتیں ہمارے قومی افلاس کو دور کیوں نہیں کرتیں اور ہمارے سامنے دین و دنیا کے موعودہ برکات کا انبار کیوں نہیں لگ جاتا، لیکن خدا کا وعدہ یہ ہے:

﴿وَعَدَ اللَّهُ الَّذِينَ أَمْتُوا مِنْهُمْ وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ لَيَسْأَلُنَّهُمْ فِي الْأَرْضِ﴾ (۲۴ / التور: ۵۵)

* صحیح بخاری، کتاب الایمان، باب دعا ذکم ایمانکم۔ ۸:؛ صحیح مسلم، کتاب الایمان، باب بیان اركان الاسلام: ۱۱۱ تا ۱۱۴۔

”اللہ نے ان سے جو ایمان رکھتے ہیں اور تمام نیک کام کرتے ہیں، یہ وعدہ کیا ہے کہ وہ ان کو زمین میں خلیفہ بنائے گا۔“

اسی لیے ایمان کامل اور اعمال نیک کے بغیر اس وعدہ کی ایفا کی توقع رکھنا حماقت ہے۔

اسی طرح ان چاروں جمل عنوانات کے احکام سے قطع نظر کر کے صرف مندرجہ تحت جزویات کی تقلیل ممکن ہے کہ دنیاۓ فانی کی بادشاہی کا اہل بنادے۔ مگر آسمان کی بادشاہت میں اس کو کوئی حصہ نہیں ملے گا اور اسلام اس لیے آیا ہے کہ اپنے پیروؤں کے پاؤں کے نیچے دونوں جہانوں کی بادشاہیاں رکھ دے ۔ اور یہ اسی وقت ممکن ہے جب عبادات کے مفہوم کو اس وسعت کے ساتھ سمجھا جائے جو اسلام کا منشاء ہے اور اسی وسعت کے ساتھ اس کو ادا کیا جائے جو اسلام کا مطالبہ ہے۔

١ سیرۃ ابن ہشام و فد قریش عند النبی مُصطفیٰ ح ۱، ص: ۲۵۲ مطبع محمد علی مصر، کلمة واحدة یعطونیها تملکون بها العرب و تدين لكم بها العجم

نماز

﴿وَأَقِيمُوا الصَّلَاةَ﴾

اسلام کی عبادت کا یہ پہلا رکن ہے جو امیر و غریب، بوڑھے، جوان، عورت، مرد، بیمار و تدرست سب پر یکساں فرض ہے۔ یہی وہ عبادت ہے جو کسی شخص سے کسی حال میں بھی ساقط نہیں ہوتی۔ اگر اس فرض کو کھڑے ہو کر نہیں ادا کر سکتے تو پیشہ کر ادا کرو اور اگر اس کی بھی قدرت نہیں ہے تو لیٹ کر کر سکتے ہو۔ اگر منہ سے نہیں بول سکتے تو اشاروں سے ادا کرو۔ * اگر کسی سخت مجبوری میں رک کر نہیں پڑھ سکتے تو چلتے ہوئے پڑھو۔ * اگر کسی سواری پر ہو تو جس طرف وہ چلتے اسی رخ پڑھو۔ *

نماز کیا ہے؟

خلوق کا اپنے دل زبان اور ہاتھ سے اپنے خالق کے سامنے بندگی اور عبودیت کا ظہار، اس رحمٰن و رحیم کی یاد اور اس کے بے انہتا احسانات کا شکریہ، حسن ازل کی حمد و شنا اور اس کی یکتاں اور بڑائی کا اقرار یا اپنے محبوب سے محبور روح کا خطاب ہے، یہ اپنے آقا کے حضور میں جسم و جان کی بندگی ہے۔ یہ ہمارے اندر وہی احسانات کا عرض نیاز ہے، یہ ہمارے دل کے ساز کا فطری ترانہ ہے۔ یہ خالق و مخلوق کے درمیان تعلق کی گردہ اور وابستگی کا شیرازہ ہے۔ یہ بے قرار روح کی تسلیکیں، مضطرب قلب کی تشفی اور ما یوس دل کی دوا ہے۔ یہ فطرت کی آواز ہے، یہ حساس و اثر پذیر طبیعت کی اندر وہی پکار ہے، یہ زندگی کا حاصل اور ہستی کا خلاصہ ہے۔ کسی غیر مریٰ طاقت کے آگے سرنگوں ہونا، اس کے حضور میں دعا و فریاد کرنا اور اس سے مشکلوں میں تسلی پانا انسان کی فطرت ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ دل کی گہرائیوں میں کوئی ساز ہے، جو نامعلوم الگیوں کے چھوٹے سے بجتا رہتا ہے، یہی ﴿السُّتُّ بِرَبِّكُم﴾ کا فطری جواب ہے۔ قرآن نے جاہاں انسانوں کی اس فطری حالت کا نقشہ کھینچا ہے اور پوچھا ہے کہ جب تم پر مصیبتیں آتی ہیں۔ جب سمندر میں طوفان اٹھتا ہے اور تمہارا جہاز بخونر میں پھنستا ہے تو خدا کے سوا کون ہوتا ہے جس کو تم پکارتے ہو؟ غرض انسان کی پیشانی کو خود بخود ایک بھود کی تلاش رہتی ہے، جس کے سامنے وہ بھکرے، اندر وہن دل کی عرض و نیاز کرے اور اپنی ولی تھناؤں کو اس کے سامنے پیش کرے، غرض عبادت، روح کے اسی فطری مطالبہ کا جواب ہے۔ اگر یہ نہ ہو تو انسانی روح کے جوش جنون کا علاج ممکن نہیں۔ وحشی سے وحشی مذہب میں بھی عبادت کے کچھ رسم اس نداء فطرت کی تسلی کے لئے موجود ہیں، بھرا سماں مذاہب اس سے کیوں کر خالی ہو سکتے ہیں؟ چنانچہ دنیا کے ہر آسمانی مذہب میں خدا کی یاد کا حکم اور اس یاد کے کچھ مراسم موجود ہیں۔ اسلام میں اگر حمد و شکر ہے تو یہودیوں میں مزمور، عیسائیوں میں دعا،

* نیل الاولاء، ج ۲، ص ۲۸ بروایت موقوف از دارقطنی۔ * ابو داود، کتاب صلاة السفر، باب صلاة الطالب: ۱۲۴۹۔ * صحيح بخاری، کتاب التفسير، تفسیر سورة البقرة باب قوله: فَإِنْ خَفْتُمْ فَرِجَالًا.....: ۴۵۳۵ مسلم، کتاب صلاة المسافرين، باب جواز صلاة النافلة على الدابة في السفر حيث توجّهت: ۱۶۱۱، ۱۶۱۰۔

پارسیوں میں زمرہ اور ہندوؤں میں بھی ہیں اور دن رات میں اس فریضہ کے ادا کرنے کے لئے ہر ایک میں بعض اوقات کا تعین بھی ہے۔ اس بنا پر یہ یقین کرنا چاہیے کہ نماز مذہب کے ان اصول میں سے ہے جن پر تمام دنیا کے مذہب متفق ہیں۔ قرآن پاک کی تعلیم کے مطابق دنیا میں کوئی پیغمبر ایسا نہیں آیا جس نے اپنی امت کو نماز کی تعلیم نہ دی ہو اور اس کی تاکید نہ کی ہو۔ خصوصاً ملت ابراہیمی میں اس کی حیثیت سب ۱ سے زیادہ نمایاں ہے۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام جب اپنے صاحبزادے حضرت اسماعیل علیہ السلام کو مکہ کی ویران سرز میں میں آباد کرتے ہیں تو اس کی غرض یہ بتاتے ہیں کہ ﴿أَرْبَّنَا يُقِيمُوا الصَّلَاة﴾ (۱۳/ابراهیم۔۲) اے ہمارے پروردگار! تاکہ وہ نماز کھڑی کریں۔“ حضرت ابراہیم علیہ السلام اپنے اور اپنی نسل کے لئے دعا کرتے ہیں کہ ﴿رَبَّنَا أَجْعَلْنَاهُ مُقِيمَ الصَّلَاةَ وَمِنْ ذُرِّيَّتِنَا﴾ (۱۳/ابراهیم۔۲۰) اے میرے پروردگار! مجھ کو اور میری نسل میں سے لوگوں کو نماز کھڑی کرنے والا بناء۔“ حضرت اسماعیل علیہ السلام کی نسبت قرآن پاک کی شہادت ہے: ﴿وَكَانَ يَأْمُرُ أَهْلَهُ بِالصَّلَاةِ﴾ (۱۹/مریم: ۵۵) ”او روہ اپنے اہل و عیال کو نماز کا حکم دیتے تھے۔“ حضرت شعیب علیہ السلام کو ان کے ہم قوم طعنہ دیتے ہیں: ﴿أَصَلَّوْتُكَ تَأْمُرُكَ أَنْ تَنْهِكَ مَا يَعْدُ أَبَا وَعِنْدَنَا﴾ (۱۱/ہود۔۷۔۸) ”کیا تمہاری نماز تم کو یہ حکم دیتی ہے کہ ہمارے باپ دادا جس کو پوچھتے آئے ہیں اس کو چھوڑ دیں۔“ حضرت لوط علیہ السلام، حضرت اسحاق علیہ السلام، حضرت یعقوب علیہ السلام اور ان کی نسل کے پیغمبروں کے متعلق قرآن کا بیان ہے: ﴿وَأَوْحَيْنَا إِلَيْهِمْ فَعْلَ الخَيْرَاتِ وَإِقَامَ الصَّلَاةَ﴾ (۲۱/النیام: ۲۳) ”اور ہم نے ان کو نیک کاموں کے کرنے اور نماز کھڑی کرنے کی وجہ کی۔“ حضرت لقمان علیہ السلام اپنے بیٹے کو نصیحت کرتے ہیں: ﴿يَعْتَيْ أَقِيمُ الصَّلَاةَ﴾ (۳۱/لقمان۔۱۷) ”اے میرے بیٹے! نماز کھڑی کر۔“ حضرت موسیٰ علیہ السلام سے کہا گیا: ﴿وَأَقِمُ الصَّلَاةَ لِذِكْرِي﴾ (۲۰/ظہہ: ۱۳) ”او میری یاد کے لیے نماز کھڑی کر۔“ حضرت موسیٰ علیہ السلام اور ہارون علیہ السلام اور ان کے ساتھ بني اسرائیل کو حکم ہوتا ہے: ﴿وَأَقِيمُوا الصَّلَاةَ﴾ (۱۰/یونس: ۸۷) ”او نماز کھڑی کیا کرو۔“ بني اسرائیل سے وعدہ تھا: ﴿إِنِّي مَعَلِمٌ طَائِنَ أَقْمَتُمُ الصَّلَاةَ﴾ (۵/آلہ مائدہ: ۱۲) ”میں تمہارے ساتھ ہوں اگر تم نماز کھڑی کیا کرو۔“ حضرت زکریا علیہ السلام کی نسبت ہے: ﴿وَهُوَ قَالِمٌ يُصَلِّي فِي الْعُرَبَابِ﴾ (۳/آل عمران: ۳۹) ”وہ محراب میں کھڑے نماز پڑھ رہے تھے۔“ حضرت

۲ قرآن کی تائید تواریخ اور زبور سے بھی ہوتی ہے، لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہودیوں کے پرانے صحیفوں میں نماز کے لیے اصطلاحی لفظ خدا کا نام لینا تھا، چنانچہ تواریخ اور زبور میں نماز کا ذکر اسی نام سے آتا ہے۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے بیت ایل (بیت اللہ) کے پاس ایک تربان گاہ بنا کی اور خدا کا نام لیا۔ (پیدائش: ۱۸۔۲۔۱۲) حضرت اخْلَق علیہ السلام نے خدا کا نام لیا (پیدائش: ۲۶۔۲۵) حضرت واوْد علیہ السلام نے خدا کا نام لیا (زبور: ۱۱۔۱۲) اور یہ اصطلاح قرآن میں بھی مستعمل ہوئی ہے: ﴿وَلَوْدَكْرَاسْمَرَرَةَ فَصَلَّى﴾ (۱۵/العلی: ۸۷) اور اپنے رپ کا نام لیا، پس نماز پڑھی۔“ اس معنی کی اور بھی آئیں قرآن پاک میں مذکور ہیں، یہودیوں کے پچھے صحیفوں مفردا یا مجموعہ اور عیسیٰ مسیح کے تام صحیفوں میں نماز کے لیے دعا کا لفظ استعمال ہوا ہے جو عربی لفظ صلوا کے ہم معنی ہے۔ اس لیے انجیل کے اردو مترجموں نے اس کا ترجمہ نماز کیا ہے۔ (متی: ۱۷۔۲۱ اور متی: ۲۲۔۲۳) (مس: ۲۲۲۔۲۲۳)

عیسیٰ علیہ السلام کہتے ہیں: «وَأَوْصَنِي بِالصَّلَاةِ» (۱۹/ مریم: ۳۱) ”او رخانے مجھ کو نماز کا حکم دیا ہے۔“ آیات بالا کے علاوہ قرآن سے یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ اسلام کے زمانہ میں بھی عرب میں بعض یہود اور عیسائی نماز پڑھا کرتے تھے:

﴿مِنْ أَهْلِ الْكِتَابِ أُمَّةٌ قَيِّمَةٌ يَتَّلَقَّنَ أَيْتَ اللَّهُ أَنَّاءَ الْأَيْلَلِ وَهُمْ يَسْجُدُونَ﴾

(۲/ آل عمران: ۱۱۳)

”اہل کتاب میں کچھ لوگ ایسے بھی ہیں جو راتوں کو کھڑے ہو کر خدا کی آسمیں پڑھتے ہیں اور وہ سجدہ کرتے ہیں۔“

حدیث میں بھی یہودیوں اور عیسائیوں کی نماز کے مذکرے ہیں۔ مثلاً: آپ ﷺ نے فرمایا کہ ”جب نماز پڑھو تو تمہند باندھ لو یا چادر اوڑھو۔ یہودیوں کی طرح (شگلے) نہ پڑھو۔“ (ص ۲۷) ”تم یہودیوں کی طرح صرف اوپر سے نماز میں چادر مرت ڈال لو بلکہ اس کو باندھ لیا کرو۔“ (ص ۲۸) ”نماز میں یہودیوں کی طرح مت جھومو۔“ (ص ۱۱۲) ”تم یہودیوں کے برخلاف نماز میں موزے اور جوتے پہنے رہو۔“ (ص ۱۱۳) ”میری امت میں اس وقت تک دین کا کچھ نہ کچھ اثر رہے گا جب تک لوگ یہودیوں کی تقلید میں مغرب کی نماز میں ستاروں کے نکلنے کا اور عیسائیوں کی تقلید میں صبح کی نماز میں ستاروں کے ڈوبنے کا انتظار نہ کریں گے۔“ (ص ۸۲) ان حوالوں سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ عرب کے یہود و نصاری میں کچھ لوگ ایسے تھے جو نماز ادا کرتے تھے۔ عرب میں جو لوگ اپنے کو دین ابراہیمی کا پیر و کہتے تھے، ان میں بعض تو ایسے تھے کہ وہ کسی خاص طریقہ عبادت سے واقف نہ تھے۔ چنانچہ زید بن عمرو کا واقعہ گزر چکا ہے کہ وہ کہا کرتے تھے کہ اے خدا مجھے معلوم نہیں کہ میں تھوکی کیسے پوجوں؟ یہ کہ کر تخلیل اٹھاتے تھے اور اسی پر سجدہ کر لیتے تھے۔ یعنی ایک دو ایسے بھی تھے جو کسی نہ کسی صورت سے نماز پڑھتے تھے۔ چنانچہ حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ عنہ آنحضرت ﷺ کی ملاقات اور اپنے اسلام لانے کے تین برس پہلے سے رات کو نماز پڑھ لیتے تھے۔ کسی نے ان سے پوچھا کہ اس وقت آپ کس رخ نماز پڑھتے تھے کہنے لگے جدھرخ کر لیا۔ عرب کا ایک جاہلی شاعر جران العود کہتا ہے:

وادر کن اعجازاً من اللیل بعدما اقام الصلوة العابد المتحنف

”اور ان سواریوں نے رات کے پچھلے حصہ کو پالیا اس وقت کے بعد جب کہ عبادت گزار حنفی نماز پڑھ چکا تھا۔“

اس شعر سے ثابت ہوتا ہے کہ عرب میں مذهب حنفی کے پیر و پھٹل رات میں نماز ادا کرتے تھے۔

- ❶ کنز العمال بعد چار مطیع حیرہ آپ کے مختلف ابواب سے یہ حدیث لفظ کی گئی ہیں اور متن میں اس جملہ کے صرف صفات لکھ دیے گئے ہیں۔
- ❷ ابن هشام ذکر زید بن عمرو بن نفیل، ص: ۱۴۴۔ ❸ صحیح مسلم، کتاب فضائل الصحابة، باب من فضائل ابی ذر: ۶۳۵۹۔ ❹ لسان العرب لفظ حنف، ج ۱، ص: ۷۳۹۔

یہود کی بڑی جماعت نے نماز کو بھلا دیا تھا اور ان کی نماز صرف چند رسم کا مجموعہ بن کر رہ گئی تھی اور نماز سے زیادہ انہوں نے قربانی اور نذر انوں پر زور دیا تھا، جن میں خلوص اور خدا پرستی کا شاستہ تک نہ تھا۔ عیسائیوں نے خدا کی نماز کے ساتھ ساتھ انسانوں کی نمازیں بھی شروع کر دی تھیں وہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام اور حضرت مریم علیہ السلام کے علاوہ اور بھی سینکڑوں ولیوں اور شہیدوں کی عبادت میں مصروف ہو گئے تھے۔ ۴ دین ابراہیم کی پیروی کے مدعا صرف اپنے قیاس سے کچھ ارکان ادا کر لیتے تھے، الغرض آپ کی بعثت سے پہلے نماز کی خاص اور موحدانہ حقیقت دنیا سے عموماً گم ہو چکی تھی۔ اس کی شکل و صورت اس قدر منسخ ہو گئی تھی کہ آج بھی ان کے صحقوں میں اس کی اصل شکل نظر نہیں آتی، نہ اس کے ارکان کا پتہ لگتا ہے نہ یہ معلوم ہوتا ہے کہ ان الہامی تجویزیں جن پر مذہبی فریضہ سمجھ کر عمل کیا جا رہا تھا۔ بجدہ جو نماز کی روح اور نیازِ الہی کی انتہائی منزل ہے۔ اس کو یہود و نصاریٰ دونوں نے مشکل اور باعث تکلیف سمجھ کر چھوڑ دیا تھا اور اس طرح نماز کی ظاہری شکل و صورت بھی انہوں نے بگاڑ دی تھی۔ قرآن مجید میں ان کی اس صورت حال کا نقشہ ان الفاظ میں سمجھنا گیا ہے:

﴿فَلَفَّ مِنْ بَعْدِهِمْ خَلْفٌ وَرَوَا الْكِتَبَ يَأْخُذُونَ عَرَضَ هُنَّا الْأُدُلُّ وَيَقُولُونَ سَيَقْفَرُ
لَنَا وَإِنْ يَأْتِهِمْ عَرَضٌ قُتْلُهُ يَأْخُذُهُ أَكْمَنْ يُؤْخَذُ عَلَيْهِمْ قِيَّاقُ الْكِتَبِ أَنْ لَا يَقُولُوا
عَلَى اللّٰهِ إِلَّا حَقٌّ وَدَرُسُوا مَا فِيهِ وَاللّٰهُ أَلْأَخْرَةُ خَيْرٌ لِلّٰدِينِ يَقُولُونَ أَفَلَا تَعْقِلُونَ
وَالَّذِينَ يَمْسِكُونَ بِالْكِتَبِ وَأَقَامُوا الصَّلَاةَ إِنَّا لَأَنْضِيْمَ أَجْرَ الْمُصْلِحِينَ ﴾

(الاعراف: ۱۶۹-۱۷۰)

”ان کے بعد ان کے وہ جانشین ہوئے جن کو خدا کی کتاب باپ دادوں سے وراثت میں ملی وہ صرف اس دنیاوی زندگی کا فائدہ لیتے ہیں اور کہتے ہیں کہ ہم کو معاف کر دیا جائے گا اور اگر ایسا ہی فائدہ اب بھی ان کے سامنے آئے تو لے لیں (اور مذہب کی پرواہ کریں) کیا ان سے کتاب کا معاہدہ نہیں لیا گیا کہ وہ خدا کے متعلق سچ کے سوا کچھ اور نہ کہیں گے اور ان لوگوں نے جو کچھ اس (کتاب) میں ہے، اس کو پڑھا اور آخرت کا گھر ان لوگوں کے لئے ہے جو پرہیز گاریں کیا تم نہیں سمجھتے؟ اور وہ لوگ جو کتاب کو مضبوطی سے پکڑ لیں اور انہوں نے نماز کو قائم کیا تو ہم اپنی حالت درست کرنے والوں کی محدودی کو برداشتیں کرتے۔“

سورہ مریم میں تمام انبیاء کے صارقین کے ذکر کے بعد خدا فرماتا ہے:

﴿وَلَكُمْوَانِسِلَكُمْ بَيْلَدٌ يَأْبُرُنَّ إِلَيْكُمْ يَأْطِعُنَّ يَأْزِدُهُمْ لِقْنَاعَ عَبَادَتٍ (وَرَشْبٌ) -

﴿فَلَكُفَّ مِنْ بَعْدِهِمْ خَلَفٌ أَضَاعُوا الصَّلَاةَ وَأَبْيَوْا الشَّهَادَةَ﴾ (۱۹ / مریم: ۵۹)

”ان کے بعد ان کے جانشین ایسے ہوئے جنہوں نے نماز کو بر باد کر دیا اور اپنی خواہشوں کی پیروی کی۔“

نماز کے ضائع اور بر باد کرنے سے مقصود نماز کو صرف چھوڑ دینا نہیں ہے، بلکہ زیادہ تر اس کی حقیقت اور اس کی روح کو گم کر دینا ہے۔ مسلمان جب اپنی نماز کے لئے حی علی الصلوٰۃ (نماز کے لئے آؤ) کا تراہہ بلند کرتے ہیں تو یہ دو نصاريٰ اس کا مذاق اڑاتے تھے، اس پر قرآن نے ان کی نسبت یہ شہادت دی کہ ان کی خدا پرستی کی روح اتنی مردہ ہو چکی ہے کہ جب دوسرا لوگ خدا پرستی کے جذبے میں سرشار ہوتے ہیں تو وہ اس کو ہنس کھیل بنا لیتے ہیں:

﴿وَإِذَا نَادَيْتُمُ الصَّلَاةَ اتَّخَذُوهَا هُرُونًا وَلَعْبًا طَذِلَكَ يَأْتُهُمْ قَوْمٌ لَا يَعْقِلُونَ﴾

(۵ / المائدہ: ۵۸)

”اور جب تم نماز کے لئے آواز دیتے ہو تو وہ اس کو ہنس کھیل بنا لیتے ہیں، یہ اس لئے کہ وہ عقل سے خالی ہو چکے ہیں۔“

ابلی عرب اور قریش جو اپنے آبائی مذہب پر تھے وہ گونماز کی صورت سے کسی حد تک واقف تھے، مگر بھولے سے بھی اس فرض کو ادا نہیں کرتے تھے۔ بتوں کی پوجا، جنات کی دہائی، فرشتوں کی خوشامد، یہ ان کی عبادات کا خلاصہ تھا۔ حج و طواف یا دوسرے موقعوں پر وہ خدا سے دعا میں مانگتے تو ان میں بھی بتوں کے نام لے لیتے اور شرک کے فقرے ملا دیتے تھے۔ موحدانہ خضوع و خشوع کا ان کی دعاوں میں شاید تک نہ تھا۔ مسلمانوں کو جب کبھی نماز پڑھتے دیکھ لیتے تو ان کا منہ پڑھاتے تھے، دیق کرتے تھے، دھکیل دیتے تھے، شور کرتے تھے، سیٹی اور تالی بجا تے تھے، چنانچہ ان کے متعلق قرآن نے کہا:

﴿وَمَا كَانَ صَلَّاهُمْ عِنْدَ الْبَيْتِ إِلَّا مُكَاءَ وَّضَرِيَّةً﴾ (۳۵ / الانفال: ۸)

”اور ان کی نماز خانہ کعبہ کے پاس سیٹی اور تالی بجانا ہے۔“

اگلے مفسروں نے اس آیت پاک کے دو مطلب لئے ہیں، ایک یہ کہ واقعہ جو نماز پڑھتے تھے اس میں سیٹی اور تالی بجا یا کرتے تھے۔ دوسرے یہ کہ مسلمان جب نماز پڑھتے تھے تو وہ سیٹی اور تالی بجا کر ان کی نماز خراب کرنی چاہتے تھے اور گویا یہی ان کی نماز تھی۔ پہلے معنی کی بنا پر تو ان کی نماز مغض ایک قسم کا کھیل کو دو اور لہو ولعب تھا اور دوسرے معنی کی رو سے سرے سے ان کے ہاں نماز ہی ن تھی، بلکہ دوسروں کو نماز سے روکنا یہی ان کی نماز تھی۔ ایک اور آیت میں ہے:

﴿أَرَعِيهِ الَّذِي يَنْهَا عَبْدًا إِذَا صَلَّى﴾ (۹۶ / العلق: ۹-۱۰)

ابن جریر طبری، تفسیر آیت مذکور، ج ۹، ص: ۱۴۷، ۱۴۸۔

”کیا تو نے اس شخص کو دیکھا جو ایک بندہ کو نماز پڑھنے سے روکتا ہے۔“

ایک بندہ سے مراد خود آنحضرت ﷺ کی ذات ہے آپ جب صحن حرم میں نماز پڑھتے تو قریش جو بے فکری کے ساتھ اوہ رہ بیٹھے رہتے کبھی آپ کی بھی اڑاتے اور کبھی دق کرتے، ۱ کبھی آپ کی گروں میں پہنڈا اذال دیتے ۲ اور کبھی جب آپ بجھہ میں جاتے پشت مبارک پر نجاست لا کر ڈال دیتے تھے اور جب آنحضرت ﷺ کو اس بارنجاست سے انھیں میں تکلیف ہوتی تو ہنستے اور قہقہہ لگاتے تھے۔ ۳ اسی لئے آنحضرت ﷺ اسلام کے آغاز میں تو اخفا کے خیال سے اور اس کے بعد ان کے ان حرکات کی وجہ سے عموم امارات کو اور وہ کوئی غاریارہ میں چھپ کر نماز پڑھا کرتے تھے اور مسلمان بھی عموماً اوہ رہ جھپ کر ہی نماز پڑھتے تھے یا پھر رات کے ننانے میں اس فرض کو ادا کرتے تھے۔ مشرکین اگر کبھی اس حالت میں ان کو دیکھ پاتے تو مرنے پر تیار ہو جاتے تھے۔ اب ان الحجت میں ہے کہ صحابہ جب نماز پڑھنا چاہتے تو گھائیوں میں چھپ کر نماز پڑھتے تھے۔ ایک دفعہ حضرت سعد رضی اللہ عنہ بن ابی و قاس چند مسلمانوں کے ساتھ ان کی ایک گھانی میں نماز پڑھ رہتے تھے کہ مشرکین کی ایک جماعت آگئی، اس نے اس نماز کو بدعت (نیا کام) سمجھا اور مسلمانوں کو برا بھلا کہا اور ان سے لڑنے پر آمادہ ہو گئی۔ ۴ الغرض جب محمد رسول اللہ ﷺ نے انسانوں کو خدا کے آگے سر بخجود ہونے کی دعوت دی تو اس وقت تین قسم کے لوگ تھے، ایک وہ (یعنی یہود) جو نماز تو پڑھتے تھے لیکن عموماً اس کی حقیقت سے بیگانہ تھے، ان کی نماز میں بالعموم اخلاص و اثر، سکون و دلجمی، خشوع و خصوع اور خوف و خشیت سے بالکل خالی تھیں، دوسرا وہ (یعنی عیسائی) جو خدا کی نماز کے ساتھ انسانوں کو بھی اپنے سجدہ کے قابل سمجھتے تھے اور ان کی عبادتیں کرتے تھے اور وہ چیز جو تو حید کا آئینہ تھی، ان کے ہاں شرک کا مظہر بن گئی تھی۔ تیسرا وہ (یعنی عرب بت پرست) جنہوں نے نہ کبھی خدا کا نام لیا اور نہ کبھی خدا کے آگے سر جھکایا وہ اس روحانی لذت سے آشنا ہی نہ تھے۔

توحید کے بعد اسلام کا پہلا حکم

آنحضرت ﷺ جب مسیحوت ہوئے تو توحید کے بعد سب سے پہلا حکم جو آپ کو ملا وہ نماز کا تھا۔ (یا لیهَا الْمَدْبُرُوْ قُمْ فَأَنْذِرُوْ وَرَبَّكَ فَلَكِرُوْ) (۷۴ / المدبر: ۱-۳) ”اے لحاف میں لپٹنے ہوئے انہوں اور ہشیار کرو اور اپنے رب کی بڑائی بول۔“ رب کی بڑائی بولنا یہی نماز کی بنیاد ہے۔ اس کے بعد رفتہ رفتہ نماز تکمیل کے درجات کرتے ہوئی اس لفظ پر پہنچ گئی جو روحانی معراج کی آخری سرحد ہے۔ آپ نے سونے والوں کو جگایا، بھولے ہوؤں کو بہتایا، انجانوں کو سکھایا اور خدا اور بندے کے نٹے ہوئے رشتہ کو جوڑا، گوشت پوست

۱ ابن حجر طبری، تفسیر آیت مذکور، ج ۳، ص ۱۴۰، ۱۴۱۔ ۲ صحیح بخاری، کتاب فضائل اصحاب

النبی ﷺ، ۳۶۷۸۔ ۳ صحیح بخاری، کتاب الصلوٰة، باب المرأة تطرح عن المصلى شيئاً من الاذى: ۵۲۰۔

۴ سیرۃ ابن ہشام (ابتداء ما افترض الله سبحانه من الصلوٰة)، ج ۱، ص: ۱۶۲۔

کے، سونے چاندی کے اور اینٹ اور پتھر کے ان بتوں کو جو خدا کی جگہ کھڑے تھے دھکیل کر نیچے گرا دیا۔ صرف ایک خدا کی نماز دنیا میں باقی رکھی اور خدا کے سوا ہر ایک کے جدہ کو حرام کر دیا، اس طرح آپ کی تعلیم کے ذریعہ سے نماز کی اصل حقیقت دنیا میں ظاہر ہوئی۔ آپ نے اہل عرب اور دنیا کی بت پرست قوموں کو نماز کا طریقہ بتایا، اس کے ارکان و آداب سمجھائے، مسٹر دعا میں تعلیم کیں، عیسائیوں کو مخلصانہ عبادت اور ایک خدا کی پرتش کا سبق دیا۔ یہودیوں کو نماز کے خضوع و خشوع راز و نیاز اور اخلاق و اثر سے باخبر کیا اور انہیاے عالم کی نماز کو اپنے عمل کے ذریعہ سے شکل و صورت اور روح و حقیقت دونوں کے ساتھ تلقابِ تحریف اور غیر متغیر وجود بخش دیا۔ حکم ہوتا ہے کہ

﴿ حِفْظُوا عَلَى الصَّلَاةِ ﴾ (البقرة: ٢٣٨)

”نمازوں کی نگہداشت کرو۔“

یہ نماز کی ظاہری اور معنوی دونوں حیثیتوں سے نگہداشت کا حکم ہے اور مسلمان کی پہچان یہ مقرر ہوئی کہ

﴿ وَهُمْ عَلَى صَلَاتِهِمْ يَحْفَظُونَ ۝ ﴾ (آل الانعام: ٩٢)

”اور وہ اپنی نماز کی نگہداشت کرتے ہیں۔“

﴿ الَّذِينَ هُمْ عَلَى صَلَاتِهِمْ دَائِرُونَ ۝ ﴾ (المعارج: ٧٠)

”جو اپنی نماز ہمیشہ ادا کرتے ہیں۔“

﴿ وَالَّذِينَ هُمْ عَلَى صَلَاتِهِمْ يَحْفَظُونَ ۝ ﴾ (آل المؤمنون: ٩)

”اور (کامیاب ہیں) وہ جو اپنی نمازوں کی نگہداشت کرتے ہیں۔“

خود آنحضرت ﷺ کو حکم ہوتا ہے کہ خود بھی نماز پڑھو اور اپنے اہل دعیاں کو بھی اس کا حکم دو اور اس نماز پر جس کا مکہ کے قیام کے زمانہ میں ادا کرنا بہت مشکل ہے، پوری پابندی اور مضبوطی کے ساتھ ہے رہو۔ فرمایا:

﴿ وَأَمْرُ أَهْلَكَ بِالصَّلَاةِ وَاصْطَبِرْ عَلَيْهَا ۝ ﴾ (آل المؤمنون: ٢٠)

”اور اپنے گھر والوں پر نماز کی تاکید رکھو اور خود بھی اس کے اوپر مجھے (پابند) رہو۔“

نماز کیسی ہوئی چاہیے؟ فرمایا:

﴿ وَقَوْمُوا لِلَّوْقَتِيْنَ ۝ ﴾ (البقرة: ٢٣٨)

”اور خدا کے سامنے ادب سے کھڑے رہو۔“

تعریف کی گئی کہ

﴿ الَّذِينَ هُمْ فِي صَلَاتِهِمْ خَشِعُونَ ۝ ﴾ (آل المؤمنون: ٢)

”کامیاب ہیں وہ مومن جو اپنی نماز میں خشوع کرتے ہیں۔“

حکم ہوا کہ

﴿أَدْعُوكُمْ تَضَرِّعًا وَخُفْيَةً﴾ (۵۵/الاعراف)

”تم اپنے پروگار کو گزگڑا کر اور پچکے چکے پکارو۔“

﴿وَادْعُوهُ خَوْفًا وَطَمَعًا﴾ (۵۶/الاعراف)

”اور اس (خدا) کو ڈرا اور امید کے ساتھ پکارو۔“

﴿وَادْعُوهُ فُلْصِيْنَ لَهُ الدِّيْنُ هُوَ﴾ (۲۹/الاعراف)

”اور خدا کو پکارو اس حال میں کہ تم دین کو اسی کے لئے خالص کرنے والے ہو۔“

اس اجمال کے بعد نماز کے تمام مباحث پر ایک تفصیلی لگاہ کی ضرورت ہے۔

اسلام میں نماز کا مرتبہ

اسلام سے پہلے بھی دنیا میں کوئی ایسا نہ ہب نہیں آیا جس میں نماز کو اہمیت نہ دی گئی ہو، لیکن چونکہ وہ مذہب خاص قوموں اور قبائل تک محدود تھے، اس لئے ان کے اندر سے عملاً اس کی اہمیت جاتی رہی۔ چنانچہ اسلام سے پہلے کی دنیا کے کسی مذہب میں آج نماز یعنی خدا کے سامنے اقرار عبودیت اور اس کی حمد و شناکو واضح معین اور تاکیدی حیثیت حاصل نہیں۔ یعنی کسی مذہب کے پیروؤں بلکہ معلوموں کے عمل سے بھی اس کی یہ صورت نمایاں نہیں ہوتی۔ ورنہ جیسا کہ گزر پا قرآن کے رو سے تو دنیا میں کوئی ایسا یقین برثیں آیا، جس کو نماز کا حکم نہ دیا گیا ہو اور اس نے اپنی امت کو اس کی تاکید نہ کی ہو، مگر موجودہ حیثیت یہ ہے کہ اسلام کے سوا وہ کہیں نمایاں واضح اور موکد صورت میں باقی نہیں رہی ہے اور اس کا سبب یہ ہے کہ چونکہ محررس رسول اللہ ﷺ خاتم الانبیاء اور قرآن پاک خاتم الکتب ہو کر آیا ہے، اس لئے اس فریضہ الہی کو دین کامل میں ایسی منظم، واضح موکد اور نمایاں صورت دی گئی ہے کہ وہ قیامت تک دنیا میں قائم اور باقی رہے۔ یہ اسلام کا وہ فریضہ ہے جس سے کوئی مسلمان تنفس جسب تک اس میں کچھ بھی ہوش و حواس باقی ہے، کسی حالت میں بھی سکدوش نہیں ہو سکتا۔ قرآن پاک میں سو مرتبہ سے زیادہ اس کی تعریف، اس کی بجا آوری کا حکم اور اس کی تاکید آئی ہے۔ اس کے ادا کرنے میں سستی اور کابلی نفاق کی علامت ہے اور اس کا ترک کفر کی نشانی ہے بتائی گئی ہے، یہ وہ فرض ہے جو اسلام کے ساتھ پیدا اور اس کی تکمیل اس شہستان قدس میں ہوئی جس کو معراج کہتے ہیں۔ *

* متفقین کی مفت میں ہے: ﴿وَكَذَا قَاتُوا إلَى الصَّلَاةِ قَائِمُوا لَكَلَّا﴾ (۱۳۲/النَّاسُ، ۱۳۳) ”جب وہ نماز کو ائھتے ہیں تو سوت و کامل ہو کر ائھتے ہیں۔“ وَقَوْنَى لِلْمُصْلِيْنَ ﴿الَّذِيْنَ هُمْ عَنِ الصَّلَاةِ نَهُمْ سَآفُونَ﴾ (۱۰۷/العاوِن، ۱۰۸) ”افسوس ہے ان نمازوں پر جو اپنی نماز سے غفلت کرتے ہیں۔“ * کفار کے بارے میں ہے: ﴿أَمَّنْكُمْ مِنَ الْمُصْلِيْنَ﴾ (۲۷/المرثیَة) ”ہم نمازوں میں نہ تھے۔“ یہ وہ اس وقت کہیں گے جب ان سے پوچھا جائیگا کہ تم دوزخ میں کیوں ہو۔ * کتب صحاح واقعات معراج و اسراء و صحیح بخاری، کتاب الصلوٰۃ، باب کیف فرضت الصلوٰۃ فی الْاَسْرَاءِ - ۳۴۹

اسلام میں پہلا فرض ایمان اور اس کے لوازم ہیں اور اس کے بعد دوسرا فرض نماز ہے۔ چنانچہ سورہ روم (رکوع ۲) میں پہلا حکم یہ دیا گیا: «فَأَقِمْهُ وَجْهَكَ لِلنَّبِيِّنَ حَتَّىٰ مَا فِطَرَ اللَّهُ الَّتِي فَطَرَ النَّاسَ عَلَيْهَا» (الروم: ۳۰) اپنا منہ ہر طرف سے پھیر کر دین تو حید پر سیدھا رکھو ہی اللہ کی فطرت ہے جس پر اس نے لوگوں کو بنا�ا ہے۔ اس کے بعد دوسرا حکم اسی سے ملتی یہ ہے:

«وَاتَّقُوهُ وَأَقِيمُوا الصَّلَاةَ وَلَا تُكُونُوا مِنَ الْمُشْرِكِينَ» (الروم: ۳۱)

”اور نماز کو کھڑا رکھو اور مشرکوں میں سے نہ ہو جاؤ۔“

اس آیت پاک سے ایک تو توحید و ایمان کے بعد سب سے اہم چیز نماز ثابت ہوتی ہے اور دوسرا بات اس سے یہ معلوم ہوتی ہے کہ ترک نماز سے کفر و شرک میں گرفتار ہو جانے کا اندر یہ ہے، کیونکہ جب تک دل کی کیفیت کو ہم بیرونی اعمال کے ذریعے سے بڑھاتے نہ ہیں، خود اس کیفیت کے زائل ہو جانے کا خوف لگا رہتا ہے۔ یہی سبب ہے کہ آنحضرت ﷺ نماز کی اہمیت پر ہمیشہ خاص طور سے زور دیتے اور اس کے تارک کے متعلق شرک اور کفر کا ذرطا ہر فرماتے رہے۔ چنانچہ آپ ﷺ نے فرمایا کہ ”نمازوں کا ستون ہے۔“ جس طرح ستون گر جانے سے عمارت گر جاتی ہے، اسی طرح نماز کے ترک کرنے سے دل کی دینداری بھی رخصت ہو جاتی ہے۔ طائف کے وفد نے جب مدینہ منورہ آ کر صلح کی بات چیت شروع کی تو نماز، جہاد اور صدقات سے مستثنی ہونا چاہا آپ نے وہ بھیل باتوں سے مستثنی کر دیا۔ لیکن نماز کے متعلق فرمایا: ”جس دین میں خدا کے سامنے جھکنا نہ ہو اس میں کوئی بھلانی نہیں۔“ آپ ﷺ نے یہ بھی فرمایا ہے کہ ”نمازوں کی روشنی ہے۔“ اپنی نسبت فرمایا ہے: ”نماز میری آنکھ کی خندک ہے۔“ ایک تمثیل میں آپ ﷺ نے فرمایا کہ ”انسان آگ میں جلتا رہتا ہے اور نماز سے وہ آگ بجھ جاتی ہے، یہ محظوظ ازل کے بھروسہ فراق کی آگ ہے اور نماز آب زلال ہے جو اس آگ کو سرد کر دیتا ہے، آپ ﷺ نے فرمایا کہ ”کفر اور ایمان کے درمیان امتیاز نماز ہی سے ہے۔“ کیونکہ ایمان اور کفر دونوں انسان کی اندر ہونی حالت سے تعلق رکھتے ہیں، جس کا اظہار اس کے اعمال ہی سے ہو سکتا ہے۔ مسلمان کا وہ عمل جس کے دیکھنے کا دن میں متعدد دفعہ لوگوں کو موقع ملے نماز ہی ہے میں اس وقت جب جناب رسالت پناہ کی زندگی کے اخیر لمحے تھے اور فرض نبوت کے آخری حروف زبان مبارک سے ادا ہو رہے تھے، آپ ﷺ فرمائے ہے تھے: ”نماز اور غلام۔“

نماز کی حقیقت

نماز کے لیے اصل عربی لفظ صلوٰۃ ہے۔ صلوٰۃ کے معنی عربی اور عربانی زبانوں میں دعا کے ہیں، اس لیے نماز کی لفظی حقیقت خدا سے درخواست اور التجھیہ ہے اور اس کی معنوی حقیقت بھی یہی ہے۔ آنحضرت ﷺ نے

* یقانتام حدیثیں کنز العمال، (کتاب الصلوٰۃ، ج: ۴) میں مختلف کتب حدیث کے حوالوں سے درج ہیں۔

بھی نماز کی یہی تشریع فرمائی ہے۔ معاویہ بن حکم سلمی ایک نو مسلم صحابی تھے، ان کو اسلام کے جو آداب بتائے گئے ان میں ایک چیز یہ ہی تھی کہ ”جب کسی کسی مسلمان کو چھینک آئے اور وہ الحمد للہ کہے تو اس کے جواب میں تم یہ حکم اللہ کہو۔“ اتفاق سے ایک دفعہ نماز باجماعت ہو رہی تھی۔ معاویہ یعنی عاذہ بھی اس میں شریک تھے، ان کے پاس کسی مسلمان کو چھینک آئی، انہوں نے نماز کی حالت میں یہ حکم اللہ کہہ دیا۔ صحابہ یعنی عاذہ نے ان کو گھورنا شروع کیا۔ معاویہ نے نماز ہی میں کہا تم سب مجھے کیوں گھور رہے ہو؟ صحابہ یعنی عاذہ نے زانوپر ہاتھ مارے اور سجان اللہ کہا، اب وہ سمجھے کہ بولنے سے منع کیا جا رہا ہے۔ نماز ہو چکی تو آنحضرت ﷺ نے پوچھا کہ ”نماز میں کون باتیں کرتا تھا۔“ لوگوں نے معاویہ یعنی عاذہ کی طرف اشارہ کیا۔ آپ نے ان کو پاس بلاؤ کرنہ بایت زمی سے سمجھایا کہ ”نماز قرآن پڑھنے اور اللہ کو یاد کرنے اور اس کی پاکی اور برائی بیان کرنے کا نام ہے، اس میں انسان کو باتیں کرنا مناسب نہیں۔“ **●** حضرت انس یعنی عاذہ کہتے ہیں کہ آپ ﷺ نے ایک دفعہ فرمایا: ((الدُّعَاءُ مُنْهُ الْعِبَادَةِ)) ”دعاء عبادت کامغز ہے۔“ اور حضرت نعمان بن بشیر انصاری یعنی عاذہ روایت کرتے ہیں کہ آپ ﷺ نے فرمایا: ((الدُّعَاءُ هُوَ الْعِبَادَةُ)) ”دعا ہی عبادت ہے۔“ اس کے بعد آپ نے یہ کہہ کر کہ تمہارا پروار دگا رفرماتا ہے اس تفسیر کی تائید میں یہ آیت پڑھی۔ **●**

جس میں دعا ہی کا نام عبادت بتایا گیا ہے:

﴿إِذْ عُوْنَىٰ أَسْتَهْبَ لَكُمْ إِنَّ الَّذِينَ يَسْتَهِبُونَ عَنْ عِبَادَتِنَ سَيَّدُ الْخُلُونَ جَهَنَّمَ ذَخْرِينَ ۚ﴾

(٤٠/المؤمن: ٦٠)

”مجھ سے دعا مانگو میں قبول کروں گا، جو لوگ میری عبادت سے سرکشی کرتے ہیں، وہ عنقریب جہنم میں جائیں گے۔“

مدرسہ حاکم (کتاب الدعاء) میں ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا: ”بہترین عبادت دعا ہے۔“ اس کے بعد آیت مذکور تلاوت فرمائی۔ قرآن پاک میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کے قصہ کے ضمن میں نماز کی حقیقت صرف ایک لفظ میں ظاہر کی گئی ہے۔ یعنی خدا کی یاد فرمایا:

﴿وَأَقِمِ الصَّلَاةَ لِذِكْرِيٍّ ۝﴾ (١٤: طہ: ٢٠)

”اوہ میری یاد کے لیے نماز کھڑی کر۔“

کامیابی اسی کے لیے ہے جو خدا کو یاد کر کے نماز ادا کرتا ہے:

▪ سنن ابن داود، کتاب الصلوة، باب تشتمیت العاطس فی الصلوة: ٩٣٠، ٩٣١، ٩٣٢، ٣٣٧١، ٣٣٧٢ دلوں کو تجھ کر لیا ہے۔ ▪ یہ دلوں حدیثیں جامع ترمذی، کتاب الدعوات، باب الدعاء مخ العبادة: ٤١٧٩؛ مدرسہ حاکم، کتاب الدعاء، ج ١، ص: ٤٩١۔

﴿قَدْ أَفْلَحَهُ مَنْ تَزَّمَّلَ وَذَكَرَ اسْمَ رَبِّهِ فَصَلَّى ط﴾ (۸۷/الاعلان: ۱۴-۱۵)

”کامیاب وہ ہوا جس نے پا کی حاصل کی اور خدا کا نام یاد کیا پس نماز پڑھی۔“

انسان کو اپنی روحانی تربیت، دلی بے چین، قلبی اضطراب اور ہنی شورش کے عالم میں جب دنیا اور دنیا کی ہر چیز فانی، عقل کی ہر تدبیر دامانہ، جسم کی ہر قوت عاجز اور سلامتی کا ہر راستہ بند نظر آتا ہے تو سکون واطمینان کی راحت اس کو صرف اسی ایک قادر مطلق کی پکار، دعا اور التجاہی ملتی ہے۔ وحی الہی نے اس نکتہ کو ان الفاظ میں ادا کیا:

﴿أَكَلِذْ كُرَّلُهُ تَطْمِئِنُ الْقُلُوبُ ط﴾ (۱۲/ الرعد: ۲۸)

”ہاں! خدا ہی کی یاد سے دل تکسین پاتے ہیں۔“

ہبھی وجہ ہے کہ مصیبتوں کے بھوم اور تکلیفوں کی شدت کے وقت ثبات قدم اور دعا ہی چارہ کا رہنے ہے اسی

﴿وَاسْتَعِينُوا بِالصَّبْرِ وَالصَّلَاةِ ط﴾ (۴۵/ البقرة: ۲)

”ثابت قدی اور نماز (یادعا) کے ذریعے سے اپنی مصیبتوں میں مدد چاہو۔“

زمین سے لے کر آسمان تک کائنات کا ذرہ ذرہ خداۓ قادر و توانا کے سامنے سرگوں ہے، آسمان، زمین، چاند، ستارے، دریا، پہاڑ، جنگل، جھاڑ، چرند، پرند سب اس کے آگے سر بخود ہیں اور اس کے مقرر کردہ احکام و قوانین کی بے چون و چرا اطاعت کر رہے ہیں، یہیں ان کی تسبیح و نماز ہے:

﴿وَكُلْنَ مِنْ شَيْءٍ إِلَّا يُسْتَهْمِمُ بِهِمْ وَلَكُنْ لَا تَفْقَهُونَ شَيْءًا دُسُودُ ط﴾

(۴۴/ بنی اسراء بیل: ۱۷)

”اور (دنیا میں) کوئی چیز نہیں مگر یہ کہ وہ اس (خدا) کی حمد کی تسبیح پڑھتی ہے، البتہ تم ان کی تسبیح سمجھتے نہیں ہو۔“

﴿الْحَمْدُ لِلَّهِ يَسْجُدُ لَهُ مَنْ فِي السَّمَاوَاتِ وَمَنْ فِي الْأَرْضِ وَالثَّمُوسُ وَالْقَمَرُ وَالْجِوَمُ وَالْجِيَالُ وَالشَّجَرُ وَالدَّوَابُ وَغَيْرُ مَنْ فِي النَّاسِ ط وَكَيْرٌ حَقٌ عَلَيْهِ الْعَذَابُ ط﴾

(۱۸/ الحج: ۲۲)

”کیا تو نہیں دیکھتا کہ جو آسمانوں میں ہے اور جوز میں میں ہے اور سورج چاند تارے پہاڑ درخت جانور اور بہت سے آدمی اس کو سجدہ کرتے ہیں اور بہت سے آدمیوں پر اس کا اعذاب ثابت ہو چکا (یوں کہ وہ اس کو سجدہ نہیں کرتے تھے)۔“

غور کرو! کائنات کا ذرہ ذرہ بلا استثناء خدا کے سامنے سرگوں ہے۔ لیکن استثناء ہے تو صرف انسان میں کہ بہترے اس کو سجدہ کرتے ہیں اور بہترے اس سے روگروں ہیں، اسی لیے وہ عذاب کے مستحق ہو چکے۔ انسان کے علاوہ تمام مخلوقات بلا استثناء طاعت گزار ہے، کیونکہ وہ ذاتی ارادہ اور اختیار سے سرفراز نہیں، خدا کے حکم

کے مطابق وہ ازل سے اپنے کام میں مصروف ہے اور قیامت تک مصروف رہے گی، لیکن انسان ذاتی ارادہ و اختیار کا ایک ذرہ پا کر سرکشی اور بغاوت پر آمادہ ہے، اسلام کی نماز انہیں سرکش اور باغی انسانوں کو دوسرا میطع و فرمانبردار مخلوقات کی طرح اطاعت و انتیاد اور بندگی و سرافندگی کی دعوت دیتی ہے۔ جب دنیا کی تمام مخلوقات اپنی اپنی طرز اور اپنی اپنی بولیوں میں خدا کی حمد و شا اور تسبیح و تہلیل میں مصروف ہے تو انسان کیوں نہ اپنے خدا کی تقدیس کا ترانہ کراپنی اطاعت کا شہوت پیش کرے اور یہی نماز ہے۔

نماز کی روحاںی غرض و غایت

نماز کی روحاںی غرض و غایت یہ ہے کہ اس خاتم کل، رازقی عالم، مالک الملک، منعم عظیم کی بے غایت بخششوں اور بے پایاں احسانوں کا شکر ہم اپنے دل اور زبان سے ادا کریں تاکہ نفس و روح اور دل و دماغ پر اس کی عظمت و کبریائی اور اپنی عاجزی و بے چارگی کا نقش بیٹھ جائے۔ اس کی محبت کا نشہ رگ رگ میں سراہیت کر جائے، اس کے حاضر و ناظر ہونے کا تصورنا قابل زوال یقین کی صورت میں اس طرح قائم ہو جائے کہ ہم اپنے ہر دلی ارادہ و نیت اور ہر جسمانی فعل و عمل کے وقت اس کی ہوشیار اور بیدار آنکھوں کو اپنی طرف اٹھا ہوا دیکھیں، جس سے اپنے برے ارادوں پر شرما میں اور ناپاک کاموں کو کرتے ہوئے تجھیں اور بالآخر ان سے باکل بازا آئیں۔ صحیحین کی کتاب الایمان میں ہے کہ ایک روز آنحضرت ﷺ صاحبہ خلیلہ کے مجمع میں تشریف فرماتھے، ایک شخص نے سائل کی صورت میں آ کر ایمان اسلام کی حقیقت دریافت کی۔ آپ نے اس کی تشریف فرمائی پھر پوچھا کہ یا رسول اللہ ﷺ احسان کیا ہے؟ فرمایا: ”یہ کہ تم اپنے پروردگار کی عبادات اس طرح کرو گویا تم اس کو دیکھ رہے ہو، کیوں کہ اگر تم اس کو نہیں دیکھ رہے ہو تو تم کو دیکھ رہا ہے۔“ اسی طرح ایک اور شخص کو نماز کے آداب کی تعلیم دیتے ہوئے فرمایا کہ ”نماز کی حالت میں کوئی شخص سامنے نہ تھوکے کیوں کہ اس وقت وہ اپنے رب کے ساتھ راز و نیاز کی باتوں میں مصروف ہوتا ہے۔“ ❶ حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ نے کہ اس وقت وہ اپنے رب کے ساتھ راز و نیاز کی باتوں میں مصروف ہوتا ہے۔ ❷ حضرت ابی عمار رضی اللہ عنہ نے کہ ایک رات جب آپ اعتکاف میں بیٹھے تھے اور شاید لوگ الگ الگ تراویح کی نماز پڑھ رہے تھے تو آپ ﷺ نے سرمهارک ہاہر کال کفرمایا: ”لوگو! نمازی جب نماز پڑھتا ہے تو اپنے رب سے رُغوثی کرتا ہے، اس کو جانا چاہیے کہ وہ کیا عرض معرض کر رہا ہے، نماز میں ایک دوسرے کی آواز کو مت دباو۔“ ❸ ان تعلیمات سے اندازہ ہو گا کہ نماز کی عادت سے ایک شخص نمازی کے دل و دماغ پر کیسے نفیاتی اثرات طاری ہو سکتے ہیں اور اس کے اخلاق و عادات پر کتنا گہرا اثر پڑ سکتا ہے۔ اسی لیے قرآن پاک میں اس نکتہ کی شرح اس طرح کی گئی:

- ❶ صحیح بخاری، کتاب الصلوٰۃ، باب حکم البیاق بالید من المسجد: ۴۰۵؛ مسلم، باب المساجد، باب النہی عن البصاق فی المسجد: ۱۲۲۰؛ مسند احمد، ج ۲، ص: ۳۴۔
 ❷ مسند احمد، ج ۲، ص: ۳۶، ۶۷، ۱۲۹۔

﴿وَأَقِمِ الصَّلَاةَ إِنَّ الصَّلَاةَ تَهْذِي عَنِ الْفَحْشَاءِ وَالْمُنْكَرِ وَلَذِكْرُ اللَّهِ أَكْبَرُ﴾

(٤٥) / العنكبوت: ٢٩

”اور نماز کھڑی کیا کر کے نماز بے حیائی اور برائی کی باقتوں سے روکتی ہے اور البتہ خدا کی یاد سب سے بڑی چیز ہے۔“

اس آیت میں نماز کی دو حکمتیں بیان کی گئی ہیں ایک تو یہ کہ نماز برا یوں اور بے ہی یوں سے روکتی ہے اور دوسری اس سے بڑھ کر یہ کہ نماز خدا کی یاد ہے اور خدا کی یاد سے بڑھ کر کوئی بات نہیں، بے ہی اور برائی کی باقتوں سے نچھے کا نام ہر تر کیہ اور صفائی ہے یعنی اس سلبی حالت کی یہ ایجادی صورت ہے جس کا حصول انسان کی منزل مقصود اور حقیقی کامیابی ہے، چنانچہ فرمایا:

﴿قَدْ أَفْلَمَهُمْ مَنْ تَرَكُوا وَذَرَّ كَرَاسِمَ رَبِّهِ فَصَلَّى﴾ (١٤-١٥) / الاعلیٰ: ٨٧

”کامیاب ہوا وہ جس نے صفائی حاصل کی اور اپنے پروردگار کا نام لیا پس نماز پڑھی۔“

اس آیت سے معلوم ہوا کہ انسان کی فلاج اور پاکیزگی کے حصول کی تدبیر یہ ہے کہ وہ اپنے پروردگار کا نام لے یعنی نماز پڑھے اس سے زیادہ واضح یہ آیت پاک ہے:

﴿إِنَّمَا تُنْذَرُ الَّذِينَ يَعْمَلُونَ رَبِّهِمْ بِالْغَيْبِ وَأَقَامُوا الصَّلَاةَ وَمَنْ يَرْكِنْ فَإِنَّمَا يَرْتَكِنْ لِنَفْسِهِ وَإِلَى اللَّهِ الْمَصِيرُ﴾ (٣٥) / فاطر: ١٨

”تو انہیں کو تو ہشیار کر سکتا ہے جو بن دیکھے اپنے پروردگار سے ڈرتے ہیں اور نماز کھڑی کیا کرتے ہیں اور جو تر کیہ اور دل کی صفائی حاصل کرتا ہے وہ اپنے ہی لیے حاصل کرتا ہے اور (آخر) خدا ہی کے پاس لوٹ کر جانا ہے۔“

اس سے ظاہر ہوا کہ نماز انسان کو اس کی اخلاقی کمزوریوں سے بچاتی، نفسانی برا یوں سے ہٹاتی اور اس کی روحانی ترقیوں کے درجہ کو بلند کرتی ہے۔ فرمایا:

﴿إِنَّ الْأَنْسَانَ حُلْقَ هَلْعَاقٌ إِذَا مَسَّهُ الشَّرُّ جَزَعَّاً وَإِذَا مَسَّهُ الْخَيْرُ مَسْعَاعًا إِلَّا

الْمُصَلِّيُّنَ الَّذِينَ هُمْ عَلَى صَلَاتِهِمْ دَآبِعُونَ﴾ (٢٠-٢٣) / المعارج: ٧٠

”بے شک انسان بے صبر ابنا ہے جب اس پر مصیبت آئے تو گھبرا یا اور جب کوئی دولت ملے تو بخیل لیکن وہ نمازی (ان باقتوں سے پاک ہیں) جو اپنی نماز ہمیشہ ادا کرتے ہیں۔“

آپ نے دیکھا کہ پابندی سے نماز ادا کرنے والے کے لیے قرآن نے کن اخلاقی برکتوں کی بشارت سنائی ہے۔

نماز کے انہیں ثرات اور برکات کی بنا پر ایک دفعہ آنحضرت ﷺ نے ایک تمثیل میں صحابہ رضی اللہ عنہم سے

فرمایا کہ ”اگر کسی شخص کے گھر کے سامنے ایک صاف و شفاف نہر ہتی ہو جس میں وہ دن میں پانچ دفعہ نہاتا ہو تو کیا اس پر میل رہ سکتا ہے؟“ صحابہ رضی اللہ عنہم نے عرض کی! نہیں یا رسول اللہ ﷺ ارشاد ہوا کہ ”نماز بھی اسی طرح گناہوں کو دھو دیتی ہے جس طرح پانی میل کو۔“ * ایک دفعہ ایک بدوسی مسلمان نے آ کر اپنے ایک گناہ کی معافی کی تدبیر پوچھی اس پر یہ آیت نازل ہوئی : *

﴿وَأَقِمِ الصَّلَاةَ طَرَقَى اللَّهَارِ وَزَلَقاً قِنَ الْيَلِ طَ إِنَّ الْحَسَنَتِ يُذْهِبُونَ السَّيِّئَاتِ طَ ذَلِكَ ذَكْرُى لِلَّذِكْرِيْنَ طَ﴾ (۱۱: هود: ۱۱۴)

”اور دن کے دونوں کناروں پر اور رات کے کچھ گلزاروں میں نماز کھڑی کیا کرو،“ بے شک نیکیاں برائیوں کو دور کر دیتی ہیں، یہ صحیح ہے یا درکھنے والوں کے لیے۔“

اس تفصیل سے ظاہر ہو گا کہ مذہب اپنے پیروؤں میں جس قسم کے جذبات اور حرکات پیدا کرنا چاہتا ہے ان کا اصلی سرچشمہ یہی نماز ہے جو اپنے صحیح آداب و شرائط کے ساتھ بجالائی گئی ہو یہی وجہ ہے کہ آنحضرت ﷺ نے نماز کو دین کی عمارت کا اصلی ستون قرار دیا ہے جس کے گردانے سے پوری عمارت کا گرجانا یقینی ہے۔

نماز کے لیے کچھ آداب و شرائط کی ضرورت

جس طرح مادی عالم کے کچھ قانون ہیں جن کی پابندی اور رعایت سے ہمارے اعمال کے صحیح نتائج پیدا ہوتے ہیں اسی طرح انسان کی اندر ورنی دنیا جس کو مذہب ”قب کا عالم“ اور فلسفہ نفیات یا ”دماغی یقینیات“ کہتا ہے اس کے لیے بھی کچھ قانون اور اسباب ہیں جن کی پابندی اور رعایت سے قلب و دماغ اور نفس و روح کے مطلوبہ اعمال و افعال سامنے آتے اور ان کے صحیح نتیجہ مرتب ہوتے ہیں۔ سایکالوچی (علم نفیات) کے انکشاف اور ترقی نے اب اس گروہ کو بالکل کھول دیا ہے اس نے بتایا ہے کہ ہم اپنے یادوؤؤں کے اندر جس قسم کے جذبات اور لوگوں پیدا کرنا چاہیں اور ان کے مناسب شکل و صورت اور ماحول (گروپیٹ) نہ اختیار کریں تو ہم کو ان کے پیدا کرنے میں کامیابی نہیں ہو سکتی۔ ہمارے تمام تمدنی اجتماعی اور معاشرتی قوانین اسی اصول کے تحت میں وضع ہوئے ہیں اور اسی اصول کی بنابرہ قسم کے مذہبی، سیاسی اور اجتماعی مقاصد کے حصول کے لیے رواجی رسوم و آداب اور قواعد و ضوابط مقرر ہیں۔ معبدوؤں، ہیلکوؤں اور گرجوؤں میں جہاں مذہبی عظمت و تقدس پیدا کرنا مقصود ہوتا ہے، پیغمباریوؤں اور کاہنوؤں کے خاص لباس، خاص رسوم و آداب، سکون و خاموشی، آداب و لحاظ، گھنٹوؤں کی پر شکوہ آواز اور نشست و برخاست کے خاص طریقے ضروری سمجھے گئے ہیں شاہزاد رعب

* یہ حدیث مختلف کتابوؤں میں مختلف روایتوؤں کے ساتھ آتی ہے کنز العمال، (ج ۴، ص: ۶۷ و ۶۸) میں حاکم، ۱/۲۰۰؛ ۱/۱۷۷؛ ابن خزیمہ ۵۲۸ و طبرانی کیبر: ۷۵۸۴ اور بیہقی کے حوالوؤں سے یقانت روایتیں کیجاں گے کوئی ہیں۔
** صحیح بخاری، کتاب موافقۃ الصلوۃ، باب الصلوۃ کفارۃ: ۵۲۶ و کتاب التفسیر: ۴۶۸۷۔

و داب کے اثرات پیدا کرنے کے لیے شاہی جلوسوں اور سلطانی درباروں میں فوجوں کے پرے توی ہیکل چوہدار عصا بردار ترقیب و چاؤش خدام کی زرق برق پوشائیں، ٹنگی تلواریں، بلند نیزے، تخت و تاج، علم و پرچم، ماہی مراتب، نوبت و نقارہ اور دمبدم دور باش اور زنگاہ رو برو کی پر رعب صدائیں ضروری ہیں، کسی تعلیمی یا علمی میلان پیدا کرنے کے لیے فضا کا سکون و خاموشی، مقام کی سادگی و صفائی، شور و غونا اور شہر و بازار سے دوری، ضروری چیزیں ہیں، بزمِ عروی کے لیے رنگ و بو، نور و سور، گانا، بجانا اور عیش و نشاط کا اظہار طبعی ہے۔ انہی طبعی و نفسی اصول کی بنابر نہیں اعمال میں بھی ان حرکات و آداب و قوانین کی رعایت رکھی گئی ہے۔ نماز مقصود دل کے خضوع و خشوع، توبہ و انبات، پشمیانی و شرمندگی، اطاعت و بندگی اور خدا کی عظمت و کبریائی اور اپنی عاجزی و درماندگی کا اظہار نیز دل و ماغ اور نفس و روح میں پا کی صفائی اور طہارت پیدا کرنا ہے اس بنابر نماز کے لیے بھی ایسے آداب و شرائط اور ارکان مقرر کیے گئے جن سے انسان کے اندر اس قسم کے جذبات کو تحریک اور نشوونما ہو۔ مثلاً: نماز پڑھنے والا یہ سمجھ کر کہ وہ اب شہنشاہ عالم کے دربار میں کھڑا ہے، ہاتھ باندھ رہے، نظر نیچے کی رہے، طور و طریق اور حرکات و سکنات میں ادب و احترام کا لحاظ رکھئے، نماز کی جگہ پاک ہو، بدن پاک ہو، کپڑے پاک ہوں، ادب سے اس کی بارگاہ میں اپنی دعاوں اور التجاویں کو پیش کرے، اس ظاہری مجموعی ہیئت کا اثر انسان کی باطنی کیفیت پر پڑتا ہے اور اس میں روحانی فیوض و برکات کی استعداد و صلاحیت پیدا ہوتی ہے۔ فرض کیجئے کہ ظاہری صفائی و پاکیزگی کا لحاظ نہ رکھا جائے تو دل کی صفائی و پاکیزگی کا تصور اس کے اندر موثر انداز میں کیوں کر پیدا ہوگا، یہی نفسی اصول ہے جو انسان کے ہر نظام اور ارادہ میں چاری و ساری ہے۔ اندر بنانے کے لیے باہر کا بنانا بھی ایک حد تک ضروری ہے۔

اسی اصول کی بنابر تہائی کی فرض نمازوں سے جماعت کی نماز اور گھر کی نمازوں سے مسجد کی نماز، بہتر ہے کہ جماعت کا ماحول اور مسجد کا منظر دلوں کی کیفیت کو دو بالا کر دے گا۔ اسی بنابر تمام ہرے ہرے کاموں میں اجتماعیت اور نظام کی وحدت کا خیال رکھا جاتا ہے۔ اسی اصول کے ماتحت اسکو لوں کی تنظیم اور ان کی درجہ بندی، کھیل میں فریقین کی ہم رکنی و ہم لبائی، فوجوں میں وردی اور حرکت و عمل کی یکسانی کی ضرورت سمجھی گئی ہے اور یہ کام اسلوچ اور تھیار اور ہمقدم سکون و رفتار کی بھی ضرورت ہے کہ ان ظاہری حرکات کا اثر پوری جماعت کے اندر وہی تخلیل پر پڑتا ہے اور یہ بھی ممکن ہے کہ جماعت میں چند اشخاص ایسے ہوں جو اصلی کیفیت سے مبتکف ہوں ان کی یہ حقیقی کیفیت اپنے اثر سے دوسروں کو بھی پر کیف بناتی ہے اور ان سے دوسرا اور دوسرا سے تیسرا متاثر ہو کر کم و بیش پوری جماعت متاثر ہو جاتی ہے، اسی لیے جلوسوں میں ایک کی ہمی سے سب کو ہمی اور ایک کے رونے سے بہتوں کو رونا آ جاتا ہے۔ نفیات اجتماع میں یہ مسئلہ پوری طرح واضح ہے، غرض اسی سے اسلام نے اپنی عبادات کے لیے ان طبعی و نفسی اصول کا بڑا لحاظ رکھا ہے نماز کے

آداب شرائط اور اركان انہی کا نام ہے۔
ذکر و دعا و تسبیح کے دو طریقے

یہ بار بار دہرا لیا جا چکا ہے کہ نماز مقصود خضوع و خشوع، ذکر الہی، حمد و شنا، اپنے گناہوں پر ندامت و استغفار اور اسی قسم کے دوسرے پاک جذبات کی تحریک ہے۔ یہ تمام باتیں درحقیقت انسان کے دل سے تعلق رکھتی ہیں جن کے لیے ظاہری ارکان کی حاجت نہیں ہے۔ اسی لیے اسلام نے اپنی عبادتوں کی دو قسمیں کی ہیں ایک تزوہ، جن کو انسان ہر حال اور ہر صورت میں کسی قید و شرط کے بغیر ادا کر سکے اس کا نام عام تسبیح و تبلیل اور ذکر الہی ہے جس کے لیے نہ زمانہ کی قید ہے نہ مکان کی شرط ہے، نہ اٹھنے بیٹھنے کی پابندی ہے، یہ عبادت ہر لمحہ اور ہر صورت میں انجام پاسکتی ہے۔ چنانچہ خدا نے فرمایا:

﴿فَإِذْكُرُوا اللّٰهَ قِيمًا وَقُعُودًا وَعَلَى جُنُوبِكُمْ﴾ (النساء: ۱۰۳)

”پس تم اللہ کو کھڑے بیٹھے اور لیٹھے یاد کرو۔“

اور محمد رسول اللہ ﷺ کے فیض صحبت سے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی یہی حالت تھی، خدا نے ان کی مدح فرمائی:

﴿الَّذِينَ يَذْكُرُونَ اللّٰهَ قِيمًا وَقُعُودًا وَعَلَى جُنُوبِهِمْ﴾ (آل عمران: ۱۹۱)

”جو کھڑے بیٹھے لیٹھے یاد کرو یاد کرتے ہیں۔“

دنیاوی مشاغل اور ظاہری کاروبار بھی ان کو اس فرض سے غافل نہیں کرتے۔ فرمایا:

﴿رِجَالٌ لَا تُنْهِيْهُمْ تجَارَةً وَلَا يَنْهِيْهُمْ عَنْ ذِكْرِ اللّٰهِ﴾ (النور: ۲۴)

”ایسے لوگ ہیں جن کو تجارتی کاروبار اور خرید و فروخت کے مشاغل خدا کی یاد سے غافل نہیں کرتے۔“

نماز تحدہ طریقہ عبادت کا نام ہے

دوسری عبادت وہ ہے جو خاص شکل و صورت کے ساتھ خاص اوقات میں اور خاص دعاوں کے ذریعہ ادا کی جائے اس کا نام نماز ہے۔ پہلا طرز عبادت انفرادی چیز ہے اور وہ ہر فرد کے جدا گانہ انتخاب پر منحصر ہے۔ اس کو جماعتی حیثیت حاصل نہیں ہے اور نہ اسلام میں اس کو جماعت کے ساتھ ادا کرنا مسنون بتایا گیا ہے وہ تنہائی کاراز ہے جس کو اس طرح خاموشی سے ادا کرنا چاہیے کہ ریا اور نمائش کا شائیب بھی پیدا نہ ہو سکے لیکن دوسری قسم کی عبادت درحقیقت جماعتی صورت رکھتی ہے اور اسی لیے اس کو جماعت کے ساتھ ادا کرنا واجب قرار دیا گیا ہے اور اس کے انکار پر قتل تک جائز ہو سکتا ہے۔ اگر اس کو جماعت کے ساتھ کوئی شخص ادا نہ کرے تو اگرچہ وہ ادا ہو جائے گی لیکن جماعت کے ثواب اور برکات سے اس شخص کو محرومی رہے گی۔ دوسرے لفظوں میں ہم اس کو یوں تعبیر کر سکتے ہیں کہ عام ذکر و فکر اور تسبیح و تبلیل انفرادی طریقہ عبادت ہے اور نماز ایک جماعتی

شعار ہے جو خاص ارکان اور شرائط کے ساتھ اوقات مقررہ پر ادا ہوتی ہے اور جس کے ادا کرنے کا جماعت کے ہر فرد کو ہر حالت میں حکم ہے البتہ اگر کسی عذر کی بنا پر جماعت کے ساتھ ادا نہ ہو سکے تو تہا بھی اس کو ادا کرنا ضروری ہے۔ اس کی مثال اس سپاہی کی سی ہے جو کسی منزل میں اپنی فوج سے جس کے ساتھ اس کو چلانا تھا کسی وجہ سے یتھے رہ گیا اب تہارہ کربھی اس کو وہی فرض ادا کرنا ہے جو پوری فوج کے ساتھ اس کو ادا کرنا پڑتا۔ نماز میں نظام وحدت کا اصول

اسلام کے عام فرائض و احکام اور خصوصی نماز اور اس کے متعلقات کی نسبت غور کرتے وقت ایک خاص اصول کو ہمیشہ پیش نظر رکھنا چاہیے۔ وہی اصول درحقیقت اسلام کا اصلی راز بلکہ سرالسرار ہے۔ اسلام کی اصل حقیقت صرف ایک ہے اور وہ توحید ہے یہ توحید نہ صرف ایک فلسفیانہ موشگانی اور صوفیانہ نکتہ پر وری ہے بلکہ وہ عملی کیفیت ہے جس کو اسلام کے ایک ایک حکم سے آشکارا ہونا چاہیے۔ اسلام کے دوسرے احکام کی طرح نماز بھی اس حقیقت اور کیفیت کا مظہر ہے نماز کی ایک ایک حرکت، ایک ایک جنبش، ایک ایک لفظ، ایک ایک اشارہ اور ایک ایک طرز سے اس حقیقت و کیفیت کو تزادش کرنا چاہیے اور یہ ظاہر ہے کہ جب تک نماز کی کوئی خاص شکل و صورت آئین و طریق اور سمت و وقت مقرر نہ کیا جاتا جماعتیں اس کو ایک متحدة نظام میں ادا نہیں کر سکتی تھیں، نماز لاکھوں کروڑوں مسلمانوں پر جنہوں نے دعوت محمدی ﷺ کو قبول کیا فرض تھی اب اگر ان میں سے ہر ایک کو یہ اجازت ہوتی کہ جیسے چاہے جب چاہے جدھر منہ کر کے چاہے ادا کر لے تو اسلام کی وحدت کا نظام قائم نہ رہتا اور نہ اس کے دل کی طرح اس کی جسمانی ادائیں سے بھی توحید کا راز آشکار ہوتا اور نہ کل روئے زمین کے لاکھوں کروڑوں مسلمان واحد جماعت کی بھرم صورت بن سکتے۔ غرض اس نظام وحدت کا آشکارا ہو یہدا کرنا توحید کا سب سے بڑا مرزا اور شعار ہے اور کروڑوں دلوں کو جو کروڑوں اشباح و جسمان میں ہیں ایک متحد جسم اور واحد قالب ظاہر کرنا صرف اسی طرح ممکن ہے کہ ان سے واحد نظام کے ماتحت واحد صورت و شکل میں واحد اعمال و افعال کا صدور کرایا جائے چنانچہ انسان کے تمام جماعتی نظام کی وحدت اسی اصول پر مبنی ہے قوم کی وحدت، فوج کی وحدت، کسی بزم و اجمن کی وحدت، کسی مملکت و سلطنت کی وحدت، غرض ہر ایک نظام وحدت اسی اصول پر قائم ہے اور اسی طرح قائم ہو سکتا ہے۔
نماز میں جسمانی حرکات

یہ بھی ظاہر ہے کہ نماز کی اصل غرض و غایت چند پاکیزہ جذبات کا اظہار ہے۔ یہ انسانی فطرت ہے کہ جب انسان کے اندر کوئی خاص جذبہ پیدا ہوتا ہے تو اس کے حسب حال اس سے کوئی فعل یا حرکت بھی صادر ہوتی ہے غصہ کی حالت میں چہرہ سرخ ہو جاتا ہے، خوف میں زرد پڑ جاتا ہے، خوشی میں کھل اٹھتا ہے، غم میں سکر جاتا ہے، جب وہ کسی سے سوال کرتا ہے تو اس کے سامنے اپنے دونوں ہاتھ پھیلادیتا ہے، کسی کی تعظیم کرتا ہے تو

اس کو دیکھ کر کھڑا ہو جاتا ہے، کسی سے عاجزی کا اظہار کرتا ہے تو اس کے آگے جھک جاتا ہے، اس سے بھی زیادہ اپنا تذلل، فروقی اور خوشامد مقصود ہوتا منہ کے بل گرتا ہے اور پاؤں پر سر رکھ دیتا ہے۔ یہ جذبات کے اظہار کے فطری طریقے ہیں جو ہر قوم میں تقریباً یکساں رائج ہیں۔ اس تصریح کے بعد اب یہ سمجھنا چاہیے کہ جس طرح نماز کی دعائیں انسانی طرز یا ان میں ادا کی گئی ہیں اس کے ارکان بھی انسان کے فطری افعال و حرکات کی صورت میں رکھے گئے ہیں۔ انسان کے قلبی افعال و اعمال کے مظاہر اس کے جسمانی اعضاء ہیں کوئی شخص کسی دوسرے شخص کے ارادہ و نیت اور اس کے دلی جذبات و احساسات کے متعلق اس وقت تک کچھ نہیں کہہ سکتا جب تک اس کے ہاتھ پاؤں اور زبان سے ان کے مطابق کوئی عمل یا حرکت ظاہر نہ ہو اگر ایسا نہ ہو تو ہر انسان اپنی نسبت ولایت اور خیر کل ہونے کا دعویٰ کر سکتا ہے اور سوسائٹی کا کوئی مجرم اس کی تکذیب نہیں کر سکتا لیکن ظاہر ہے کہ اس طرح سوسائٹی کی بنیاد ہی سرے سے تباہ و بر باد ہو جاتی ہے اگرچہ انسان کے اندر کی ہر چیز اس طرح خدا کے سامنے ہے جس طرح باہر کی اور اس لیے خدا کو ظاہری اعمال کی ضرورت نہیں مگر خود بندوں کو ان کی ضرورت ہے کہ وہ اپنی ظاہری اور باطنی دونوں حیثیتوں سے عرض و انتباہ اور تذلل و عاجزی کی تصویر بن جائیں۔ انسان اپنے جسم اور روح و دونوں کے لحاظ سے خدا کا مخلوق ہے اس کی زندگی کے دونوں جزو خدا کے احسانات و انعامات سے یکساں گراں بار ہیں اس لیے ضرورت ہے کہ اس خالق و رازق اور اس ارحم الراحمین کے سامنے روح اور جسم دونوں جھک کر سجدہ نیاز ادا کریں۔ غرض یہ وجہ ہیں جن کی بنا پر شریعت نے جسم و جان دونوں کی رعایت کرتے ہوئے نماز کے ارکان مقرر کیے۔

اوپر گزر چکا ہے کہ انسان کے فطری اعمال و حرکات کے قالب میں نماز کا پیکر تیار کیا گیا ہے۔ جسمانی طریقے سے ہم کسی بڑے محس کی تعظیم اور اس کے سامنے اپنی عاجزی کا اظہار تین طریقوں سے کرتے ہیں، کھڑے ہو جاتے ہیں، جھک جاتے ہیں، زین پر سر رکھ دیتے ہیں۔ نماز کے بھی یہ تین رکن ہیں چنانچہ آغاز عالم سے انبیائے کرام ﷺ نے جس نماز کی تعلیم انسانوں کو دی وہ انہیں تین اجزاء سے مرکب تھی کھڑے ہو جانا (قیام) جھک جانا (رکوع) اور زین پر سر رکھ دینا (سجدہ)

ارکان نماز

معلوم ہو چکا ہے کہ نماز ملت ابراہیم کی سب سے بڑی خصوصیت تھی۔ حضرت ابراہیم ﷺ کو جب خدا کے گھر کی تعمیر و تطہیر کا حکم ہوا تو ساتھ ہی اس کی غرض بھی بتائی گئی:

﴿وَطَهَرَ بَيْتَهُ لِطَّاهِيْنَ وَالْقَابِيْنَ وَالرَّكْعَ الشَّجُوْدُ﴾ (الحج: ۲۶)

”اوہ میرے گھر کو طواف کرنے والوں، کھڑے ہونے والوں، رکوع کرنے والوں اور سجدہ کرنے والوں کے لیے پاک و صاف کر۔“

اس حکم میں نماز کے تینوں اركان قیام، رکوع اور سجدہ کا مفصل اور بہتر ترتیب ذکر ہے۔ حضرت مریم ﷺ

کاظ مانہ سلسلہ اسرائیل کا آخری عہد تھا ان کو خطاب ہوا:

﴿يَعِيزُهُمْ أَنفُقُهُ لِرَبِّكَ وَأَسْجِدُهُ وَإِذْ جَعَ مَعَ الظَّاهِرِينَ﴾ (آل عمران: ۴۳)

”اے مریم! اپنے رب کے حضور میں کھڑے ہو کر بندگی کرو اور سجدہ کرو رکوع کرنے والوں کے ساتھ رکوع کرو۔“

اس نماز میریکی میں بھی نماز کے تینوں اركان موجود ہیں۔

ان اركان کی ترتیب

جب کوئی حقیقت تین مرتب اركان سے مرکب ہو اور اس میں سے ایک کا اول ہونا اور دوسرا کے کاسب سے مؤخر ہونا ثابت ہو جائے تو تیرے کا وسط میں ہوتا خود بخوبی ثابت ہو جائے گا۔ چنانچہ نماز کی ہر رکعت قیام اور رکوع اور سجدہ سے مرکب ہے اور قیام کا اول اور بخوبی آخرون قرآن پاک کی حسب ذیل آیت سے ثابت ہے تو رکوع کا ان دونوں کے بیچ میں ہوتا خود بخوبی ثابت ہو جائے گا:

﴿وَإِذَا أَنْتَ فِيهِمْ فَاقْسِطْ لَهُمُ الْأَصْلُوَةَ فَلَتَقْرُمْ طَائِبَةً مِنْهُمْ مَعَكَ وَلَيَأْخُذُوا أَسْلَحَتَهُمْ وَلَا إِسْجَدُوا فَلَيَكُوْنُوا مِنْ وَرَائِكُمْ﴾ (النساء: ۱۰۲)

”جب تو ان میں ہے تو ان کے لیے نماز کھڑی کرے تو چاہیے کہ ان میں سے ایک گروہ کے لوگ تیرے ساتھ کھڑے ہوں اور اپنے ہتھیار لیے رہیں، پھر جب یہ سجدہ کر لیں تو یہ تمہارے پیچھے چلے جائیں۔“

اس سے معلوم ہوا کہ ایک رکعت میں پہلے کھڑا ہونا ہے اور آخر میں سجدہ پر ایک رکعت تمام ہوئی ہے پس لامحالہ رکوع، قیام و بخوبی کے بیچ میں ہوگا اور ہر رکعت کے اركان سے گانہ کی ترتیب یہ ہوگی کہ اول قیام پھر رکوع، پھر بخوبی۔

صحف سابقہ میں نماز کے اركان

تورات کے حوالوں سے بھی نماز کے مختلف اركان کا پتہ چلتا ہے مگر مشکل یہ ہے کہ متوجوں نے عبرانی اور یونانی لفظ کے ترجمے اپنے خیالات اور سرم و رواج کے مطابق کر دیے ہیں جس سے حقیقت کے چہرہ پر بڑی حد تک پرداہ پڑ جاتا ہے۔ بہر حال عبادت اور تعظیم کے یہ تینوں طریقے حضرت ابراہیم علیہ السلام کی شریعت اور ان کی نسل میں جاری تھے۔ ذیل میں ہم ان میں سے ہر ایک کا حوالہ تورات کے مجموعہ سے نقل کرتے ہیں۔

قیام

”پر ابراہیم (ابراہیم) ہنوز خداوند کے حضور میں کھڑا رہا۔“ (پیدائش ۱۸-۲۲)

رکوع

”اور (ابراہیم) زمین تک ان کے آگے بھکا اور بولا اے خداوند۔“ (پیدائش ۱۸-۲۲)

مسجدہ

”اور یہ سن کے کہ خداوند نے بنی اسرائیل کی خبر گیری کی اور ان کے دکھوں پر نظر کی انہوں نے اپنے سر جھکائے اور سجدے کیے“ (خرود ۲۱-۲۲)

”تب ابراہام (ابریم) منہ کے بلگر اور خداوس سے ہم کلام ہو کر بولا۔“ (پیدائش ۳۷-۳۸)

”تب ابراہام (ابریم) نے اپنے جوانوں سے کہا: تم یہاں گدھے کے پاس رہو میں اس لڑکے کے ساتھ (اپنے فرزند کی قربانی کے لیے) وہاں تک جاؤں گا اور سجدہ کر کے پھر تمہارے پاس آؤں گا۔“ (پیدائش ۵۰-۵۱)

”تب اس مرد (حضرت اسحاق علیہ السلام کا اپنی) نے سر جھکایا اور خداوند کو سجدہ کیا اور اس نے کہا میرے خداوند ابراہام کا خدامبارک ہے۔“ (پیدائش ۲۶-۲۷)

”اور ایسا ہوا کہ جب داؤد علیہ السلام، پہاڑ کی چوٹی پر پہنچا جہاں اس نے خدا کو سجدہ کیا۔“ (سموال ۱۵-۳۲)

زبور میں حضرت داؤد علیہ السلام خدا تعالیٰ سے کہتے ہیں:

”اور تجھ سے ڈر کرتی ری مقدس یہیکل کی طرف تجھے سجدہ کروں گا۔“ (زبور ۵-۷)

ان حوالوں سے بخوبی ثابت ہے کہ ابراہیمی ملت میں عبادت اور تعظیم الہی کے یہ تینوں اركان موجود تھے اور اسلام نے اسی کی پیروی کی ہے۔ موجود انجیل میں دعا اور نماز کا ذکر (متی ۲۱، ۲۶ و ۲۷-۳۲، ۳۲-۳۳ و لوقا ۲۲-۲۳) اور دوسری میں (متی ۲۲-۳۹) منہ کے بلگرنا یعنی سجدہ کرنا لکھا ہے اور بقیہ انجیلوں میں خاموشی ہے۔ عہد بعثت میں یہود و نصاریٰ میں جو لوگ نماز کے پابند تھے وہ بھی ان اركان کو ادا کرتے تھے۔ کھڑے ہو کر تو رات یا زبور کی آیتیں تلاوت کرتے تھے۔ اور سجدہ بھی کرتے تھے قرآن پاک کی شہادت ہے:

﴿لَيَسْوَأَوَّلَهُ مِنْ أَهْلِ الْكِتَابِ أَمْهَةً فَإِلَهَهُمْ يُشْتَهِنُونَ إِلَيْهِ أَنَاءَ الْيَوْمِ وَهُمْ لَا يَسْجُدُونَ﴾

(آل عمران: ۱۱۳)

”وہ برادر نہیں ہیں اہل کتاب میں کچھ ایسے بھی ہیں جو رات کو خدا کی آیتیں کھڑے ہو کر پڑھتے ہیں اور سجدے کرتے ہیں۔“

روايات میں ہے کہ رکوع میں یہودیوں کی طرح دونوں ہاتھ جڑے نہ رہیں۔ اس سے معلوم ہوا کہ عرب کے یہود بھی نماز کے یہ مختلف ارکان ادا کرتے تھے۔ اسلام کی نماز بھی انہیں قدیم ارکان اور فطري شکل و صورت کے ساتھ فرض ہوئی جو حضرت ابراہیم علیہ السلام کے عہد سے اب تک چلی آرہی تھی چنانچہ انسانیکو پیدیا آف اسلام کے مصنفوں اس حقیقت کو تسلیم کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

”اسلامی نماز اپنی ترکیب میں بہت حد تک یہودیوں اور عیسائیوں کی نماز کے مشابہ ہے۔“

• فتح الباری ابن حجر، ج ۲، ص: ۲۲۷ • مضمون صلوٰۃ، ج ۴، ص: ۹۶ -

اسلام نے صرف یہ کیا کہ اس خزانہ کو وقف عام کر دیا۔ انسانی آمیز شوں کو نکال کر بھلائے ہوئے فریضوں کو دوبارہ یاد دلایا، مٹے ہوئے نقش کو باہمار دیا، نماز کے بے جان پیکر میں حقیقت کی روح پھونک دی اس میں اخلاق کا جو ہر پیدا کیا اس کو دین کا ستون بنایا اور اپنی متواتر تعلیم و عمل سے اس کی ظاہری شکل و صورت کو بھی ہر انسانی تغیر سے محفوظ کر دیا اس طرح اس نے اس تکمیل کا فرض انعام دیا جس کے لیے وہ ازل سے منتخب تھا۔ یہ مسئلہ کہ نماز مطلق تسبیح و تبلیل اور ذکر الہی کا نام نہیں بلکہ اس کے ساتھ کچھ ارکان بھی ہیں، رسول اللہ ﷺ اور صحابہ رضی اللہ عنہم کے عمل متواتر کے علاوہ خود قرآن پاک سے بھی ثابت ہے۔ خوف اور جنگ میں نماز کے قصر اور ارکان کی تخفیف کی اجازت دی گئی ہے اس کے بعد ہے کہ جب خطروہ جاتا رہے تو نماز کو اس طرح ادا کرو جس طرح تم کو سکھایا گیا ہے۔

﴿ حِفْظُوا عَلَى الصَّلَاةِ وَالصَّلَاةُ الْوُسْطَىٰ وَقُوْمُوا بِلِلَّهِ قُنْتِيْنَ ۝ قَلْنَ حَفْظُهُ فَرِجَالًا وَرُلْبَانًا ۝ فَإِذَا أَمْنَتُمْ فَأَذْكُرُوا اللَّهَ كَمَا أَعْلَمُمْ مَا لَمْ تَعْلُمُوا ۝ تَعْلَمُونَ ۝ ۝﴾

(البقرۃ: ۲۳۸-۲۳۹)

”نمازوں کی اور نیچ کی نماز کی نگہداشت کرو اور خدا کے سامنے ادب سے کھڑے ہو پھر اگر خوف ہو تو پیارہ یا سوار ہو کر (پڑھو) پھر جب خوف جاتا رہے تو اللہ کو دیسے یاد کرو جیسے اس نے تم کو بتایا جو تم نہیں جانتے تھے۔“

اس سے ثابت ہوتا ہے کہ اس ذکر الہی کا کوئی خاص طریقہ تھا جس کی عملی شکل نماز ہے اور اس کی تفصیل سورۂ نساء میں ہے۔ اس طرح جنگ کی نماز میں ایک رکعت امام کے ساتھ با قاعدہ ادا کرنے کے بعد دوسرا رکعت ﴿ ۝ کے متعلق کہا گیا ہے:

﴿ فَإِذَا قَضَيْتُمُ الصَّلَاةَ فَأَذْكُرُوا اللَّهَ قِيمًا وَقُعُودًا وَعَلَى جُنُوبِكُمْ ۝ فَإِذَا اطَّهَأْنَتُمْ فَأَقِمُوا الصَّلَاةَ ۝ ۝﴾ (النساء: ۱۰۳)

”پس جب نماز (ایک رکعت) ادا کر چکو تو اللہ کو اٹھتے بیٹھتے اور پہلوؤں پر یاد کرو پھر جب اطمینان ہو جائے تو نماز کھڑی کرو۔“

اس آیت میں غور کرنے کی دو باتیں ہیں: اول یہ ہے کہ ایک رکعت جو با قاعدہ ادا ہوئی اس کو اصلوۃ (نماز) کہا گیا اور دوسرا رکعت جو خدا کا نام الحکم کر، بیٹھ کر، جھک کر، لیٹے اور لڑائی، حملہ اور مدعا فعت کی حالت میں پوری ہوئی اس کو صرف ذکر اللہ کہا گیا۔ دوسرا بات یہ ہے کہ جنگ کی اس عارضی مخفف نماز کو اقا مس صلوۃ (نماز کھڑی کرنا) کے لفظ سے ادا نہیں کیا گیا حالانکہ ذکر الہی تسبیح و تبلیل اور بعض ارکان بھی اس میں

• اس کی تعریج میں فقہا کا اختلاف ہے، میں نے یہاں وہ لکھا ہے جو میرے زندگی میں صحیح ہے۔

موجود تھے بلکہ یہ فرمایا گیا کہ پھر جب اطمینان ہو جائے تو نماز کھڑی کرو۔ اس سے معلوم ہوا کہ اقامت صلوٰۃ (نماز کھڑی کرنے) کے معنی مطلق ذکر و فکر، تسبیح و تہلیل، حمد و شناور تلاوت قرآن سے جدا گانہ ہیں لیکن اقامت صلوٰۃ کے ضمن میں ذکر و فکر، تسبیح و تہلیل، حمد و شناور قراءت کے علاوہ پچھا اور ارکان بھی داخل ہیں جو جنگ کی حالت میں کم یا موقوف ہو گئے تھے اب اس عارضی مانع کے دور ہو جانے کے بعد پھر بدستور نماز میں ان کی بجا آوری کا مطالبہ کیا جا رہا ہے یہی وہ ارکان تھے جن کے متعلق سورہ بقرہ میں یہ کہا گیا تھا کہ جب خوف جاتا رہے تو پھر خدا کو اس طرح یاد کرو جس طرح اس نے بتایا ہے۔ اب ہم کو یہ دیکھنا ہے کہ اسلام میں نماز کن ارکان کے ساتھ مقرر ہوئی ہے۔ گواں کے لیے یہ بالکل کافی ہے کہ آنحضرت ﷺ نے تمام عمر خود کس طرح نماز پڑھی اور صحابہ رضی اللہ عنہم کو اس طرح کی نماز سکھائی کیوں کہ نماز کی عملی کیفیت پورے قواتر کے ساتھ اس عہد سے لے کر آج تک موجود ہے اور دوست و دشمن اور مختلف و مخالف کو معلوم ہے اور اسلام کے ہر فرقہ میں یکساں طور سے عملًا بلا اختلاف مسلم ہے، تاہم نظریہ پسند لوگوں کے لیے قرآن پاک سے ان کا ثبوت پہنچا دینا زیادہ مناسب ہوگا:

ہم پہلے رب العزت کی بارگاہ میں مودب کھڑے ہوتے ہیں:

﴿لَهُفِظُوا عَلَى الصَّلَاةِ وَالصَّلُوةِ الْوُسْطَىٰ وَثُوْمُوا بِلِهِ قُنْتِيْنَ ۝﴾ (۲/ البقرہ: ۲۳۸)

”نمازوں پر (عموماً) اور تسبیح کی نماز پر (خصوصاً) نگاہ رکھو اور خدا کے آگے مودب کھڑے ہو۔“

نماز کا آغاز خدا کا نام لے کر کرتے ہیں کہ

﴿وَذَكَرَ اسْمَ رَبِّهِ قَصْلَىٰ ۝﴾ (۱۵/ الاعلی: ۸۷)

”اور اپنے پروردگار کا نام لیا پس نماز پڑھی۔“

﴿وَرَبَّكَ قَلْتَرَبَّ ۝﴾ (۷۴/ المدثر: ۳)

”اور اپنے رب کی بڑائی کر۔“

لفظ اللہ اکبر: جس کی نماز میں بار بار سکرار کی جاتی ہے اسی حکم کی تعلیل ہے۔

اس کے بعد خدا کی حمد و شناور کرتے اور اس سے اپنے گناہوں کی بخشش چاہتے ہیں:

﴿وَسَيِّدُنَا مُحَمَّدُ رَبُّكَ حِينَ تَقُومُ ۝﴾ (۴۸/ الطور: ۵۲)

”اور جب تو کھڑا ہو تو اپنے پروردگار کی حمد کی تسبیح کر۔“

پھر قرآن پڑھتے ہیں:

﴿فَأَقُورُوا مَا أَتَيْسَرَ مِنَ الْقُرْآنِ ۝﴾ (۲۰/ المزمل: ۷۳)

”قرآن میں سے جتنا ہو سکے پڑھو۔“

قرآن کی ان آیتوں میں خدا کے اسماء اور صفات کا تذکرہ کرتے ہیں اور اس کی حدِ خصوصیت کے ساتھ بیان کرتے ہیں جس سے اس کی بڑائی (تکبیر) ظاہر ہوتی ہے:

﴿ قُلْ ادْعُوا اللَّهَ أَوِ ادْعُوا الرَّحْمَنَ أَيَّاً مَا تَدْعُوا فَلَهُ الْأَسْمَاءُ الْحُسْنَىٰ وَلَا يَجْهَرُ صَلَاتُكُوكَلْخَافِتُ بِهَا وَابْتَغِ بَيْنَ ذَلِكَ سَبِيلًا وَقُلْ الحَمْدُ لِلَّهِ الَّذِي لَمْ يَتَنَعَّذْ وَلَدَّ وَلَمْ يَنْلِنْ لَهُ شَرِيكٌ فِي الْمُلْكِ وَلَمْ يَنْلِنْ لَهُ وَلِيٌّ مِنَ الدُّلُّ وَلَمْ يَرْبِدْ تَكْبِيرًا ﴾

(۱۷) بنی اسراء یہل (۱۱۰-۱۱۱)

”کہہ اللہ کو پکارو یا حمّن کو پکارو جو کہہ کر پکارو سب اپنے نام اسی کے ہیں اپنی نماز نہ بہت زور سے پڑھو اور نہ بہت پچکے سچ کی راہ تماش کرو اور کہہ کہ حمد اس اللہ کی جس نے کوئی میانہیں بنایا اور نہ سلطنت میں کوئی اس کا شریک ہے اور نہ درماندگی کے سبب سے اس کا کوئی مددگار ہے اور اس کی بڑائی کر بڑی بڑائی۔“

چونکہ اس کی یہ حمد سورة فاتحہ میں بہ تمام و کمال مذکور ہے اس لیے اس سورہ کو ہر نماز میں پہلے پڑھتے ہیں اس کے بعد قرآن میں جتنا پڑھنا ممکن اور آسان ہوتا ہے اس کو پڑھتے ہیں۔ پھر خدا کے سامنے ادب سے جھک جاتے یعنی رکوع کرتے ہیں:

﴿ وَإِذْ كَعَوْمَةُ الرَّاكِعِينَ ﴾ (۲/ البقرة: ۴۳)

”اور رکوع کرنے والوں کے ساتھ رکوع کرو۔“

پھر اس سے آگے پیشانی کو زمین پر رکھ دیتے یعنی سجدہ کرتے ہیں:

﴿ يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا إِذْ كَعَوْا وَاسْجُدُوا وَاعْبُدُوا رَبَّكُمْ وَافْعُلُوا الْغَيْرَ لَعَلَّكُمْ تُفْعَلُونَ ﴾

(الحج: ۲۲)

”اے ایمان والو! جھکو (رکوع کرو) اور سجدہ کرو اور اپنے رب کی پستش کرو اور نیک کام کرو تاکہ کامیاب ہو۔“

ان دونوں (رکوع و سجدہ) میں خدا کی تسبیح و تحمید کرتے ہیں:

﴿ فَسِيمَهُ يَأْسُو رَبِّكَ الْعَظِيمِ ﴾ (۵۶/ الواقعہ: ۷۴ و ۹۶)

”تو اپنے بزرگ پروردگار (رب عظیم) کے نام کی تسبیح کر۔

﴿ سَيَحْ أَسْمَرَبِّكَ الْأَعْلَى ﴾ (۸۷/ الاعلی: ۱)

”اپنے برتر برب (رب اعلیٰ) کی تسبیح کر۔“

آنحضرت ﷺ کی ربانی تعلیم کے مطابق پہلا حکم رکوع میں اور دوسرا حجد میں ادا ہوتا ہے۔

ابن ماجہ، ابواب اقامۃ الصلوۃ، باب التسبیح فی الرکوع والسجود: ۸۸۷۔

قیام، رکوع اور سجدہ کی یہ ترتیب سورہ حج (۳۔ ذکر ابراہیم علیہ السلام) اور آل عمران (۵۔ ذکر مریم) سے اور یہ امر کہ سجدہ پر ایک رکعت تمام ہو جاتی ہے سورہ نساء (۱۵۔ ذکر نماز خوف) سے ثابت ہے۔ درحقیقت ارکان کی یہ ترتیب بالکل فطری اور عقلی ہے، پہلے کھڑا ہونا، پھر جھک جانا، پھر سجدہ میں گرپٹنا، اس میں خود طبعی اور فطری ترتیب ہے۔ تنظیم کی ابتدائی اور کثیر الواقع شکل یہ ہوتی ہے کہ آدمی کھڑا ہو جاتا ہے۔ جب کیفیات اور جذبات میں گھرائی پیدا ہو جاتی ہے تو وہ جھک جاتا ہے اور جب فرط بے خودی کی کیفیت پیدا ہو جاتی ہے تو اپنے بلند ترین حصہ جسم (یعنی پیشانی) کو اپنے حسن اور معظم کے پست ترین حصہ جسم (یعنی پاؤں) پر رکھ دیتا ہے۔ میں سبب ہے کہ سجدہ نماز کی کیفیات کی انتہائی صورت ہے۔ قرآن نے کہا ہے:

﴿وَاسْجُدْ وَاقْتَرِبْ ﴾ (۹۲/العلق: ۱۹)

”او سجدہ کر اور قریب ہو جا۔“

گویا سجدہ قربت الہی کی اخیر منزل ہے شاید اسی لیے وہ ہر رکعت میں مکرراً دکیا جاتا ہے۔

نماز تمام جسمانی احکام عبادت کا مجموعہ ہے

قرآن پاک کی مختلف آیتوں میں ہم کو مختلف قسم کی جسمانی، لسانی اور قلبی عبادتوں کا حکم دیا گیا ہے۔ جسم کو ادب سے کھڑا رکھنے، پھر جھکانے اور سرگاؤں کرنے کا حکم ہے۔ مختلف دعاؤں کے پڑھنے کی تاکید ہے۔ خدا کی تسبیح و تحمید کا ارشاد ہے۔ دعا اور استغفار کی تعلیم ہے۔ دل کے خضوع و خشوع کا فرمان ہے۔ رسول پر درود بھجنے کا امر ہے۔ اس لیے نماز کی تشكیل اس طرح کی گئی کہ اس ایک عبادت کے اندر قرآن پاک کی تمام جسمانی، لسانی اور روحانی عبادتوں کے احکام یکجا ہو گئے۔ اسی لیے ایک نماز قرآن کے تمام گوناگون جسمانی، لسانی اور روحانی عبادات کا مجموعہ ہے۔ دوسرا لفظوں میں یوں کہہ سکتے ہیں کہ قرآن پاک میں مسلمانوں کو قیام، رکوع، سجدہ، تہلیل، تسبیح، تکبیر، قراءت، قرآن، ذکرِ الہی اور درود پڑھنے کے جواہکام عطا کیے گئے ہیں ان کی مجموعی تعلیم کا نام نماز ہے۔ جس میں یہ تمام منفرد احکام مجموعی تہیثت سے انجام پاتے ہیں۔ دوسری طرف ان احکام کی بجا آوری میں ایک ترتیب پیدا کی گئی ہے کہ اگر وہ نہ ہوتی اور یہ کام انسانوں کے ذاتی انتخاب پر چھوڑ دیا جاتا کہ جو چاہے رکوع کر لے، جو چاہے سجدہ کر لے، جو چاہے صرف قیام کر لے، جو چاہے زبان ہی سے ذکر و قراءت پر اکتفا کر لے اور جو چاہے صرف دل سے دھیان کر کے اس فرض سے ادا ہو جائے تو ہر فرد سے فرائضِ الہی کے متعدد ارکان چھوٹ جاتے، جن پر کبھی عمل نہ ہوتا اور عجب نہیں کہ افراد کی طبعی سستی اور سہل انگاری ان پورے احکام کی تعلیم میں منع آتی۔ سب سے بڑھ کر یہ کہ تمام مسلمانوں کی عبادت کی واحد اور منظم شکل پیدا نہ ہوتی نہ جماعت ہو سکتی اور نہ نماز کو ایک مذهب کی عبادت خاص کہا جا سکتا اور نہ جماعتی رمز و شعار کی وحدت کی شان اس سے پیدا ہو کر مسلمانوں کو واحد امت بناتی اور بتاتی۔ اللہ تعالیٰ نے اپنے فرشتہ کے

ذریعہ اپنے رسول کو اس عبادت کی عملًا تعلیم دی۔ ① اور رسول نے امت کو سکھایا اور امت نے نسل بعد نسل موجودہ اور آینہ نسل کو سکھایا اور اس پرے تو اُن عمل کے ساتھ جن میں ذرا بھی شک و شبہ نہیں، وہ آج تک محفوظ ہے۔

نماز کی دعا

نماز کی مختلف حالتوں میں ان حالتوں کے مطابق دعائیں پڑھی جاتی ہیں اور پڑھی جاسکتی ہیں۔ خود آنحضرت ﷺ سے نماز کی مختلف حالتوں کی بیسوں مختلف دعائیں مردی ہیں اور ہر مسلمان ان میں سے جو چاہے پڑھ سکتا ہے۔ لیکن نماز کی وہ اصلی دعا جس سے ہمارے قرآن کا آغاز ہوتا ہے، جس کو نماز میں پڑھنے کی تکید آنحضرت ﷺ نے فرمائی ہے۔ جس کو آپ نے تمام عمر نماز کی ہر رکعت میں پڑھا ہے اور اس وقت سے لے کر آج تک تمام مسلمان پڑھتے آئے ہیں، وہ سورۃ فاتحہ ہے، جو مقاصد نماز کے ہر پہلو پر حاوی اور بحیط ہے، اسی لیے وہ اسلام میں نماز کی اصلی دعا ہے۔ یہ وہ دعا ہے جو خدا نے بندوں کی بولی میں اپنے منہ سے ادا کی۔

الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِينَ الرَّحْمٰنُ الرَّحِيمُ مُلِكُ يَوْمِ الدِّيْنِ إِيَّاكَ نَعْدُ وَإِيَّاكَ نَسْتَعِنُ إِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيمَ صِرَاطَ الَّذِينَ أَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ غَيْرُ الْمَغْضُوبِ عَلَيْهِمْ وَلَا الصَّالِحُونَ

(۱/ الفاتحة: ۱) (۷)

”حمد ہوا اللہ کی جو سب جہانوں کا پروردگار ہے رحم والا مہربان ہے، ہمارے عمل کے بدے کے دن کا مالک (ہے) (اے آقا) ہم تجھی کو پوچھتے ہیں اور تجھی سے مدد مانگتے ہیں، تو ہم کو سید ہے راستہ پر چلا، ان کا راستہ جن پر تو نے فضل کیا، ان کا راستہ نہیں جن پر غضب آیا اور نہ ان کا جو بہک گئے۔“

(اس دعا کو ختم کر کے آمیں کہتے ہیں۔ یعنی اے خدا تو اس کو قبول کر)

یہ وہ دعا ہے جس کو ہر مسلمان ہر نماز میں دہراتا ہے، جس کے بغیر ہر نماز نا تمام اور ادھوری رہتی ہے۔ ② یہ دعا اسلام کی تمام تعلیمات کا عطر اور خلاصہ ہے، خدا کی حمد و شکر ہے، تو حید ہے، اعمال کی جزا اسرا کا یقین ہے، عبادت کے خلاصہ ادا کا اقرار ہے، توفیق و ہدایت کی طلب ہے، اچھوں کی تقلید کی آرزو اور بروں کی پیروی سے پہنچنے کی تمنا ہے۔ جس وقت اس حمد میں خدا کی پہلی صفت کل جہانوں کا پروردگار زبان پر آتی ہے تو اس کی تمام قدر تین اور بخششیں جو زمین سے آسمان تک پھیلی ہیں، سب سامنے آ جاتی ہیں۔ جہانوں کی وسعت کے خیل سے اس کی عظمت اور کبریائی کی وسعت کا خیل پیدا ہوتا ہے۔ سارے جہانوں کے ایک ہی

① مؤٹا امام مالک، کتاب وقوف الصلوة، باب وقوف الصلوة: ۱؛ صحيح بخاری، کتاب مواقف الصلوة،

باب مواقف الصلوة: ۵۲۱؛ صحيح مسلم، کتاب المساجد، باب اوقافات الصلوات الخمسی: ۱۳۸۰۔

② جامع ترمذی، ابواب الصلاة، باب ما جاء انه لا صلاة الا بفاتحة الكتاب: ۲۴۷۔

پروردگار کے تصور سے کل کائناتِ حقیقتی کی برادری کا مفہوم ذہن میں آتا ہے۔ انسان ہوں کہ حیوان، چند ہوں کہ پرند، بھر انہوں میں امیر ہوں یا غریب، مخدوم ہوں یا خادم، بادشاہ ہوں یا گدا، کالے ہوں یا گورے، عرب ہوں یا عجم، بلکل مخلوقاتِ خلقت کی برادری کی حیثیت سے یکساں معلوم ہوتی ہے۔ خدا کو حسن و رحیم کہہ کر پکارنے سے اس کی بے انتہا حرمت، بے پایاں شفقت، غیر محدود بخشش اور ناقابلِ بیان کیف، محبت کا سمندر دل کے کوزہ میں موجود مارنے لگتا ہے۔ روز بڑا کے مالک کا خیال ہم کو اپنے اپنے اعمال کی ذمہ داری اور مواخذہ سے باخبر اور خدا کے جلال و جبروت سے مرعوب کر دیتا ہے۔ ”ہم بھی کو پوچھتے ہیں“ کہہ کر ہم اپنے دل کی زمین سے ہر قسم کے شرک کو بخوبی بن سے اکھاڑ دیتے ہیں ”ہم بھی سے مدد مانگتے ہیں“ بول کر ہم تمام دنیاوی سہاروں اور بھروسوں کو ناجائز بخستہ اور صرف خدا کی طاقت کا سہارا ڈھونڈتے ہیں اور سب سے بے نیاز ہو کر اسی ایک کے نیاز مند بن جاتے ہیں۔ سب سے آخر میں ہم اس سے سیدھی راہ پر چلنے کی توفیق چاہتے ہیں۔ یہ سیدھی راہ (راہ مستقیم) کیا ہے؟ اس کی شریعت کے احکام ہیں:

﴿فُلْ تَعَالَوْا أَئْلُلْ مَا حَكَمَ رَبِّكُمْ عَلَيْكُمُ الْأَشْرِكُوا بِهِ شَيْئًا وَلَا إِلَهَ إِلَّا هُوَ الْوَالَّدُ الْيُنْ إِحْسَانًا وَلَا تَقْتُلُوا

أَوْلَادَكُمْ قِنْ إِمْلَاقٍ طَمْحُنْ نَزْرُقْلُمْ وَإِيَّاهُمْ وَلَا تَقْرِبُوا الْفَوَاحِشَ مَا ظَهَرَ مِنْهَا وَمَا

بَطَنَ وَلَا تَقْتُلُوا النَّفَسَ الَّتِي حَرَمَ اللَّهُ إِلَّا يَأْعِقَ طَلِكُمْ وَضَلَّمُهُ لَعَلَّكُمْ تَعْقِلُونَ وَلَا

تَقْرِبُوا مَالَ الْيَتَمِمِ إِلَّا يَأْتَى هُنَّ أَحْسَنُ حَتَّى يَلْعُنَ أَشْدَدَهُ وَأَوْفُوا الْكَيْلَ وَالْوِيزَانَ

بِالْقِسْطِ لَا تُكْلِفُ نَفْسًا إِلَّا وُسْعَهَا وَإِذَا قُلْمُرْ فَاعْدُلُوا وَلَوْ كَانَ ذَا قُرْبَى وَبِعَهْدِ اللَّهِ

أَوْفُوا طَلِكُمْ وَضَلَّمُهُ لَعَلَّكُمْ تَذَكَّرُونَ وَأَنَّ هَذَا صِرَاطُنِي مُسْتَقِيًّا فَإِنَّمَا يَعْبُدُهُ

(۱۵۱-۱۵۲) (الانعام: ۶)

”کہہ دے (اے پیغمبر) آدمیں تم کو پڑھ کر سناؤں جو تمہارے رب نے تم پر حرام کیا ہے۔ یہ کہ اس کے ساتھ شرک نہ کرو، ماں باپ کے ساتھ یتکی کرو، غربت کے سبب اپنی اولاد کو قتل مت کرو، ہم تم کو اور ان کو روزی دیتے ہیں، بے حیائی کی باتوں کے نزد یہکہ نہ جاؤ، خواہ وہ ظاہر میں (خش) ہوں یا باطن میں، جس جان کو خدا نے محترم کیا ہے اس کو مت مارو، لیکن انصاف کے ساتھ، یہ وہ باتیں ہیں جن کا حکم خدا نے تم کو دیا ہے۔ شاید کہ تم سمجھو اور سیتم کے مال کے پاس مت جاؤ، لیکن اچھی نیت سے یہاں تک کہ وہ اپنی قوت کو بخیچ جائے اور ناپ اور توں کو انصاف کے ساتھ پورا کھو، ہم کسی کو اس کی طاقت سے زیادہ کا حکم نہیں دیتے۔ جب تم بات بلوتو انصاف کی گوتمہ را عزیز ہی کیوں نہ ہو اور خدا کے عہد کو پورا کرو یہ وہ باتیں ہیں جن کا خدا نے تم کو حکم دیا ہے تاکہ تم نصیحت پکڑو اور بے شبہ یہی ہے میرا سیدھا راستہ (صراطِ مستقیم) تو تم

اسی کی پیروی کرو۔“

ان آیات نے واضح کر دیا کہ وحی محدث علیہ السلام کی اصلاح میں صراط مستقیم کیا ہے، یعنی شرک نہ کرنا، مال بآپ کے ساتھ نیک سلوک، اولاد کے ساتھ اچھا برداشت، ظاہری و باطنی ہر قسم کی برائیوں سے بچنا، مقصوم اور بے گناہ جانوں کی عزت کرنا (ناحق قتل نہ کرنا)، یتیم کے ساتھ احسان، تاپ توں میں ایمانداری، بلا رور عایت حق بولنا اور عہد کا پورا کرنا، یہ وہ صفات عالیہ ہیں جن کو صراط مستقیم کی محضسری ترکیب تو صرفی میں ہم خدا سے روزانہ مانتے ہیں، جو خلاق کا جو ہر اور نیکی کی روح ہیں۔

یہی وہ صفات حسنہ ہیں جن سے خدا کے وہ خاص بندے متصف تھے۔ جن پر اس کا فضل و انعام ہوا۔ یہ خاص بندے کوں ہیں؟ قرآن پاک نے اس کی شریعت بھی خود کر دی ہے:

﴿وَمَنْ يُطِعِ اللَّهَ وَالرَّسُولَ فَأُولَئِكَ مَعَ الظَّيْنِ أَنَّمَّا اللَّهُ عَلَيْهِمْ قَنَ التَّبِيَّنَ

وَالصَّدِيقَيْنَ وَالشَّهِدَاءِ وَالصَّلِحِيْجِينَ وَحَسْنَ أُولَئِكَ رَفِيقًا﴾ (٤/ النساء: ٦٩)

”اور جو خدا اور رسول کے حکم پر چلتے ہیں تو وہ ان لوگوں کے ساتھ ہیں، جن پر خدا کا فضل اور انعام ہوا یعنی نبی، صدیق، شہید اور صالح لوگ ان کی رفاقت کیسی اچھی ہے۔“

اس بنا پر ہر نمازی جس صراط مستقیم اور راہ راست کے لیے دعا کرتا ہے، وہ نیکی کی وہ شاہراہ ہے جس پر خدا کے تمام نیک بندے (انبیاء، صدیقین، شہداء اور صالحین) علی قدر مرابت چل سکے۔

سید ہے راستے سے ہندا و طرح سے ہوتا ہے (۱) افراط (زیادتی) کے سبب سے اور (۲) تفریط (کم) کے سبب سے، افراط یہ ہے کہ خدا کی شریعت میں ہم اپنی طرف سے بدعنوں کا اضافہ کریں یہ گمراہی ہے اور تفریط یہ ہے کہ خدا کے احکام پر عمل چھوڑ دیں، اس سے خدا کا غضب قوم پر نازل ہوتا ہے اور ہر قسم کا انعام و اکرام چھین لیا جاتا ہے۔ پہلی صورت کی مثال نصاری ہیں، جنہوں نے دین میں اپنی طرف سے ہزاروں باتیں اضافہ کر دیں۔ دوسری کا نمونہ یہود ہیں، جنہوں نے احکامِ الہی کو پس پشت ڈال دیا اور ہر قسم کے انعام و اکرام سے محروم ہو گئے۔ مسلمانوں کی دعا یہ ہے کہ الہی ہم کو ان دونوں غلط راستوں سے بچانا اور اعادتی کی شاہراہ پر قائم رکھنا۔

اس تفصیل سے ظاہر ہو گا کہ اسلام کی یہ دعا (سورہ فاتحہ) دین و دنیا کی دعاؤں کی جامع، جسم و روح کی نیکیوں پر مشتمل اور اخلاق و ایمان کی تعلیمات کو محیط ہے۔ اس میں خدا کی حمد بھی ہے اور بندے کی اباق بھی۔ اسی لیے آنحضرت علیہ السلام نے صحابہؓؐ سے اس کی نسبت فرمایا:

”جونماز میں اس سورہ کو نہ پڑھے، اس کی نماز ناٹھی اور ناکمل ہے۔ خدا فرماتا ہے کہ نماز میرے اور میرے بندے کے درمیان دو حصوں میں ہٹی ہوئی ہے۔ آدمی میرے لیے ہے اور آدمی اس کے لیے، بندہ

جب «الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِينَ» (حمد ہوسارے جہانوں کے پروردگار کی) کہتا ہے تو خدا فرماتا ہے: میرے بندہ نے میری سائش کی پھر جب وہ «الْأَكْرَمُ الْجَيْوُونُ» (مہربان رحم والا) کہتا ہے تو خدا فرماتا ہے: میرے بندہ نے میری تعریف کی۔ پھر وہ کہتا ہے: «مُلِّيكُ يَوْمِ الدِّينِ» (نیک و بد کی جزا کے دن کا مالک) تو خدا فرماتا ہے: میرے بندہ نے میری براہی ظاہر کی۔ اتنا میرا حصہ ہے اور میرے بندہ کے درمیان مشترک یہ ہے کہ «إِنَّاَكُ نَعْبُدُ وَإِنَّاَكُ نَسْتَعِينُ»۔ (هم تجھی کو پوچھتے ہیں اور تجھی سے مدد چاہتے ہیں) اس کے بعد آخونک (کہ ہم کو صراط مستقیم دکھا) میرے بندہ کی دعا ہے اور میرے بندہ نے جو مانگا وہ اس کو ملنا۔

اس حدیث قدسی کے آئینہ میں اسلامی نماز کی اس دعا کا جو لکش و لفڑیب نظارہ نظر آتا ہے، وہ روح میں نشاط اور دل میں سرور پیدا کرتا ہے۔ یہ کیفیت ہے جس کا ایک دھندا ساتھورا ایک عیسائی یورپیں فاضل اے جی وینسٹنک (A-G-Wensinck) کو بھی جس نے انسانیکو پیدا یا آف اسلام میں اسلامی نماز پر ایک پرمحلوبات مضمون لکھا ہے۔ تھوڑی دریکے لیے ہو جاتا ہے، وہ لکھتا ہے:

”(اسلام کی رو سے) نماز حضور قلب کے ساتھ ادا ہوئی چاہیے۔ ایک دفعہ محمد ﷺ نے ایک پرتش و نگار کپڑے کو اس لیے اتار دیا کہ اس سے نماز میں توجہ بنتی ہے۔ یہ واقعہ کہ نماز صرف ظاہری رسوم ادا کرنے کا نام نہیں، بلکہ اس میں دلی خضوع و خشوع کی بھی ضرورت ہے۔ اس حدیث سے ثابت ہوتا ہے جس میں محمد ﷺ نے کہا ہے کہ مجھے تمہاری دنیا کی دو چیزیں پسند ہیں، خوشبو اور عورت اور میری آنکھوں کی ٹھنڈک نماز ہے۔ محمد ﷺ پر نمازوں میں گریہ طاری ہو جانا بھی بعض اوقات منقول ہے۔ نماز کی ایک سب سے اعلیٰ خصوصیت وہ ہے جس کو ہم ان دو حدیثوں میں پاتے ہیں، جن میں بیان ہے کہ ”نماز خدا سے سرگوشی اور مکالمہ ہے۔“ اور اس کی تشریح ہم کو اس حدیث قدسی میں ملتی ہے کہ سورہ الحمد میرے بندہ کے درمیان نہیں ہوئی ہے۔

اس دعا میں کوئی پیغبرا یا نہیں آیا جس کو نماز کا حکم نہ دیا گیا ہوا اور نماز میں پڑھنے کے لیے کوئی دعا تعلیم نہ کی گئی ہو۔ کوہ طور پر جلوہ ربانی کے وقت حضرت موسیٰ علیہ السلام نے نماز میں جو دعا پڑھی تھی وہ توراة کی کتاب خود ج میں موجود ہے۔ زیور تو شروع سے آخونک دعاوں کا مجموعہ ہی ہے، مگر اس میں ایک خاص دعا پر یہ عنوان بھی لکھا نظر آتا ہے کہ ”داو دکی نماز“، انجیل میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام اپنی وداعی شب میں حواریوں کو ایک خاص دعا کی تعلیم دیتے ہیں جو آج تک عیسائیوں کی نماز کا اصلی جزو ہے۔ ان دعاوں کو سامنے رکھ کر محمد رسول

* جامع ترمذی، ابواب التفسیر، باب ومن سورة فاتحة الكتاب: ۲۹۵۳ و مسند احمد، ج ۲، ص: ۴۶۰۔

* یہ حدیث اور گزر بھی ہے۔

اللہ علیہ السلام کی زبان و حج ترجمان کے ذریعے سے آئی ہوئی دعا کی تاثیری کیفیت، حسن تعبیر، جامعیت، پاکیزگی اور اختصار کا اندازہ ہو گا اور پتہ چلے گا کہ اس کی کیا بے مثالی ہے، جس کے سبب سے نمازوں میں پڑھنے کے لیے اسی کا انتخاب ہوا؟ اسی لیے ایک دفعہ آنحضرت علیہ السلام نے اس کی نسبت اپنے ایک صحابی حضرت ابو بن عکب رضی اللہ عنہ سے فرمایا تھا کہ ”نماز میں جو سورہ تم پڑھتے ہو، لعنی ام القرآن“ تھم ہے، اس ذات کی جس کے ہاتھ میں میری جان ہے کہ وہ نہ تورۃ میں اتری نہ نجیل میں نہ زبور میں اور نہ اس کے مثل کوئی دوسری چیز خود قرآن میں موجود ہے۔“ اس حدیث کی صحت اور صداقت کا لیقین خود ان دعاؤں پر ایک نظر ڈالنے سے ہو گا۔

حضرت موسی علیہ السلام کی نماز کی دعا

توراة کی کتاب الخروج میں ہے کہ جب حضرت موسی علیہ السلام توراة لینے اور ربانی تجلی کا ایک تاشاد کیھنے کے لیے کوہ طور پر چڑھے اور تجلی نظر آئی تو فوراً خدا کا نام لیتے ہوئے سجدہ میں گر پڑے۔ اس وقت اللہ تعالیٰ نے ان کو یہ دعا تعلیم کی:

”خداوند، خداوند، خدا، رحیم اور مہربان، قہر میں دھیما اور رب الفیض ووفا، ہزار پتوں کے لیے فضل رکھنے والا، گناہ اور تقصیر اور خططا کا بخششے والا، لیکن وہ ہر حال میں معاف نہ کرے گا، بلکہ باپوں کے گناہ کا بدلہ ان کے فرزندوں سے اور فرزندوں کے فرزندوں سے تیسری اور چوتھی پشت تک لے گا۔“ (۶-۳۳)

اس دعا کے ابتدائی نظرے اگرچہ نہایت موثر ہیں، لیکن خاتمه نہایت مایوس کن ہے۔ پہلے فضل و رحمت کی امید دلا کر آخر میں باب اجابت پر قفل چڑھادیا ہے۔
زبور میں حضرت داؤد علیہ السلام کی نماز کی دعا: زبور باب: ۸۶

داؤ د علیہ السلام کی نماز

”اے خداوند! اپنا کان جھکا اور میری سن کی میں پریشان اور مسکین ہوں، میری جان کی حفاظت کر کے میں دین دار ہوں، اے تو کہ میرا خدا ہے اپنے بندہ کو کہ جس کا توکل تجوہ پر ہے رہائی دے۔ اے خداوند! مجھ پر حرم کر کے میں تمام دن تیرے آگے نالہ کرتا ہوں اپنے بندہ کے جی کو خوش کر کے خداوند! میں اپنے دل کو تیری طرف اٹھاتا ہوں، کیونکہ تو اے خداوند بھلا ہے اور بخششے والا ہے اور تیری رحمت ان سب پر جو تجوہ کو پکارتے ہیں وافر ہے۔ اے خداوند! میری دعا سن اور میری مناجات کی آواز پر کان دھر، میں اپنے بیپت کے دن تجوہ کو پکاروں گا کہ تو میری سے گام بعوروں کے درمیان اے خداوند! تجوہ سا کوئی نہیں اور تیری صفتیں کہیں نہیں۔ اے خداوند! ساری قومیں جنہیں تو نے خلق کیا آئیں گی اور تیرے آگے جدہ کریں گی اور تیرے نام کی بزرگی کریں گی کہ تو بزرگ ہے اور عجائب کام کرتا ہے تو ہی اکیلا خدا ہے۔

اے خداوند! مجھ کو اپنی راہ تماں تیری سچائی میں چلوں گا، میرے دل کو یک طرف کرتا کہ میں تیرے نام سے ڈروں اے خداوند! میرے خدا میں اپنے سارے دل سے تیری ستائش کروں گا اور ابد تک تیرے نام کی بزرگی کروں گا کہ تیری رحمت مجھ پر بہت ہے اور میری روح کو اسفل پا تال سے نجات دلا۔

اے خدا! مغروفوں نے مجھ پر چڑھائی کی ہے اور کرن ل لوگوں کی جماعت میری جان کے پیچھے پڑی ہے اور انہوں نے مجھ کو اپنی آنکھوں کے سامنے نہیں رکھا لیکن تو اے خداوند! خدار حیم و کریم اور برداشت کرنے والا ہے اور شفقت اور وفا میں بڑھ کر ہے، میری طرف متوجہ ہو اور مجھ پر حرم کر، اپنے بندہ کو اپنی تو انکی بخشش اور اپنی لونڈی کے بیٹھے کو نجات دے، مجھے بھلانی کا کوئی نشان دکھاتا کہ وہ جو میرا کینہ رکھتے ہیں، دیکھیں اور شرم نہ ہوں، کیوں کہ تو نے اے خداوند میری مدد کی اور مجھے تسلی دی۔“

اس دعا میں بھی وہی خدا کی حمد و صفت اور تو حید و عبادت کا ذکر، راہ راست کی ہدایت کی طلب اور شریروں اور گمراہوں سے بچائے جانے کی درخواست ہے، لیکن طول تکرار اور دعا مانگنے والے کی شخصیت کا رنگ غالب ہونے کے سبب سے یہ انسان کی دعا نہیں بن سکتی اور نہ اس کا طول اس کو ہر وقت کی نماز میں پڑھے جانے کی سفارش کرتا ہے۔

اممیل میں نماز کی دعا

حضرت علیہ السلام حواریوں کو دعا اور نماز کے آداب بتا کر یہ دعا تعلیم کرتے ہیں:

”اے ہمارے باپ جو آسمان پر ہے تیرا نام مقدس ہو، تیری بادشاہت آئے، تیری مرضی جیسی آسمان پر ہے زمین پر بھی پوری ہو، ہماری روز کی روٹی آج ہمیں دے اور ہمارے قرض ہمیں

معاف کر جیے ہم بھی اپنے قرض داروں کو معاف کرتے ہیں اور ہمیں آزمائش میں مت ڈال بلکہ برائی سے بچا، کیوں کہ بادشاہت اور قدرت اور جلال ہمیشہ تیراہی ہے۔ آئیں، ”نام کی تقدیس ”خدا کی حمد“ ہے بادشاہت کے آنے سے مقصود شاید قیامت اور اعمال کے فیصلہ کا دن ہے، جو دعائے قرآنی میں «مَالِكِ يَوْمِ الدِّينِ ۖ» کے لفظ سے ادا ہوا ہے۔ نیز استعارہ کی زبان میں روز کی روٹی سے مراد دنیاوی روٹی نہ لی جائے۔ بلکہ روح کی غذا یا صراط مستقیم لی جائے اور قرض سے مراد فرائض اور حقوق لئے جائیں، جو خدا کی طرف سے انسانوں پر عائد ہیں، آزمائش میں نہ پڑنے اور برائی سے بچنے کے معنی وہی لئے جاسکتے ہیں جو اسلامی دعا کے خاتمه میں مذکور ہے کہ ”یا ان کا راستہ ہے جن پر تیراغضب آیا اور جو سید ہے راستے سے بہک گئے ہیں۔“ اس تشریح سے مقصود یہ ہے کہ یہ چاروں دعائیں جو چار اول المعزم شیعہروں کی زبان نبوت سے ادا ہوئیں، کسی قدر معنوی اشتراک کی وجہ سے باہم وہی نسبت رکھتی ہیں جو تنہیل دین کے مختلف مدارج میں کسی کو نظر آ سکتی ہے۔ دعائے محمدی ﷺ حکیمی شکل کی آئینہ دار ہے، وہ مختصر ہے، تاثیر سے لمبیز ہے خدا کی تمام صفات کاملہ کا مرتع ہے، تمام مقاصد اور احکام شریعت کی جامع ہے، اس کے الفاظ میں ایسی عالمگیری ہے جو ہر وقت اور ہر حالت میں ہر انسان کے دل کی نمائندگی کر سکتی ہے، وہ ایسے استعارات سے پاک ہے جو ظاہر بینوں کی لغوش کا باعث ہوں اور خدا کو انسانوں سے رحم و کرم کی صفت قرض لینے پر آمادہ کرتے ہیں۔ نیزوہ خدا کی رحمت عام کو ایسے عنوان سے ادا کرتی ہے، جس میں کائنات کا ایک ایک ذرہ داخل ہے خدا کی وہ تین صفتیں جن کا تصور کیے بغیر خدا کا تصور پورا نہیں ہو سکتا۔ (یعنی رو بیت، رحمت اور مالکیت) یہ سورہ ان سب کی جامع ہے، رو بیت میں وہ تمام صفتیں داخل ہیں جن کا تعلق پیدائش سے لے کر موت تک ہر مخلوق کے ساتھ قائم رہتا ہے۔ رحمت اس کی وہ عالمگیر صفت ہے جس میں اس کی تمام جمالی صفتیں کی نیرنگیاں ظاہر ہوتی ہیں۔ مالکیت اس کی تمام جمالی صفتیں کا مظہر ہے اور پوری سورہ دعا کے اغراض شامل شحمد اچھائیوں کے لئے درخواست اور برائیوں سے بچانے کی انجام پر مشتمل ہے۔ طرز بیان خدا اور بندہ کے شایان شان ہے۔ درخواستیں حد درجہ موڈ بانہ ہیں۔ اوصاف الہی وہی ہیں جو ایک دعا کے مناسب ہو سکتے ہیں۔ دعا میں عموم ہے، وہ ذاتیات تک محدود نہیں ہے۔ للہیت اور روحانیت کا کمال منتها نے نظر ہے، اس لئے دنیاوی چیزوں کا ذکر نظر انداز کیا گیا ہے۔ خدا کے اوصاف اور بندہ کی انجاؤں میں کیت اور کیفیت دونوں حیثیتوں سے تابع موجود ہے۔ یعنی دونوں حصول نے مناسبت کے ساتھ جگہ گھیری ہے اور دونوں نکڑوں کے مضامین میں ربط اور تعلق قائم ہے، خدا کے عظمت و جلال، رحم و کرم، قدرت و شوکت، شفقت و رافت اور بندہ کے خشوع و خضوع، بلند حوصلگی، صداقت طلبی کا ایسا جامع محضرا اور پرا شریان سورہ فاتحہ کے سوا اور کہاں مل سکتا ہے۔

نماز کے لیے تعین اوقات کی ضرورت

نماز کے سلسلہ میں اسلام کا ایک اور بھی مکمل کارنا۔ اوقات نماز کی تعین ہے، ظاہر ہے کہ دنیا کا کوئی کام وقت اور زمانہ کی قید سے آزاد نہیں ہو سکتا، اس لیے کسی کام کے کرنے کے لیے وقت سے بے نیازی ممکن نہیں، اب سوال یہ ہے کہ کیا نماز کے لیے خاص خاص اوقات کی تعین ضروری ہے؟ واقعہ یہ ہے کہ محمد رسول اللہ ﷺ جس دین کامل کو لے کر مبعوث ہوئے اس کی بڑی خصوصیت یہ ہے کہ وہ عملی ہے، محض نظری نہیں، اس نے نماز کی تعلیم وی تو محض اصول اور نظریات کے لحاظ سے نہیں، بلکہ اس لیے کہ انسان روزانہ مختلف اوقات میں اس فرض کو ادا بھی کرے، انسان کی نفس (سانکیلو جیکل) خصوصیت یہ ہے کہ جو کام مداومت کے ساتھ اس کو کرنا ہوتا ہے، جب تک وہ اس کے اوقات نہ مقرر کر لے، کبھی وہ اس کو مستعدی کے ساتھ بلا ناغ انعام نہیں دے سکتا اسی لیے ہر منظم باقاعدہ اور داعی عمل کے لیے اوقات کی تعین ضروری ہے اور یہی طریقہ تمام دنیا نے اپنے باقاعدہ اور منظم کاموں کے لیے اختیار کیا ہے، اس میں اصلی راز یہ ہے کہ جب انسان کو یہ معلوم ہوتا ہے کہ اس کو کسی کام کے کرنے کے لیے ۲۴ گھنٹوں کی مہلت ہے تو وہ ہمیشہ سستی اور کامیابی سے اس کام کو ایک وقت سے دوسرے وقت پر ثالتا جاتا ہے، یہاں تک کہ دن تمام ہو جاتا ہے اور آخری گھنٹی بھی گزر جاتی ہے اور وہ اس کام کو انعام نہیں دیتا لیکن جب کاموں کے لیے اوقات متعین ہو جاتے ہیں تو ہر مقررہ وقت کی آمد انسان کو اس وقت کا کام یاد دلاتی ہے اور وہ وقت گزر نے نہیں پاتا کہ دوسرے کام کا وقت آ جاتا ہے، اس طرح وقت کا فرشتہ ہر وقت انسان کے فرائض کو یاد دلاتا رہتا ہے اور تمام کام پابندی کے ساتھ بلا ناغ انعام پاتے ہیں۔

اوقات نماز کے تقریر میں وہ چیز بھی مذکور ہے جس کا ذکر پہلے آچکا ہے، یعنی اصول وحدت جو اسلام کا اصلی رمز اور شعار ہے۔ مسلمان مختلف شہروں، ملکوں اور قبیلوں میں بزرگوں لاکھوں اور کروڑوں کی تعداد میں آباد ہیں، مگر یہ کثرت ایک خاص وقت اور ایک خاص حالت میں وحدت کا مرقع بن جاتی ہے۔ کہہ ہو ایں لگی ہوئی دور میں سے اگر زمین کی طرف دیکھو تو ایک خاص وقت میں لاکھوں، کروڑوں انسانوں کو ایک ہی وضع میں، ایک ہی شکل میں خالق عالم کے سامنے سرگاؤں پاؤ گے اور جہاں تک مطاعن و مغرب میں نمایاں فرق نہ ہوگا یہی مظراً لاکھوں کے سامنے رہے گا، مختلف ملکوں میں طلوع و غروب کا اختلاف اگر اس وحدت کے رنگ کو کامل نہیں ہونے دیتا تو کم از کم اتنی وحدت تو تعین ہے کہ جس حالت میں ایک جگہ آفتاب ہوتا ہے، جب دوسری جگہ بھی اسی حالت میں ہوتا ہے تو نماز کا فرض اس وقت وباں ادا ہوتا ہے۔ یہ وحدت ظاہر ہے کہ اوقات کے تقریر کے بغیر ممکن نہ تھی، اگر ایسا نہ ہوتا تو صفحہ ارضی تو کبھی ایک محلہ، ایک گھر کے مسلمان بھی ایک جگہ اور ایک حالت میں نظر نہیں آ سکتے تھے۔

نماز کے اوقات دوسرے مذہبوں میں

اسی لیے اوقات کے تقریباً اور تعین کی اس مصلحت کو دنیا کے تمام مذہبوں نے یکساں تسلیم کیا ہے اور اپنے نظریوں اور اصولوں کے مطابق عبادتوں کے مختلف اوقات مقرر کر رکھے ہیں، ہندو آفتاب کے طلوع و غروب کے وقت پوچاپٹ کرتے ہیں، زردشتی صرف طلوع آفتاب کے وقت زمزمه خواں ہوتے ہیں، رومان کیتھولیک عیسائی صبح کو طلوع آفتاب سے پہلے، پھر شام کو، پھر رات کو سوئے وقت دعا مانگتے ہیں، یہودیوں میں تین وقت کی نمازیں ہیں جن کو ”یفلاء“ کہتے ہیں، دانیال نبی کی کتاب میں ہے:

”جب دانیال کو معلوم ہوا کہ نوشتہ پر دستخط ہو گئے تو وہ اپنے گھر آیا اور اپنی کو ٹھڑی کا دروازہ جو بیت المقدس کی طرف تھا، کھول کر اور دن بھر میں تین مرتبہ گھنٹے ٹیک کر خدا کے حضور میں جس طرح سے پہلے کرتا تھا، دعا اور شکرگزاری (حمد) کرتا رہا…… پر ہر روز وہ تین بار دعا مانگتا ہے۔“

(۱۳۰-۲)

حضرت داؤد علیہ السلام کی زبور میں ان تین وقتوں کی تعین ان لفظوں میں ملتی ہے:

”پر میں خدا کو پکاروں گا، تب خدا مجھے بچا لے گا، شام کو اور صبح کو اور دوپھر کو میں فریاد کروں گا اور نالہ کروں گا، سودہ میری آوازن لے گا۔“ (۱۶-۵۵)

اسلامی اصطلاح میں ہم ان کو فجر، ظہر اور مغرب کی نمازیں کہہ سکتے ہیں۔

حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے دعاؤں اور نمازوں کی اہمیت اور زیادہ بڑھائی، لوقا کی انجیل میں ہے:

”پھر اس نے (حضرت عیسیٰ نے) اس لیے کہ ان کو ہمیشہ دعا میں لگے رہنا اور سُتی نہ کرنا، ضرور ہے ایک تمثیل کہی۔“ (۱۸-۱)

حواریوں کے اعمال سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی شریعت میں بھی نماز کے کچھ اوقات وہی تھے جو یہودیوں میں تھے اور کچھ اور زیادہ تھے، ظہر کی نمازان کے ہاں بھی تھی، چنانچہ اعمال میں ہے:

”پھر اس دوپھر کے قریب کوٹھے پر دعا مانگنے لگا۔“ (اعمال ۹-۱۰)

لیکن ان کے علاوہ بعض اوقات بڑھائے بھی گئے۔ ایک جگہ ہے:

”پس پھر اس اور یوحنا ایک ساتھ دعا کے وقت تیسرے پھر یہ یکل کو چلے۔“ (اعمال ۱-۳)

یونانی میں تیسرے پھر کی بجائے نویں گھنٹی کو لکھا ہے جس کو ہم عصر کہتے ہیں، پھر اسی وقت کی نماز کا ذکر اعمال ۱۰-۳ میں بھی ہے۔

ایک دفعہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے کسی شاگرد نے نماز کی خاص دعا دریافت کی، آپ نے بتائی اور فرمایا کہ دعا کا بہترین وقت آٹھی رات ہے۔

اور ایسا ہوا کہ وہ ایک جگہ دعا مانگ رہا تھا جب مانگ چکا، ایک نے اس کے شاگردوں میں سے اس سے کہا کہ اے خداوند! ہم کو دعا مانگنا سکھا، جیسا کہ یوحنًا (حضرت یوحنا علیہ السلام) نے اپنے شاگردوں کو سکھایا اس نے ان سے کہا، جب تم دعا مانگو تو کہو..... اس نے ان سے کہا، تم میں سے کون ہے، جس کا ایک دوست ہوا اور وہ آدمی رات کو اس کے پاس آ کر کہے، اے دوست! مجھے تمین روٹی ادھارو دے۔“ (لوقا ۱۱: ۲۰-۲۱)

اس تمثیل میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے رات کی نماز کی تعلیم دی ہے، چنانچہ جس شب کو انہیں گرفتار کیا گیا وہ ایک جماعت کے ساتھ اسی نماز تجدید میں مصروف تھے۔ (لوقا ۳۹: ۲۲-۳۹)

صحح کی نماز کا ذکر بھی انجیل میں موجود ہے، مرسی کے پہلے باب کی ۳۵ آیت میں ہے: ”اور بڑے تر کے پوچھنے سے پہلے وہ ائمہ کے نکلا اور ایک دریان جگہ میں گیا اور وہاں دعا مانگی۔“ * بلکہ عربی ترجمہ سے جو براہ راست یونانی سے ہوا ہے۔ * یہ ظاہر ہوتا ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام دو اس وقت نماز پڑھا کرتے تھے، چنانچہ اس میں اس آیت کا عربی ترجمہ یہ ہے: ”وفی الصبح باکرا جدا فام و خرج و مضى الى موضع خلاء و کان يصلی هناك“ یعنی وہ وہاں نماز پڑھا کرتے تھے۔ اب ان اوقات کو جو یہودی اور عیسوی کتابوں میں مذکور ہیں ہم جمع کر لیں، تو وہی اسلامی نماز کے اوقات ہو جائیں گے جن میں سے صحح (فجر) دوپہر (ظہر) اور شام (مغرب) کا ذکر زبور (۱۶-۵۵) میں، صحح کا مرسی (۳۵) میں عصر کا اعمال (۳۰-۳۱، ۳۲-۳۳) میں ہے اور عشاء (رات) کی نماز کا لوقا (۱۱-۲۲، ۳۹) میں۔

نماز کے لیے مناسب فطری اوقات

اصل یہ ہے کہ حق تواریخا کہ انسان بھی فرشتوں کی طرح شب و روز صرف دعا و نماز میں مصروف رہتا، مگر انسان کی فطری و نوعی ضرورتوں کے سبب سے ایسا ہونا ممکن اور مناسب نہ تھا، اس لیے شریعت نے اس کی تلافی اس طرح کی کہ اس کے لیے چند مناسب اوقات مقرر کر دیے، ہر انسان ہر روز مختلف قسم کے کاموں میں اپنی عمر کے یہ ۲۲ گھنٹے بس رکرتا ہے، صحح کو بیدار ہوتا ہے، دوپہر تک کام کر کے تھوڑی دیرستاتا ہے، پھر سہ پہر تک وہ اپنا بقیہ کام انجام دیتا ہے اور اس کو تمام کر کے سیر و تفریح اور دلچسپ مشاغل میں دل بہلاتا ہے، شام ہوتی ہے تو گھر آ کر خانگی زندگی کا آغاز کرتا ہے اور کھانی کر تھوڑی دیر کے بعد طویل آرام اور غفلت کی نیند کے لیے تیار ہوتا ہے، اسلامی نمازوں کے اوقات پر ایک غائر نظر ڈالنے سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ اسلام نے روزانہ کے ان مختلف انسانی مشاغل کے ہر آغاز پر ایک وقت کی نماز رکھی ہے، تاکہ پورے اوقات خدا کی یاد ہی میں محسوب ہوں، نور ظہور کے وقت جب صحح کی شیم سحری حقیقی علی الصلوٰۃ کا نغمہ جانفراسناتی ہے اور ہر شے کی زبان سے عالم کے صانع کی تشیع و تمجید کا ترانہ بلند ہوتا ہے تو یہ وقت غالباً انسانوں کے سر جھکانے کے لیے بھی

* مطبوع لندن ۱۸۹۵ء۔ * مطبوع مطبع ادیبیہ بیروت ۱۸۸۸ء مطبع آکسفورد ۱۸۹۰ء۔

نہایت موزوں ہے کہ کتاب زندگی میں حیاۃ امر و زہ کا ایک نیا ورق اس وقت کھلتا ہے، اس لیے مناسب ہے کہ اس دن کے، کارنا موس کی لوح پر سب سے پہلے بحمدہ نیاز کا طغراً نقش ہو، اس کے بعد انسان اپنی محنت و مشقت کا آغاز کرتا ہے اور دو پھر تک اس میں مصروف رہتا ہے، دو پھر کو روزانہ کاروبار کا نصف حصہ ختم کر کے آدمی تھوڑی دیر کے لیے آرام کرتا ہے، اس موقع پر بھی اس کو خدا کا شکر ادا کرنا چاہیے کہ دن کا آدھا کام بخیر و خوبی ختم ہو گیا، پھر سہ پہر کے بعد جب اپنے اس دن کا کام ختم کر کے سیر و تفریح اور ذاتی آرام کے کام شروع ہوتے ہیں۔ تو یہ وقت بھی ایک دفعہ خدا کا نام لینے کا ہے، اس کے بعد شام ہوتی ہے اور دنیا کے انقلاب کا دوسرا منتظر پیش کرتی ہے، دن بھر کے کاموں کے بعد اب آرام و سکون کا دور شروع ہوتا ہے، اس لیے ضرور ہے کہ اس کا سر نامہ بھی عبودیت کا سجدہ ہو، پھر سوتے وقت جب انسان اپنی با احساس زندگی سے پکجھ دیر کے لیے بے خبر ہونے لگتا ہے تو مناسب ہے کہ وہ خدا کا نام لے کر اس جہان سے بے خبر ہو، کیونکہ اسے کیا معلوم کہ اس وقت کی ان بند ہونے والی آنکھوں کو پھر بھی کھلنا بھی نصیب ہو گا۔ اسی طرح آخر عمر تک روزانہ کام کے یہ ہیں اپنی جگہ پر گھومتے رہتے ہیں۔ صبح سے دو پھر تک انسان کی مصروفیت کے اصلی گھنٹے ہیں، اسی لیے صبح سے زوال تک کوئی فرض نماز نہیں رکھی گئی، اسی طرح عشا سے لے کر صبح تک کوئی فرض نماز نہیں ہے، یہ وقت صرف خواب راحت کے لیے موزوں ہے، ان خاص اوقات کو چھوڑ کر بقیہ اوقات تمام تر انسان کے کام کے ہیں، انھیں کام کے اوقات کے شروع میں نماز پڑھنے مقرر ہوئی ہے۔

اسلامی اوقات نماز میں ایک نکتہ

اوقات نماز کی تعین میں اسلام کے لیے ایک اور اصول کو بھی پیش نظر کھانا ضروری ہے، دنیا کے مشرکانہ مذاہب کی تاریخ پر ہم سے معلوم ہوتا ہے کہ انسانوں کے شرک کا سب سے بڑا مظہر جسد کائنات کا سب سے زیادہ تباہا کچیرہ (آفتاب) ہے ہندوستان، ایران، بابل، عرب، مصر، شام، روم، یونان ہر جگہ سورج کی پرستش کی جاتی تھی، جس کی روشنی قلوپ انسانی کی تاریکی کا سب سے بڑا سبب بنتی تھی، آفتاب پرست قوموں میں آفتاب کی پرستش کے خاص اوقات تھے، جب وہ صبح کو اپنے شہابہ جاہ و جلال کے ساتھ نمودار ہوتا ہے، پھر جب وہ آہستہ آہستہ مملکت نیروں کو فتح کر کے دنیا پر اپنے فاتحانہ تسلط کا اعلان کرتا ہے، پھر شام کو جب وہ عالم کائنات سے رخصت ہو کر نقاہ شب میں اپنا چہرہ چھپا لیتا ہے۔ سب سے پہلا موحد جس نے آفتاب پرستی کو گل کیا ۷ حضرت ابراہیم خلیل اللہ تھے۔ ملت ابراہیمی میں نماز کے وہ اوقات مقرر کیے گئے، جب ستارہ پرستوں کے خدامے عظم (آفتاب) کے ظہور اور عروج کا نہیں بلکہ اس کے زوال اور غروب کا وقت ہوتا ہے، تاکہ یہ اوقات خود زبان حال سے شہادت دیں کہ یہ آفتاب پرستی کے باطل عقیدہ کے خلاف اس خدامے برحق

کی عبادت ہے، جس کے آستانہ کمال کے سجدہ سے خود آفتاب کی پیشانی بھی داندار ہے، وہیں محمدی، ملت ابراہیمی کا دوسرا نام ہے، اس لیے اس میں بھی نماز کے اوقات وہی رکھنے گے جو ملہت ابراہیمی میں تھے، دن نکلنے سے پہلے جب باطل پرستی کا یہ دیوتا (آفتاب) پر دعہ عدم میں روپوش ہوتا ہے، دوپہر کے بعد جب یہ اپنے انتہائی عروج کو پہنچ کر انحطاط اور تنزل کی طرف جھلتا ہے، اس انحطاط اور تنزل کے بھی دو تین دور ہوتے ہیں جب سر (ست الراس) سے نیچے اترتا ہے، جس کو زوال کہتے ہیں، جب آنکھوں کے دارہ تقابل سے نیچے اترتا ہے جس کو عصر کہتے ہیں اور پھر جب دارہ نظر (افق) سے نیچے گرتا ہے جس کو مغرب کہتے ہیں، آفتاب کے ان تینوں اوقاتیں انحطاط میں ایک نماز اور ہوتی ہے، خوب اچھی طرح ڈوبنے کے بعد جب وہ تاریکی کی قبر میں مدفن ہو جاتا ہے، اس وقت عشاء کی نماز ادا کی جاتی ہے۔ اسی لیے قرآن پاک میں نماز کے اوقات کے ذکر میں آفتاب کے ڈھلنے اور تاریک ہونے کا خاص طور سے ذکر آیا ہے:

﴿أَقِمِ الصَّلَاةَ لِدُلُوكِ الظُّهُرِ مِنْ إِلَى غَسْقِ الظَّلَّ وَقُرْآنَ الْفَجْرِ﴾

(۷۸/ بنی اسراء یہل: ۷۸)

”نماز کھڑی کر آفتاب کے انحطاط کے وقت، رات کی تاریکی تک، (ظہر، عصر، مغرب، عشاء) اور فجر کی نماز۔“

تفصیل آگے آتی ہے۔

غرض یہی سبب ہے کہ اسلام میں کوئی فرض نماز صحیح سے دوپہر تک نہیں رکھی گئی کہ یہ آفتاب کے عروج کا وقت ہے، بلکہ تمام نمازیں آفتاب کے ہر تر تجھی انحطاط، تنزل اور روپوش کے اوقات میں ہیں، نیز یہی سبب ہے کہ اسلام میں آفتاب نکلنے وقت، اس کے عروج و کمال کے وقت اور اس کے ٹھیک ٹھیک غروب کے وقت نماز پر صنائع ہے ॥ کہ یہ آفتاب پر ستوں کی عبادت کے خاص اوقات ہیں۔

اسلام میں طریق و اوقات نماز

نماز کس طرح اور کن کن اوقات میں ادا کرے اور کتنی کمی رکعتیں کر کے پڑھنی چاہیے اور اس کے کیا آداب و شرائط ہیں، ان سب کے لیے قرآن پاک میں ایک جامع آیت ہے جو لڑائی کی حالت میں نماز ادا کرنے کی تفصیل کے سلسلہ میں مذکور ہے:

﴿حَفِظُوا عَلٰى الصَّلَاةِ وَالصَّلُوةَ الْوُسْطَىٰ وَقُومُوا بِلِلٰهِ قَنِيْتُمْ ۝ فَإِنْ خَفِنْتُمْ فَرِجَالًا أَوْ رُبَّنًا ۝ فَإِذَا آمِنْتُمْ فَاقْذُرُوا اللّٰهَ كَمَا عَلَيْكُمْ مَالَمْ تَكُونُوا عَلَمُوْنَ ۝﴾

(۲۲۸-۲۳۹/ البقرۃ: ۲)

”نمازوں پر اور نیچے کی نمازوں پر پابندی کرو اللہ کے لیے (نماز میں) ادب سے کھڑے ہو، پھر اگر

● صحیح مسلم، کتاب الصلوٰۃ، باب الاوقات التي نهى عن الصلوٰۃ فيها: ۱۹۲۰ تا ۱۹۲۶ء۔

دشمنوں کا خوف ہو یا تو پیادہ ہو کر یا سوار ہو کر (نماز پڑھو) پھر جب تم کو امن ہو جائے تو خدا کو اس طرح یاد کرو جس طرح اس نے تم کو سکھایا جس سے تم پہلے واقف نہ تھے۔“

اس آیت پاک سے یہ بات بصریح ظاہر ہوتی ہے کہ ان باتوں کی کہ ہم کو نماز کس طرح اور کن اوقات میں اور کتنی رکعتوں کے ساتھ پڑھنی چاہیے، خود اللہ تعالیٰ نے اسی طرح تعلیم فرمائی ہے جس طرح خود قرآن پاک کی، اس ابھال کی تفصیل سنت نبوی کے ذریعہ احادیث میں تحریر، اور مسلمانوں کے نسل ابعض مسلم متفقہ تو اتر عمل میں عملاً موجود ہے اور قرآن پاک میں اس کے عملی حوالے اور متعلقہ احکام مذکور ہیں۔

نمازوں کی پابندی و نگرانی

اس سلسلہ میں سب سے پہلی بات یہ ہے کہ ہم نمازوں کو پابندی سے ادا کریں، ان کی نگہداشت رکھیں، اور ان پر مدد اور مدد کریں۔ قرآن پاک میں نماز کی پابندی، نگہداشت اور مدد اور مدد کے لیے ایک خاص لفظ ”محافظت“ کا استعمال کیا گیا ہے جس کے لفظی معنی نگرانی کے ہیں اور جس کی وسعت میں پابندی سے ادا کرنا، وقت پر ادا کرنا اور بشرط ادا کرنا سب داخل ہیں۔ فرمایا:

﴿لَحِظُوا عَلَى الصَّلَاةِ﴾ (۲/ البقرة: ۲۳۸)

”نمازوں کی نگرانی رکھو۔“

﴿وَالَّذِينَ هُمْ عَلَى صَلَاتِهِمْ يَحَافِظُونَ﴾ (۷۰/ المعارج: ۳۴)

”اور جو اپنی نمازوں کی نگرانی رکھتے ہیں۔“

﴿وَالَّذِينَ هُمْ عَلَى صَلَاتِهِمْ يَحَافِظُونَ﴾ (۹/ المؤمنون: ۲۳)

”اور جو لوگ اپنی نمازوں کی نگرانی رکھتے ہیں۔“

﴿وَهُمْ عَلَى صَلَاتِهِمْ يَحَافِظُونَ﴾ (۶/ الانعام: ۹۳)

”اور وہ اپنی نمازوں کی نگرانی رکھتے ہیں۔“

ایک آیت میں یہ بھی فرمایا:

﴿الَّذِينَ هُمْ عَلَى صَلَاتِهِمْ دَائِرُونَ﴾ (۷۰/ المعارض: ۲۳)

”جو اپنی نماز ہمیشہ ادا کرتے ہیں۔“

ان آیتوں سے ثابت ہوا کہ نماز ایسا فرض ہے جو کسی مسلمان سے کسی حال میں معاف نہیں ہو سکتا اور اس کو ہمیشہ پابندی کے ساتھ وقت پر اور اس کے سارے شرائط کے ساتھ ادا کرنا چاہیے۔

نماز کے اوقات مقرر ہیں

اس کے بعد یہ مسئلہ ہے کہ نماز کے لیے اللہ تعالیٰ نے کچھ اوقات مخصوص فرمائے ہیں۔ ارشاد ہے:

﴿إِنَّ الصَّلَاةَ كَانَتْ عَلَى الْمُؤْمِنِينَ كَلِمَاتًا مَوْفُوتًا﴾ (٤/ النساء: ١٠٣)

”بے شبه نماز مسلمانوں پر مقررہ اوقات میں فرض ہے۔“

اس آیت پاک سے معلوم ہوا کہ، ہماری فرض نمازوں کے لیے اوقات مخصوص ہیں۔

وہ اوقات کیا ہیں؟

اوائی نماز کے لیے قرآن نے زیادہ تر میں لفظ استعمال کیے ہیں صلوٰۃ یا اقامت صلوٰۃ، تسبیح اور ذکر اللہ۔ پہلا لفظ اقامت صلوٰۃ نماز کے لیے مخصوص ہے، لیکن دوسرا اور تیسرا لفظ عام شیع و تحرید اور یادِ اللہ کے لیے بولا جاتا ہے، جس کا جزو عظم تسبیح و تحرید ہے، احادیث میں بھی تسبیح کے معنی نماز پڑھنے کے ہیں۔ ۱۴ اور اشعار عرب ۱۵ و لغت عرب ۱۶ سے بھی اس کا ثبوت ملتا ہے۔ قرآن میں جب اس لفظ (تسبیح) کے ساتھ وقت کی تخصیص ہو گئی تو اس سے کسی شبہ کے بغیر نماز کے علاوہ کوئی اور چیز مراد نہیں ہو سکتی، کیونکہ وقت مخصوص کے ساتھ اسلام میں نماز کے علاوہ کوئی عام تسبیح فرض نہیں ہے البتہ اوقات کی تخصیص کے بغیر قرآن نے جہاں تسبیح کا حکم دیا ہے، اس سے خدا کی عام یاد و توصیف مراد ہو سکتی ہے۔ اس تحرید کے بعد حسب ذیل آیتوں پر نظر کرنی چاہیے:

۱۷ ﴿قُمِ الْيَلَى إِلَّا قَيْلَأًٌ تِصْنَةً أَوْ نَقْضٌ مِنْهُ قَيْلَأًٌ أَوْ زُدْ عَلَيْنِكُو رَتِيلُ الْقُرْآنَ تَرِيلَلَطُ﴾

(المزمول: ٤-٢)

”رات کو کھڑا رہا کر گر کچھ کم یا آدمی رات یا اس سے کچھ گھنادے یا بڑھا لے اور قرآن (اس میں) ٹھہر ٹھہر کر پڑھ۔“

۲ ﴿وَسَيِّدُنَّا مُحَمَّدُ رَبُّكَ يَا الْعَظِيْمُ وَالْإِلَهُكَارُ﴾ (٤٠/ المؤمن: ٥٥)

”اور اپنے رب کی حمد سے پھر اور صبح کو کرو۔“

۳ ﴿وَسَيِّدُوُّبَدْرَةٍ وَّأَصْبِلَأً﴾ (٤٢/ الاحزاب: ٤٢)

”اور تم اس کی پا کی صبح کو اور سہ پہر کو کیا کرو۔“

۴ ﴿وَسَيِّدُوُّبَدْرَةٍ وَّأَصْبِلَأً﴾ (٤٨/ الفتح: ٩)

”اور تم اس کی پا کی صبح کو اور سہ پہر کو بیان کرو۔“

۵ ﴿وَادْلُرَرَبِّكَ فِي تَقْرِيْكَ تَقْرِيْعًا وَخِيْفَةً وَدُونَ الْجَهَرِ مِنَ الْقُوْلِ يَالْفُدُودُ وَالْأَصَالُ وَكَا تَلْكُنُ مِنَ الْغَفِيلِيْنَ﴾ (٧/ الاعراف: ٢٠٥)

صحیح مسلم، باب استحباب صلوٰۃ الصحنی: ۱۶۶۲ ”مارایت رسول اللہ ﷺ یصلی سبحة الصحنی فقط وانی لا سبحة“ نیز صحیح مسلم، باب جواز صلاة النافلة على الدابة، ۱۶۱۹، ۱۶۱۸، ۱۶۱۰، ۱۶۱۸/۶۔ ۱۸ اعشی وائل کاشعر ہے: وسیع على حین العشیات والضحی. ولا تحمد الشیطان والله فاحمد (شعراء الجاهلية ج ۳، ص: ۲۶۵) وکتاب شعراء النصرانية (قسم ثالث فی شعراء بکر بن وائل من بنی عدنان) ص: ۳۶۵ (بیروت)۔ ۱۹ لسان العرب، ج ۲، ص: ۸۲، مصر۔

”اور تو اپنے پروردگار کو اپنے دل میں گڑا گڑا کرو اور پست آواز میں، صبح کو اور دوپہر کو یاد کرو اور بھولنے والوں میں سے نہ ہو۔“

❸ ﴿ وَلَا تَطْرُدُ الَّذِينَ يَذْعُونَ رَبَّهُمْ بِالْغَدْوَةِ وَالْعَشَيْتِ ﴾ (۶/ الانعام: ۵۲)

”اے رسول! ان کو مت انکال جو اپنے پروردگار کو صبح کو اور سہ پہر کو پکارتے ہیں۔“

❹ ﴿ فِي بَيْوَتٍ أَذِنَ اللَّهُ أَنْ تُرْفَعَ وَيُذْكَرَ فِيهَا اسْمُهُ لَا يُسَيِّمُهُ لَهُ فِيهَا بِالْغَدْوَةِ وَالْأَصَالِ ﴾ (۷)

(۳۶/ النور: ۲۴)

”ان گھروں میں جن کو بلند کرنے کا حکم خدا نے دیا ہے اور ان میں خدا کا نام لیا جاتا ہے اور ان میں وہ لوگ جن کو دنیا کا کاروبار خدا سے غافل نہیں کرتا، صبح اور سہ پہر کو خدا کی پاکی بیان کرتے ہیں۔“

❺ ﴿ وَاصْبِرْ نَفْسَكَ مَعَ الَّذِينَ يَذْعُونَ رَبَّهُمْ بِالْغَدْوَةِ وَالْعَشَيْتِ ﴾ (۱۸/ الكهف: ۲۸)

”اور تو (اے رسول) اپنے کوان لوگوں کے ساتھ روکرے رہ جو اپنے پروردگار کو صبح اور سہ پہر کے وقت پکارتے ہیں۔“

❻ ﴿ وَسَيِّخَ يَحْمَدُ رَبِّكَ حِينَ تَقُومُ وَمِنَ الَّيْلِ فَسِّعْنَهُ وَإِذْبَارَ الْجُمُورِ ﴾ (۸)

(۴۸-۴۹/ الطور: ۵۲)

”اور تو اپنے پروردگار کی حمد کی پاکی بیان کر، جب تو اٹھتا ہے اور رات کے کچھ حصے میں اس کی تسبیح کرو ستاروں کے پیچے پھیرتے وقت۔“

❽ ﴿ وَأَقِمِ الصَّلَاةَ صَرِيقَ التَّهَارِ وَرَلْفَآ مِنَ الَّيْلِ ﴾ (۱۱/ هود: ۱۱۴)

”اور نمازِ وقتِ کرودن کے دونوں کناروں میں اور رات کے کچھ مکڑوں میں۔“

❾ ﴿ أَقِمِ الصَّلَاةَ لِدُلْوَى الشَّمْسِ إِلَى عَسْقَ الَّيْلِ وَقُرْآنَ الْفَجْرِ إِنَّ قُرْآنَ الْفَجْرِ كَانَ مَشْهُودًا وَمِنَ الَّيْلِ فَتَبَجَّدْ يَهُ نَافِلَةً لَكَ ﴾ (۱۷/ بنی اسرائیل: ۷۸-۷۹)

”نمازِ قائم کر آفتاب کے جھکاؤ کے وقت رات کی ابتدائی تاریکی تک اور فجر کا پڑھنا، بیشک فجر کا پڑھنا پر حضور ہے اور رات کو کچھ دیر جاگ کر مزید نماز پڑھ (تجبد)۔“

❿ ﴿ وَاذْكُرْ أَسْمَرَتِكَ بَكْرَةً وَأَصِيلًا وَمِنَ الَّيْلِ فَاسْجُدْ لَهُ وَسَيِّعْهُ لَيَلَالَ طَيْلَالًا ﴾ (۱۰)

(۷۶-۷۵/ الدہر: ۷۶)

”اور اپنے پروردگار کا نام یاد کر صبح کو اور سہ پہر کو اور کچھ رات گئے اس کو سجدہ کرو بڑی رات تک اس کی تسبیح کرو۔“

❻ ﴿ فَاصْبِرْ عَلَى مَا يَقُولُونَ وَسَيِّخَ يَحْمَدُ رَبِّكَ قَبْلَ طُلُوعِ الشَّمْسِ وَقَبْلَ غُرُوبِهَا وَمِنْ

۱۳۰ طہ: ۲۰) اَنَّاۤئِ الْلَّیْلِ فَسِیْمٌ وَآطْرَافُ النَّهَارِ لَعَلَّکَ تَرْضَیۤ ۝

”کافروں کے کبے پر صبر کرو اور اپنے پروگار کی حمد کی تسبیح پڑھ آتا قاب نکلنے سے پہلے اور اس کے ذوبنے سے پہلے اور رات کے کچھ حصوں میں اس کی تسبیح پڑھ اور دن کے کناروں میں تاکہ تو خوش رہے۔“

۱۴) ﴿ قَسْبُحَنَ اللَّهُ جِينَ تُمْسُونَ وَجِينَ تُصْبِحُونَ وَكَلَّهُ الْحَمْدُ فِي السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ وَعَثَيْاً وَجِينَ تُظَهِرُونَ ۝﴾ (الروم: ۱۷-۳۰)

”تو خدا کی تسبیح پڑھو، جب شام کرو اور جب صبح کرو اور اس کی حمد آسمانوں اور زمین میں اور دو پہر کرو اور جب تم دو پہر کرو۔“

۱۵) ﴿ فَاصْبِرْ عَلَىٰ مَا يَقُولُونَ وَسَيِّئْ بِمَحْدُرِيَّكَ قَبْلَ طُلُوعِ الشَّاهِمِينَ وَقَبْلَ الْغُرُوبِ ۝ وَمَنِ الْلَّیْلَ فَسِیْحُهُ وَآدِبَ الرَّسْجُودُ ۝﴾ (النور: ۵۰-۳۹)

”تو ان کافروں کے کبے پر صبر کرو اور اپنے پروگار کی حمد کی تسبیح پڑھ اور ذوبنے کے بعد۔“

۱۶) ﴿ مِنْ قَبْلِ صَلْوَةِ الْفَجْرِ وَجِينَ تَضَعُونَ شَيْأَكُمْ قِنَ الظَّهِيرَةَ وَمِنْ بَعْدِ صَلْوَةِ الْعِشَاءِ ۝﴾ (النور: ۵۸)

”فجر کی نماز سے پہلے اور جب دو پہر کی گرمی کے سبب سے کپڑے اتارتے ہو اور عشاء کی نماز کے بعد۔“

ان اوپر کی آیتوں میں نماز کے مختلف اوقات کا ذکر ہے، ان میں سے بعض مکرر ہیں اور بعض نہیں۔ مکرر اوقات کو ملادینے کے بعد یہ وہی پانچ وقت ہو جاتے ہیں، جن میں رسول اللہ ﷺ تمام عمر نماز ادا فرماتے رہے اور آپ کے بعد آپ کے صحابہ اور اس وقت سے لے کر آج تک تمام روئے زمین کے مسلمان نسل ابعد نسل ادا کرتے آئے ہیں اور جن کے مشہور نام، فجر، ظہر، عصر، مغرب، عشاء ہیں، غدو، غدہ، بکرہ، فجر، قبل طلوع شمس اور حین تصبحون کے معنی صبح کی نماز، اصبل، عشی اور قبل غروب الشمس سے مراد عصر، دلوك الشمس (زوال) اور حین تظہرون (جب دو پہر کرو) سے مقصد ظہیر، طرف النہار دن کا کنارہ اور تمسون (جب شام کرو) سے مراد مغرب اور من آناء اللیل (کچھ رات گزرے) غسق اللیل (رات کی ابتدائی تاریکی) اور صلواۃ العشاء میں مقصود عشاء کی نماز ہے اور یہی نماز کے پانچ اوقات ہیں، جن میں خدا کی یاد اور تسبیح و تحمد کا ہم کو حکم دیا گیا ہے۔

..... جہور کے نزدیک اس کا ترجیح ہو گا جدہ کے بعد اور عام اہل تفسیر نے اس سے فرض نمازوں کے بعد کی تسبیح و تہلیل مرادی ہے۔

اوقات کی تکمیل

نمازوں کے اوقات کی تدریجی تکمیل

اسلام کا آغاز سب کو معلوم ہے کہ کس غربت، مظلومی اور بے سر و سامانی کے ساتھ ہوا تھا، اس لیے ابتدائی زمانہ میں دن کے وقت کوئی نماز نہ تھی، لوگ صرف رات کو کہیں ادھرا وھر چھپ کر دیر تک نماز پڑھا کرتے تھے۔ سورہ مزمل میں جو کہ کمی نہایت ابتدائی سورتوں میں ہے، یہ آئیں ہیں:

﴿يَا أَيُّهَا الْمَرْءُ مِنْ إِنْ كَيْلَ إِلَّا قَلِيلًاٰ يَصْفَهُ أَوْ يَقْعُضُ مِنْهُ قَلِيلًاٰ أَوْ زُدْ عَلَيْهِ وَرَبِّكَ لِقُرْآنَ تَرْتِيلًاٰ إِنَّا سَلَقْنَ عَلَيْكَ قَوْلًا تَقْلِيلًاٰ إِنَّ نَاشِئَةَ الْيَلَى هِيَ أَشَدُّ وَطَاءً وَأَقْوَمُ قَلِيلًاٰ إِنَّ لَكَ فِي الشَّهَارِ سَبْعًا طَيْلَلًاٰ﴾ (۷۳ / المزمل: ۱-۷)

”اے کملی اوڑھ کر سونے والے، تھوڑی دیر کے علاوہ ساری رات اٹھ کر نماز پڑھا کر، آدمی رات تک یا اس سے کچھ کم یا اس سے (کچھ) زیادہ اور اس میں قرآن پھر پھر کر پڑھا ہم تھوڑے پر عنقریب ایک بھاری بات ڈالنے والے ہیں۔ یعنی (شریعت کے مفصل احکام اتنا نے والے ہیں) بے شک رات کو اٹھ کر نماز پڑھنے میں طمانتیت قلب کا زیادہ موقع ہے اور قرآن سمجھ کر پڑھنے کے لیے زیادہ مناسب ہے، بے شبه تجوہ کو دن کے وقت آرام کی فرصت حاصل ہے۔“

نماز کا یہ طریقہ غالباً ان تین برسوں تک رہا جب اسلام کی دعوت برلانہیں دی جا سکتی تھی، کیونکہ جہاں

﴿وَأَنْذِرْ عَشِيرَتَكَ الْأَقْرَبَيْنَ﴾ (۲۶ / الشعرا: ۲۱۴)

”اپے قریب کے اہل خاندان کو ہشیار کرو۔“

کے ذریعہ سے دعوت کے اعلان کا حکم آیا ہے، ویس یہ بھی اسی کے بعد مذکور ہے:

﴿وَتَوَكَّلْ عَلَى الْعَزِيزِ الرَّحِيمِ الَّذِي يَرِكَ جِئْنَ تَكْوُنُ وَتَقْلِبَكَ فِي الشَّجَدَيْنَ إِنَّهُ هُوَ السَّمِيمُ الْعَلِيِّمُ﴾ (۲۶ / الشعرا: ۲۱۷-۲۲۰)

”اور غالب مہربان پر بھروسہ کھو جو تھوڑا وسیع وقت دیکھتا ہے جب تو (نماز کے لیے) اٹھتا ہے اور نمازیوں میں تیرا پھرنا (دیکھتا ہے) بے شک وہی سنتا اور جانتا ہے۔“

اس کا مقصد یہ ہے کہ اعلان دعوت کا حکم ملنے سے پہلے آنحضرت ﷺ ان دشمنوں کے بیچ میں راتوں کو اٹھ کر خود نماز پڑھتے تھے اور مسلمانوں کو دیکھتے پھرتے تھے کہ کون نماز میں مصروف ہے اور کون سویا ہوا ہے جس کو نماز کے لیے جگانا چاہیے۔ ایسی پر خطر حالت میں آپ کا راتوں کو تن تھاں یہ فرض انجام دینے کے لیے نکلا اس اعتماد پر تھا کہ خدا آپ ﷺ کو خود دیکھ رہا ہے اور آپ کی حفاظت کر رہا ہے، اس کے بعد جب نبیتہ اطمینان حاصل ہوا اور دعوت کے اظہار کا وقت آیا تو رفتہ رفتہ اسلام کا قدم تکمیل کی طرف بڑھا اور رات کی طویل نماز (تجدد) کے علاوہ رات کے ابتدائی حصہ (عشاء) اور تاروں کے جھلکلاتے وقت بھی ایک نماز

(نمر) اضافہ کی گئی۔

﴿وَاصْبِرْ لِلّٰهِ رَبِّكَ فَإِنَّكَ بِأَعْيُنِنَا وَسَيَّمْ بِمُحَمَّدٍ رَبِّكَ حِينَ نَقْوَمٌ وَمِنَ الْيَوْمِ قَسْيَتُهُ وَإِذْبَارُ النَّجُومِ﴾ (۵۲/ الطور: ۴۸-۴۹)

”اور اپنے رب کے فیصلہ کا انتظار کھیج، بے شک تو ہماری آنکھوں کے سامنے ہے اور اپنے رب کی تعریف کی تسبیح کر جب تو (رات کو تجد کے وقت) امتحان ہے اور کچھ رات کے حصہ میں اس کی تسبیح کر اور ستاروں کے پیہی پھیرتے وقت۔“

یہ آیت سورہ طور کے آخر میں ہے اور سورہ طور کے متعلق معلوم ہے کہ وہ مکہ میں نازل ہوئی تھی ॥ اور شاید اس وقت جب قریش نے آنحضرت ﷺ کو ایذا دینا شروع کر دیا تھا۔ یونکہ اسی سورہ میں اس آیت سے پہلے آپ کے مصائب اور ان پر صبر کرنے اور فیصلہ الہی کے انتظار کا حکم اور آپ کی ہر قسم کی حفاظت کی خوشخبری ہے، ابھی تک یہ رات کی نمازوں کی تفریق ہے۔ سورہ دہر میں جو جمہور کے زندگی کی ہے اور غالباً سورہ طور کے بعد اتری ہے، انہی معنوں کی ایک اور آیت ہے جس میں ان اوقات کے علاوہ دن کے خاتمه کے قریب کی ایک نماز جس کو عصر کہیے اور بڑھتی ہے:

﴿فَاصْبِرْ لِلّٰهِ رَبِّكَ وَلَا تَأْطِعْ مِنْهُمْ أَيْمَانًا أَوْ لَقُورًا وَلَا ذُرْ أَسْمَرَ رَبِّكَ بَغْرَةً وَكَاصِيلًا وَمِنَ الْيَوْمِ فَالْمُجْدَلَةُ وَسَيِّدُهُ لَيْلًا طَوِيلًا﴾ (۷۶/ الدھر: ۲۴-۲۷)

”تو اپنے پروردگار کے فیصلہ کا انتظار کر اور ان مخالفوں میں سے کسی گناہ گار یا اللہ کے ناشکر گزار کا کہنا نہ مان اور صبح کو اور تیرے پہر کو اپنے پروردگار کا نام لیا کر اور کچھ رات گئے اس کو سجدہ کر اور رات کو دیریک اس کی تسبیح کیا کر۔“

اب رات کی دیریک کی نماز تجد کے علاوہ تین وقتیں کی تصریح ہے، یعنی صبح، اخیر دن اور ابتدائی شب مگر ہنوز اصل میں ظہر و عصر اور من ایل (رات) میں مغرب اور عشاء کی تفریق نہیں ہوئی تھی، کیوں کہ کل تین نمازوں تھیں ایک نمر کے وقت ایک سہ پہر کو اور ایک رات کو، اسی لیے ابھی تک باقی دونمازوں کی جگہ رات کو دیریک نماز پڑھتے رہنے کا حکم تھا، جیسا کہ آیت بالا سے ظاہر ہے۔

اب یا ان تین وقتیں کی تسبیح و تجدید با قاعدہ نماز کا قابل اختیار کرتی ہے حکم ہوتا ہے:

﴿وَأَقِمِ الصَّلٰوةَ طَرِيقًا * اللَّهَ أَرَادَ وَزْلَافًا مِنَ الْيَوْمِ﴾ (۱۱/ هود: ۱۱۴)

① صحیح بخاری، تفسیر طور واقعہ جیبر بن مطعم ۴۸۵۴۔

② اصلیل دن کے آخری حصہ کو کہتے ہیں، عام کتب افت میں لکھا ہے کہ دو وقت جو عصر کے بعد سے مغرب تک ہواں کو اصلیل کہتے ہیں، مسان العرب میں اصلیل کے معنی عشقی لکھتے ہیں، جو عصر کے لیے سورہ دوم میں استعمال ہوا ہے۔

③ طرفی النہار کو مختلف طریقوں سے قرآن مجید میں ادا کیا گیا ہے قبل طلوع الشمس و قبل غروبها، بالعشی والابکار بالغدو والا صال۔ اس میں پہلا طرف فجر، بکرہ اور غدو ہے دوسرا طرف عصر عشی اور اصلیل ہے۔

”دن کے دنوں کناروں میں (یعنی نہر اور عصر) اور رات کے ایک ٹکڑے میں نماز پڑھا کر۔“
یہ آیت سورہ ہود کی ہے جو مکہ میں نازل ہوئی ہے۔ اس میں اکثر انہیں ﷺ کے متعلق یہ بیان کر کے کہ
انہوں نے اپنی اپنی امت کو خدا نے برحق کی عبادت کی دعوت دی۔ آنحضرت ﷺ کو یہ نماز کی اقامت کا حکم
دیا گیا ہے اور غالباً نماز کے اوقات کے سلسلہ میں یہ پہلی آیت ہے۔ جس میں تسبیح کی وجہے باقاعدہ صلوٰۃ کی
اقامت کا حکم آیا ہے، اس وقت مسلمانوں کی خاصی تعداد تھی جیسا کہ اس سے پہلے کی آیت سے ظاہر ہوتا ہے:

﴿فَاسْتَقِمْ كَمَا أُمِرْتَ وَمَنْ تَأْبَ مَعَكَ وَلَا تَنْظُفْ﴾ (۱۱/ ہود: ۱۱۳)

”پس تو سیدھا چلا چل جیسا کہ مجھ کو حکم دیا گیا ہے اور وہ جنہوں نے تیرے ساتھ تو بکی (وہ بھی
سیدھے چلیں) اور تم لوگ حد سے آگے نہ بڑھو۔“

اب رات کی طویل نمازوں کو جھوڑ کر تین نمازوں میں باقاعدہ فرض ہوتی ہیں۔ ایک دن کے ایک کنارہ میں یعنی
رات کے خاتمه کے قریب تاروں کے جھلملاتے وقت، دوسری دن کے دوسرے کنارے میں دن کے خاتمه
کے قریب اور تیسرا رات کے ابتدائی حصہ میں۔ پہلی سے صبح کی نماز، دوسری سے عصر کی جس کو پہلے اصل کہا
گیا تھا اور تیسرا سے عشاء کی نماز مراد ہے۔ ابھی تک دن اور رات کی نمازوں میں اجمال اور ابہام تھا، دوسری
میں ظہر و عصر اور تیسرا میں مغرب و عشاء کی نمازیں جھپٹی ہوئی تھیں۔ اب رات کی نمازوں سب سے پہلے
علیحدہ ہوتی ہیں۔ سورہ ق میں جو کی سورہ ہے۔ اللہ تعالیٰ اپنے اوقات خلق کو بیان کرنے کے بعد فرماتا ہے:

**﴿فَاصْبِرْ عَلَى مَا يَقُولُونَ وَسَيَرْجُحْ بِمَعْدِلِكَ قَبْلَ طُلُوعِ الشَّمْسِ وَقَبْلَ الْغُرُوبِ وَمَنْ
الَّذِي لَفَسَخَهُ وَأَذْبَارَ السُّجُودِ﴾** (۵۰/ ق: ۳۹)

”پس ان (مخالفوں) کے کہنے پر (اے رسول) صبر کرو اور آفتاب کے نکلنے سے پہلے (صبح) اور
اس کے ڈبنے سے پہلے (عصر) اپنے پروردگار کی حمد و تسبیح کرو اور پکھراتے گئے پر (عشاء) اس
کی تسبیح کرو اور (آفتاب کے) ۲ سجدہ کرنے کے بعد یعنی مغرب کے وقت اس کی تسبیح کرو۔“

صبر کی تلقین سے ثابت ہوتا ہے کہ یہ حکم اس وقت کا ہے جب کفار قریش ہنوز آپ کی ایذا و تھیر کے
درپے تھے۔ اس آیت پاک میں رات کی نماز کا ابہام دور کر کے مغرب اور عشاء کی تعین کرو دی گئی۔ ایک کی

۱ آفتاب کا لفظ جو نکل پہلے آ جکا ہے، اس لیے ادب اسرائیل میں ادب الشمس میں اس کا لفظ استعارہ لایا گیا۔ حودا صل میں پرمیانی رکھنے کو کہتے
کہ اس کے لیے دوسرے لفظ لایا جائے۔ چنانچہ اس معنی کے لیے تجوہ کا لفظ استعارہ لایا گیا۔ حودا صل میں پرمیانی رکھنے کو کہتے
ہیں اور غروب کے وقت آفتاب کی سیلی عالت ہوتی ہے، اس طرز ادا سے آفتاب پر متلوں کی تردید مقصود ہے۔ اسی بنابر اللہ تعالیٰ نے نماز
کے لیے تدوش کا ذکر کیا کہ جس وقت آفتاب کا سر پر خالق کے آگے جدہ میں ہو، تم بھی اپنا سارے خالق کے آگے جھاؤ تھیں وہ اور
میں حضرت علیؑ سے روایتیں ہیں کہ اس سے مراد مغرب کی نماز کے بعد کی دور کعیتیں ہیں۔

نسبت کہا گیا (وَمِنَ الْلَّيلِ) (کچھ رات گئے) اور دوسری کی نسبت کہا گیا: (وَأَدْبَارَ السُّجُودِ) (آن قات کے ڈوبنے پر) اوقات نماز کی تفصیل کے سلسلہ میں رات سے آغاز اس لیے کیا گیا کہ یہ نسبتہ کفار سے محفوظ رہنے کا وقت تھا۔ زوال کے بعد سے غروب تک کی نماز جس کو پہلے اصل اور پھر طرفی انعام (دن کے دونوں کنواروں میں) اور یہاں قبل غروب کی نماز کہا گیا ہے۔ نہ تفصیل طلب ہے جس کے اندر ظہر و عصر دونوں نمازیں داخل ہیں۔ چنانچہ سورہ روم میں جو مکہ میں نازل ہوئی ہے۔ اس کی تفصیل کی گئی ہے۔ اس سورہ کے اترے کا وقت تاریخ سے ثابت ہے کہ وہ رومیوں کی شکست کا مل کے بعد جس کا زمانہ نبوت کے پانچویں چھٹے سال سے لے کر آٹھویں نویں سال تک ہے۔

«فَسَبَحَنَ اللَّهُ حِينَ نَعْصَوْنَا وَحِينَ نُقْصَنُونَ وَكَلَّهُ الْحَمْدُ فِي الشَّمَوْتِ وَالْأَرْضِ وَعَيْنًا

وَحِينَ تُظَاهِرُونَ» (۲۰/الروم: ۱۷-۱۸)

”اللّٰہ کی تسبیح کرو، جب شام (یا رات) کرو اور جب صبح کرو اور اس کی حمد آسمان اور زمین میں ہے اور اخیر دن کو اس کی تسبیح کرو اور جب ظہر کرو۔“

اس آیت پاک میں زوال کے بعد (ظہر) اور غروب سے قبل (عصر) کی بہم نمازوں کی توضیح کی گئی ہے۔ ایک عویشی (عصر) اور دوسری کو ظہر کہا گیا ہے۔ تمام آیتوں کو سامنے رکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ نمازوں کا بالتصیر تھا ذکر طہ، طور، دہر، ہود، ق، روم اور نور میں۔ ظہر کا بالا جمال، دہر، ق، طہ اور اسراء میں اور بالتصیر اسراء اور روم میں، عصر کا بقیرہ، دہر ہود، طہ، ق اور روم میں، مغرب کا بالا جمال ہود، طہ اور روم میں اور بالتصیر ق میں عشاء کا بصورت صلوٰۃ اللیل مزل، طور اور دہر میں اور بصورت عشاء بالا جمال طہ، ہود اور روم میں اور بالتصیر ق اور ہود میں ہے۔ تمام نمازوں کا بالا جمال تذکرہ بقیرہ اسراء اور طہ میں ہے۔ طور سے مجھ اور عشاء دو وقتوں کی نماز اسراء، ہود اور طہ سے کم از کم ظاہر تین وقتوں کی، روم سے چار وقتوں کی (اگر مسائے سے صرف مغرب مراد ہیں) اور طہ اور روم سے پانچ وقتوں کی نماز ثابت ہے۔

جمع بین الصلوٰتین

اوپر کی آیتوں پر غور کی نظر ڈالنے سے ایک عجیب نکتہ حل ہوتا ہے۔ پہلی آیتوں میں ظہر اور عصر کی نمازیں محمل ہیں، یعنی دونوں کو ایک لفظ قل الغروب یا حصل یا طرفی النہار کے ذریعہ سے بیان کیا گیا ہے، آخراً یہ میں جو سورہ روم کی ہے ظہر و عصر کی نمازوں کا نام تصریح کے ساتھ آیا ہے۔ مگر شام کی نماز میں اجمال ہے۔ یعنی مغرب و عشاء دونوں کو (حین تمسون) (جب رات کرو) کے ذریعہ سے ادا کر دیا گیا ہے۔ اس سے اس جانب ایک لطیف اشارہ نکلتا ہے کہ یہ دونوں مل کر ایک بھی ہیں اور علیحدہ بھی ہیں، اسی بنا پر کسی اشد ضرورت اور سفر کی بے اطمینانی کے وقت ظہر و عصر کو ایک ساتھ اور مغرب و عشاء کو ایک ساتھ ملا کر بھی ادا کر سکتے ہیں ۴۱ اور صحیح کی نماز چونکہ ہر آیت میں ہمیشہ علیحدہ ذکر کی گئی ہے۔ اس لیے اس کا کسی دوسری نماز سے ملانا جائز نہیں ہے۔ احادیث میں جمع بین الصلوٰتین کے عنوان سے آنحضرت ﷺ کی عملی مثالیں اس نکتہ قرآنی کی تصریح میں موجود ہیں۔

وقات پنجگانہ اور آیتِ اسراء

محمد شین اور مورخین کااتفاق عام ہے کہ نماز کے اوقات پنجگانہ کی تعین مراجع میں ہوئی ہے۔ جو ہماری تحقیق کے مطابق بعثت کے باہر ہویں سال اور بھرت سے ایک سال پہلے واقع ہوئی تھی۔ گواقات پنجگانہ کا ذکر سورۃ قمر اور روم میں موجود ہے جو اس سے پہلے نازل ہو چکی تھیں۔ لیکن اقسامِ صلوٰۃ کے امر کے ساتھ سب سے پہلے اسی سورہ اسراء (مراجع) میں نماز پنجگانہ کا حکم ہوتا ہے۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ نماز پنجگانہ کی تکمیل بصورت صلوٰۃ اسی مراجع میں ہوئی، جس طرح وضو عمل گو پہلے سے تھا، مگر اس کا حکم قرآن میں مدینی سورتوں کے اندر نازل ہوا ہے۔ سورہ اسراء (مراجع) کی وہ آیت جس میں نماز پنجگانہ کا ذکر ہے، حسب ذیل ہے:

۴۲ مؤطأ امام مالک، کتاب قصر الصلاة فی السفر، باب الجمیع بین الصلوٰتین فی السنّر والحضر: ۳۲۹، ۳۳۰، مسلم، کتاب صلاة المسافرين، باب جواز الجمع بین الصلوٰتین فی السفر: ۱۶۲۱ تا ۱۶۲۷، ترمذی، باب سا جاءه فی الجمع بین الصلوٰتین: ۵۵۳، بعض مستشرقین کو جمع بین الصلوٰتین کی حدیثیں دیکھ کر یہ شبیدہ ہوا ہے کہ زمانہ بنوی میں شاید تین وقت کی نمازوں ادا جوئی تھیں۔ (اندیکلودیڈ پا آف اسلام میں فاضل دینسک کو بھی یہی شبیدہ ہوا ہے دیگر اس کا مضمون صلوٰۃ) مگر حقیقت یہیں سے بلکہ نمازوں میں ہمیشہ پانچ توتوں کی ہوتی ہیں البتہ بضرورت ظہر و عصر کو ایک ساتھ اور مغرب و عشاء کو ایک ساتھ ملا کر پڑھ سکتے تھے۔ رکعتیں اتنی ہی رہتی تھیں۔ صرف وقت میں کمی ہو جاتی تھی۔ فقہائیں باہم اس کے تعلق اختلاف ہے کہ دو دو نمازوں کو یک جا کر صورتوں میں پڑھا جائیں گے۔ احتجاف کے نزدیک حقیقی طور سے صرف ایک موقع پر جمیع عرفات میں ۶۹ ذی الحجه کو ظہر اور عصر دونوں ظہر کے وقت ادا کی جاتی ہیں۔ کیونکہ اس دن عصر کا وقت خاص رجح کی دعا کی لیے ہے۔ بقیٰ نمازوں میں حفیہ کے نزدیک حقیقی کجا نہیں بلکہ محض صورۃ دو دو نمازوں ایک ساتھ ادا کی جاسکتی ہیں۔ اس کی صورت یہ ہے کہ ایک نماز اخیر وقت میں اور دوسری اول وقت میں پڑھی جائے جنہیں کے علاوہ دوسرے فقہاء کے نزدیک سفر میں حقیقت دو نمازوں ایک وقت میں پڑھی جاسکتی ہیں اور آنحضرت ﷺ نے ایسا کیا ہے۔ شیعوں میں دو دو نمازوں کے ایک ساتھ پڑھنے کا عالم روایج ہے۔

﴿أَقْوَمُ الصَّلَاةِ لِدُلُوكِ الشَّمْسِ إِلَى غَسْقِ اللَّيلِ وَقُرْآنُ الْفَجْرِ إِنَّ قُرْآنَ الْعَجْزِ كَانَ

مَشْهُودًا﴾ (۱۷/ بنی اسراء بیل: ۷۸)

”آفتاب کے جھکاؤ کے وقت رات کی تاریکی تک نماز کھڑی کر اور فجر کی قراءت قائم کر بے شک فجر کی قراءت میں حضور ہوتا ہے۔“

یہ آیت کریمہ اوقات چنگانہ کی تعین اور اس کے سبب کو پوری طرح بیان کرتی ہے۔ اس میں سب سے اہم اور تشریح کے قابل لفظ دلوک ہے، دلوک کے اصلی معنی بھکنے اور مائل ہونے کے ہیں، لیکن تحقیق طلب یہ ہے کہ دلوک الشمس یعنی آفتاب کے بھکنے سے کیا مراد ہے؟ اور اہل عرب اس کو کہنے میں بولتے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ عربی میں اس لفظ کا اطلاق تین اوقات یا آفتاب کی تین حالتوں پر ہوتا ہے۔ زوال پر، مقابل نقطہ نگاہ سے آفتاب کے ہٹ جانے پر اور غروب پر اور جب آیت مذکورہ میں یہ کہا گیا کہ آفتاب کے دلوک (جھکاؤ) پر نماز پڑھو تو ان تینوں دلوکات یعنی آفتاب کے تینوں جھکاؤ پر ایک ایک نماز لازم آئی۔ غرض یہ ہے کہ اوج کمال پر پہنچنے کے بعد جب آفتاب ڈھلانا شروع ہوتا ہے تو اس کے تین دلوک یا جھکاؤ ہوتے ہیں۔ ایک نقطہ سمت الراس سے، دوسرا نقطہ مقابل سے اور تیسرا ارکہ افق سے، پہلا ظہر کا وقت ہے، دوسرا عصر کا اور تیسرا مغرب کا اور اس کے ہر دلوک یعنی اخحطاط پر اس کی خدائی کی نفع و تردید اور خداۓ برحق کی الوہیت کے اقرار و اعلان کے لیے ایک ایک نماز رکھی گئی ہے، اس طرح ”دلوك“ کے لفظ کے اندر تین نمازوں کے وقت بتائے گئے ہیں، چوتھی نماز کا وقت غسق اللیل (رات کی تاریکی) ہے، یہ عشاء کی نماز ہے اور اس کو حقیقت میں نصف شب کو ادا ہونا چاہیے، جب آفتاب کا چہرہ نورانی تو برتو جبابات ظلمت میں چھپ جاتا ہے۔ لیکن لوگوں کی تکلیف کے خیال سے وہ سونے سے پہلے رکھی گئی، تاکہ خواب کی غفلت کی تلافی اس سے ہو جائے اور پانچویں نماز کا وقت قرآن الفجر (صح کا پڑھنا) بتایا گیا ہے، یہ آفتاب کے طلوع سے پہلے اس لیے ادا کی جاتی ہے کہ عنقریب وہ ظاہر ہو کر اپنے پرستاروں کو اپنی طرف متوجہ کرے گا، اس لیے ضروری ہے کہ دنیا اس کے طلوع سے پہلے ہی خالق اکبر کا نام لے اور اس باطل پرستی سے جس میں آفتاب پرست عنقریب بنتا ہونے والے ہیں۔ تمہی طاہر کرے، غرض اس آیت پاک سے اقامت صلواۃ کے اوقات چنگانہ کا شہوت متباہے۔ اب ہم کو یہ دکھانا ہے کہ کلام عرب میں آفتاب کے ان تینوں جھکاؤ یا میلانات پر دلوک کا اطلاق ہوتا ہے۔ اگر کلام عرب سے یہ ثابت ہو جائے تو اس آیت سے اوقات چنگانہ کی تشریح کے قبول کرنے میں کسی کو مذر نہ ہو گا۔
دلوک کی تحقیق

مفسرین میں سے بعض نے دلوک سے زوال کا وقت اور بعض نے غروب کا وقت مراد لیا ہے اور اہل لفت نے بھی اس کے یہ دونوں معنی لکھے ہیں اور ایک تیرے معنی اور بھی بیان کیے ہیں، یعنی مقابل نقطہ نگاہ

سے ہٹ جانا اور اس کے ثبوت میں ایک جاہل شاعر کا شعر بھی پیش کیا ہے۔ چنانچہ سان العرب میں ہے:

وَدَلْكَ الشَّمْسُ تَدْلِكُ دَلْوَكَ غَرْبَتْ وَقَيلَ: اصْفَرْتْ وَمَالتْ لِلْغَرْوَبِ وَفِي
الْتَّنْزِيلِ الْعَزِيزِ ۝ أَقِمِ الصَّلَاةَ لِدَلْوَكِ الشَّمْسِ إِلَى عَسْقِ الْأَيْلِ ۝ وَقَدْ دَلْكَ
رَالْتَّ عَنْ كَبْدِ السَّمَاءِ ۝ وَقَالَ الْفَرَاءُ عَنْ أَبْنِ عَبَاسٍ فِي دَلْكِ الشَّمْسِ أَنَّهُ زَوْلَهَا
الظَّهَرُ قَالَ وَرَأَيْتُ الْعَرَبَ يَذْهَبُونَ بِالدَّلْوَكِ إِلَى غَيَابِ الشَّمْسِ قَالَ الشَّاعِرُ:

هَذَا مَقْتَامٌ قَدْمَى رِبَاحٍ
ذَبَبٌ حَتَّى دَلَكَتْ بِرَاحٍ

یعنی الشَّمْسُ قال ابو منصور: وقد روى يَنْعَانُ عن أَبْنِ مُسْعُودٍ أَنَّهُ قَالَ دَلْوَكَ
الشَّمْسُ غَرَوْبَهَا وَرَوَى أَبْنُ هَانِيٍّ عَنْ أَخْفَشٍ أَنَّهُ قَالَ: دَلْوَكَ الشَّمْسُ
مِنْ زَوْلَهَا إِلَى غَرَوْبَهَا . وَقَالَ الزَّحَاجُ: دَلْوَكَ الشَّمْسُ زَوْلَهَا فِي وَقْتِ الظَّهَرِ وَ
ذَلِكَ مِيلَهَا لِلْغَرْوَبِ وَهُوَ دَلْوَكُهَا إِيْضًا يَقَالُ قَدْ دَلْكَتْ بِرَاحٍ وَبِرَاحٍ إِيْ
قَدْ مَالَتْ لِلْزَوْلَ حَتَّى كَادَ النَّاظِرُ يَحْتَاجُ إِذَا تَبَصَّرَ هَا إِنْ يَكْسِرَ الشَّعَاعَ عَنْ
بَصَرِهِ بِرَاحْتِهِ فَإِنْ قِيلَ مَا مَعْنَى الدَّلْوَكِ فِي كَلَامِ الْعَرَبِ قِيلَ الدَّلْوَكُ الزَّوْلَ
وَلِذَلِكَ قِيلَ لِلشَّمْسِ إِذَا زَالَتْ نَصْفُ النَّهَارِ دَالِكَةً وَقِيلَ لَهَا إِذَا افْلَتْ
دَالِكَةً لَا نَهَا فِي الْحَالَتِينِ زَائِلَةً ۝ قَالَ الْفَرَاءُ فِي قَوْلِهِ بِرَاحٍ جَمْعُ رَاحَةٍ وَ

هِيَ الْكَفُ يَقُولُ يَضْعِفُ كَفَهُ عَلَى عَيْنِيهِ يَنْظَرُ هَلْ غَرْبَتِ الشَّمْسُ بَعْدَ ۝

”آفَاتَبْ كَ دَلَوكْ هَوَا يَعْنِي وَهُ (۱) غَرَوْبُ هَوَا اُورَكَهَا گَيَا ہے کہ اس کے معنی یہ ہیں کہ
(۲) آفَاتَبْ زَرَدِ ہو گَيَا اُورَ غَرَوْبَ کے لَیے جَهَنَّمَ گَيَا اُورَ قُرْآنَ میں ہے کہ دَلَوكَ شَمْسَ کے وَقْتِ
رَاتَ کَ تَارِیکَیِ تَنَازُکَھَرِیَ کَ اُورَ آفَاتَبْ کَ دَلَوكْ هَوَا یَعْنِی (۳) وَهُ آسَانَ کَ نَجَّ سَے ہَبَتْ
گَيَا اُورَ فَرَاءُ نَے کہا کہ اَبْنِ عَبَاسٍ ۝ یَنْهَا سَے روایت ہے کہ دَلَوكَ شَمْسَ کَ مَعْنَى ظَهَرَ کَ وَقْتِ
آفَاتَبْ کَ زَوَالَ کَ ہیں اُورَ اسَنَ نَے بِیَانَ کَیا کَہ مَیْنَ نَے اَبْلِی عَرَبَ کَ دَلَوكَ سَے آفَاتَبَ کَا
غَرَوْبَ مَرَادِ لَیْتَے دِیکھا ہے، شَاعِرَ کَہتا ہے: یَوَهُ جَلَجَ ہے جَهَانِ لَرَائِی مَیْں رِبَاحَ کَ دُونُوں قَدَمَ
نَجَّتَهُ، اسَنَ نَے دِشْنَوْنَ سَے اپَنِ عَزَّتَ کَ حَفَاظَتَ کَی، بِیَهَانِ تَنَکَ کَ سُورَجَ ۝ ہَنْطِلِی سَے جَهَنَّمَ
گَيَا، ابو منصور نَے کہا کہ: ہُمَنَے اَبْنِ مَسْعُودٍ ۝ سَرَے نَقْلَ کَی کہ دَلَوكَ شَمْسَ آفَاتَبَ کَا
غَرَوْبَ ہے اُورَ اَبْنِ هَانِیٍّ نَے اَنْهَشَ سَے نَقْلَ کَی کہ دَلَوكَ شَمْسَ ظَبَرَ کَ وَقْتِ آفَاتَبَ کَا زَوَالَ ہے
اوَّلَ اسَنَ کَ مَعْنَى غَرَوْبَ کَ لَیے جَهَنَّمَ ہیں اُورَ یَهَیِ اسَنَ کَ دَلَوكَ ہے۔ مَحَاوِرَہ میں کہا جاتا
ہے کہ دَلَكَتْ بِرَاحٍ وَبِرَاحٍ ۝ یَعْنِ آفَاتَبَ زَوَالَ کَ لَیے جَهَنَّمَ گَيَا۔ بِیَهَانِ تَنَکَ کَ دِیکھَنَے والا

جب اس کی کو دیکھنا چاہے تو اس کرن کی شدت کو توڑنے کے لیے اس کو آنکھ پر ہتھیلی رکھنے کی ضرورت ہے۔ تو اگر کہا جائے کہ عرب کے محاورہ میں دلوک کے کیا معنی ہیں؟ تو جواب دیا جائے گا کہ دلوک کے معنی زوال کے ہیں اور اسی لیے آفتاب کو دالسکہ کہتے ہیں۔ جب وہ دوپہر کو جھک جائے اور جب آفتاب ڈوب جاتا ہے تب بھی اس کو دالسکہ کہتے ہیں کیوں کہ ان دونوں حالتوں میں وہ جھک جاتا ہے۔ فراء نے کہا کہ اس قول (شعر یا محاورہ) میں جو براہ کا لفظ ہے، یہ راحہ کی جمع ہے جس کے معنی ہتھیلی کے ہیں، کہنے والے کا مطلب یہ ہے کہ وہ دونوں آنکھوں پر ہتھیلی رکھ کر دیکھتا ہے کہ آفتاب ابھی غروب ہوا یا نہیں۔“

شعراء عرب نے آفتاب کے ڈھلن کر آنکھوں کے سامنے آجائے کے وقت آنکھوں پر ہتھیلی رکھنے کا اکثر ذکر کیا ہے۔ عجائب کہتا ہے:

وَالشَّمْسُ قَدْ كَادَتْ تَكُونُ دَلْفًا ادْفِعْهَا بِالرَّاحِ كَيْ تَزْحِلَفَا
”اور آفتاب قریب تھا کہ بیمار ہو کر دبلا ہو جائے میں اس کو ہتھیلی سے ہٹاتا تھا، تاکہ وہ ہٹ جائے۔“

اس دوسرے شعر سے پہلے شعر کے معنی کھل جاتے ہیں کہ اس میں دلوک سے زوال اور غروب کے بجائے وہ وقت مراد ہے، جب آفتاب ڈھلن کر آنکھوں کے سامنے آ جاتا ہے اور یہ عصر کا وقت ہوتا ہے۔ الغرض دلوک کا لفظ آفتاب کے ہر جھکاؤ پر برابر بولا جاتا ہے، اس کا پہلا جھکاؤ زوال کے وقت ہوتا ہے، جب وہ سمت الراس سے ہٹتا ہے دوسرا جھکاؤ عصر کے وقت ہوتا ہے جب وہ مقابل کی سمت نظر سے ہٹتا ہے اور مغرب کی طرف چلنے والوں کی آنکھوں کے سامنے پڑتا ہے، اس وقت شاعروں کی تیزی سے بچنے کے لیے آدمی کو آنکھوں کے اوپر ہتھیلی رکھنے یا کسی اور چیز سے آڑ کرنے کی ضرورت لاحق ہوتی ہے اور اس کا تیرسا جھکاؤ غروب کے وقت ہوتا ہے، جب وہ سمت افق سے نیچے ہو کر ڈوب جاتا ہے۔ ان ہی تین مسلسل اوقات کی وجہ سے جزو وال سے لے کر غروب تک کے زمانہ پر مشتمل ہیں، بعض اہل لغت نے جیسا کہ اوپر گزر راستا ہما یہ کہہ دیا ہے کہ دلوک زوال سے غروب تک کے وقت کو کہتے ہیں حالانکہ اس کا اطلاق تحقیقی طور سے آفتاب کے تین میلانات پر کیا جاتا ہے اول اس میلان پر جو سمت الراس سے ہوتا ہے، پھر اس میلان پر جو سمت نظر سے ہوتا ہے اور بالآخر اس کامل میلان پر جو سمت افق سے ہوتا ہے اور یہ اوقات زوال سے غروب تک مسلسل یکے بعد دیگرے چند چند گھنٹوں کے بعد آتے ہیں، اس تمام بحث کا نتیجہ یہ ہے کہ

﴿أَقْوَمُ الصَّلَوةَ لِدُلْوِلِ الْكَمْس﴾ (۱۷ / بنی اسرائیل: ۷۸)

”آفتاب کے دلوک کے وقت نماز کھڑی کر۔“

● پیغمبر تفسیر طبری میں آیت مذکورہ کے تحت میں اور اسان العرب میں دلف (ج ۱۹، ص ۱۹۰) اور زحلف (ج ۲، ص ۱۶) کے تحت میں مذکور ہے۔

سے مراد تین نمازیں ہیں، کیوں کہ تین دلوک ہوتے ہیں: ظہر (۱) جب آفتاب کا دلوک (جھکاؤ) سمت الراس سے ہوتا ہے، (۲) عصر جب اس کا دلوک سمیت نظر سے ہوتا ہے اور مغرب (۳) جب اس کا کامل دلوک سمیت افق سے ہوتا ہے ۔ اس کے بعد غسق اللیل (رات کی تاریکی) اور قرآن الفجر (فجر کی قراءت) سے ظاہر ہے کہ عشا اور فجر کی نمازیں مراد ہیں، اس طرح اس آیت سے جو سورہ اسراء میں واقع ہے اوقات پنجگانہ میں اوقات صلوٰۃ کے اوقات کی تشریح ہو جاتی ہے۔

اوقاتِ نماز کا ایک اور راز

اس آیت کریمہ کو ایک دفعہ اور پڑھو تو معلوم ہو گا کہ نماز کے اوقات کا آغاز ظہر (میلان اول آفتاب) سے ہوتا ہے اور یہی اس حدیث سے بھی ثابت ہے، جس میں بذریعہ جریل نماز کے اوقات پنجگانہ کی تعلیم کا ذکر ہے اس میں پہلے ظہر کا نام آتا ہے پھر بدتر ترتیب اور چاروں نمازوں کا، ظہر کے بعد عصر پھر مغرب پھر سونے سے پہلے عشاء یہ چار نمازیں تقریباً دو تین گھنٹوں کے فاصلہ سے ہیں، اس کے بعد صبح کی نماز ہے، جو عشاء سے تقریباً سات آٹھ گھنٹوں کا فصل رکھتی ہے اور پھر صبح سے ظہر تک تقریباً اس قدر فصل ہے۔ چنانچہ اس آیت میں ظہر سے عشاء تک ایک ساتھ نماز کا مسلسل حکم ہے، چند گھنٹے ہٹھر کر صبح کا حکم ہوتا ہے، پھر خاموشی ہو جاتی ہے یہاں تک کہ آفتاب طلوع ہو کر ایک لمبے وقفے کے بعد پھر ظہر کا وقت آتا ہے اور اسی طرح دور قائم ہو جاتا ہے غرض ظہر سے عصر، عصر سے مغرب اور مغرب سے عشاء تک مسلسل نمازیں ہیں، پھر صبح تک استراحت کا طویل وقت ہے، صبح اٹھ کر خدا کی یاد ہوتی ہے اور پھر انسانی کاروبار کے لیے ایک طویل و قدر کھا گیا ہے، جو صبح سے ظہر تک ہے اور اس میں کوئی فرض نماز نہیں رکھی گئی ہے۔

اوقات پنجگانہ کی ایک اور آیت

سورہ اسراء کی آیت کی طرح سورہ طہ میں بھی ایک آیت ہے جس میں اوقات پنجگانہ کی تفصیل ہے، وہ

یہ ہے:

﴿وَسَيِّدُ الْمُحْمَدِ رَبِّكَ قَبْلَ طُلُوعِ الشَّمْسِ وَقَبْلَ عُرُوْبِهَا وَمِنْ أَنَّى إِلَّا فَسَيِّدُ
وَأَطْرَافُ النَّهَارِ﴾ (۱۳۰: طہ / ۲۰)

”اپنے پروردگار کی حمد کی تسبیح پڑھ آفتاب نکلنے سے پہلے اور اس (آفتاب کے) ڈوبنے سے پہلے اور رات کے کچھ وقت میں تسبیح پڑھ اور دن کے کناروں میں۔“

تغیریوں میں بھی صحابہ کی روایتوں سے انہی نمازوں کا اختلاف روایت مراد ہونا نہ کوہے۔ حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ دلوک سے غروب آفتاب اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما وآلہ وسیدہ کی روایت مراد ہونا نہ کوہے۔ حضرت ابن حماد رضی اللہ عنہ میں اور فیصلہ کرتبے میں کہ دلوک شمس سے ظہر اور عصر اور غسق اللیل سے مغرب اور عشاء اور قرآن الفجر سے نمازوں صبح مراد ہے اور اس طرح ان کے نزدیک بھی یہ آیت اوقات پنجگانہ کو پہنچائی ہے۔

﴿سیرت ابن هشام، باب ابتداء فرضیت صلوٰۃ، ج ۱، ص: ۱۵۶۔﴾

آفتاب لکھنے سے پہلے نہر ہے، دو بنے سے پہلے عصر ہے، رات کے کچھ وقت سے عشاء مراد ہے اور دن کے کناروں میں ظہر اور مغرب ہے۔
اطراف النہار کی تحقیق

یہ شب کیا جاسکتا ہے کہ اطراف کا لفظ جمع ہے، جو کم سے کم تین پر بولا جاتا ہے، اس بنا پر دن کے تین طرف (کنارے) ہونے چاہئیں، دن کے کنارے یا تو دو ہی ہیں، صبح اور شام یا تین ہیں، اگر وسط کا بھی اعتبار کیا جائے۔ یعنی صبح دوپہر اور شام۔ پہلی شق لی جائے تو صبح کا ذکر مکرر ہو جاتا ہے اور ظہر غائب ہو جاتی ہے، دوسری شق اختیار کی جائے تو گو ظہر آ جاتی ہے، مگر پھر بھی صبح مکرر ہی رہتی ہے۔

اس لفظی اعتراض کا جواب یہ ہے کہ اطراف گو جمع ہے، مگر کلام عرب میں تثنیہ یعنی دو پہنچی جمع کا اطلاق ہوتا ہے اور خود قرآن مجید میں اس کے استعمالات موجود ہیں، مثلاً: ایک جگہ مشرقین اور مغربین دو مشرق اور دو مغرب ہے۔ دوسری جگہ انہیں کو مشارق اور مغارب کہا گیا ہے سورہ تحریم میں ہے «فَقَدْ صَفَّتُ قُلُوبُكُمَا» (تم دونوں کے قلوب) ظاہر ہے کہ دوآ دمیوں کے دو قلب ہوں گے، قلوب (بصینہ جمع) انہیں ہو سکتا، مگر یہ زبان کا حاحورہ اور بول چال ہے۔ اس میں قیاس اور عقلیت کو دھل نہیں، اس بنا پر اطراف سے مراد صرف دو طرف ہیں۔ یہ سب کے نزدیک مسلم ہے کہ دن کے دو ہی ممتاز حصے ہیں، ایک صبح سے دوپہر تک اور دوسرا دوپہر سے شام تک، اطراف سے انہیں دونوں حصوں کے آخری کنارے یہاں مراد ہیں۔ صبح سے مراد دوپہر تک کے حصے کا آخری کنارا ظہر ہے اور دوپہر سے غروب تک کے حصے کا آخری کنارا غصیر یا مغرب ہے، لیکن چونکہ عصر کا ذکر قبل غروب بھا کے اندر مستقل موجود ہے، اس لیے متعین ہو گیا کہ یہاں اس سے مراد مغرب ہے۔

ایک اور طریقہ ثبوت

اگر ہم قرآن پاک کی علیحدہ علیحدہ آیتوں سے اوقات چنگانہ پر استدلال کرنا چاہیں تو کر سکتے ہیں۔ مثلاً:

﴿أَقِمِ الصَّلَاةَ لِدُلُوكِ الشَّمْسِ﴾ (۱۷/ بنی اسرائیل: ۷۸)
”زوال آفتاب کے وقت نماز کھڑی کر۔“

یہ ظہر کی نماز ہے۔

﴿وَقَبْلَ الْغُرُوبِ﴾ (۵۰/ ق: ۳۹)
”اور غروب آفتاب سے پہلے خدا کی تسبیح کرو۔“

﴿وَإِذْ كُرِّأَ سَمْرَاتِكَ بَكْرَةً وَأَصِيلًا﴾ (۲۵/ الدھر: ۷۶)
”اپنے پروردگار کا نام لو صبح کو اور عصر کو۔“

الاصلیل الوقت بعد العصر الى المغرب (صحاح جوہری ولسان العرب، ج ۱، ص: ۶۹)۔

یہ عصر کی نماز ہوئی اور اسی کو
﴿وَالصُّلُوةُ الْوُسْطَىٰ﴾ (۲/ البقرة: ۲۳۸) (۱۱۴: هود)

”صحیح کی نماز۔“

سورہ بقرہ میں اس لیے کہا گیا ہے کہ یہ دن کی نمازوں میں ظہر اور مغرب کے صحیح میں واقع ہے۔

﴿وَأَقِمِ الصَّلَاةَ طَرَقَيِ التَّهَارِ﴾ (۱۱۴: هود)

”اور دن کے دونوں (ابتدائی اور انتہائی) کناروں میں نماز کھڑی کر۔“

دن کا ابتدائی کنارہ صحیح اور انتہائی کنارہ مغرب ہے۔

سورہ نور میں ہے کہ صحیح کی نماز سے پہلے بے پکارے زناہ کرہ یا مکان میں نہ جایا کرو۔

﴿مِنْ قَبْلِ صَلَاةِ الْفَجْرِ﴾ (۵۸: النور)

”صحیح کی نماز سے پہلے۔“

اس سے نماز صحیح کا عملی ثبوت بھی ملا، پھر اسی میں اسی موقع پر ہے۔

﴿وَمِنْ بَعْدِ صَلَاةِ الْعِشَاءِ﴾ (۵۸: النور)

”اور عشاء کی نماز کے بعد۔“

اس کی رو سے مسلمانوں کو عشاء کی نماز کے بعد جو سونے اور کپڑے اتار دینے کا وقت ہے، کسی کے مکان میں بلا اجازت اندر جانے کا حکم نہیں، یہ بھی نماز عشاء کا عملی ثبوت ہے اور یہی پانچوں اوقات نماز ہیں۔

نماز پنجگانہ احادیث و سنت میں

تمام انبیاء صلی اللہ علیہ وسلم میں آنحضرت ﷺ کو جو خاص تفوق و امتیاز حاصل ہے، وہ یہ ہے کہ آپ جو شریعت لے کر آئے، اس کی صورت صرف نظری اور خیالی نہ تھی اور نہ وہ کسی حیثیت سے بہم اور جملہ رہی، بلکہ آپ نے اپنے عمل اور طریق سے اس کی پوری تشریع فرمادی اور خود عمل فرمائ کر اور اپنے تمام پیر و دوں سے اس کی تعمیل کرو کر اس کے متعلق ہر قسم کے پیدا ہونے والے شک و شبہ کی جڑ کاٹ دی۔ اسلام نے جس روزانہ طریق عبادت کو پیش کیا۔ آنحضرت ﷺ نے اپنے عمل سے اس کے تمام ارکان و آواب و شرائط و اوقات و تعداد کی پوری تشریع فرمادی اور ان میں سے ہر چیز ناقابل شک قولی عملی تو اتر کے ذریعہ سے ہم تک پہنچی۔ نماز کس طرح پڑھنی چاہیے؟ اس میں کیا کیا پڑھنا چاہیے؟ کن کن وقوں میں پڑھنی چاہیے؟ کس وقت کی نماز کی کتنی رکعتیں ہیں؟ ان میں سے ہر چیز کی آپ نے زبانی تشریع فرمائی۔ صحابہ رضی اللہ عنہم کو تلقین کی اور عملاً نبوت کی پوری زندگی میں جو حکم نماز کے بعد گزری ایک دن دو دن نہیں کم از کم مدینہ میں متصل وسیں تک ہر روز پانچ دفعہ تمام جماعت مسلمین کے سامنے پورے اعلان کے ساتھ ادا فرماتے رہے۔ یہاں تک کہ مرض الموت میں بھی اس میں تخلص نہ ہوا اور

کتابِ سنت و محدثین اور علماء کی ترجیحات کے مطابق اس فہرست میں مذکورہ مکتبہ کو اپنے نامے میں شامل کیا گی۔

آخری سانس تک اسی طرح بدستور اس پر عمل ہوتا رہا۔ مدینہ کی مسجد نبوی اور تمام اسلامی مسجدوں میں پنج وقتہ اعلان نماز کی آوازیں بلند ہوئیں اور ہر روز پانچ دفعہ ہر جگہ جہاں اسلام کا کلمہ پڑھا جاتا تھا، یہ فرض ادا ہوتا تھا آپ کے بعد تمام خلفائے راشدین اور تمام پیر و ان محمدی جہاں بھی رہے اور جہاں بھی پہنچے، اسی طرح دن میں پانچ بار علی الاعیاد صفو و حضرت میں تمام عمر ادا کرتے رہے۔ کیا ایسی مستری علی الاعلان متواتر اور دائمی چیز میں کسی کوشک واقع ہو سکتا ہے، یہ اہتمام، یہ علایمیہ استرار اور یہ تاکید بلیغ اس لیے فرمائی، تاکہ جس طرح دوسرے پیغمبروں کا طریق عبادت بعد کے پیروؤں کے ترک عمل سے مشتبہ اور عدم صحت نقل سے مشکوک ہو گیا۔ خاتم الانبیاء ﷺ کی شریعت آخرین کا طریق عبادت اس سے محفوظ رہے، کیون کہ اگر اب اس شریعت میں شک پڑ جاتا تو پھر کوئی دوسری نبوت آ کر اس کی تجدید و اصلاح کرنے والی نہ تھی۔ چنانچہ اسی بنا پر آج تک تمام پیر و ان محمدی ﷺ میں آپ کی یہ نماز اور اس کے ضروری اور اہم متعلقہ ارکان و شرائط و احکام روایۃ متواتر اور عمل محفوظ و قائم ہیں۔ نماز وہ فرضہ الہی ہے جس کی فرضیت خسے کا حکم اللہ تعالیٰ نے اس ساعت سعید میں دیا، جب آنحضرت ﷺ میں مراجع کے تقرب خاص سے متاز ہوئے۔ حکم ہوا کہ شب و روز میں پانچ نمازیں تم پر اور تمہاری امت پر لکھی گئیں جو بیچاں نمازوں کے حکم میں ہیں۔ ﴿ قرآن پاک سے بھی اس کی تصدیق ہوتی ہے ارشاد ہے کہ ﴿ مَنْ جَاءَ بِالْحَسَنَةِ فَلَهُ عَشْرُ أَمْتَانِهَا ﴾ (الانعام: ۱۶۰) یعنی ”جو ایک نیکی کرے گا اس کوں گناہ و نواب ملے گا۔ ” اس لیے پانچ نمازیں یقیناً بچاوس کے حکم میں ہیں۔ نماز کی فرضیت کے بعد فرضہ الہی نے اتر کر خود نماز کے طریق ادا اور اس کے اوقات خسے کی تعلیم کی اور ہر وقت کی ابتداء اور انہا پر ایک ایک نماز پڑھا کر عملنا ہر چیز کی تلقین کی اور وہی آپ نے اپنے پیروؤں کو بتایا اور اس پر ان سے عمل کرایا۔ چنانچہ آپ نے شیوخ اسلام کے بعد ہر جگہ احکام شریعت کی تبلیغ و اعلان کے مبلغ جب متعین فرمائے تو ایک بدوسی نے جو نجد کے دور دراز راستہ سے سفر کر کے آیا تھا، خدمتِ اقدس میں آ کر عرض کی، یا رسول اللہ! آپ کے قاصد نے بتایا ہے کہ دن رات میں پانچ نمازیں فرض ہیں کیا یہ صحیح ہے؟ فرمایا: ”ہاں صحیح ہے۔ عرض کی کہ اس ذات کی قسم جس نے آپ کو پیغمبر بنا کر بھیجا کیا خدا نے آپ کو اس کا حکم دیا ہے؟ فرمایا: ”ہاں۔ ”

خود آنحضرت ﷺ نے صحابے سے فرمایا کہ ”جبریل اترے اور انہوں نے میری امامت کی تو میں نے ان کے ساتھ نماز پڑھی، پھر پڑھی، پھر پڑھی، پھر پڑھی یہ فقرے منہ سے کہتے جاتے تھے اور انگلی سے ایک دو تین چار پانچ گنتے جاتے تھے۔ ” ﴿ ایک دفعہ صحابہ کو خطاب کر کے فرمایا کہ ”اگر کسی کے گھر کے

1. صحيح بخاری، کتاب الصلوٰۃ، باب کیف فرضت الصلوٰۃ فی الایسٰراء: ۳۴۹؛ مسلم، کتاب الایمان، باب الاسراء بر رسول اللہ: ۴۱۱۔ 2. صحيح بخاری، کتاب مواقيت الصلوٰۃ، باب مواقيت الصلوٰۃ وفضلها: ۵۲۱؛ مسلم، کتاب المساجد، باب أوقات الصلوٰۃ الخمس: ۱۳۸۰۔ 3. صحيح بخاری، کتاب الایمان، باب الرکوٰۃ من الاسلام: ۶۴ و کتاب العلم: ۶۳؛ صحيح مسلم، کتاب الایمان: ۱۰۲۔ 4. صحيح مسلم، کتاب المساجد، باب أوقات الصلوٰۃ الخمس: ۱۳۷۹۔

سامنے کوئی صاف شفاف نہ باری ہوا وہ اس میں دن میں پانچ دفعہ نہاتا ہو تو کیا اس کے بدن پر کچھ میل رہ سکتا ہے؟ ”سب نے عرض کی تھیں، نہیں رہے گا فرمایا: ”تو یہی مثال پانچوں وقت کی نمازوں کی ہے کہ ان سے اللہ تعالیٰ گناہوں کو دھوڈیتا ہے۔“ * اوقات کی تیسین میں فرمایا کہ ”جب صبح کی نماز پڑھو تو اس کا وقت اس وقت تک ہے جب تک سورج کی پہلی کرن نہ لکل آئے، پھر جب ظہر پڑھو تو اس وقت تک اس کا وقت ہے جب تک عصر کا وقت نہ آ جائے، پھر جب عصر کی نماز پڑھو تو اس کا موقع اس وقت تک ہے کہ آفتاب زرد پڑ جائے۔ پھر جب مغرب پڑھو تو شفق ڈوب جانے تک اس کا وقت ہے، پھر جب عشاء پڑھو تو آہمی رات تک اس کا وقت ہے۔“ * ابو بزرگ رضی اللہ عنہ ایک صحابی کہتے ہیں کہ حضور صبح کی نماز میں ساٹھ سے سو آیتیں تک قراءت کرتے تھے اور ظہر زوال کے بعد ادا کرتے تھے اور عصر اس وقت پڑھتے تھے کہ ایک آدمی مدینہ کے آخری کنارہ تک جا کر لوٹ آتا تھا، پھر بھی آفتاب میں جان رہتی تھی، مغرب کی بابت راوی کو سننا ہوا بیان یاد نہیں رہا اور عشاء کو تھا اور رات تک ادا کرنے میں آپ تامل نہیں فرماتے تھے * حضرت جابر رضی اللہ عنہ دوسرے صحابی سے نقل کرتے ہیں کہ آنحضرت ﷺ ظہر کی نمازوں پر ہر میں پڑھا کرتے تھے اور عصر اس وقت جب سورج باقی رہتا تھا اور مغرب جب سورج ڈوب جاتا تھا اور عشاء میں کبھی دیر کرتے اور کبھی غلت اور صبح اندھیرے میں پڑھتے تھے۔ * صحابہ کہتے ہیں کہ حضور ظہر اور عصر کی نمازوں کی دو پہلی رکعتوں میں آہستہ آہستہ سورہ فاتحہ کے ساتھ سورہ پڑھتے تھے کبھی کبھی کوئی آیت سنائی بھی دیتی تھی۔ مغرب میں سورہ المرسلات پڑھی اور کبھی سورہ طور پڑھی۔ عشاء میں (اذالسماء انشقت) اور (والذین والذینون) قراءت کی ہے اور صبح میں سورہ طور پڑھی ہے۔ * اس قسم کی اور بیسوں روایتیں ہیں اور روایتوں پر کیا موقوف ہے، اس وقت سے آج تک تمام امتیں محمد رسول اللہ ﷺ کا عملی تو اتر دوست و دشمن سب کے زد دیک ناقابل تردید ہوتے ہیں۔ *

تجہاب لف لف ہو گئی لیکن کیوں؟

ان نمازوں کی تکمیل کے بعد صلوٰۃ اللیل (تجہد کی نماز) جو پہلے فرض تھی، عام امت کے لیے لف ہو گئی، چنانچہ پوری آیت یہ ہے:

* صحیح بخاری، کتاب الصلوٰۃ، باب الصلوٰۃ الخمس، فخارہ: ۵۲۸۔

* صحیح مسلم، کتاب المساجد و مواضع الصلوٰۃ، باب اوقات صلوٰۃ الخمس: ۱۳۸۶۔

* صحیح بخاری، کتاب مواقيت الصلاة، باب وقت الظہر عند الزوال: ۵۴۱۔

* صحیح بخاری، کتاب مواقيت الصلاة، باب وقت العشاء اذا اجتمع الناس او تاخروا: ۵۶۵۔

* صحیح بخاری، کتاب الاذان، باب القراءة في الظہر والعصر والمغرب والعشاء والفجر بروايات متعددة: ۷۵۸ تا ۷۷۱۔

* چونکہ بعض مستشرقین نے (انسیکلوپیڈیا آف اسلام لفظ صلوٰۃ) دانست یا نادانست طور پر اوقات نماز میں غلط نہیں پھیلانی پا یہی۔ اس لیے اتنی تفصیل کی ضرورت پڑی، تاکہ ان کی غلط نہیں درج ہو جائے۔

»أَقِمِ الصَّلَاةَ لِدُلُوكِ الشَّمْسِ إِلَى عَسْقِ الْيَلَى وَقُرْآنَ الْفَجْرِ إِنَّ قُرْآنَ الْفَجْرِ كَانَ مَشْهُودًا وَمِنَ الْيَلَى فَتَعْجِذْ بِهِ نَافِلَةً لَكَ عَسَى أَنْ يَعْتَشَكَ رَبِّكَ مَقَامًا مَحْمُودًا^{۱۰}«

(۱۷) بنی اسراءءيل: ۷۸-۷۹)

”نماز کو آن تاب کے جھکاؤ کے بعد کھڑی کر (ظہر عصر مغرب) رات کی تاریکی تک اور صبح کی قراءت قائم کر، بے شک صبح کی قراءت میں حضور ہوتا ہے اور رات کے حصہ میں تو اٹھ کر (اوقات مقررہ سے) زیادہ نماز پڑھ شاید کہ تجھ کو تیرابر قابل تعریف مقام میں اٹھائے۔“

غور کرو کہ جب تک اوقات مقررہ ہوئے تھے، رات کو دیر تک نماز اور نماز میں جتنا زیادہ قرآن پڑھا جاسکے، پڑھنے کا حکم تھا، گویا یہ پانچوں وقت کی ایک ہی وقت میں نماز تھی یعنی نماز کی پانچ چتوں والا پھول ابھی تک غنچہ کی طرح ورق برقرار رہا، جب دو اور تین وقتوں کی نمازیں الگ الگ ہوئیں تو ان کے بعد رات کی طویل نماز میں تخفیف ہو گئی اور حکم آیا کہ «فَاقْرُءُوا مَا تَسْتَرَ مِنَ الْقُرْآنِ^{۱۱}» (المرمل: ۲۰/۳۷) یعنی: ”قرآن سے اس قدر حصہ پڑھو جتنا آسانی سے پڑھ سکو۔“ اس کے بعد اس آیت پاک میں جب اقامۃ صلوٰۃ کے اوقات پڑھ گانہ کا ذکر آیا تو رات کی نماز تجدی کی فرضیت ساقط ہو گئی۔ یہاں ایک قابل ذکربات اور بھی ہے اور وہ یہ کہ شاید یہ آیت پاک اوقات نماز کی تکمیل کی آخری اطلاع ہے، کیوں کہ اس کے نازل ہونے سے پیشتر قدیم فرض نماز تجدی نہ تھی اور اب نفل ہو گئی۔

قبلہ

انسان کا کوئی کام جس طرح زمان سے خالی نہیں ہو سکتا۔ جس کی بنیا پر اوقات نماز کی تعینی کی گئی ہے، اسی طرح مکان سے بھی خالی نہیں ہو سکتا۔ جب انسان کوئی کام کرے گا تو ظاہر ہے کہ اس کامنہ کی نہ کسی سمت ہو گا۔ اگر نماز میں کسی خاص سمت کا تعین نہ ہوتا اور یہ عام اجازت دے دی جاتی کہ جس کا جدھر جی چاہے منہ کر کے نماز ادا کرے تو جماعت کی یکسانی کا شیرازہ درہم ہو جاتا اور نمازوں کی وحدت صوری قائم نہ رہتی بلکہ اگر ایک ہی مسجد میں ایک ہی وقت میں کوئی پورب، کوئی پچھم کوئی اتر اور کوئی دکھن رخ کر کے کھڑا ہوتا تو یہ وحدت نظام کے خلاف ہونے کے علاوہ اچھا خاصہ مuttleed انگیز تماشبن جاتا، اس لیے ہر مذہب میں عبادت کے لیے کوئی نہ کوئی سمت خاص کر لی گئی ہے۔ صائبی (ستارہ پرست) قطب شما کی طرف منہ کرتے تھے کہ ستاروں میں وہی ہے، جو نظر آنے کے باوجود اپنی جگہ سے حرکت نہیں کرتا، بلکہ برقرار رہتا ہے۔ * آن تاب پرست سورج کی طرف منہ کرتے ہیں، آتش پرست آگ کو سامنے رکھتے ہیں اور بت پرست کوئی نہ کوئی بت آگ کے رکھ لیتے ہیں۔ اکثر شامی قومیں مشرق کی طرف رخ کرتی تھیں۔ یہاں تک کہ یہودیوں کے ایک فرقہ

* صحيح مسلم، کتاب الصلاة، باب وجوب قراءة الفاتحة: ۸۸۵، نیز دیکھو فتح الباری، ج ۱، ص: ۳۹۳۔

* الرد على المنطقين لابن تيمية ومجموع فتاوى شيخ الإسلام ابن تيمية، ج ۹، ص: ۲۱۶۔

یسینی نے آنفاب کے مطلع کو قبلہ بنالیا تھا۔ شامی عیسائی بھی اسی طرف رخ کر کے نماز پڑھتے تھے * بنی اسرائیل میں بھی قبلہ ضروری تھا، تورات سے حضرت ابراہیم، حضرت اُلٹھ اور حضرت یعقوب علیہم السلام کا یہ دستور معلوم ہوتا ہے کہ وہ جہاں عبادت کرنا چاہتے تھے، اس جگہ کو چند پھروں سے گھیر کر خدا کا گھر ”بیت ایل“ * بنایتے تھے قرآن مجید میں ہے کہ بنی اسرائیل جب مصر میں تھے تو حضرت موسیٰ علیہ السلام کے ذریعہ سے ان کو حکم ہوا تھا کہ گھروں کو قبلہ رخ بنائیں اور نماز ادا کریں:

﴿وَاجْعَلُو بَيْوَكْلَمْ قِلَّةً وَآقِيمُوا الصَّلَاةَ﴾ (۱۰ / یونس: ۸۷)

”اور اپنے گھروں کو قبلہ رخ کر لوا اور نماز کھڑی کرو۔“

بیت المقدس کے قبلہ ہونے کا ذکر عہد تدبیم کے مجموعہ صحیف میں متعدد موقوں پر آیا ہے۔ حضرت داؤد علیہ السلام کے زبور میں ہے۔

”لیکن میں جو ہوں سو تیری رحمت کی کثرت سے نیرے گھر میں آؤں گا اور تھہ سے ڈر کر تیری
مقدس ہیکل کی طرف تجھے سجدہ کروں گا۔“ (۵۔۷)

سلامیں اول میں ہے:

”جب تیرا گروہ بڑائی کے لیے اپنے دشمن کے بخلاف نکلے، جہاں کہیں تو نہیں بھیج دے اور
خداوند کے آگے دعا مانگے، اس شہر کی طرف جس کو تو نے پسند کیا اور اس گھر کی طرف ہے
میں نے تیرے نام کے لیے بنایا۔“ (۷۔۲۲)

اسی صحیفہ میں آگے پال کر ہے:

”اور اس زمین کی طرف جس کو تو نے ان کے باپ دادوں کو دی اور اس شہر کی طرف جسے تو نے
چن لیا اور اس گھر کی طرف جو میں نے تیرے نام کے لیے بنایا تھا سے دعا مانگیں۔“ (۲۸)

اہل عرب میں کعبہ کو ہی حیثیت حاصل تھی جوئی اسرائیل میں بیت المقدس کو تھی، اس لیے اہل عرب کا
قبلہ کعبہ تھا، اس تمام تفصیل سے قرآن مجید کی اس آیت کی تشریح ہوتی ہے:

﴿وَلِكُلٍّ وَجْهٌ هُوَ مُوَلِّهٗ فَأَسْتَبِّعُوا الْخَيْرَاتِ﴾ (۲/ البقرہ: ۱۴۸)

”اور ہر ایک امت کا ایک قبلہ ہے، جدھروہ منہ پھیرتی ہے، تو اے مسلمانو! نیکیوں کی طرف دوڑو۔“

اوپر کے بیان سے واضح ہوا ہو گا کہ دنیا کے تین مذاہب میں تمیں قسم کے قبلے تھے، ستارہ پرست یا ستارہ
پرستی سے متاثر، پرستش کے لیے کسی وقت کسی ستارہ کو قبلہ بناتے تھے، مثلاً: آنفاب پرست آنفاب کے طلوع
کے رخ یعنی مشرق کو اور صائمی (ستارہ پرست) قطب شمال کو، عناصر پرست یا بت پرست اپنی پرستش کے عنصر

* تفصیلات انسیکلوپیڈیا آف اسلام لفظ ”قبلہ“ میں ہیں ج ۲۸، ج ۹۸۵۔

** سفر گوین باب: ۱۶۔۸۔ عبد نام تدبیم، ج ۱۹ اور ۳۱۔۳۔۲۸۔۷۔۱۸، ۱۹۔۳۱۔۳۵، ج ۱۹۔۱۳۔۳۱۔۳۵۔

یعنی آگ یا کسی دریا یا کسی بستک قبلہ قرار دیتے تھے، موحدین اپنی مرکزی مسجد کو قبلہ سمجھتے تھے۔ ابراہیم قوموں میں اسی قسم کی مسجدیں دو تھیں، مسجد اقصیٰ (بیت المقدس) اور مسجد حرام (خانہ کعبہ) پہلی مسجد کی تولیت حضرت اسحاق اور ان کی اولاد کے پردوہوئی تھی، اس لیے وہ ان کا قبلہ تھی۔ دوسرا مسجد کے متولی حضرت اس علیل علیہ السلام اور ان کے بیٹے تھے، جنہوں نے اس قبلہ کو بنایا تھا۔ آنحضرت ﷺ جب تک مکہ معظمه میں رہے، خانہ کعبہ کی طرف اس طرح منہ کر کے کھڑے ہوتے تھے کہ کعبہ اور بیت المقدس دونوں سامنے پڑ جاتے تھے، لیکن جب مدینہ منورہ تشریف لائے تو یہ صورت ممکن نہ تھی، کیونکہ بیت المقدس مدینہ سے شمال اور خانہ کعبہ جنوب کی طرف واقع تھا، تاہم کعبہ کے قبلہ ہونے کی اب تک چونکہ اجازت نازل نہیں ہوئی تھی، آپ ﷺ بیت المقدس کی طرف رخ کرتے تھے، کہ وہی انبیاء نبی اسرائیل کا قبلہ گاہ تھا لیکن آپ ﷺ کی طبعی خواہش تھی کہ اس تازہ ملت ابراہیم کے لیے وہی ابراہیمی مسجد (خانہ کعبہ) قبلہ قرار رپائے، جس کی تولیت اس کے بانی (حضرت ابراہیم علیہ السلام) کی طرف سے بنی اسرائیل کے پردوہوئی تھی، چنانچہ سورہ بقرہ کے وسط میں اس کے متعلق احکام نازل ہوئے جن میں سب سے پہلے بتایا گیا کہ خدا کو کسی جہت اور سمت سے کوئی تعلق نہیں کیونکہ وہ بے سمت ہے اور سب سختیں اسی کی ہیں:

﴿وَلِلّهِ الْمُسْتَقْرِئُ وَالْمَغْرِبُ فَإِنَّمَا تَوْلُوا فَقَمَةً وَجْهُ اللّهِ إِنَّ اللّهَ وَآيَةٌ عَلَيْهِ﴾

(۱۱۵/ البقرۃ)

”اور خدا ہی کے لیے ہے پورب اور پچھم، توجہ درخ کرو ادھری خدا کا منہ ہے، بیشک اللہ بڑی گنجائش، اور وسعت والا اور بڑے علم والا ہے۔“

اس کی گنجائش اور وسعت میں ہر سمت داخل ہے اور ہر جہت کی اس کوخبر ہے، یہ آیت کریمہ قبلہ کے تین کی کسی ایسی تشریح کو جس سے شرک کا شائبہ پیدا ہو سکے قطعاً غلط قرار دیتی ہے اور دوسرا آیت میں بھی بھی مضمون ادا ہوا ہے:

﴿سَيَقُولُونَ السُّفَهَاءُ أَمَّا مَا وَلَيْهِمْ عَأْنُ قَبْلَهِمُ الَّذِي كَانُوا عَلَيْهَا نَهَى اللّهُ الْمُسْتَقْرِئُ

وَالْمَغْرِبُ طَيْهِدِنِي مَنْ يَشَاءُ إِلَى صَرَاطِ مُسْتَقِيْوَهِ﴾

(۱۴۲/ البقرۃ)

”بے وقوف لوگ کہیں گے کہ ان (مسلمانوں) کو ان کے اس قبلہ سے کس نے ہنادیا، جس پر وہ تھے، کہہ دے کہ پورب اور پچھم دونوں خدا کے ہیں، وہ جس کو چاہتا ہے سیدھا راستہ دکھاتا ہے۔“

یہود، جن کو سب سے زیادہ اعتراض یہ تھا کہ مشرقی مسجد یعنی بیت المقدس کو چھوڑ کر، مغربی مسجد یعنی خانہ کعبہ کو کیوں قبلہ قرار دیا گیا، ان کو خطاب کر کے فرمایا:

لَیْسَ الیَّ اَن تُلَوُّ وَجْهَكُمْ قَبْلَ الْمَشْرِقِ وَالْمَغْرِبِ وَلَیْکَ الیَّ مَنْ امْنَ بِاللَّهِ وَالیَوْمِ
الْاُخْرَ وَالْمَلِکَةَ وَالْكَتِیبَ وَالْسَّیِّقَ وَأَنَّ الْمَالَ عَلَیْهِ ذَوِی الْقُرْبَی وَالْیَتَامَی وَالْمَسْکِینَ
وَابْنَ السَّبِیْلِ وَالسَّالِیْلِنَ وَفِی الرِّقَابِ وَأَقَامَ الصَّلَاةَ وَأَنَّ الرِّکُوْنَ وَالْمُوْفُونَ يَعْمَدُهُمْ
إِذَا عَمَدُوا وَالصَّرِیْرِنَ فِی الْبَأْسَاءِ وَالصَّرَاءِ وَجِئْنَ الْبَأْسِ «أُولَئِکَ الَّذِینَ صَدَقُوا
وَأُولَئِکَ هُمُ الْمُتَّقُونَ» (٢/ البقرة: ١٧٧)

”نیکی یہ نہیں کہ تم اپنے منہ شرق اور مغرب کی طرف پھیر، والبته نیکی یہ ہے کہ خدا، قیامت، فرشتوں، کتابوں اور پیغمبروں پر ایمان لائے اور اپنی دولت کو اس کی محبت کے باوجود (یاد کی) محبت پر) رشتہ داروں، تینیوں، غریبوں، مسافروں، سالموں اور غلاموں کو (آزاد کرنے میں) دے اور نماز پڑھے اور زکوٰۃ دے اور (نیکی یہ ہے) جو اپنے وعدہ کو پورا کرتے ہیں اور سختی اور تکلیف اور جنگ میں صبر کرتے ہیں، یہی وہ ہیں جو سچے ہوئے اور یہی پر ہیز گار ہیں۔“

اس تصریح سے یہ اچھی طرح ثابت ہو جاتا ہے کہ اسلام میں قبلہ کی یا حیثیت ہے، قبلہ یعنی وہ ست یا جگہ جس کا رخ کیا جائے، عبادت کے لیے کوئی ضروری چیز نہیں ہے، لیکن چونکہ نمازوں میں امت کے نظام و حدت کو قائم رکھنے کے لیے کسی ایک رخ کی تخصیص کی حاجت تھی، اسی لیس ایہ میں خانہ کعبہ کے قبلہ بنانے کا حکم ہوا:

﴿فَوَّلَ وَجْهَكَ شَطْرَ الْسِّجْدَ الْحَرَامِ وَحَيْثُ مَا كُنْتُمْ فَوَّلُوا وَجْهَكُمْ شَطْرَهُمْ﴾

(٢/ البقرة: ١٤٤)

”پس تو انہیں مسجد حرام (خانہ کعبہ) کی طرف پھیر اور تم لوگ جہاں بھی ہو اسی کی طرف اپنے منہ پھیرو۔“

اسلام نے قبلہ کے لیے کسی خاص سمت کا نہیں، بلکہ ایک مرکزی مسجد کا انتخاب کیا، جس کے چاروں طرف چاروں سمتوں سے نماز پڑھی جاسکے، اس طرح شرق، مغرب، جنوب، شمال، سب بہ یک وقت مسلمانان عالم کا قبلہ میں، جس سے ایک اطینف مرزیہ لٹکتا ہے کہ مسلمانوں کے خدا کی طرح ان کا قبلہ بھی ہے جہت ہے اور اس کا درسرافائدہ یہ ہے کہ سمت کے تعین سے اس سمت کی مرکزی چیز (مثلاً آفتاب یا قطب شمالی وغیرہ) کی محدودیت اور مجبودیت کا جو تخلیق پیدا ہوتا تھا اور جس سے بت پرستی اور ستارہ پرستی کا رواج ہو گیا تھا اس کا گلیظت خاتمه ہو گیا۔

لیکن یہ مرکزی مسجد بیت المقدس کی بجائے مسجد حرام (کعبہ) قرار دی گئی، جس میں بہت سی مصلحتیں تھیں:
❶ یہ در تھا کہ کوئی ایسی چیز ہو جس کی طرف جو شخص ہر جگہ سے ہر ملک میں منہ پھیر سکے، ایسی چیز یا تو کوئی

مصنوعی شے ہو سکتی تھی، مثلاً: چراغ، کوئی موی شمع، کوئی تصویر، کوئی مجسم، کوئی کتاب۔ جیسا کہ اوپر گزرا ہبض اہل مذاہب ان چیزوں کو سامنے رکھتے تھے جن کی وہ پرستش کرتے تھے، مثلاً: بت۔ محمد، آنگ، پانی، آفتاب۔ وغيرہ اشیاء، دعا صرد کو اکب، ظاہر ہے کہ اسلام اگر ایسا کرتا تو وہ بھی کھلی ہوئی بت پرست میں گرفتار ہو جاتا، دوسری صورت یہ تھی کہ اشیا کو نہیں بلکہ سمت کو خاص کیا جاتا مثلاً: شمال یا مشرق کو پہلی سمت میں جگہ سے نہ نہیں والا قطب تھا اور دوسری چرہ خور شید کا مطلع اور بیاض حمر کا دیباچہ تھی، دین تو حید کے لیے یہ بالکل ناممکن تھا کہ ستارہ پرستی کے ابطال کے ساتھ ساتھ ستارہ پرستی کے علمات اور امتیازات کو فاقہم رکھے۔

۲ یہ کہنا ممکن ہے کہ شمال اور مشرق کو چھوڑ کر جن کی طرف منہ کرنا ستارہ پرست ہوتی، کسی اور سمت کا انتخاب کیا جاسکتا تھا مگر یہ کھلی ہوئی بات ہے کہ چار سمتوں میں سے کسی ایک کا انتخاب کسی نہ کسی مردح سبب ہی کی ناپر ہو سکتا ہے، ورنہ خدا کے لحاظ سے تو ہر سمت برابر تھی اب جو بھی سمت اختیار کی جاتی اس کے لیے ضروری تھا کہ اس کی تخصیص کی کوئی مناسب وجہ بھی ہوتی، سمت کی تین آفتاب یا دوسرے ممتاز ستاروں کا طلوع و غروب کا لحاظ کیے بغیر ممکن ہی نہیں، کیونکہ ہر سمت میں کوئی نہ کوئی مشہور ستارہ ہے، جس کی سیدھے وہ سمت تینیں کی گئی ہے، اس لیے جو سمت بھی اختیار کی جاتی اس سے اس سمت کا خاص ستارہ کے تعلق وجود ترجیح کا پیدا کرنا ضروری تھا اور اس ترجیح سے دین تو حید کا دین شرک بن جانا لازمی تھا۔

۳ اسی لیے مدتِ ابراہیم نے ان صورتوں کو چھوڑ کر بیمیشہ کسی قربان گاہ یا مسجد کو پاناقبلہ بنایا، تاکہ شرک کے ہر قسم کے شانہ سے اس کی نماز محفوظ رہے۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی بنائی ہوئی مسجدوں میں ان کی نسل نے دو مرکزی مسجدوں کو محفوظ رکھا تھا، ایک بیت المقدس جس کو حضرت واوہ علیہ السلام اور حضرت سلیمان علیہ السلام نے اپنے اپنے زمانوں میں بڑے اہتمام سے تیار کرایا اور یہ بنی اسرائیل کا قبلہ بنی، دوسری مسجد کعبہ جو بنی اسماعیل کا نام ہے مرکز تھی۔

۴ اسلام کا دعویٰ ہے کہ خانہ کعبہ، بیت المقدس سے پہلے بنا تھا، وہ دنیا میں پہلا گھر تھا جو خدا کی عبادت کے لیے تعمیر ہوا اور اس کے معمار خود حضرت ابراہیم علیہ السلام اور حضرت اسماعیل علیہ السلام تھے:

﴿إِنَّ أَوَّلَ بَيْتٍ وُضِعَ لِلنَّاسِ لِلَّذِي يَبْلُغُهُ حِلْمًا﴾ (۹۶/۲) آیہ عمران

”بے شک سب سے پہلا مبارک گھر جو انسانوں کے لیے (خدا کا) بنا، وہ ہے جو کہ میں ہے۔“

﴿وَإِذْ يَرْفَعُ إِلَيْهِمُ الْقَوَاعِدَ مِنَ الْبَيْتِ وَإِسْمَاعِيلَ﴾ (۱۲۷/۲) البقرہ

”او جبکہ ابراہیم اور اسماعیل بیت اللہ کے کھبے اٹھا رہے تھے۔“

خانہ کعبہ کا قبلہ ہوا ایک ایسی حقیقت ہے، جس کا انکار عبدِ اسلام کے یہود کو سمجھی نہ تھی، چنانچہ قرآن پاک میں ہے:

﴿وَلَئِنِ الَّذِينَ أَوْتُوا الْكِتَابَ لَيَعْلَمُونَ أَنَّهُ الْحُقُّ مِنْ رَبِّهِمْ﴾ (۱۴۴/۲) البقرہ

”اور جن کو کتاب دی گئی وہ جانتے ہیں کہ خانہ کعبہ کا قبلہ ہونا حق ہے (اور وہ) ان کے پروردگار کی طرف سے (ہے)۔“

پلوٹ (پال) ایک خط میں جو گھمتوں کے نام بے لکھتا ہے:

کہ یہ لکھا ہے ابرہام (حضرت ابراہیم علیہ السلام) کے دو بیٹے تھے، ایک لوڈی (ہاجرہ) سے دوسرا آزاد (سارہ) سے، پر وہ جو لوڈی سے تھا (اسماعیل علیہ السلام) جسم کے طور پر پیدا ہوا اور جو آزاد سے تھا (احمد علیہ السلام) سو وعدہ کے طور پر یہ باتیں تمثیلی بھی مانی جاتی ہیں، اس لیے کہ یہ عورتیں وہ عہد ہیں، ایک تو سینا پہاڑ (حضرت ہاجرہ مصر کی تھیں اور سینا مصر کے راستے میں ہے) پر سے جو ہوا وہ نزے غلام حنفی ہیں، یہ ہاجرہ ہے کیونکہ ہاجرہ عرب کا کوہ سینا ہے اور اب کے یہ شام (بیت المقدس) کا جواب ہے اور یہی اپنے لڑکوں کے ساتھ غلامی میں ہے پر اور پر کا یہ شام آزاد ہے۔ (گلیتوں کے نام ۲۲-۲۳ باب ۲)

اس اقتباس سے یہ واضح ہو گا کہ عیسائیت کا بانی بھی اس بھیڈ سے آگاہ تھا کہ یہ شام اور بیت اللہ (یا عرب کا کوہ سینا) ایک دوسرے کا جواب ہیں ”اب کے یہ شام“ سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہ شام نیا ہے اور بیت اللہ پرانا، یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ دونوں عورتیں دو عہد تھیں، یعنی ان کی اولاد کے متعلق حضرت ابراہیم علیہ السلام سے خدا نے دو وعدے کیے تھے، ہاجرہ کا وعدہ کوہ سینا پر ہوا تھا، جب وہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے ساتھ مصر سے آری تھیں اور راستے میں سینا پڑتا تھا، اس وعدہ کے مطابق ہاجرہ کی غلام اولاد نے عرب میں عبادت کا ایک مرکزی گھر تعمیر کیا تھا اور یہ غلام اس پرانے مرکزی گھر کے متولی ہو گئے، یہ گھر بعد کوئی اسرائیل کے نزدیک ان کے نئے مرکزی عبادت گاہ بیت المقدس کا پورا جواب تھا، سارہ کے وعدہ کا یہاں ذکر نہیں ہے، لیکن یہ معلوم ہے کہ بیت المقدس کی تولیت بنی اسرائیل کو عطا ہوئی تھی، گویا حضور انور علیہ السلام کے پیشتر تک خدا کا عہد بیت المقدس اور بنی اسرائیل کے ساتھ تھا، چونکہ بنی اسرائیل نے اپنی بغاوت، تمرد، سرکشی، اور قساوت کے سبب سے اس عہد کو تورڈیا تھا، اس لیے آنحضرت علیہ السلام کی بعثت کے بعد خدا نے ان کو متنبہ کیا جس کا ذکر سورہ اسراء کی آیتوں میں ہے اور جب بنی اسرائیل پر اس تنبیہ کا کچھ اثر نہ ہوا تو خدا نے ان سے اپنا عہد تورڈ کر اسماعیل کا وہ عہد شروع کیا جو سینا پر ہاجرہ کے متعلق باندھا گیا تھا۔

معراج میں آنحضرت علیہ السلام کا بیت المقدس (مسجد قصی) میں نماز ادا کرنا اور اس سے چند سال بعد خانہ کعبہ کا قبلہ بن جانا، گویا بنی اسرائیل کے عہد کی شکست اور بنو اسماعیل کے عہد کی ابتدا کا اعلان تھا، جیسا کہ اس کتاب کی تیسرا جلد میں بسلسلہ معراج:

سُبْحَنَ الَّذِي أَسْرَى يَعْنِدَهُ لَيْلًا فِي الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ إِلَى الْمَسْجِدِ الْأَقْصَى الَّذِي يَرْجِعُ إِلَيْهَا

حولہ (۱۷/ بنی اسرائیل)

”پاک ہے وہ خدا جو اپنے بندہ کورات کے وقت مسجد حرام (خانہ کعبہ) سے اس مسجد قنسی (بیت المقدس) تک لے گیا جس کے چاروں طرف ہم نے برکت دی ہے۔“
کی تفسیر میں لکھا گیا ہے۔

اس تفصیل سے ظاہر ہو گا کہ بیت المقدس جو عہد اسرائیل کا نشان تھا، اسلام کے بعد اس میں قبلہ ہونے کی شان باقی نہیں رہی، بلکہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی وہ مسجد قبلہ بنائی گئی جس کا تعلق عہد اسرائیل سے تھا (یعنی خانہ کعبہ) وہ عہد کیا تھا؟ اس کی تفصیل یہ ہے:

﴿وَإِذْ أَنْتَلَ إِبْرَاهِيمَ رَبِّهِ بِكَلْمَتٍ فَأَتَمَّنُطَقَّةً قَالَ إِنِّي جَاعِلُكَ لِلنَّاسِ إِمَامًاٌ قَالَ وَمَنْ ذُرِّيَّتُهُ طَقَّةً قَالَ لَا يَنَالُ عَهْدِي الظَّلِيمِينَ وَإِذْ جَعَلْنَا الْبَيْتَ مَقَابِلَةً لِلنَّاسِ وَأَمْنًا وَأَنْجَدْنَا هُنَّ مَقَامِ إِبْرَاهِيمَ مُصْلَىٰ طَوَّعَهُنَا إِلَى إِبْرَاهِيمَ وَإِسْمَاعِيلَ أَنْ طَهَرَا بَيْتَنَا لِلظَّاهِيفِينَ وَالْغَفِيفِينَ وَالرَّاجِحِ الشَّجُوفِ﴾ (۲/ البقرة: ۱۲۵)

”اور جب خدا نے چند باتوں میں حضرت ابراہیم علیہ السلام کو آزمایا تو اس نے ان باتوں کو پورا کیا۔ خدا نے کہا: میں تمھکو لوگوں کا پیشوادا بانے والا ہوں (ابراہیم نے) کہا: اور میری نسل میں سے (خدانے) فرمایا: میرا عہد ظالموں کو شامل نہ ہو گا اور جب ہم نے گھر (کعبہ) کو لوگوں کے اجتماع کی جگہ اور امن بنایا اور تم ابراہیم علیہ السلام کے کھڑے ہونے کی جگہ کو نماز پڑھنے کی جگہ بناؤ اور ہم نے ابراہیم علیہ السلام اور اسماعیل علیہ السلام سے عہد کیا کہ تم دونوں میرے گھر کو طواف کرنے والوں، اعتکاف کرنے والوں، رکوع کرنے والوں اور سجدہ کرنے والوں کے لیے پاک رکھو۔“

غرض یہ رمز الہی تھا جو ہزاروں برس پہلے سے خدا کے علم میں تھا اور جس کی بنی پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بھرت کے بعد عالم کا زرد حلقی مرکز بیت المقدس کے مجاہے خانہ کعبہ قرار پایا، جو تاریخی حیثیت سے وہ گھر تھا جہاں کھڑے ہو کر حضرت ابراہیم علیہ السلام نے تو حید کی آواز بلند کی تھی اور دنیا میں اس لحاظ سے خدا کا سب سے پہلا گھر تھا اور روحاںی حیثیت سے وہ گھر قبلہ قرار پایا، جو اس دنیا میں عرش الہی کا سایہ اور زمین پر حظیرۃ القدس کا عکس تھا، اس لیے حکم ہوا:

﴿وَهُنَّ حَيْثُ خَرَجْتَ فَوْلَ وَجْهَكَ شَطَرَ السَّمَاءِ الْعَرَافِ﴾ (۲/ البقرة: ۱۴۹)
”او تو جہاں بھی نکلے مسجد حرام ہی کی طرف منہ کر۔“

وہ حقیقت ہے مسلمان کا فرض یہ ہے کہ وہ بھی اسی طرح کھڑا ہو کر فریضہ عبودیت ادا کرے، جہاں حضرت ابراہیم علیہ السلام کھڑے ہوئے تھے، لیکن چونکہ ہر مسلمان کو ہر جگہ اور ہر وقت ایسا کرنا ممکن نہیں تو کم از کم نماز کے وقت ادھر رخی کر لے، ورنہ ظاہر ہے کہ خدا کی رحمت اور اس کی توجہ ہر طرف برابر ہے، اسی لیے قبلہ

کی تعین کے موقع پر فرمایا:

﴿فَأَيْمَّا تُولُوا فَنَهَا وَجْهُ اللَّهِ طِبً﴾ (٢/ البقرة: ١١٥)

”پس جدھر منہ پھیر وادھر بی خدا کا منہ ہے۔“

خانہ کعبہ کی دیواریں اور اس کی چھت کسی مسلمان کا معبد و مسجد نہیں، نہ مشکوں، بست پرستوں اور ستاروں پرستوں کی طرح نماز و دعا میں قبلہ سے خطاب ہوتا ہے، نہ اس سے کچھ ما لگا جاتا ہے، نہ اس کی دہائی دی جاتی ہے نہ اس کو خدا سمجھا جاتا ہے اور نہ یہ خیال کیا جاتا ہے کہ خدا اس کے اندر بیٹھا ہے، خانہ کعبہ کی دیواریں اگر (بالفرض) ٹوٹ جائیں، اس کی چھت گر جائے اور صرف نضا باقی رہ جائے تو بھی کعبہ قبلہ ہے گا، اسی طرح خود خانہ کعبہ کے اندر جا کر بلکہ اس کی چھت پر کھڑے ہو کر بھی نماز پڑھی جاسکتی ہے، اگرست قبلہ کا پتہ نہ لگ سکے تو جدھر قبلہ کا گمان ہو ادھر ہی نماز پڑھی جاسکتی ہے، سواری میں نفل نماز ہر سمت جدھر سواری جا رہی ہو پڑھ سکتے ہیں، گھسان کی لڑائیوں میں بھی ایسا کیا جاسکتا ہے یہ باتیں ان تمام مشراکانہ غلط فہمیوں کی جو خانہ کعبہ کے قبہ ہونے سے پیدا ہو سکتی ہیں، قطعی تردید کرتی ہیں اور یہی اس باب میں دین محمدی علیہ السلام کی تکمیلی حیثیت ہے۔

یہ قبلہ گویا مسلمانوں کا ارضی مرکز، ملت ابراہیمی کے پیرو ہونے کا عملی ثبوت، دنیا کے قدیم موحدوں کی پہلی یادگار، محمد رسول اللہ علیہ السلام کے پیرو ہونے کا شعار اور مسلمانان عالم کی وحدت کا شیرازہ ہے، اسی لیے آنحضرت علیہ السلام نے اس کی طرف رخ کرنے کو قبول اسلام کی علامت قرار دیا اور فرمایا کہ جو ہمارے قبلہ کی طرف رخ کر کے نماز پڑھے اور ہمارے ہاتھ کا ذبح کیا ہوا جائز رکھائے، وہ مسلمان ہے، اگر خیال کے پڑھ پرواز سے اڑ کر اور فضا میں آسمانی کی نیلگوں سطح پر کھڑے ہو کر دنیا کے مسلمانوں کو نماز کی حالت میں کوئی شخص دیکھے تو نظر آئے گا کہ قبلہ ایک مرکزی نقطہ ہے، جس کے چاروں طرف تمام مسلمانان عالم دائرہ کی صورت میں خدا کے آگے صاف بستہ اور سر بوجود ہیں۔

رکعتوں کی تعداد

ایک قیام، اس کے بعد رکوع، پھر سجدہ، اس مرتب صورت کا نام ایک رکعت ہے، نماز میں کم از کم دو رکعتیں اور زیادہ سے زیادہ چار مقرر کی گئیں، صبح کو دو، ظہر، عصر، اور عشاء کے وقت چار چار اور مغرب میں تین، ایک رکعت کی مستقل نماز نہیں رکھی گئی اور نہ چار سے زیادہ رکعتیں رکھی گئیں، کیونکہ مصلحت یہ تھی کہ نماز نہ اتنی مختصر ہو کر دل میں ذرا اثر بھی پیدا نہ ہو کر سکے، نہ اتنی بھی کہ انسان کو بدال بنا دے، ایک رکعت کی نماز اتنی مختصر تھی کہ اس سے قلب میں خضوع و خشوع پیدا نہ ہوتا، کیونکہ صرف چند سینٹ میں تمام ہو جاتی اور چار سے زیادہ رکعتوں کی نماز بدلی کا باعث ہوتی، کیونکہ دیر لگنے کی وجہ سے جی گھبرا تا، اس لیے فرض نماز کی رکعتیں دو سے

* صحیح بخاری، کتاب التفسیر، تفسیر سورہ بقرۃ: ٤٥٣٥۔

* صحیح بخاری، کتاب الصلوٰۃ، باب فضل استقبال القبلۃ: ٣٩١۔

زیادہ نہیں رکھی گئیں۔

مکہ میں مسلمانوں کو جو بے اطمینانی اور بے سرو سامانی تھی اور جس طرح کفار کے ڈر سے چھپ کر وہ نماز پڑھتے تھے، اس لحاظ سے اسوقت نماز میں زیادہ رکعتیں ہونا ممکن نہ تھا، اسی لیے مکہ معظمه میں ہر نماز صرف دو رکعتوں کی تھی، جب مدینہ آ کر اطمینان نصیب ہوا تو ظہر، عصر اور عشاء کی چار چار رکعتیں، کردی گئیں لیکن مسافر کے لیے وہی دو رکعتیں *** قائم رہیں**، کیونکہ اس کی عارضی پریشان حالی باقی رہتی ہے، جو اس تخفیف کی علت تھی، حضرت ابن عباس رض کی روایت کا خلاصہ یہ ہے کہ مقیم کے لیے چار رکعتیں ہیں، مسافر کے لیے دو اور بحالت خوف ایک *** اس سے ظاہر ہوا کہ اطمینان کی زیادتی اور کمی کی بنا پر ان رکعتوں کی تعداد گھٹتی اور بڑھتی ہے۔**

مغرب اور صبح کی نمازیں قیام و سفر دونوں حالتوں میں یکساں ہیں، مغرب کی تین رکعتوں کا آدھا ممکن نہیں اور صبح میں پچھہ دو رکعتیں ہیں ان میں کیا کمی ہو سکتی ہے؟ لیکن مغرب اور صبح میں یہ تین اور دو رکعتیں کیوں ہیں؟ اس کی گردہ کشاںی امام المومنین حضرت عائشہ رض نے فرمائی ہے: ”مغرب میں تین اس لیے ہیں کہ وہ دن کا وتر ہے اور صبح میں دو اس لیے کہ اس میں دو رکعتوں کے بڑھانے کے بجائے قراءت لمبی کردی گئی ہے۔“ *****

حضرت عائشہ رض کے ارشاد میں تھوڑی سی تفصیل کی ضرورت ہے۔ گزر پڑکا ہے عین طلوع اور غروب کے وقت نماز کی ممانعت اس لیے کی گئی ہے کہ یہ کفار (آفتاب پرستوں) کی عبادت کا وقت تھا ***** مغرب کی نماز غروب آفتاب کے بعد فوراً ہوتی ہے، اس لیے ضرورت ہے کہ اہل توحید آفتاب پرستی کے شرک سے پوری براءت ظاہر کریں اسی لیے اس وقت کی نماز میں رکعتوں کی تعداد وہ رہ گئی جس سے خدا کے واحد اور وتر ہونے کا ثبوت مل سکے۔ ***** یہ عدد واحد تو ہو نہیں سکتا کہ اس سے خضوع و خشوع اور تاثر کا مقصد فوت ہوتا، دو کا عدد بھی نہیں ہو سکتا کہ یہ زوج اور جوڑا ہے، طلاق نہیں، بنا بریں توحید کا رمز آشکارا کرنے والا سب سے قریب ترین طلاق عدد تین ہی ہے، جس سے خدا کا واحد ہونا اور وتر ہونا دونوں باتیں ثابت ہوتی ہیں، نیز نماز کے خشوع و خضوع کا کمال بھی فوت نہیں ہوتا جو ایک رکعت ہونے میں فوت ہو جاتا ہے، اس لیے مغرب میں رکعتوں کی تعداد تین رکھی گئی اور چونکہ آفتاب کا کامل زوال و انحطاط جس کو غروب کہتے ہیں، اسی وقت ہوتا ہے، اس لیے اس توحید کے رمز کو اسی وقت آشکارا ہونا چاہیے، اس مفہوم کی تشریع اس حدیث کے الفاظ سے بھی ہوتی ہے جس میں آنحضرت ﷺ نے وتر نماز کی تاکید فرمائی ہے:

1 صحيح بخاری، کتاب مناقب الانصار، باب هجرة النبي ... : ۳۹۳۵؛ صحيح مسلم، کتاب صلوٰۃ المسافرین: ۱۵۷۱، ۱۵۷۱؛ مسنند احمد، ج ۶، ص ۲۴۱؛ وابن خزيمة وابن حبان والیبھقی (فتح الباری)، ج ۱، ص: ۳۹۳۔

2 صحيح مسلم، کتاب صلوٰۃ المسافرین: ۱۵۷۵۔ مسنند احمد بن حنبل، ج ۶، ص: ۲۴۱۔

3 صحيح مسلم، کتاب صلوٰۃ المسافرین، باب اسلام عمرو بن عبیسہ: ۱۹۳۰۔

4 عشاء کے بعد وتر نماز کو بھی وتر اسی لیے کہتے ہیں کہ وہ طلاق ہوتی ہے یعنی جورات کی نماز ہے۔

((او تو رو ایا اہل القرآن فان اللہ و تریحہ الوتر)) *
 ”اے قرآن والو! وتر (طاق) پڑھا کرو، کیونکہ خدا بھی وتر (طاق) ہے اور وہ وتر (طاق) کو
 پسند کرتا ہے۔“

صحح کا وقت وہ لکش وقت ہے جب انسان پورے آرام و سکون کے بعد بیدار ہوتا ہے، یہ براہمہانا وقت ہوتا ہے، طبیعت موزوں ہوتی ہے، دل مطمئن ہوتا ہے، تمام عالم اس وقت سراپا اثر جسم کیف نظر آتا ہے، اس لیے یہ وقت نماز و دعا کے لیے خاص طرح سے موزوں ہے اور قرآن مجید میں اس کے اس خاص امتیاز کا ذکر ان لفظوں میں کیا گیا ہے:

﴿إِنَّ قُرْآنَ الْفَجْرِ كَانَ مَشْهُودًا﴾ (۱۷/ بنی اسرائیل: ۷۸)

”صحح کی نماز کی قراءت کا وقت حضوری کا ہوتا ہے۔“

اس بنا پر شریعت محمدیہ ﷺ نے اس وقت کی نماز میں رکعتوں کی تعداد کے بجائے اس کی اصل کیفیت کو پیش نظر رکھا، یعنی رکعتیں تو دو ہی رہیں، مگر حکم دیا گیا کہ قراءت بھی کردی جائے اور سورتیں بڑی بڑی پڑھی جائیں، چنانچہ خود آنحضرت ﷺ اور نمازوں میں ایک رکعت میں تقریباً پندرہ آیتیں تلاوت فرماتے تھے، مگر صحح کی نماز میں سانچھ آیتوں سے لیکر سو آیتوں تک قراءت کرتے تھے * اور اسی نسبت سے رکوع و بکوع بھی ہوتا تھا۔ * رکعتوں کی تعداد اگر چہ آنحضرت ﷺ اور صاحبہ کی سنت متواترہ سے ثابت ہے اور تمام مسلمان اس تو اتر پر بلا استثناء عامل بھی ہیں، تاہم اس کا عملی اشارہ قرآن پاک میں نماز خوف سے ظاہر ہوتا ہے، جس میں یہ حکم ہے کہ اسلامی فوج کے دو حصے ہو جائیں، پہلے اگلا حصہ امام کے پیچھے کھڑا ہو کر ایک رکعت ادا کرے اور دوسرا دشمن کے مقابل کھڑا رہے، پھر اگلا حصہ امام کے سامنے کھڑا ہو جائے اور دوسرا امام کے پیچھے آ کر ایک رکعت ادا کرے، اس طرح امام کی دور رکعتیں ہو جاتی ہیں اور مقتدیوں کی جماعت کے ساتھ ایک ایک اور اگر دوسری رکعت کا موقع ملتا ہے، تو وہ ارکان کے ساتھ اور یہ ممکن نہ ہو تو اشاروں سے علیحدہ علیحدہ ادا کرتے ہیں، * جب نماز خوف میں قصر کی دور رکعتیں ثابت ہوئیں تو اصل رکعتیں چار ہوں گی، اس سے یہ بھی ظاہر ہوا کہ قصر چار ہی رکعت والی نمازوں میں ہے، نماز قصر کی آیات سورہ نساء کے پندرہوں رکوع میں ہیں۔

نماز کے آداب باطنی

قرآن پاک اور احادیث نبویہ میں نماز کے لیے متعدد لفظ آئے ہیں۔ مثلاً صلوٰۃ، دعا، تسبیح اور ذکر الہی

* ابو داؤد، کتاب الوتر، باب استحباب الوتر: ۱۴۱۶ - * صحیح مسلم، کتاب الصلوٰۃ، باب القراءة فی الصبح: ۱۰۳۲ - * صحیح مسلم، کتاب الصلوٰۃ، باب اعتدال ارکان الصلوٰۃ: ۱۰۵۸ -

* حدیث میں نماز خوف کی بہت سی صورتیں ہیں جن میں سے ہر جو تدبیر نے اپنی اپنی دلیل کی رو سے ایک ایک صورت کو مخصوص کر لیا ہے مگر محدثین میں کچھ لوگ ایسے ہیں جو یہ کہتے ہیں کہ یہ سب صورتیں جائز ہیں، میرا ناقص خیال یہ ہے کہ یہ سب مختلف صورتیں لواہی کے مختلف حالات کی بنا پر ہیں۔ جب جیسی صورت پیش آئی اس کے مطابق نماز ادا کی گئی۔ جنگ میں اشاروں سے نماز ادا کرنے کا مسئلہ امام بخاری اور بعض محدثین کا ہے۔

اور یہ الفاظ خود نماز کے روحاںی خصوصیات و آداب ظاہر کرتے ہیں۔ نماز جسم و روح دونوں کی عبادت ہے، اگر اس میں جسم کی حرکت کے ساتھ دل کی جنبش شامل نہ ہو اور روح میں اہتمار پیدا نہ ہو جائے تو ایسی نماز کل بے رنگ اور شراب بے کیف سے زیادہ نہ ہو گی۔

اقامت صلوٰۃ

نماز پڑھنے کے لیے قرآن پاک میں جا بجا اقامت صلوٰۃ (نماز کو قائم کرنا) کا لفظ استعمال ہوا ہے، جس کے معنی صرف نماز پڑھنے کے نہیں، بلکہ نماز کو اس کے آداب اور اركان و سنن کے ساتھ ادا کرنے کے ہیں چنانچہ خوف کی حالت میں جہاں نماز کے بعض آداب و اركان و شرائط کو معاف کر دیا گیا ہے، اس کے بعد یہ کہا گیا ہے: ﴿فَإِذَا أَطْمَأْنَتُهُمْ فَأَقِيمُوا الصَّلَاةَ﴾ (۴/ النساء: ۱۰۳) ”پھر جب تم کوطمیناں ہو جائے تو نماز کو قائم کرو۔“ اس سے معلوم ہوا کہ اقامت صلوٰۃ یعنی نماز کو قائم کرنے کے معنی یہ ہیں کہ نماز کو اس کے آداب و اركان و شرائط کے ساتھ بجا لایا جائے، اس بنا پر نماز میں اطمینان، اركان کا اعتدال، باطنی خضوع و خشوع علوٰۃ رہنا چاہیے، جس کے بغیر نماز ناقص رہتی ہے۔

قوتوٰۃ

نماز کے آداب باطنی میں دوسری چیز قوت ہے، اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

﴿وَقُومُوا إِلَيْهِ فَيُبَيِّنُنَّهُ﴾ (۲/ البقرۃ: ۲۳۸)

”او رخدا کے سامنے ادب سے کھڑے ہو۔“

صحابہ کہتے ہیں کہ ہم لوگ پہلے نماز میں باتیں کر لیا کرتے تھے، لیکن جب یہ آیت اتری تو آنحضرت ﷺ نے اس سے منع فرمادیا کہ یہ یکسوئی اور نماز کے باطنی آداب کے خلاف تھا۔ قرآن پاک میں جس قوت کا حکم دیا گیا ہے، وہ عجیب جامِ لفظ ہے، لغت میں (دیکھو لسان العرب) اس کے حسب ذیل معنی ہیں: چپ رہنا، بندگی کرنا، دعا مانگنا، عبادت کرنا، کھڑے رہنا، دیرتک کھڑے رہنا، عاجزی کرنا، نماز کے جس قوت کا اس آیت میں ذکر ہے اس کے متعدد معنوں میں سے ہر معنی نماز میں مقصود ہے، کیوں کہ نماز میں ذکر و قراءت تسبیح و استغفار سلام و تشهد کے سوا تمام انسانی ضرورتوں اور باتوں سے خاموشی ہوتی ہے، وہ خدا کی بندگی بھی ہے، دعا بھی ہے، عبادت بھی ہے، اس میں دیرتک قیام بھی ہے اور عاجزی کا اظہار بھی ہے۔ اگر ان میں سے کوئی بھی کسی نماز میں کم ہو تو اس قد نماز کے اوصاف میں بھی کمی ہو جائے گی۔

خشوع

تیسرا چیز خشوع ہے، چنانچہ قرآن پاک میں نمازوں کی یہ صفت آئی ہے:

﴿الَّذِينَ هُمْ فِي صَلَاةٍ هُمْ خَشِيعُونَ﴾ (۲۳/ المؤمنون: ۲)

”وہ مؤمنین کا میاہ ہیں (جو اپنی نماز میں خشوع و خضوع کرتے ہیں۔“

خشوی کے لغوی معنی یہ ہیں: بدن جھکا ہونا، آواز پست ہونا، آنکھیں پیچی ہونا یعنی ہر ادا سے مسکنت عاجزی اور توضیح ظاہر ہونا (السان العرب) اس لیے نماز خدا کے سامنے اپنی مسکینی، بیچارگی اور افتادگی کا اظہار ہے، اگر یہ کیفیت پیدا شہ تو گویا نماز کی اصلی غرض فوت ہو گئی۔

تقبل

قبول کے اصلی معنی کٹ جانے کے ہیں اور اس کے اصطلاحی معنی ہیں خدا کے سوا ہر چیز سے کٹ کر صرف خدا کا ہو جانا۔ ظاہر ہے کہ یہ ایک مسلمان کی زندگی کا حقیقی نصب اعین ہے۔ مگر قرآن پاک میں جہاں اس کا حکم ہے۔ سیاق و سبق سے معلوم ہوتا ہے کہ نماز کی حالت سے متعلق ہے، چنانچہ سورہ مزمل میں ہے:

﴿يَا أَيُّهَا الْمُرْسَلُونَ قُمُّ إِلَيْنَا إِلَّا قُلْيَلًا نِصْفَةُ أَوْ النُّقْضُ مِنْهُ قَلِيلًا أَوْ زُدْ عَلَيْهِ وَرَدِيلٌ الْقُرْآنَ تَرْبِيلًا إِنَّا سَنُنْقُ عَلَيْكَ قَوْلًا ثَقِيلًا إِنَّ نَاهِيَةَ الْيَلِيلَ هِيَ أَشَدُّ وَطَأً وَأَقْوَمُ قَلِيلًا إِنَّ لَكَ فِي السَّهَارِ سَبَعًا طَوِيلًا وَإِذْكُرْ أَسْمَرَ رَيْكَ وَتَبَكَّلْ إِلَيْهِ تَبَقْلًا﴾

(المرمل: ۱-۸ / ۷۳)

”اے کملی اوڑھنے والے! تھوڑی دیر کے سواتھ رات اٹھ کر نماز پڑھ، آدمی رات یا اس سے پچھ کم و بیش اور اس میں قرآن پڑھ کر پڑھ، ہم تجھ پر ایک بھاری بات اتارنے والے ہیں بے شک رات کو اٹھ کر نماز پڑھنا نفس کو خوب زیر کرتا ہے اور موثر ہوتا ہے، تیرے لیے دن کو بڑی فرصت ہے اپنے پروردگار کا نام لے اور ہر چیز سے کٹ کر اس کی طرف ہو جا۔“

یعنی نماز کی حالت میں خدا کا ذکر کرتے وقت اس کی عظمت اور اپنی عاجزی کے سوا ذہن سے تمام خیالات کل جانے چاہیں۔ صحیح مسلم میں حضرت عمر بن جب سلمی رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ مجھے آنحضرت ﷺ نے جو نماز سکھائی اس کے متعلق پیر میا کہ ”وضو کر کے جب کوئی نماز کے لیے کھرا ہوا پھر خدا کی حمد کی، شاکی اور خدا کی اس بزرگی کا اظہار کیا، جس کا وہ سزا اوارہ ہے اور اپنے دل کو خدا کے لیے ہر چیز سے خالی کر لیا (وَفَرَغَ قَلْبَهُ لِلّٰهِ) تو وہ نماز کے بعد ایسا ہو جاتا ہے، جیسے اس کی ماں نے اس کو اسی وقت پیدا کیا ہو۔“ یہ حدیث کو یا اسی آیت کی تفسیر ہے۔

تضرع

تضرع کے معنی زاری اور عاجزی اور عاجزی کے ساتھ درخواست کرنے کے ہیں (السان العرب) نماز میں بندہ پر عاجزی، زاری اور عجز و الحاح کے ساتھ سوال کرنے کی کیفیت طاری ہونی چاہیے، ورنہ اس حکم پر عمل نہ ہو گا:

﴿أَدْعُوكُمْ لِتَضَرَّعًا وَخُفْيَةً﴾ (۵۵/ الاعراف)

* صحیح مسلم، کتاب صلوٰۃ المسافرین، باب اسلام عمرو بن عبّس: ۱۹۳۰۔

”تم اپنے پروردگار کو مسکنت اور زاری کے ساتھ اور دھنی آواز سے پکارو۔“

اخلاص

نماز کے باطنی سنن و آداب کا اصلی جوہ راخلاص ہے، یعنی یہ کہ نماز سے مقصود خدا کے سوا کوئی اور چیز نہ ہو، کیوں کہ اگر ایسا نہیں ہے تو نماز نہیں بلکہ ریا اور نمائش ہو گی اور بعض اہل حق کے نزدیک شرک لازم آئے گا۔ فرمایا:

﴿وَأَقِيمُوا وَجُوهُكُمْ عِنْدَ كُلِّ مَسْجِدٍ وَادْعُوهُ فَخُلِّصُؤْنَ لَهُ الدِّينُ﴾

(الاعراف: ۲۹)

”اور تم ہر نماز کے وقت اپنے رخ کو ٹھیک رکھو اور خدا کو اخلاص کے ساتھ پکارو۔“

اس سے معلوم ہوا کہ نماز میں اخلاص کا پیدا کرنا اس کی تکمیل کے لیے ضروری ہے۔

ذکر

نماز خدا کی یاد کے لیے ہے، اگر دل میں کچھ اور زبان پر کچھ ہو تو خدا کی حقیقی یاد نہ ہو گی۔ اس لیے فرمایا:

﴿وَأَقِيمُ الصَّلَاةَ لِذِي الْكُرْبَةِ﴾ (۱۴/ طہ: ۲)

”میری یاد کے لیے نماز کھڑی کر۔“

ظاہر ہے کہ یاد صرف زبان سے الفاظ ادا کرنے کا نام نہیں ہے، اس کے ساتھ دل کی معیت اور قلب کا حضور بھی ہونا چاہیے اور یہی نماز کی بڑی غرض ہے۔

فهم و تدبر

نماز میں جو کچھ پڑھا جائے اس کے سمجھنے کی کوشش کرنی چاہیے۔ اگر بے پرواہی کی وجہ سے معنوں کی طرف دل متوجہ نہ ہو تو اس سے دل پر کچھ اثر نہ ہو گا، اسی لیے نشر کی حالت میں نماز پڑھنے کی ممانعت کی گئی ہے کہ اس حالت میں سمجھنے والا دل شرابی کے پہلو میں نہیں۔ فرمایا:

﴿لَا تَقْرِبُوا الصَّلَاةَ وَإِنَّمَا سُكْرُى حَتَّى تَعْلَمُوا مَا تَنْهَوْنَ﴾ (۴/ النساء: ۴۳)

”نماز کے قریب نہ جاؤ، جب تم نشر میں ہو، یہاں تک کہ (انتا ہوش آجائے کہ) جو تم کہو اس کو سمجھو۔“

اس آیت پاک نے یہ واضح کیا کہ نماز میں جو کچھ پڑھا جائے اس کے سمجھنے کی بھی ضرورت ہے، اسی بنا پر آپ نے نیند کے غلبہ کی حالت میں نماز پڑھنے کی ممانعت فرمائی ہے کہ اس میں بھی انسان فہم اور تدبر سے عاری ہو جاتا ہے۔ چنانچہ حدیث میں ہے کہ آنحضرت ﷺ نے فرمایا کہ ”نماز میں جب تم پر نیند غالب آئے تو سو جاؤ، کیوں کہ اگر نیند کی حالت میں نماز پڑھو گے تو ممکن ہے کہ دعا کی بجائے اپنے آپ کو برآ جلا

کہنے لگو۔“ * دوسری روایت میں ہے کہ فرمایا: ”نمازی کو جب نیند آئے تو سوچانا چاہیے، تاکہ وہ جو کہتا ہے وہ سمجھے۔“ * حاکم کی مستدرک میں ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا: ”جو شخص اچھی طرح وضو کرے پھر اس طرح نماز پڑھے کہ جو وہ کہتا ہے اس کو سمجھتا بھی ہے، یہاں تک کہ نماز ختم کر لے تو وہ ایسا ہو جاتا ہے کہ گویا اسی دن وہ ماں کے پیٹ سے پیدا ہوا۔“ *

یہ نماز کے وہ باطنی آداب ہیں جن کے بغیر نماز کامل نہیں ہوتی، جس طرح نماز کے ظاہری شرائط سے غفلت بر تا نماز سے غفلت ہے، اسی طرح نماز کے ان باطنی آداب کا لاحاظہ کرنا بھی نماز سے غفلت ہے اور اس لیے اس آیت ذیل کے مصدق و دلنوں ہیں:

﴿فَوَيْلٌ لِّلْمُصَلِّيْنَ إِنَّ الَّذِيْنَ هُمْ عَنْ صَلَاتِهِمْ سَاهُوْنَ إِنَّ الَّذِيْنَ هُمْ يَرَأُوْنَ لِلَّهِ عَوْنَ﴾

(الماعون: ٦-٤)

”پھٹکار ہوان نمازیوں پر جو اپنی نماز سے غفلت بر تھے ہیں، جو دکھاوے کی نماز پڑھتے ہیں۔“ ذرا ان الفاظ پر غور کیجئے! ان نمازیوں پر جو اپنی نماز سے غافل ہیں پھٹکار ہو، نمازی ہونے کے باوجود نماز سے غافل ہونے کے بھی معنی ہیں کہ نماز کے لیے جو ظاہری آداب مثلاً: خشوع و خضوع، تضرع و زاری اور فہم و تدبیر وغیرہ ضروری ہیں، ان سے نماز میں تغافل بر تاجے۔ نماز کے گزشتہ آداب کے مطابق آنحضرت ﷺ کی ہدایات، تعلیمات اور عملی مثالیں ہیں، جن میں آپ نے نماز کی اصلی حقیقت کو آشکارا کیا ہے۔ ایک دفعہ مسجد نبوی ﷺ میں ایک شخص نے آکر نہایت عجلت میں نماز پڑھی آپ ﷺ نے فرمایا: ”اے شخص! اپنی نماز پھر پڑھ کیوں کہ تو نے نماز نہیں پڑھی۔“ اس نے دوبارہ اسی طرح نماز ادا کی آپ نے بھروسی ارشاد فرمایا جب تیسری دفعہ بھی ایسا ہی ہوا تو اس نے عرض کی، یا رسول اللہ ﷺ! کیسے نماز پڑھوں؟ فرمایا: ”اس طرح کھڑے ہو، اس طرح قراءت کرو، اس طرح اطمینان و سکون کے ساتھ رکوع اور سجده کرو۔“ * نماز میں نظر اٹھا کر ادھر ادھر دیکھنا خشوع کے خلاف ہے اس سے انسان کی توجہ بُتھی اور حضور قلب میں خلل پڑتا ہے، اس لیے آنحضرت ﷺ نے فرمایا کہ ”نماز میں ادھر ادھر نہ دیکھا کرو، کیا تمہیں یہ ذہنیں کہ تمہاری نظر واپس نہ آ سکے۔“ * آپ ﷺ نے یہ بھی فرمایا کہ ”جب

۱ مسلم، کتاب صلاة المسافرين، باب امر من نعم في صلاة: ١٨٣٥۔

۲ بخاري، کتاب الصلوة، باب الوضوء من النوم: ٢١٣۔

۳ مستدرک، کتاب الطهارة، ج ۱، ص: ۱۳۱ (ترغیب و ترهیب حافظ منذری)، ج ۱، ص: ۷۳ مصر) اس سے ان مسلمانوں کو جو عربی زبان نہیں سمجھتے عموم حاصل کرنی چاہیے ورنہ جا گئے کہ نماز میں جو سورتیں اور دعا میں وہ پڑھتے ہیں ان کے معنی ذہن نہیں کر سکتیں اور یہ مرسلان کے لیے بہت آسانی میں ملکن ہے۔ بشرطیکو وہ تھوڑی توجہ کرے۔

۴ صحيح بخاري، کتاب الاذان، باب وجوب القراءة للامام والمأمور في الصلوات: ٧٥٧؛ صحيح مسلم، کتاب الصلاة، باب وجوب قراءة الفاتحة في كل ركعة: ٨٨٥؛ أبو داود، کتاب الصلوة، باب صلوة من لا يقيم صلبه في الركوع والسجود: ٨٥٦۔ مسنـد احمد عن جابر بن سمرة، ج ٥، ص: ٩٣۔

تک بندہ نماز میں دوسری طرف ملتفت نہیں ہوتا اندھا اس کی طرف ملتفت رہتا ہے اور جب وہ خدا کی طرف سے منہ پھیر لیتا ہے تو خدا بھی اپنا منہ اس کی طرف سے پھیر لیتا ہے۔ **۱** طبرانی میں ہے کہ آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا: ”جب تم میں سے کوئی شخص نماز کے لیے کھڑا ہو تو وہ خدا کی طرف پوری طرح متوجہ ہے، یہاں تک کہ نماز سے فارغ ہو جائے اور نماز میں منہ پھیر کر ادھر ادھر دیکھو کیوں کہ جب تک تم نماز میں ہو خدا سے با تین کر رہے ہو۔“ **۲** مسند بزار میں ہے کہ ”جب بندہ نماز میں ادھر ادھر دیکھتا ہے تو خدا فرماتا ہے تو کہا ہو دیکھتا ہے؟ کیا تیرے زدیک مجھ سے بھی بہتر کوئی چیز ہے تو میری طرف دیکھو دوسری دفعہ بھی خدا بھی فرماتا ہے پھر تیسرا دفعہ جب اس سے یہ حرکت صادر ہوتی ہے تو خدا اس کی طرف سے اپنا منہ پھیر لیتا ہے۔“ **۳**

ایک دفعہ آپ ﷺ نے فرمایا: ”سب سے بڑا چور وہ ہے جو نماز کی پوری کرتا ہے۔“ صحابہ نے دریافت کیا کہ یا رسول اللہ نماز کی پوری کیا ہے؟ فرمایا: ”رکوع اور سجدہ اچھی طرح نہ کرنا اور خشونت نہ ہونا۔“ **۴** ایک دفعہ آپ نے نماز سے فارغ ہو کر آخري صفائی کے ایک شخص کو آواز دی کہ ”اے فلاں تو خدا سے نہیں ڈرتا کس طرح نماز پڑھتا ہے، جب کوئی شخص نماز پڑھنے کھڑا ہوتا ہے تو اپنے رب سے با تین کرتا ہے، پس سوچنا چاہیے کہ اس سے کس طرح با تین کرے۔“ **۵** صحیح مسلم میں ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا کہ ”کیا تو نماز بھی اچھی طرح نہیں پڑھتا کیا نماز پڑھنے والا جب نماز پڑھتا ہے تو نہیں سمجھتا کہ وہ کس طرح نماز پڑھ رہا ہے، تو اپنے ہی فائدہ کے لیے نماز پڑھتا ہے۔“ **۶** نماز کی حالت میں تھوکنا اور خصوصاً سامنے تھوکنا ادب کے خلاف ہے۔ آپ نے صحابہ علیہ السلام سے فرمایا کہ ”نماز کی حالت میں خدا تمہارے سامنے ہوتا ہے تو کیا تم پسند کرتے ہو کہ تم اس کے سامنے تھوکو۔“ **۷** دوسری روایتوں میں ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا: ”نماز میں کوئی شخص سامنے تھوکے کہ اس وقت وہ خدا سے با تین کرتا ہوتا ہے۔“ **۸** مسلم کی ایک اور روایت میں ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا: ”نماز میں خدا تمہارے منہ کے سامنے ہوتا ہے۔“ **۹**

نماز میں سکون اور اطمینان پیدا کرنے کی بھی آپ نے ہدایتیں فرمائی ہیں ارشاد ہوا کہ ”جب نماز ہو رہی ہو اور تم باہر سے آؤ تو دوڑ کر مت آؤ بلکہ اس طرح آؤ کہ تم پر سکون ہو اور وقار طاری ہو۔“ **۱۰** اس سے

۱ مسند احمد، ج ۵، ص: ۱۷۲؛ ابو داود، باب الالتفات في الصلوة: ۹۰۹؛ مستدرک، ج ۱، ص: ۲۳۶۔

۲ طبرانی فی الاوسط عن ابی هریرة بحواله تک العمال، ج ۴، ص: ۱۰۸۔ **۳** کنز العمال، ج ۴، ص: ۱۰۸۔

۴ مسند احمد، ج ۵، ص: ۲۱۰ و دارمی، کتاب الصلاة، باب من لایتم الرکوع والسجود: ۱۳۲۸ و ابن ابی شیبۃ و ابن حزمیة و ابن حبیان و عبد بن حمید و عبد الرزاق و طبرانی فی الاوسط اخیر لفظ بعض روایتوں میں نہیں ہے۔

۵ مستدرک حاکم، ج ۱، ص: ۲۳۶ (علی شرط مسلم)۔ **۶** صحیح مسلم، کتاب الصلاة، باب الامر بتحمیل الصلوة: ۹۵۷۔ **۷** صحیح مسلم، کتاب المساجد، باب النهى عن البصاق فیها: ۱۲۲۲ و حاکم فی المستدرک، ج ۱، ص: ۲۵۷؛ ابو داود، باب کراہیۃ البصاق فی المسجد: ۴۷۸۔

۸ صحیح بخاری، کتاب مواقيت الصلاۃ، باب المصلى یتاجی رہے: ۵۳۱؛ مسلم، کتاب المساجد: ۱۲۳۰۔

۹ مسلم، باب النهى عن البصاق فیها: ۱۲۲۳۔ **۱۰** صحیح مسلم، باب استحباب اتیان الصلوة بوقار: ۱۳۵۹۔

اول تو یہ مقصود ہے کہ خود اس شخص پر سکون واطمینان طاری رہے، دوسرے یہ کہ اس کی دوڑیا چال سے دوسرے نمازیوں کے سکون میں خلل نہ آئے، اسی طرح بے اطمینانی کے اگر طبعی اسباب ہوں تو نماز سے پہلے ان سے بھی فراغت کر لی جائے۔ مثلاً: بھوک ہوا اور کھانا رکھا ہوا اور ادھر جماعت کھڑی ہو رہی ہو تو پہلے کھانا کھالینا چاہیے، تاکہ نماز الطمینان سے ادا ہو۔ * اسی طرح اگر استجایا قضاۓ حاجت کی ضرورت ہو تو پہلے اس سے فراغت کر لی جائے تب نماز پڑھی جائے۔ *

آغاز اسلام میں لوگ نماز کی حالت میں ہاتھ اٹھا کر سلام کا جواب دیتے تھے۔ لیکن مدینہ آ کر یہ اجازت منسوخ ہو گئی، ایک صحابی نے جن کو اس کی خبر نہ تھی۔ آنحضرت ﷺ کوئی دفعہ نماز میں سلام کیا اور جب آپ نے جواب نہ دیا تو نماز کے بعد انہوں نے اس کا ذکر کیا فرمایا: *

((ان فی الصلوٰۃ لشغلاً))

”نماز میں اور ہی مصروفیت ہوتی ہے۔“

نماز پڑھتے وقت ایسے کپڑے پہننا یا سامنے ایسا پردہ لٹکانا جن کے نقش و نگار میں دل محو ہو جائے اور توجہ ہٹ جائے، مگر وہ ہے، ایک دفعہ آنحضرت ﷺ نے گل بولوں کی ایک چادر اور ڈھنپی پھر فرمایا: ”اس کے گل بولوں نے مجھے اپنی طرف متوجہ کر لیا اس کا بوہم (تاجر کا نام) کے پاس لے جاؤ اور انہانی سادہ چادر لے آؤ۔“ * اسی طرح ایک دفعہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے سامنے دیوار پر ایک مقش پردہ لٹکایا تھا، آپ نے نماز پڑھی تو خیالات میں یک سوئی نہ رہی، آپ نے اس کو اتر وادیا۔ *

نماز کے اوقات کی تعین میں بھی یہ اصول مذکور رکھا گیا ہے کہ وہ ایسے ہونے چاہیے جن میں نبہتا سکون میسر ہوتا ہو، اسی لیے ظہر کی نماز کا اصلی وقت اگرچہ فوراً بعد زوال ہونا چاہیے، تاہم چونکہ اس وقت گری سخت ہوتی ہے، اس لیے توفیق کا حکم دیا گیا۔ گرمی کے دنوں میں چونکہ اور بھی زیادہ شدت ہوتی ہے، اس لیے فرمایا کہ یہ دوپہر کی گرمی (گویا) جہنم کی آگ ہے، اس لیے ذرا اٹھنڈک کے بعد ظہر کی نماز پڑھو۔

((فان الصلوٰۃ مشهودة محضورة)) *

”کیونکہ نماز میں حضور ہوتا ہے۔“ *

* صحیح بخاری، کتاب الاذان، باب اذا حضر الطعام واقیمت الصلوة: ٦٧٤١ تا ٦٧٤٣؛ صحیح مسلم، باب کراهة الصلوة بحضور الطعام: ١٢٤١؛ ابو داود، کتاب الطهارة: ٨٩؛ ترمذی، ابواب الصلاة، باب ما جاء اذا حضر: ٣٥٣۔ * مسلم، کتاب المساجد، ایضاً: ١٢٤٦؛ ابو داود، باب يصلی الرجل وهو حاقن: ٩١، ١٠؛ موطا امام مالک، النہی عن الصلوٰۃ والانسان برید: ٣٨٠۔ * صحیح مسلم، کتاب المساجد، باب تحريم الكلام فی الصلوٰۃ: ١٢٠١۔ * صحیح مسلم، باب کراهة الصلوة فی ثوب له اعلام: ١٢٣٨۔

* صحیح بخاری، کتاب اللباس، باب الأکسیة والسمائص: ٥٨١٧؛ مسلم کتاب اللباس، باب تحريم تصویر: ٥٥٢٩۔ * صحیح مسلم، کتاب صلاة المسافرين، باب اسلام عمرو بن عبّة: ١٩٣٠۔

* محدثین نے اس حضور سے فرشتوں کا حاضر ہونا مراد لیا ہے۔

نماز کی روحانی کیفیت کا سب سے اعلیٰ منظر یہ ہے کہ انسان پر ایسی حالت طاری ہو جائے کہ اسے معلوم ہو کہ وہ اس وقت خدا کے سامنے کھڑا ہے۔ گزر چکا ہے کہ ایک شخص نے آپ سے دریافت کیا تھا کہ احسان کیا ہے؟ فرمایا：“یہ ہے کہ جب تم عبادت کرو تو تم کو یہ معلوم ہو کہ تم خدا کو دیکھ رہے ہو۔ کیوں کہ اگر تم خدا کو نہیں دیکھ رہے ہو تو وہ تو تم کو ہبھر حال دیکھ رہا ہے۔” * کبھی کبھی آنحضرت ﷺ پر نماز میں رفت طاری ہو جاتی تھی اور چشم مبارک سے آنسو نکلنے لگتے تھے۔ ایک صحابی جنوں نے آنحضرت ﷺ کی اس کیفیت کو ایک دفعہ دیکھا تھا، کہتے ہیں کہ میں نے دیکھا کہ آنحضرت ﷺ نماز میں ہیں، آنکھوں سے آنسو جاری ہیں، روٹے روٹے ہبھیاں بندھ گئی ہیں، ایسا معلوم ہوتا تھا کہ گویا چکلی چل رہی ہے یا ہانڈی ابل رہی ہے۔ * رات کی نمازوں میں آنحضرت ﷺ پر عجیب ذوق و شوق کا عالم طاری ہوتا تھا۔ قرآن پڑھتے چلے جاتے، جب خدا کی عظمت و کبریائی کا ذکر آتا پناہ مانگتے، جب رحم و کرم کی آیتیں آتیں تو دعا کرتے۔ * آپ ﷺ نے فرمایا کہ ”نماز دو دور کعت کر کے ہے اور ہر دوسری رکعت میں تشهد ہے اور تضرع و زاری ہے، خشوع اور خضوع ہے، عاجزی اور مسکنت ہے اور ہاتھ اٹھا کر اے رب، اے رب کہنا ہے، جس نے ایسا نہ کیا تو اس کی نماز ناقص ہے۔“ *

ایک دفعہ آپ اعتکاف میں تھے اور لوگ مسجد میں زور زور سے قراءت کر رہے تھے آپ ﷺ نے فرمایا: ”لوگوں میں سے ہر ایک خدا سے مناجات کر رہا ہے تو وہ سمجھے کہ وہ کیا کہہ رہا ہے اور ایک دوسرے کی مناجات میں اپنی آواز سے خلل انداز نہ ہو۔“ *

ایک صحابی نے درخواست کی کہ یا رسول اللہ ﷺ! مجھے کچھ ہدایت فرمائیے ارشاد ہوا کہ ”جب تم نماز کے لیے کھڑے ہو تو تمہاری نماز ایسی ہونی چاہیے کہ یہ معلوم ہو کہ تم اس وقت مر رہے ہو اور دنیا کو چھوڑ رہے ہو۔“ * تمہاری نماز کی اس کیفیت کا کوئی شخص اندازہ کر سکتا ہے؟ اس پوری تفصیل سے ظاہر ہو گا کہ اسلام کی نماز کیا ہے؟ قرآن کس نماز کو لے کر اڑا ہے اور محمد رسول اللہ ﷺ نے کس نماز کی تعلیم دی ہے؟ اور اس کی اصلی کیفیتیں کیا کیا ہیں؟ اور اگر نماز یہ نماز ہو تو وہ انسان کی روحانی اور اخلاقی اصلاحات کا کتنا موثر ذریعہ ہے۔ اسی لیے قرآن پاک نے نماز کی محافظت یعنی پابندی اور آداب کے ساتھ ادا کرنے کو ایمان کا نتیجہ بتایا ہے:

﴿وَالَّذِينَ يُؤْمِنُونَ بِالْآخِرَةِ يُؤْمِنُونَ بِهِ وَهُمْ عَلَى صَلَاتِهِمْ يَمْكُفِفُونَ﴾

(۶) (الاعnam: ۹۲)

1. صحيح بخاری، کتاب الایمان، باب سوال جریئل النبی ﷺ: ۵۰۔ 2. ترمذی فی ”الشماں“: ۳۲۱ وابوداؤد، کتاب الصلاة، باب البکاء فی الصلوة: ۹۰۵۔ 3. مسند احمد بن حنبل، ج ۶، ص: ۹۲۔
4. ابوداؤد، کتاب التطوع، باب صلوٰۃ النہار: ۱۲۹۶ وترمذی، ابواب الصلاة، باب ما جاء فی التخشیع فی الصلوة: ۳۸۵۔ 5. ابوداؤد، کتاب التطوع، باب رفع الصوت: ۱۳۳۲۔
6. مسند احمد، ج ۵، ص: ۴۱۲ عن ابی ایوب۔

”اور جو لوگ آخرت پر ایمان رکھتے ہیں وہ قرآن کو مانتے ہیں اور وہ اپنی نماز کی گہدافت کرتے ہیں۔“

نماز کی اس گہدافت اور حفظ کے دو معنی ہیں اور دونوں یہاں مقصود ہیں، یعنی ایک تو اس کے ظاہری شرائط کی تعمیل اور دوسرا سے اس کے باطنی آداب کی رعایت۔
نماز کے اخلاقی، تمدنی اور معاشرتی فائدے

نمازو درحقیقت ایمان کا ذائقہ، روح کی غذا اور دل کی تسکین کا سامان ہے، مگر اسی کے ساتھ ساتھ وہ مسلمانوں کے اجتماعی، اخلاقی، تمدنی اور معاشرتی اصلاحات کا بھی کارگر آرہ ہے، آنحضرت ﷺ کے ذریعہ سے اخلاق و تمدن و معاشرت کی جتنی اصلاحیں وجود میں آئیں، ان کا بڑا حصہ نماز کی بدولت حاصل ہوا، اسی کا اثر ہے کہ اسلام نے ایک ایسے بدوسی، حشی اور غیر متمدن ملک کو جس کو پہنچنے اور ہٹانے کا بھی سلیقہ نہ تھا، چند سال میں ادب و تمذبب کے اعلیٰ معیار پر پہنچا دیا، اور آج بھی اسلام جب افریقہ کے حشی سے حشی ملک میں پہنچ جاتا ہے، تو وہ کسی بیرونی تعلیم کے بغیر صرف مذہب کے اثر سے، مذہب و متمدن ہو جاتا ہے، متمدن قوموں میں جب وہ پہنچ جاتا ہے، تو ان کے تخلی کو بلند سے بلند تر، پاکیزہ سے پاکیزہ تر بنادیتا ہے اور ان کو اخلاص کی وہ تعلیم دیتا ہے، جس کے سبب سے ان کا وہی کام جو پہلے مٹی تھا، اب اکسیر بن جاتا ہے۔

۴۱ ستر پوشی: نماز کے ان معاشرتی فائدوں میں بالکل ابتدائی چیز ستر پوشی کا خیال ہے، انسان کا شرم و حیا کی گہدافت کے لیے، اپنے جسم کے بعض حصوں کو چھپانا نہایت ضروری ہے، عرب کے بدوسا تمذبب سے ناواقف تھے، بلکہ شہروں کے باشندے بھی اس سے بے پرواٹ تھے، یہاں تک کہ غیر قریشی عورتیں جب حج کے لیے آتی تھیں تو اپنے کپڑے اتار دیتی تھی اور کاشنگنگی ہو کر طواف کرتی تھیں، اسلام آیا تو اس نے ستر پوشی کو ضروری قرار دیا، یہاں تک کہ بغیر اس ستر پوشی کے اس کے نزدیک نماز ہی درست نہیں، آیت نازل ہوئی:

﴿خُذُوا زِينَةً عِنْدَ مُكْثِرٍ مَّسْجِدِ﴾ (۷/الاعراف: ۳۱)

”ہر نماز کے وقت اپنے کپڑے پہنو۔“

مردوں کے لیے کم از کم ناف سے گھنٹے تک اور عورتوں کے لیے بیشتر سے لے کر پاؤں تک چھپانا نماز میں ضروری قرار پایا، اس تعلیم نے جاہل اور حشی عربوں کو اور جہاں جہاں اسلام گیا، وہاں کے برہمنہ باشندوں کو ستر عورت پر مجبور کیا، اور نماز کی تاکید نے دن میں پانچ دفعہ ان کو اس فرض سے آشنا کر کے بھیشہ کے لیے ان کو ستر پوش بنادیا، افریقہ اور ہندوستان میں مسلمانوں اور غیر مسلمانوں کے لباسوں پر ایک نظر ڈالنے سے یہ معلوم کیا جا سکتا ہے کہ اسلام نے تمدن کے اس ابتدائی سبق میں دنیا کی کتنی بڑی مدد کی ہے، دوسری طرف متمدن تو میں، زیب و زینت اور حسن و آرائش اور تمدن کی بے اعتدالی سے بے حیائی پر اتر آتی

ہیں، مرد گھنٹوں سے اونچا لباس اور عورتیں نیم برہنہ یا نہایت باریک لباس پہنچتی ہیں، نماز ان کی بھی اصلاح کرتی ہے اور ان متبدن قوموں کو اعتدال سے تجاوز نہیں کرنے دیتی، چنانچہ حورتوں کو تیز خوشبو لگا کر مسجد میں جانے سے منع فرمایا اور بے حیائی کے کپڑوں کے پہنچنے سے عموماً روک دیا ہے اور کہہ دیا ہے کہ سترا عورت کے بغیر نماز نہیں ہوتی۔

۲ طہارت: اس کے بعد تمدن کا دوسرا ابتدائی سبق طہارت اور پاکیزگی ہے، جو اسلام کے اوپرین احکام میں سے ہے، اقرائے بعد دوسری ہی وحی میں جو آنحضرت ﷺ پر نازل ہوئی اس میں یہ حکم تھا:

﴿وَيَأْكُلُ فَطَهَرَةً﴾ (٤/ المدثر: ٤)

”اور اپنے کپڑوں کو پاک رکھ۔“

چنانچہ اسلام نے اس طہارت اور پاکیزگی کے اصول مقرر کیے اور آنحضرت ﷺ نے اپنی تعلیمات سے اس کے حدود متعین فرمائے اور نماز کی درستی کے لیے یہ ضروری فرادری کا انسان کا بدن، اس کے کپڑے اور اس کی نماز پڑھنے کی جگہ نجاستوں اور آلودگیوں سے پاک ہو، اہل عرب کو دوسری وحشی قوموں کی طرح طہارت و نظافت کی مطلقاً تیزی نہ تھی، یہاں تک کہ ایک بد و نمی مسجد نبوی ﷺ میں آ کر سب کے سامنے بیٹھ کر پیشاب کر دیا، صحابہ رضی اللہ عنہم اس کو مارنے کو دوڑے، آپ نے ان کو روکا، اور اس بد و کو اپنے پاس بلا کر نہایت مہربانی سے فرمایا کہ ”یہ نماز پڑھنے کی جگہ ہے، اس قسم کی نجاستوں کے لیے یہ موزوں نہیں ہے۔“ اور صحابہ سے فرمایا کہ ”اس نجاست پر پانی بہادو۔“ * ایک دفعاً ایک قبر کے پاس سے آپ گزرے تو فرمایا کہ ”اس قبر والے پر اس لیے عذاب ہو رہا ہے کہ یہ پیشاب کی چھینٹوں سے پرہیز نہیں کرتا تھا۔“ * غرض اس تعلیم نے جو صرف نماز کے لیے تھی، اہل عرب اور عام مسلمانوں کو پاک و صاف رہنے کا خواگر بنایا، اور استغنا، بیت الخلا اور طہارت کے وہ آداب سکھائے جن سے آج کی بڑی بڑی متبدن قومیں بھی نا آشنا ہیں۔ نجاستوں سے اپنے بدن، کپڑے، اور مکان کو صاف رکھنے کی تعلیم دی، جو صحابہ طہارت کا اہتمام کرتے تھے، خدا نے ان کی مدح فرمائی:

﴿فِيهِ يَجَانِيْكُوْنَ أَنْ يَسْتَطِهُوا وَاللَّهُ يُحِبُّ الْمُصْتَهِرِينَ﴾ (٩/ التوبہ: ١٠٨)

”اس مسجد میں کچھ لوگ ایسے ہیں جو پسند کرتے ہیں، کہ وہ پاک و صاف رہیں اور اللہ تعالیٰ

پاک و صاف رہنے والوں کو پیار کرتا ہے۔“

جب اسلام نے طہارت و پاکیزگی کو خدا کے پیار کرنے کا ذریعہ نہ بھرایا تو اس نعمت سے محرومی کو کون پسند کر سکتا ہے؟

۳ صفائی: نماز کا تیسرا فائدہ یہ ہے کہ وہ انسان کو اپنے جسم اور اعضا کے پاک اور سਹرا رکھنے پر مجبور کرتی

* صحیح بخاری، کتاب الوضوء، باب صب الماء علی البول: ۲۲۰۔

** صحیح بخاری، کتاب الوضوء، باب من الكبار ان لا یستتر من بول: ۱۱۷۔

ہے، دن میں عموماً پانچ دفعہ ہر نمازی کو منہ ہاتھ پاؤں جو اکثر کھلے رہتے ہیں، ان کے دھونے کی ضرورت پیش آتی ہے، ناک میں پانی ڈال کر ناک صاف کرنی ہوتی ہے، ایک بڑے ڈاکٹر نے مجھ سے یہ کہا کہ آج کل کے جراشیم کے نظریہ کی بنا پر بہت سی بیماریاں ناک کی سانس کے ذریعہ جراشیم کے بدن کے اندر جانے سے پیدا ہوتی ہیں اور ناک کے نقصوں کو پانی ڈال کر صاف کرنے سے یہ جراشیم دور ہوتے ہیں۔

دنیا میں اسلام کے سوا اور کوئی مذہب نہیں ہے جس نے ناک میں پانی ڈالنا ضروری قرار دیا ہو، حالانکہ طبی حیثیت سے یہ سب سے زیادہ ضروری چیز ہے، اس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ اسلام کے احکام کس قدر طبی اصول پر مبنی ہیں، نمازوں کو پنج وقت وضو کی ہدایت کی اہمیت اس وقت اور بڑھ جاتی ہے، جب یہ معلوم ہوتا ہے کہ یہ حکم نازل ہوا، اس ملک میں جہاں پانی سب سے زیادہ کمیاب ہے۔

اہل عرب اور خصوصاً بدو دانتوں کو بہت کم صاف کرتے ہیں، جس سے گندہ دہنی اور بد نمائی کے علاوہ طرح طرح کی بیماریاں پیدا ہوتی ہیں، آنحضرت ﷺ نے ہر نماز کے وقت سواک کرنے کی اتنی تاکید فرمائی ہے کہ گویا جو بکے قریب پہنچ گئی اور فرمایا کہ ”اگر میری امت پر یہ شاق نہ گزرتا تو میں اس کو ضروری قرار دیتا۔“ ۱ اسی پانی کی کمی جو بے اہل عرب نہاتے کم تھے، ان کے کپڑے عموماً دون کے ہوا کرتے تھے، وہ محنت مزدوری کرتے تھے، جس سے پیشہ میں شرابور ہو جاتے تھے اور چونکہ ایک ایک کپڑے کو ہٹتوں پہنچ رکھتے تھے، اس لیے جب مسجد میں نماز پڑھنے آتے تو ان کے بدن اور کپڑوں سے بدبو آتی تھی، اس بنا پر اسلام نے ہفتہ میں کم از کم ایک مرتبہ جمہ کو نماز سے پہلے غسل کرنا اور نہانا سب پر واجب کر دیا آنحضرت ﷺ نے فرمایا:

((غسل یوم الجمعة واجب على كل محتلم)) ۲

”جمعہ کے دن نہانا ہر بالغ پر ضروری ہے۔“

اسی کے ساتھ اس دن دھلے ہوئے کپڑے پہننا، خوشبو ملتا اور صفائی و نظافت کے دوسرا امور کو مستحسن قرار دیا، بعض حالات میں غسل کرنا فرض قرار دیا، جس کے بغیر کوئی نماز ممکن ہی نہیں، فرمایا:

﴿وَإِنْ كُنْتُمْ جُنُبًا فَاطْهُرُوا﴾ (۵ / المائدۃ: ۶)

”اور اگر تم ناپاک ہو گئے ہو تو نہا کر اچھی طرح پاک ہو جاؤ۔“

۳ پابندی وقت

انسان کی کامیاب عملی زندگی کا سب سے بڑا راز یہ ہے کہ اس کے تمام کام مقررہ اوقات پر انجام پائیں، انسان فطرتاً آرام پسند اور راحت طلب پیدا ہوا ہے، اس کو پابند اوقات بنانے کے لیے ضروری ہے کہ اس کے

۱ صحیح بخاری، کتاب الجمعة، باب السواک یوم الجمعة: ۸۸۷۔

۲ صحیح بخاری، کتاب الجمعة، باب فضل الغسل یوم الجمعة: ۸۷۹۔

بعض کاموں کے اوقات جبراً مقرر کر دیے جائیں، جیسا کہ کار و بار کے کاموں میں آپ کو یہ اصول نظر آتا ہے، اس کا تجھے یہ ہوتا ہے کہ انسان اپنے دوسرے کاموں کے اوقات بھی ان کی خاطر مقرر کر لیتا ہے اور اس طرح اس کی زندگی با قاعدہ ہو جاتی ہے اور اس کا وقت فضول بر باذمیں ہوتا، نماز کے اوقات چونکہ مقرر ہیں، اس لیے وہ لوگ جو نماز کے پابند ہیں، خصوصاً نماز باجماعت کے، ان کے اوقات خود تنخود منظم ہو جاتے ہیں، ان کے دن رات کے کام باقاعدہ انجام پاتے ہیں اور نماز کے اوقات ان کے کاموں کا معیار ہو جاتے ہیں، وقت پر سونا اور وقت پر ائمہ ان کے لیے ضروری ہو جاتا ہے، مشہور صحابی حضرت سلمان فارسی رض کا مقولہ ہے:

((الصلوٰة مکیال فمن اوْفی بِهِ وَمِن طُفْفٍ فَقَدْ عَلِمْتُ مَالِ الْمُطْفَفِينَ)) ﴿۱﴾

”نماز ایک پیانہ ہے، جس نے اس کو پورا نہیا، اس کو پورا ناپ کر دیا جائے گا اور جس نے ناپنے میں کمی کی تو تمہیں کم ناپنے والوں کی سزا معلوم ہے۔“

اس قول کے جہاں اور مطلب ہو سکتے ہیں، یہ بھی ہو سکتا ہے کہ نماز ہر مسلمان کے کام کا پیانہ ہے، اسی سے اس کی ہر چیز ناپی جاسکتی ہے۔

۵۳ صبح خیری

طب اور حفظان صحت کے اصول سے رات کو سوریے سونا اور صبح کو طلوع آفتاب سے پہلے بیدار ہونا جس درجہ ضروری ہے، وہ مخفی نہیں، جو لوگ نماز کے پابند ہیں، وہ اس اصول کی خلاف درزی کبھی نہیں کر سکتے، جب تک رات کو وقت پر سویانہ جائے گا، صبح کو وقت پر آنکھیں کھل سکتی، اسی لیے آنحضرت ﷺ نے رات کو نماز عشاء کے بعد بے کار باتیں کرنے سے اور قصہ کہانی سے منع فرمایا ہے ﴿۲﴾ تاکہ وقت پر سونے سے وقت پر آنکھ کھل سکے اور صبح خیری مسلمانوں کی عادت ہو جائے اور صبح کو موزن کی پرتاثیر آواز۔

((الَّصَلَاةُ خَيْرٌ مِّنَ النَّوْمِ))

”سونے سے نماز بہتر ہے۔“

ان کو بے تابانہ اپنے خواب کے بستر سے اٹھا دے۔

۵۴ اللہ کا خوف

ایک مسلمان جو نماز پڑھتا ہے، جب کبھی غلطی سے یا بشری کمزوری سے اس کا قدم ڈال گا تاہے، تو رحمت الہی اس کا ہاتھ تھام لیتی ہے، اس کو اپنے فعل پر ندامت ہوتی ہے، اس کو اپنے خدا کے سامنے جاتے ہوئے شرم آتی ہے، اس کا خییر اس کو ملامت کرتا ہے، وہ لوگوں سے اس بنا پر شرما تاہے کہ وہ کہیں گے کہ یہ نماز ہی ہو کر اس قسم کے افعال کا مرکتب ہوتا ہے، کہ اس کے پاؤں بدی کے راستے پر پڑتے وقت کا بیٹتے ہیں، غرض نماز انسان

۱) کنز العمال مندویات الصلوٰۃ، ج ۴، ص: ۲۲۰ بحوالہ مصنف عبدالرزاق۔

۲) بخاری، کتاب مواعیت الصلاۃ، باب ما یکرہ من السمر بعد العشاء: ۵۹۹۔

کے اخلاقی حاسو کو بیدار کرتی ہے اور برائیوں سے بچاتی ہے اور خود خدا نے نماز کا وصف یہ بیان کیا ہے:

﴿إِنَّ الصَّلَاةَ تَهْلِي عَنِ الْفَحْشَاءِ وَالْمُنْكَرِ﴾ (۴۵/العنکبوت)

”بے شک نماز بے حیائی اور بری با توں سے روکتی ہے۔“

۷۲) ہشیاری

نماز عقل، ہوش، بیداری اور آیاتِ الہی میں مدد برادر غور، خدا کی تسبیح و تہلیل اور اپنے لیے دعائے مغفرت کا نام ہے، اس لیے وہ تمام چیزوں جو انسان کی عقل و ہوش اور فہم اور احساس کو کھو دیں، نماز کی حقیقت کے منافی ہیں، اسی لیے اس وقت بھی جب شراب کی ممانعت نہیں ہوئی تھی، اس کو پی کر نہ کی حالت میں نماز پڑھنا جائز تھا:

﴿لَا تَقْرِبُوا الصَّلَاةَ وَأَنْتُمْ سُكْرٌ حَتَّىٰ تَعْلَمُوا مَا تَعْلُمُونَ﴾ (۴/ النساء: ۴۳)

”نہ کی حالت میں تم نماز کے قریب نہ جاؤ، یہاں تک کہ تم سمجھنے لگو جو بکھر کہتے ہو۔“

اس بنا پر ایک نماز کا پابند تمام ایسی چیزوں سے جو اس کی عقل و ہوش کو گم کر دیں، قطعاً پر ہیز کرے گا۔

۷۳) مسلمان کا امتیازی نشان

ندبی بلکہ سیاسی حیثیت سے بھی اسلام کو سب سے زیادہ مخلصین اور منافقین کے امتیاز کی ضرورت تھی، قانون ان دونوں گروہوں میں کوئی امتیاز نہیں کر سکتا تھا، احکام میں جو ایک ایسی چیز ہے، جس کے اہل عرب مدت سے خود رکھتے، اس کے ساتھ وہ ان کے مذاق کی چیز تھی، خلافت کا اجتماع ایک میلے کی صورت اختیار کر لیتا تھا، جو عرب کے تمدن کا ایک لازمی جزو تھا، فخر و امتیاز کے موقعے بھی اس میں حاصل ہو سکتے تھے، گو اسلام نے اس کی اصلاح کر دی، زکوٰۃ بھی کوئی حد فاصل نہیں ہو سکتی تھی، کیونکہ اکثر منافقین متول تھے اور یہ جاہ و فخر کا بھی ذریعہ ہو سکتی تھی، اس کے ساتھ یہ عرب کی فیاض طبیعت پر بھی گراں نہیں ہو سکتی تھی، فقراء کے ساتھ ہمدردی کا جذبہ بھی فطری ہے، صرف معمولی تحریک کی ضرورت تھی، روزہ بھی اس کا معیار نہیں قرار دیا جا سکتا، کیونکہ روزہ میں چھپے چوری کھاپی لینے کا موقع بے آسانی حاصل ہو سکتا ہے، صرف نماز ایک ایسی چیز ہے، جو ان دونوں گروہوں میں حد فاصل ہو سکتی ہے، چنانچہ قرآن پاک نے اسی فریضہ میں سستی کو منافقین کی خاص پیچان قرار دیا:

﴿وَإِذَا قَامُوا إِلَى الصَّلَاةِ قَامُوا أَكْسَالَى﴾ (۴/ النساء: ۱۴۳)

”اور جب وہ نماز پڑھنے کو اٹھتے ہیں تو کسل مندی کے ساتھ اٹھتے ہیں۔“

نیز فرمایا:

﴿وَإِنَّهَا لِكَبِيرَةٌ لَا عَلَى الْخَشْعِينَ﴾ (۲/ البقرة: ۴۵)

”خضوع و خشوع والوں کے علاوہ نماز سب پر گراں ہے۔“

خصوصاً عشاً اور فجر کی نماز کی نیست کہ راحت کے اوقات ہیں، آنحضرت ﷺ نے فرمایا:

((ليس صلاة اثقل على المنافقين من الفجر والعشاء))

”منافقین رفیح و عشاء سے زیادہ کوئی نماز گراں نہیں ہے۔“

حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ ”جب ہم (صحابہ) کسی کو عشاء اور صبح کی نمازوں میں غیر حاضر پاتے تھے تو ہم اس سے بدگمان ہو جاتے تھے۔ ﴿ مدینہ آ کر نماز میں قبلہ کی تبدیلی جہاں اور مصلحتوں سے تھی، وہاں ایک مصلحت یہ بھی تھی، کہ اس سے مخلصین اور منافقین کی تیزی ہو سکے، مکہ عظمہ کے لوگ جو کعبہ کی عظمت کے قابل تھے، بیت المقدس کی طرف منہ کرنا جائز نہیں سمجھتے تھے، مدینہ میں یہود آباد تھے، جن میں کچھ مسلمان ہو گئے تھے، وہ بیت المقدس کی طرف رخ کر کے نماز پڑھتے تھے اور کعبہ کی عظمت تسلیم نہیں کرتے تھے، اس لیے عرب منافقین کی پہچان بیت المقدس کے قبلہ بنانے سے اور یہود منافقین کی پہچان کعبہ قبلہ بنانے سے ہو سکتی تھی، چنانچہ قرآن پاک میں ہے:

وَمَا جَعَلْنَا الْقِيلَةَ الَّتِي كُنْتَ عَلَيْهَا إِلَّا يَعْلَمُ مَنْ تَبَعَّدَ الرَّسُولُ مِمَّنْ يَقْرِبُ عَلَى

عَقْبَيْهِ طَوْلٌ وَأَنْ كَانَتْ لَكِيرَةً إِلَّا عَلَى الَّذِينَ هَرَدَى اللَّهُ طَوْلٌ (٢٤٣) الْبَقْرَةُ

”اور جس قبلہ پر تم تھے اس کو ہم نے قبلہ نہیں بنایا، لیکن اس لیے، تاکہ ہم ان کو جو رسول کی پیروی کرتے ہیں، ان سے الگ کر دیں جو ائے پاؤں پھر جائیں گے اور یہ قبلہ گراں ہوا، لیکن ان پر جن کو خدا نے را دکھائی۔“

ذبیح کھانا اور ہمارے قلمب کی طرف منہ کر کے نمازِ رحمی، وہ مسلمان ہے۔“ ③

یا اور ہمارے قبلہ کی طرف منہ کر کے نماز پڑھی، وہ مسلمان ہے۔

9) باطل کی شکست اور حق کی خاطر لڑنا انسان کا فرض ہے، اس فرض کے انجام دینے کے لیے انسان کو ہر وقت تیار رہنا چاہیے، اس تیاری کا نقشہ ہماری روزانہ کی نمازیں ہیں، چنانچہ ابو داؤد میں ہے:

كان النبي صلوات الله عليه وآله وسلامه و جيوشة اذا علوا الثنايا كبروا و اذا هبطوا سبحوا فوضعت

الصلة على ذلك. ٤

”آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کا شکر جب پیاری پر چڑھتا تھا تو نگیر اور جب یچھے اترتا تھا، تو
تبیج کہتا تھا نہ اسی طریقے پر قائم کی گئی۔“

^١ بخاري، كتاب الأذان، باب فضل صلاة العشاء في الجمعة: ٦٥٧.

² مستدرك حاكم (على شرط الشيخين) ج ١، ص: ٢١١.

^٣ بخاري، كتاب الصلاة، باب فضل استقبال القبلة: ٣٩١.

٤ أبو داود، كتاب الجهاد، باب ما يقول الرجل اذا سافر: ٢٥٩٩.

صف بندی، ایک افسر (امام) کی اطاعت، تمام سپاہیوں (نمازوں) کی باہم محبت اور دشمنگیری اور ایک بکیر کی آواز پر پوری صفوں کی حرکت اور نشست و برخاست مسلمانوں کو صفتِ جنگ کے اوصاف سکھاتی ہے اور ان کے قوائے عمل کو بیدار کرتی ہے، جاؤں میں پانچ وقت خصوص کرنا، ظہر کے وقت دھوپ کی شدت میں گھر سے نکل کر مسجد کو جانا، عصر کے وقت اپہ ولعب کی دلچسپیوں سے وقت نکال کر خدا کو یاد کرنا، رات کو سونے سے پہلے دعا و اذاری کر لینا، صبح کو خواب ہر کی لذت کو چھوڑ کر جماد باری میں مصروف ہونا، اس کے بغیر ممکن نہیں کہ ہم فرضی راحت و تکلیف سے بے پرواہ ہو کر، عمل کی طاقت اپنے میں پیدا کریں اور کام کی ضرورت کے وقت احساسِ فرض کے تقاضے کو بجالانا ضروری تجھیں اور اس کے لیے عارضی تکلیفوں کی برداشت کا اپنے کو خوگر بھائیں، ہفتہ میں ایک دن نمازِ جماد کے لیے شہر کے سب مسلمانوں کا ایک جگہ جمع ہونا، دن رات کے پر آرام سے پر آرام وقت میں ممکن تھا، مگر اس کے لیے بھی دوپہر کا وقت مقرر کیا گیا تاکہ اس اجتماع اور مظاہرہ میں بھی مسلمان سپاہیاں خصائص کے خوگر ہیں اور نماز جمعہ کا ہر پابند شہادت دے گا کہ اس کی اتنی سی یہ عادت مشکلات وقت کے اتفاقات میں اس کے لیے کس قدر مردمہ ثابت ہوتی ہے۔

۱۰۰ تمام عبادات، بلکہ تمام مذاہب کا اصل مقصد تحریکِ اخلاق ہے، لیکن اصلاح اخلاق کا سب سے بڑا ذریعہ یہ ہے کہ نفس ہر وقت بیدار اور اثر قبول کرنے کے لیے آمادہ رہے، تمام عبادات میں صرف نماز ہی ایک ایسی چیز ہے جو نفس کو بیدار کہ سکتی ہے، روزہ، حج، زکوٰۃ والا توہن شخص پر فرض نہیں ہیں، اس کے ساتھ روزہ سال میں ایک بار فرض ہوتا ہے، زکوٰۃ کا بھی یہی حال ہے، حج عمر میں ایک بار ادا کرنا پڑتا ہے، اس لیے یہ فرائض نفس کے تدبیہ اور بیداری کا دامنی اور ہر روزہ ذریعہ نہیں ہو سکتے، برخلاف ان کے نمازوں میں پانچ بار ادا کرنی ہوتی ہے، ہر وقت خصوص کرنا پڑتا ہے، سجدہ، رکوع، قیام و قعود، جهر، خفا، تسبیح و تہلیل، تکبیر و تشهد نے اس کے ارکان و اعمال میں تنوع و اتفاقی پیدا کر دیا ہے، جن میں ہر چیز نفس میں تدریجی اثر پذیری کی قابلیت پیدا کرتی ہے اور ہر چوبیں گھنٹے میں چند گھنٹوں کے وقفہ سے نفس انسانی کو ہشیار اور قلب خفتہ کو بیدار کرتی ہے، اس طرح نفس کو رات دن تدبیہ ہوا کرتا ہے۔

۱۰۱ الفت و محبت

نمازوں میں باہمی الفت و محبت پیدا کرنے کا ذریعہ ہے، محلہ کے تمام مسلمان جب کسی ایک جگہ دن میں پانچ دفعہ جمع ہوں اور باہم ایک دوسرے سے ملیں تو ان کی بیگانگی دور ہوگی، ان میں آپس میں محبت اور الفت پیدا ہوگی، اس طرح وہ ایک دوسرے کی امداد کے لیے ہر وقت تیار ہیں گے، قرآن پاک نے نماز کے اس وصف اور اثر کی طرف خود اشارہ کیا ہے:

﴿وَاتَّقُوا الصَّلَاةَ وَلَا تَكُونُوا مِنَ الْمُشْرِكِينَ ۝ مِنَ الَّذِينَ فَرَّقُوا دِيْنَهُمْ وَكَانُوا

شیعات) (۳۰/الروم: ۳۲-۳۱)

”خداء سے ڈرتے رہو اور نماز کھڑی رکھو اور مشرکوں میں سے نہ بنو، ان میں سے جنہوں نے اپنے دین میں پھوٹ ڈالی اور بہت سے جھٹے ہو گئے۔“
اس سے معلوم ہوا کہ نماز کا اجتماع مسلمانوں کو جتنا بندی اور فرقہ آرائی سے بھی روک سکتا ہے، کہ جب ایک دوسرے سے ملاقات ہوتی رہے گی، تو غلط فہمیوں کا موقع کم ملے گا۔

غنوواری

بلکہ اس سے آگے بڑھ کر نماز مسلمانوں میں باہمی ہمدردی اور غنوواری کا ذریعہ بھی بنتی ہے، جب امیر و غریب سب ایک جگہ ہوں گے اور امرا اپنی آنکھ سے غریبوں کو بیکھیں گے تو ان کی فیاضی کو تحریک ہو گی، ایک دوسرے کے دکھ درد کی خبر ہو گی اور اس کی تلاشی کی صورت پیدا ہو گی۔ ابتدائے اسلام میں اصحاب صفا کا ایک گروہ تھا، جو سب سے زیادہ سُجّق اعانت تھا، یہ گروہ مسجد میں رہتا تھا، صحابہ نماز کو جاتے تو ان کو دیکھ کر خود بخود ہمدردی پیدا ہوتی تھی، چنانچہ اکثر صحابہ کھجور کے خوشے لے جا کر مسجد میں لٹکا دیتے تھے، جس پر یہ گروہ گزر اوقات کرتا تھا، اکثر صحابہ اور خود آنحضرت ﷺ نماز سے فارغ ہو کر ان لوگوں کو ساتھ لاتے اور اپنے گھروں میں کھانا کھلاتے تھے، اب بھی مساجد خیرات و صدقات کا ذریعہ ہیں، یہی وجہ ہے کہ قرآن مجید میں نماز اور زکوٰۃ کا ذکر ایک ساتھ کیا گیا ہے:

(وَيُقْيِمُونَ الصَّلَاةَ وَمَنِّا رَزَقْنَاهُمْ يُنْفِقُونَ ﴿٦﴾) (٢/ البقرة: ٣)

”اور نماز قائم کرتے ہیں اور جو کچھ ہم نے دیا ہے اس میں سے صرف کرتے ہیں۔“

اجماعیت

اجماعیت چونکہ ایک فطری چیز ہے، اس لیے تمام قوموں نے اس کے لیے مختلف اوقات اور تہوار مقرر کیے ہیں، جن قوموں کو نہ ہی قیود سے آزاد کہا جاتا ہے، ان میں بھی اس اجماعیت کی نمائش کلبیوں، کافرسوں، آئیورسیلوں اور دوسرے جلوسوں، جلوسوں اور مظاہروں سے کی جاتی ہے، لیکن یہ اجماعیت جہاں فائدے پہنچاتی ہے، وہاں اپنے مضر اڑات بھی ضرور پیش کرتی ہے، اجماعیت کام چاہتی ہے، اگر مفید کام پیش نظر نہ ہو تو وہی رنگ رلیوں، رقص و سرود، شراب خوری، تمار بازی، چوری، بد نظری، بد کاری، رشک و حسد، بلکہ فتنہ، غارت تک پہنچ جاتی ہے، میلے ٹھیلے، عرس، ہولی، تہوار جن کی مثالیں عرب مشرکوں میں بھی ملتی تھیں اور اب بھی ملتی ہیں، قبور پر ناجائز اجتماع، غرض تمام اجتماعی بدعتات بدترین لگنا ہوں اور فسادوں کا مرکز بن جاتے ہیں، اب اگر ان خطہ ناک رسوم کا صرف انساد وہی کیا جاتا اور ان کی جگہ اسلام ان کے سامنے کوئی دوسری چیز پیش نہ کرتا، تو محض یہ سلبی علاج کافی نہ ہوتا، ضرورت تھی کہ وہ اپنے قومی اجتماع کے لیے کوئی مشغلہ مقرر کرے، جس

ست قلب انسانی اپنی فطری پیاس کو بجا سکے اور اجتماعیت پیدا ہو کر بدی کی بجائے نیکی کے رخ کی طرف ہے، چنانچہ اسلام نے اسی لیے روزانہ جماعت کی عام نمازیں، ہفتہ میں جمعہ کی نماز اور سال میں دو دفعہ عیدین کی نمازیں مقرر کیں، کہ اجتماعیت کا فطری تقاضا بھی پورا ہو اور مشرکانہ بدیوں اور اخلاقی برائیوں سے بھی احتراز ہو کہ اس اجتماع کی بنیادی دعوت خیر پر رکھی گئی ہے، حج کے عالمگیر نہیں بھی اجتماع میں دوسرا اجتماعی اور اقتصادی مقاصد کے برقرار رکھنے کے ساتھ اس کے مشاغل بھی خدا کے ذکر اور اس کی بارگاہ میں توبہ و اتابت کو فرازدیا، اس طرح اسلام کا ہر اجتماع پاکیزگی خیال اور اخلاص عمل کی بنیاد پر قائم ہے۔

۱۰۷ کاموں کا تنوع

انسان کی فطرت کچھ ایسی ہی ہے کہ وہ ہرگی کے باوجود تفہیں اور تجدید کا طالب ہے، لیکن اگر انسان کے دل و دماغ، اعضاء و جوارج ہر وقت اسی ایک کام میں مصروف رہیں، تو سکون و اطمینان، عیش و راحت اور چیز کی لذت، جو ہر عمل کا آخری نتیجہ ہے، مفہود ہو جائے، مفید کام سے بھی دنیا چیخ اٹھے، اسی لیے قدرت نے اوقات کی تقسیم ایسے مناسب طریقے پر کی ہے، جس میں انسان کو حرکت و سکون دونوں کا یکساں موقع ملتا رہتا ہے، رات اور دن کا اختلاف اسی پناپ آیاتِ الہی میں شمار کیا گیا ہے، کہ اس تغیر و تبدل سے نظام عالم میں نیرنگی پیدا ہوتی ہے اور اس تقسیم سے انسانوں میں اپنے ہر کام کی لذت قائم رہتی ہے، نماز ایک ایسا فریضہ ہے جو نہ تو ہر لمحہ اور لحظہ انسان پر فرض ہے اور نہ سال میں ایک دفعہ یا عمر بھر میں صرف ایک دفعہ فرض ہے، بلکہ ہر روز پانچ دفعہ اس کو ادا کرنا پڑتا ہے، صبح سے کام شروع کیا تو ظہر پر آ کر توڑ دیا، پھر مشغولیت ہوئی اور عصر پر پہنچ کر ختم ہوئی، پھر جو سلسہ چھڑا اس کا مغرب پر خاتمه ہوا، بعد ازاں خانگی مصروفیت شروع ہوئی اور عشا پر جا کر شستی ہوئی، اب نیند آگئی اور صبح تک بے خبری رہی، اٹھے تو دعاوں کے افتتاح سے پھر اپنا کاروبار شروع کیا، وہ دولت مند جو جسمانی یاد مانگی محنت و مشقت اور مزدوری سے اپنی روزی نہیں حاصل کرتے، وہ اس رو حانی "انڑوں" (وقفہ) کے لطف سے آگاہ نہیں، یہ معلوم ہوتا ہے کہ انسان چند گھنٹوں تک ایک ہی قسم کی محنت کے لوح جسے جو دیا جاتا تھا، وہ چند منٹ میں با تھہمنہ دھوکر عاد شیعج اور نشست و برخاست کے ذریعہ اس سے بلا کا ہوئی اور پھر سے اس نے اپنے کام کے لیے خلی قوت پیدا کر لی۔

۱۰۸ تربیت

انسان کی عملی کامیابی، استقلال اور موافقت پر موقوف ہے، کہ جس کام کو اس نے شروع کیا، پھر اس پر عمر بھر قائم رہے، اسی کا نام عادات و اخلاق کی استواری اور کیر کتر کی مضبوطی ہے، جس کام میں اس خلق کی استواری اور کیر کتر کی مضبوطی کی تربیت ہو وہ ضروری ہے کہ روزانہ ہو، بلکہ دن میں کئی دفعہ ہو نماز ایک ایسا فریضہ ہے، جس کے بارے عہدہ برآ ہونے کے لیے انسان میں، استقلال، موافقت اور مداومت شرط ہے،

اس لیے انسان میں اس اخلاقی خوبی کے پیدا کرنے کا ذریعہ نماز سے بڑھ کر کوئی اور چیز نہیں ہو سکتی، اس لیے قرآن پاک نے صاحبِ کی مدح میں فرمایا:

﴿الَّذِينَ هُمْ عَلَىٰ صَلَاتِهِمْ دَائِمُونَ﴾ (المعارج: ۷۰)

”وہ جو اپنی نماز مداومت کے ساتھ ادا کرتے ہیں۔“

آنحضرت ﷺ نے فرمایا:

(احب العمل الى الله ادومه وان قل) ﴿

”محبوب ترین عمل خدا کے نزدیک وہ ہے جو ہمیشہ کیا جائے گوہ کم ہو۔“

۱۶ نظم جماعت

کسی قوم کی زندگی، اس کی نظم جماعت کے بغیر قائم نہیں رہ سکتی، یہی گرہ جب کھل جاتی ہے تو قوم کا شیرازہ منتشر و پرا گنڈہ ہو جاتا ہے، اسلام میں نماز با جماعت مسلمانوں کی زندگی کی عملی مثال ہے، محمد رسول اللہ ﷺ نے اسی عملی مثال کو عربوں کے سامنے پیش کر کے ان کی زندگی کا خاکہ کھینچا اور بتایا کہ مسلمانوں کا یہ صفت بے صفت کھڑا ہونا، ایک دوسرے سے شانہ سے شانہ ملانا اور یکساں حرکت و جنبش کرنا، ان کی قوی زندگی کی مستحکم و مضبوط دیوار کا مسئلہ ہے، جس طرح نماز کی درستی اس صفت اور نظام جماعت کی درستی پر مسروق ہے، اسی طرح پوری قوم کی زندگی اسی باہمی تعاون، تھامن، مشارکت، میل جوں اور باہمی ہمدردی پر مسروق ہے، اسی لیے آنحضرت ﷺ صفوں کی درستی پر بہت زور دیتے تھے اور فرماتے تھے، کہ ”جب تک تم خوب مل کر کھڑے رہو گے تمہارے دل بھی آپس میں نہ ملیں گے۔“

۱۷ مساوات

یہی جماعت کی نماز مسلمانوں میں برادرانہ مساوات اور انسانی برابری کی درس گاہ ہے، یہاں امیر و غریب، کالے گورے، رومی، جبشی، عرب و عجم کی کوئی تغیر نہیں ہے، سب ایک ساتھ ایک درجہ اور ایک صفت میں کھڑے ہو کر خدا کے آگے سر گلوں ہوتے ہیں، جماعت کی امامت کے لیے حسب و نسب، نسل و خاندان، رنگ و روپ، قومیت اور جنیت، عہدہ اور منصب کی ضرورت نہیں ہوتی، بلکہ علم و دانش، فضل و کمال، تقویٰ و طہارت کی ضرورت ہوتی ہے، یہاں شاہ و گدا اور شریف و رذیل کی تفریق نہیں، سب ہی ایک زمین پر، ایک امام کے پیچے، ایک صفت میں دوش بدش کھڑے ہوتے ہیں اور کوئی کسی کو اپنی جگہ سے نہیں ہٹا سکتا اور اس برادرانہ مساوات اور انسانی برادری کی مشق دن میں پانچ دفعہ ہوتی ہے، کیا مسلمانوں کی معاشرتی جمیعت کی یہ درس گاہ کہیں اور بھی قائم ہے؟

ابوداؤد، کتاب التضوع، باب ما یؤمر به من القصد في الصلوة: ۱۳۶۸۔ صحیح بخاری، کتاب الاذان، باب تسویة الصفوں عند الاقامة وبعد: ۲۱۷؛ ابوداؤد، کتاب الصلوة، باب تسویة الصفوں: ۶۶۳۔

۱۸ اطاعت

جماعت کی سلامتی بغیر ایک مفترض الاطاعت امام کے نامکن ہے، جس کے اشارہ پر تمام قوم حرکت کرے، نماز باجماعت مسلمانوں کی اس زندگی کا رمز ہے، کہ جس طرح ان کی اس عبادت کا ایک امام ہے، جس کے اشارہ پر وہ حرکت کرتے ہیں، اسی طرح قوم کی پوری زندگی کا بھی ایک امام ہونا چاہیے، جس کے اللہ اکبر کی آواز قوم کے کارروائی کے لیے بانگ درا اور صدائے جرس ثابت ہو۔

اطاعت امام کے لیے ایک طرف قوم میں فرمانبرداری کی قابلیت موجود ہوئی چاہیے، جس کی تعلیم مقتدیوں کو نماز میں ہوتی ہے، دوسری طرف امام کو اخلاق صالح کی ایک ایسی مثال پیش کرنی چاہیے جو ہمیشہ لوگوں کے پیش نظر رہے، نماز ان دونوں چیزوں کا مجموعہ ہے، وہ ایک دائمی حرکت ہے، جو قوم کے اعضاء و جوارح کو ہر وقت اطاعت گزاری کے لیے تیار رکھتی ہے، اس کے ساتھ نماز مذکونہ اور جمود عیدین کی امامت خاص امام کا حق ہے، اس لیے ہر وقت قوم کو اس کے اعمال کے احتساب، اس پر نکتہ چینی، اس سے اثر پذیری کا موقع ملتا ہے، نماز کے اوقات خاص طور پر ایسے موزوں ہیں جو ایک عیاش اور راحت طلب شخص کا پر وہ فاٹ کر دیتے ہیں، ایک ایسا شخص جو شب بھر، عیش و عشرت میں مصروف ہو، نماز صبح میں شریک نہیں ہو سکتا، ایک راحت طلب آدمی ظہر کے وقت دھوپ کی شدت برداشت کر کے شریک جماعت ہونا پسند نہیں کر سکتا، چنانچہ خلافت راشدہ کے بعد جب بنو امیہ کا زمان آیا تو صحابہ کو خاص طور پر اس کا احساس ہوا اور بے خوف نگاہوں نے ان پر نکتہ چینیاں کیں، احادیث میں بھی خاص طور پر اس زمانہ کی طرف اشارہ کیا گیا ہے، جس میں ائمہ وقت پر نماز ادا کرنے میں غفلت کریں گے۔

۱۹ معیارِ فضیلت

نماز کی امامت کے لیے چونکہ سوائے علم و فضل اور تقویٰ کے کوئی اور قید نہیں ہے، اس لیے امامت کے رتبہ اور درجہ کو حاصل کرنا ہر مسلمان کے لیے ہر وقت ممکن ہے، آنحضرت ﷺ نے فرمایا: "جماعت میں جو سب سے زیادہ صاحب علم (اقرآن) ہے وہ امام بننے کا سب سے زیادہ مستحق ہے، ایک دفعہ ایک مقام سے کچھ لوگ مسلمان ہونے کے لیے آئے، دریافت کرنے سے معلوم ہوا کہ ان میں سے جو صاحب سب سے زیادہ کم سن ہیں، انہیں قرآن زیادہ یاد ہے، چنانچہ آپ نے انہیں کم من صحابی کو ان کا امام مقرر فرمایا۔ اس سے مقصود یہ ہے کہ لوگوں میں اس کے ذریعہ سے علمی و عملی فضائل کے حاصل کرنے کی تشویل و تغییر بھی پیدا ہوتی ہے۔

۲۰ روزانہ کی مجلس عمومی

آنحضرت ﷺ اور خلفاء راشدین کے زمانہ میں یہ قاعدة تھا کہ جب کوئی اہم واقعہ پیش آتا، یا کوئی

ابوداؤد، کتاب الصلوٰۃ، باب من احق بالاماۃ: ۵۸۵، ۵۸۷۔

سیاسی و قومی مشکل پیدا ہوتی، یا کوئی نہیں بات سنانی ہوتی، تو مسلمانوں میں منادی کرائی جاتی تھی کہ الصلوٰۃ جامعۃ ”نماز جمع کرنے والی ہے“ سب لوگ وقت پر جمع ہو جاتے اور اس امر اہم سے اطلاع پاتے، یا اس کے متعلق اپنے مشورے عرض کرتے، یہ گویا مسلمانوں کے نہیں، اجتماعی، سیاسی مسائل کے مخلصانہ حل کا بھی ذریعہ تھا، جس کے لیے نماز کے تعلق سے ہر مسلمان کا کسل و سستی کے بہانے بغیر جمع ہونا ضروری تھا۔

ان تمام امور کو سامنے رکھنے سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ نماز اسلام کا اولین شعار اور اس کے نہیں اور اجتماعی و تمدنی و سیاسی و اخلاقی مقاصد کی آئینہ دار ہے، اسی کی شیرازہ بندھا تھا اور اسی کی گرہ کھل جانے سے اس کی نظم و جماعت کی ہر گرہ کھل گئی ہے، مسجد مسلمانوں کے ہر قوی اجتماع کا مرکز اور نماز اس مرکزی اجتماع کی ضروری رسم تھی، جس طرح آج ہر جلسہ کا افتتاح اس کے نصب اعین کے اظہار و تعین کے لیے صدارتی خطبات سے ہوتا ہے، اسی طرح مسلمان جب زندہ تھے، ان کے ہر اجتماع کا افتتاح نماز سے ہوتا تھا، ان کی ہر چیز اس کے تابع اور اسی کے زیر نظر ہوتی تھی، ان کی نماز کا گھر ہی ان کا دارالامارة تھا، وہی دارالشوری تھا، وہی بیت المال تھا، وہی صیغہ جنگ کا دفتر تھا، وہی درس گاہ اور وہی معبد تھا۔

جماعت کی ہر ترقی کی بنیاد، افراد کے باہمی نظم و ارتباط پر ہے اور جماعت کے فائدہ کے لیے افراد کا اپنے ہر آرام و عیش اور فائدہ کو قربان کر دینا اور اختلاف باہمی کو تبدیل کر کے صرف ایک مرکز پر جمع ہو کر جماعتی ہستی کی وحدت میں فنا ہو جانا، اس کے حصول کی لازمی شرط ہے، اسی کی خاطر کسی ایک کو امام و قائد و سر شکر مان کر اس کی اطاعت و فرمانبرداری کا عہد کر لینا ضروری ہے، اسلام کی نماز انہی رموز و اسرار کا گنجینہ ہے، یہ مسلمانوں کا نظم و جماعت، اطاعت پذیری و فرمانبردار اور وحدت قوت کا سبق دن میں پانچ بار سکھائی ہے، اسی لیے اس کے بغیر مسلمان، مسلمان نہیں اور نہ اس کی کوئی اجتماعی وحدت ہے، نہ انقیاد امامت ہے، نہ زندگی ہے اور نہ زندگی کا نصب اعین ہے، اسی بنا پر دائی اسلام غیر ممکن ہے یہ فرمادیا:

((الْعَهْدُ الَّذِي بَيْنَا وَبَيْنَهُمُ الْصَّلَاةُ فَمَنْ تَرَكَهَا فَقَدْ كَفَرَ)) ﴿١﴾

”ہمارے اور ان کے درمیان جو معاہدہ ہے، وہ نماز ہے تو جس نے اس کو چھوڑا، اس نے کفر کا کام کیا۔“

کہ نماز کو چھوڑ کر مسلمان صرف قلب بے جان، شراب بے نشہ اور گل بے رنگ و بوہو کرہ جاتا ہے اور رفتہ رفتہ اسلامی جماعت کا ایک ایک شعار اور ایک ایک امتیازی خصوصیت اس سے رخصت ہو جاتی ہے اسی لیے نماز اسلام کا اولین شعار ہے اور اس کی زندگی سے اسلام کی زندگی ہے۔

* ترمذی، ابواب الایمان، باب ما جاء فی ترك الصلوٰۃ، نسانی، کتاب الصلوٰۃ، باب الحكم فی تاریخ الصلوٰۃ: ۲۶۲۱؛ ابن ماجہ، ابواب اقامۃ الصلوٰۃ، باب ما جاء فی من ترك الصلوٰۃ: ۱۰۷۹؛ مسند احمد،

عرب کی روحانی کایاپٹ

وہ عرب جو خدا کی عبادت سے بیگانہ تھا، وہ جس کی پیشانی خدا کے سامنے کبھی بھی نہ تھی، وہ جس کا دل خدا کی پرستش سے لذت آشنا تھا، وہ جس کی زبان خدا کی تسبیح و تمجید کے ذائقہ سے واقف نہ تھی، وہ جس کی آنکھوں نے شب بیداری کا اضطراب انگیز مظہرنیں دیکھا تھا، وہ جس کی روح ربیٰ تکسین و تسلی کے احساس سے خالی تھی۔ محمد رسول اللہ ﷺ کی تعلیم سے دفعتاً کیا ہو گیا؟ اب عبادت الہی اسکے ہر کام کا مقصد بن گئی۔ اب اس کو اپنے ہر کام میں اخلاص کے سوا اور کوئی چیز مطلوب نہ تھی۔ اس کی پیشانی خدا کے سامنے جھک کر پھر انھنیں چاہتی تھی، اس کے دل کو اس لذت کے سواد نیا کی کوئی لذت پسند نہیں آتی تھی، اس کی زبان کو اس مزہ کے سوا اور کوئی مزہ اچھائے معلوم ہوتا تھا۔ اس کی آنکھیں اس منظر کے سوا اور کسی منظر کی طالب نہ تھیں اس کی روح یادِ الہی کی تزیب اور ذکرِ الہی کی بے قراری کے سوا کسی اور چیز سے تسلی نہ پاتی تھی۔

وہ عرب جن کی حالت یہ تھی کہ

﴿وَلَا يَدْكُرُونَ اللّٰهَ إِلَّا قَلِيلًا﴾ (۱۴۲: النساء)

”اور جو خدا کو بہت کم یاد کرتے ہیں۔“

دعوت حق اور فیض نبوت کے اثر و برکت نے انکی یہ شان نمایاں کی کہ دنیا کی کاروباری مشغولیتیں بھی ان کو ذکرِ الہی سے غافل نہ کر سکیں:

﴿رَجَالٌ لَا تُنْهِيهُمْ تَجَارُكُمْ وَلَا يَنْهَى عَنْ ذِكْرِ اللّٰهِ﴾ (۳۷: التور)

”ایسے لوگ جن کو کاروبار اور خرید و فروخت کا شغل خدا کی یاد سے غافل نہیں کرتا۔“

انھتے بیٹھتے، چلتے پھرتے، غرضِ حر حال میں ان کے اندر خدا کی یاد کے لیے بے قراری تھی:

﴿الَّذِينَ يَذْكُرُونَ اللّٰهَ قِيَاماً وَعَوْدًا وَعَلَى جُنُوبِهِمْ﴾ (۳: آل عمران)

”جو خدا کو انھتے بیٹھتے اور لیتھتے یاد کرتے ہیں۔“

راتوں کو جب غافل دنیا نیند کے خمار میں ہوتی، وہ بستر وال سے انھ کر خدا کے سامنے سر بخود اور راز و نیاز میں مصروف ہوتے تھے:

﴿تَتَجَافِ جُنُوبِهِمْ عَنِ الْمَضَاجِعِ يَذْعُونَ رَبَّهُمْ حَوْفًا وَطَعْمًا﴾ (۱۶: السجدہ)

”جن کے پہلو (رات کو) خواب گاہوں سے عیحدہ رہتے ہیں، وہ خوف اور امید کے ساتھ

اپنے پروردگار کو پکارتے ہیں۔“

وہ جن کا یہ حال تھا کہ

﴿وَإِذَا قِيلَ لَهُمْ أَرْجُواهُمْ كَيْفَ كَوْنَ﴾ (۴۸: المرسلات)

”اور جب ان سے کہا جاتا ہے کہ خدا کے آگے جھکو تو نہیں جھکتے۔“

اب ان کی یہ صورت ہو گئی کہ

﴿لَرَبِّهِمْ رَكِعًا سَجَدًا إِيَّنَّعُونَ فَضْلًا قِنَ اللَّهِ وَرِضَاً﴾ (٤٨ / الفتح: ٢٩)

”تم ان کو دیکھو گے کہ رکوع میں جھکے ہوئے اور سجدہ میں پڑے ہوئے خدا کے فضل اور خوشنودی کو تلاش کرتے ہیں۔“

وہ جن کے دلوں کی یہ کیفیت تھی کہ

﴿وَإِذَا ذُكِرَ اللَّهُ وَحْدَةً أَشْمَأَرْتُ قُلُوبَ الظَّبَابَ لَا يُؤْمِنُونَ بِالْآخِرَةِ﴾ (٤٥ / الزمر: ٣٩)

”اور جب تہا خدا کا نام لیا جاتا ہے تو ان کے دل جو آخرت پر ایمان نہیں رکھتے، لکھر ہو جاتے ہیں۔“

آن قریب بوت کے پرتو نے ان مکدر آئیں میں خشیت الہی کا جو ہر پیدا کر دیا:

﴿الَّذِينَ إِذَا ذُكِرَ اللَّهُ وَجَلَّتْ قُلُوبُهُمْ﴾ (٨ / الانفال: ٢ و ٢٢ / الحج: ٣٥)

”وہ لوگ کہ جب خدا کا نام لیا جائے تو ان کے دل دل جاتے ہیں۔“

یہ خود قرآن پاک کی شہادتیں ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ محدث رسول اللہ ﷺ کے عمل اور تعلیم نے عرب کی رو حانی کا نبات میں کتنا عظیم الشان انقلاب پیدا کر دیا تھا۔ وہ تمام لوگ جو حلقہ گوش اسلام ہو چکے تھے خواہ وہ بھیتی کرتے ہوں یا تجارت یا محنت مزدوری، مگر ان میں سے کوئی چیز ان کو خدا کی یاد سے غافل نہیں کرتی تھی، فتاویٰ ہنیش کہتے ہیں کہ یہ لوگ (صحابہ) خرید و فروخت اور تجارت کرتے تھے۔ لیکن جب خدا کو کوئی معاملہ پیش آتا تھا تو یہ شغل و عمل ان کو یادِ الہی سے غافل نہیں کرتا تھا، بلکہ وہ اس کو پوری طرح ادا کرتے تھے۔ **❶**
حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ ایک دفعہ وہ بازار میں تھے، نماز کی تعبیر ہوئی دیکھا کہ صحابہ رضی اللہ عنہم نے فوراً دکانیں بند کر دیں اور مسجد میں واصل ہو گئے۔ **❷** صحابہ رضی اللہ عنہم تمام تر راتیں خدا کی یاد میں جاگ جاگ کر بسر کرتے تھے تھیں تک کہ مکہ معظمہ کی غیر مطمئن راتوں میں بھی وہ عبادتِ الہی میں مصروف رہتے تھے۔ خدا نے گواہی دی:

﴿إِنَّ رَبَّكَ يَعْلَمُ أَنَّكَ تَعْوُمُ أَدُولٌ مِنْ ثُلُقَ الْيَنِيِّ وَنِصْفَةَ وَلُكْتَهَ وَطَلِيفَةَ قِنَ الَّذِينَ

مَعَكَ ۝﴾ (٢٠ / المزمول: ٢٠)

”بے شک تیرارب جاتا ہے کہ تو وہ تھائی رات کے قریب اور آدمی رات اور تھائی رات کے بعد اٹھتا ہے اور تیرے ساتھ ایک جماعت بھی اٹھ کر نماز پڑھتی ہے۔“

❶ صحیح بخاری، کتاب البيوع، باب التجارة فی البر وغيره، رقم الباب: ٨ مرسلان۔

❷ فتح الباری، ج ٤، ص: ٢٥٣ بحوالہ عبدالرزاق۔

اس زمانہ میں صحابہ کو راتوں کے سوا خدا کے یاد کرنے کا موقع کہاں ملتا تھا، جلوہ دیدار کے مشتاق دن بھر کے انتظار کے بعد رات کو کہیں کسی مخفی گوشے میں جمع ہوتے تھے۔ ذوق و شوق سے اپنی پیشانی خدا کے سامنے زمین پر رکھ دیتے تھے۔ دیر تک سجدہ میں پڑے رہتے تھے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ان کے اس والہانہ انداز عبادت کو دیکھتے پھرتے تھے۔ قرآن پاک نے اس نظراء کی کیفیت اپنے الفاظ میں اس طرح ادا کی ہے:

﴿وَتَوَكَّلُ عَلَى الْعَزِيزِ الرَّحِيمِ الَّذِي يَرِيكَ حِينَ تَقُومُ وَتَقْلِبُكَ فِي الشَّجَدَيْنِ﴾ (۱۷-۲۱۹)

”اور اس غالب رحم والے پر بھروسہ کر جورات کو جب تو نماز کے لیے المحتا ہے اور سجدہ میں پڑے رہنے والوں کے درمیان آنا جانا تمیز دیکھتا ہے۔“

مدینہ منورہ میں آ کر سب سے پہلا فقرہ جو آپ کی زبان مبارک سے نکلا وہ یہ تھا:

(يَا أَيُّهَا النَّاسُ أَطْعِمُوكُمُ الْطَّعَامَ وَأَفْشُوْا السَّلَامَ وَصَلُّوْا بِاللَّيْلِ وَالنَّاسُ نَيَّامٌ) ﴿۱﴾

”اے لوگو! غریبوں کو کھانا کھلاؤ اور سلام کو پھیلاؤ اور نماز پڑھو جب لوگ سوتے ہوں۔“

بعض صحابہ نے اس حکم پر اس شدت سے عمل کیا کہ انہوں نے راتوں کا سونا چھوڑ دیا۔ آخر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو ان لوگوں کو اعتدال اور میانہ روی کا حکم دینا پڑا۔ چنانچہ حضرت عثمان بن مظعون رضی اللہ عنہ رات بھر نماز میں مصروف رہتے تھے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان سے فرمایا کہ ”عثمان تمہارے جسم کا بھی تم پر حق ہے نماز بھی پڑھو اور سو بھی۔“ ﴿۲﴾ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ صحابہ راتوں کو اٹھاٹھ کر نماز پڑھتے تھے اور بہت کم سوتے تھے۔ ﴿۳﴾ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ نے رات کے تین حصے کر دیئے تھے ایک میں خود نماز پڑھتے تھے دوسرے میں ان کی بیوی اور تیسرے میں ان کا غلام اور باری باری سے ایک دوسرے کو جھگاتا تھا۔ ﴿۴﴾ حضرت عبد اللہ بن عمرو رضی اللہ عنہ ساری رات نماز پڑھا کرتے تھے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو معلوم ہوا تو ان کو جا کر صحیح فرمائی۔ ﴿۵﴾ حضرت ابو دوراد رضی اللہ عنہ صحابی کا بھی یہی حال تھا کہ وہ رات رات بھر نماز میں گزار دیتے تھے۔ حضرت سلمان فارسی رضی اللہ عنہ ان کے اسلامی بھائی تھے، ایک شب وہ ان کے ہاں جا کر مہمان ہوئے جب رات کو حضرت ابو دوراد رضی اللہ عنہ عبادت کے لیے اٹھنے لگے تو حضرت سلمان رضی اللہ عنہ نے منع کیا۔ پچھلے پھر جب سانا چھایا ہوا تھا حضرت سلمان رضی اللہ عنہ نے ان کو جگایا کہ اب نماز کا وقت ہے۔ ﴿۶﴾ کوئی صحابی ایسا نہ تھا جس نے اسلام لانے کے بعد پھر ایک وقت کی بھی نماز عدم اقضائی کی ہو یہاں تک کہ لڑائی اور خطہ کی حالت میں بھی وہ اس فرض سے

﴿۱﴾ ترمذی، ابواب صفة القيامة: ۲۴۸۵۔ الفاظ قدرے مختلف ہیں۔ ﴿۲﴾ ابو داود، كتاب التطوع، باب ما يؤمر به من القصد في الصلوة: ۱۲۶۹۔ ﴿۳﴾ ابو داود، كتاب التطوع، باب نسخ قيام الليل والتسير فيه: ۱۳۰۵۔

﴿۴﴾ صحيح بخاری، كتاب الاعمعة، باب: ۵۴۴۱۔ ﴿۵﴾ صحيح بخاری، كتاب الصوم، باب حق الجسم في الصوم: ۱۹۷۵۔ ﴿۶﴾ صحيح بخاری، كتاب الصوم، باب من اقسم على أخيه ليفطر في التطوع: ۱۹۶۸۔

غافل نہیں رہتے تھے۔ ایک صحابی کو آنحضرت ﷺ نے ایک پر خطر کام کے لیے کہیں بھیجا تھا۔ جب وہ منزل مقصود کے قریب پہنچے تو عصر کا وقت ہو چکا تھا۔ ان کو خوف تھا کہ اگر کہیں ٹھہر کر عصر پڑھنے کا اہتمام کیا جائے گا تو وقت نکل جائے گا اور اگر عصر میں تاخیر کی جائے تو حکم الٰہی کی تعمیل میں دری ہو جائے گی اس مشکل کا حل انہوں نے اس طرح کیا کہ وہ اشاروں میں نماز پڑھتے جاتے اور چلتے جاتے تھے۔ ۲۱۶ سخت سے سخت مجبوری کی حالت میں بھی نمازان سے ترک نہیں ہوتی تھی۔ چنانچہ بیماری کی حالت میں وہ دوسروں کا سہارا لے کر مسجد میں حاضر ہوتے تھے۔ ۲۱۷ پھر وہ جس خضوع و خشوع، جویت اور استغراق کے ساتھ نماز ادا کرتے تھے اس کا ناظرہ بڑا پڑا شرعاً ہوتا تھا۔ چنانچہ حضرت ابو بکر رض جب نماز پڑھنے کھڑے ہوتے تو ان پر اس شدت سے رفت طاری ہوتی کہ کافر عورتوں اور بچوں تک پہنچی اس کا شرعاً ہوتا تھا۔ ۲۱۸ حضرت عمر رض نماز میں اس زور سے روتے تھے کہ ان کے رونے کی آواز کچھلی صفتک جاتی تھی۔ ۲۱۹ حضرت تمیم داری رض ایک رات تجد کے لیے کھڑے ہوئے تو صرف ایک آیت کی تلاوت میں صحیح کردی بار بار اس کو ہراتے تھے اور مزے لیتے تھے۔ ۲۲۰

شب شود صبح وہ مان محو تماشا باشم

حضرت انس رض قیام اور بجہہ میں اتنی دیر گاتے تھے کہ لوگ سمجھتے کہ کچھ بھول گئے ہیں۔ ۲۲۱ حضرت عبد اللہ بن زیبر رض جب نماز میں کھڑے ہوتے تھے تو کئی کئی سورتیں پڑھ دالتے تھے اور اس طرح کھڑے ہوتے تھے کہ معلوم ہوتا تھا کہ کوئی ستوں کھڑا ہے اور جب بجہہ میں جاتے تو اتنی دیر یہ کہ جنم محرم کے کبوتر ایک سطح جامد سمجھ کر ان کی پیٹی پر آ کر بیٹھ جاتے تھے۔ ۲۲۲ ایک رات میدان جگ میں ایک پہاڑی پر دو صحابی پہراہ دینے کے لیے متعین ہوتے ہیں۔ ایک صاحب سوجاتے ہیں اور دوسرا نماز کے لیے کھڑے ہو جاتے ہیں۔ دشمن ان کو تاک کر تیر مارتا ہے جو بدن میں ترازو ہو جاتا ہے کپڑے خون سے تر تر ہو جاتے ہیں مگر نماز کا استغراق اسی طرح تمام رہتا ہے۔ نماز تمام کر کے اپنے رفیق کو بیدار کرتے اور واقع نہیں ہیں۔ ساتھی کہتے ہیں کہ تم نے اس وقت مجھے کیوں نہ جگایا جواب ملتا ہے میں نے ایک پیاری سورہ شروع کی تھی پسند نہ آیا کہ اس کو ختم کیے بغیر نماز توڑ دوں۔ ۲۲۳ اس سے بھی زیادہ پڑا منظر یہ ہے کہ دشمنوں کی فوجیں مقابل کھڑی ہیں تیروں کا بینہ بر سر رہا ہے نیزوں اور تلواروں کی بجلیاں ہر طرف کو ندرہ ہیں سرو گرد، دست و بازو کٹ کر گر رہے ہیں کہ رفتہ نماز کا وقت آ جاتا ہے فوراً جگ کی صفائی بن جاتی ہیں

۱۱۱ ابو داود، کتاب صلاة السفر، باب صلاة الطالب: ۱۲۴۹۔ ۱۱۲ نسائی، کتاب الامامة، باب المحافظة

علی الصلوات حديث ينادي بهن: ۸۵۰۔ ۱۱۳ صحيح بخاری، کتاب الصلوة، باب المسجد يكون في الطريق من غير ضرر الناس: ۴۷۶، باب هجرة النبي ﷺ: ۳۹۰۵۔ ۱۱۴ صحيح بخاری، کتاب الاذان،

باب اذابک الامام في الصلوة، رقم الباب: ۷۰۔ ۱۱۵ اسد الغابة تذكرة تمیم داری، ج ۱، ص: ۲۱۵۔

۱۱۶ صحيح بخاری، کتاب الاذان، باب المكث بين السجدين: ۸۲۱۔ ۱۱۷ حالات عبد اللہ بن زیبر اصابة،

ج ۴، ص: ۷۰ و اسد الغابة، ج ۳، ص: ۱۶۲ وغیرہ۔ ۱۱۸ ابو داود، کتاب الطهارة، باب الوضوء من الدم: ۱۹۸۔

اور ایک اللہ اکبر کی آواز کے ساتھ موت و حیات سے بے پرواہ کر گرد نیں جھکنے اور اٹھنے لگتی ہیں۔ نور کا رہا ہے اسلام کے دائرہ کام کر زفار و عظم ہی نماز ہے۔ پیچھے صاحب کی صفائی قائم ہیں۔ دفعنا ایک شفی خبر بکف آگے بڑھتا ہے اور خلیفہ پر حملہ آز، ہو کر شکم مبارک کو چاک چاک کر دیتا ہے۔ آپ غش کھا کر گر پڑتے ہیں خون کافوراہ جاری ہو جاتا ہے یہ سب کچھ ہرباہے گر نماز کی صفائی اپنی جگہ پر قائم ہیں۔ حضرت عبد الرحمن بن عوف ہی نماز پڑھانے کا آگے بڑھتے ہیں پہلے صحیح کا دو گانہ دادا ہو لیتا ہے تب خلیفہ، وقت کو اٹھایا جاتا ہے۔ ۶

حضرت عمر ہاشمؓ کو حس صحیح کی نماز میں زخم کا اس کے بعد کی صحیح کو لوگوں نے ان کو نماز کے لیے جگایا تو بولے، ہاں جو شخص نماز چھوڑ دے اسلام میں اس کا کوئی حصہ نہیں۔ چنانچہ اسی حالت میں کہ زخم سے خون جاری تھا، آپ نے نماز پڑھی۔ ۷

حضرت علی مرتضیؑ کی نماز کے لیے مسجد میں داخل ہوتے ہیں یا صحیح کی نماز میں ہوتے ہیں ۸ کابین بجم کی تواریخ کو گھاٹل کر دیتی ہے اور کچھ دری کے بعد وہ داعی اجل کو لبیک کہتے ہیں۔ امام مظلوم حسین بن علی ہاشمؓ کر بلا کے میدان میں رونق افروز ہوتے ہیں۔ عزیزوں اور دوستوں کی لاشیں میدان جنگ میں نظر کے سامنے پڑی ہوتی ہیں، ہزاروں اشقياء آپ کو زخمیں لیے ہوتے ہیں، اتنے میں ظہر کا وقت آ جاتا ہے، آپ دشمنوں سے اجازت چاہتے ہیں کہ وہ اتنا موقع دیں کہ آپ ظہر کی نماز ادا کر سکیں۔ ۹ نماز میں جس خضوع اور خشوع کا حکم ہے، صاحبہ کرام ہی اس کے یہ نمونے پیش کیے کہ عزیز سے عزیز چیز یعنی اگر ان کے اس روحانی ذوق و شوق میں خلل اندراز ہوئی تو انہوں نے اس کو اس ذوق پر شمار کر دیا۔ حضرت ابو طلحہ الفصاری ہاشمؓ اپنے باغ میں نماز پڑھ رہے تھے، ایک خوشنما چڑیا نے سامنے آ کر چھپھانا شروع کیا۔ حضرت ابو طلحہ الفصاری ہاشمؓ دیر تک اوہ را ہدھد کیتھے رہے، پھر جب نماز کا خیال آیا تو رکعت یاد نہ رہی دل میں کہاں باغ نے یہ فتنہ برپا کیا یہ کہ رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں آئے اور واقعہ بیان کیا اور کہا کہ یا رسول اللہ ﷺ ایہ باغ را خدا میں نذر ہے۔ ۱۰ اسی طرح ایک اور صاحبی اپنے باغ میں نماز میں مشغول تھے۔ باغ اس وقت نہایت سرسری و شاداب اور پھلوں سے لداہوا تھا پھلوں کی طرف نظر انہی تو نماز یاد نہ رہی، جب اس کا خیال آیا تو دل میں نادم ہوئے کہ دنیا کے مال و دولت نے اپنی طرف متوجہ کر لیا، یہ حضرت عثمان ہاشمؓ کی خلافت کا دور تھا، ان کی خدمت میں حاضر ہوئے اور عرض کی کہ یہ باغ جس نے مجھے فتنہ میں ہٹلا کر دیا را خدا میں دیتا ہوں، چنانچہ حضرت عثمان ہاشمؓ نے اس کو بیت المال کی طرف سے بیچا تو ۵۰ ہزار میں فروخت ہوا۔ ۱۱

۱۰ صحیح بخاری، کتاب فضائل اصحاب النبی ﷺ، باب قصہ اہل الیعہ والاتفاق علی عثمان بن عفان۔ ۳۷۰۰۔

۱۱ مؤطا امام مالک، کتاب الطهارة، باب العمل فیمن غلب علیه الدم۔ ۸۴۔ ۱۲ الریاض النصرة فی مناقب العشرة للمحبط الطبری، ج ۲، ص: ۲۴۶ مصر۔ ۱۳ تاریخ طبری کبیر، ج ۷، ص: ۳۴۷ واقعات ۶۱ هـ۔

۱۴ مؤطا امام مالک، کتاب الصلوة، باب النظر فی الصلاة الی ما یشغلك عنها: ۲۲۲۔

۱۵ مؤطا امام مالک، ایضاً: ۲۲۳۔

زکوٰۃ

﴿وَأَتُوا الزَّكُوٰۃ﴾ (۲/ البقرة: ۴۳)

زکوٰۃ کی حقیقت اور مفہوم

نماز کے بعد جس کا اصل تعلق خالق مخلوق کے باہمی سلسلہ اور رابطہ سے ہے اور جس کا ایک بڑا فائدہ نظام جماعت کا قیام ہے، اسلامی عبادت کا دوسرا کرن زکوٰۃ ہے، جو آپس میں انسانوں کے درمیان ہمدردی اور بآہم ایک دوسرے کی امداد اور معاونت کا نام ہے اور جس کا اہم فائدہ نظام جماعت کے قیام کے لئے مالی سرمایہ بھی پہنچانا ہے۔ زکوٰۃ کا دوسرا نام صدقہ ہے، جس کا اطلاق قیم کے ساتھ ہر مالی اور جسمانی امداد اور یتیکل پر بھی ہوتا ہے۔ لیکن فقہی اصطلاح میں ”زکوٰۃ“ صرف اس مالی امداد کو کہتے ہیں جو ہر اس مسلمان پر واجب ہے جو دولت کی ایک مخصوص مقدار کا مالک ہو۔

زکوٰۃ گزشتہ مذاہب میں

زکوٰۃ بھی ان عبادات میں سے ہے جو تمام آسمانی مذاہب کے صحقوں میں فرض بتائی گئی ہے، لیکن ان کے پیروؤں نے اس فرض کو اس حد تک بھلا دیا تھا کہ ظاہر ان کے مذہبی احکام کی فہرست میں اس کا نام بھی نظر نہیں آتا۔ حالانکہ قرآن پاک کا دعویٰ ہے اور اس کی تائید مختلف آسمانی صحقوں سے ہوتی ہے کہ جس طرح نماز ہر مذہب کا جزو لا یتک تھی، اسی طرح زکوٰۃ بھی تمام مذاہب کا ہمیشہ ضروری جزو رہی ہے۔ بنی اسرائیل سے خدا کا جو عہد تھا اس میں نماز اور زکوٰۃ دونوں تھیں:

﴿وَأَقِيمُوا الصَّلوةَ وَأَتُوا الزَّكُوٰۃ﴾ (۲/ البقرة: ۴۳)

”(ہم نے بنی اسرائیل سے اقرار یا تھا) کہ کھڑی رکھ نماز اور دینے رہو زکوٰۃ۔“

﴿لَئِنْ أَقْتَمْتُ الصَّلوةَ وَأَتَيْتُمُ الزَّكُوٰۃ﴾ (۵/ المائدۃ: ۱۲)

”(اے بنی اسرائیل) اگر تم کھڑی رکھتے نماز اور دینے رہتے زکوٰۃ۔“

حضرت اسماعیل علیہ السلام کے ذکر میں ہے:

﴿وَإِذْ كُنْتِ فِي الْكِتْمِ إِسْمَاعِيلَ إِنَّهُ كَانَ صَادِقَ الْوَعْدِ وَكَانَ رَسُولًا لِّبَيْتِهِ وَكَانَ يَأْمُرُ أَهْلَهُ

بِالصَّلوةِ وَالزَّكُوٰۃِ وَكَانَ عِنْدَ رَبِّهِ مَرْضِيًّا﴾ (۱۹/ مریم: ۵۴-۵۵)

”اور قرآن میں اسماعیل کا ذکر کر، بے شک وہ عہد کا سچا تھا اور وہ خدا کا بھیجا ہوا شفیر تھا اور وہ

اپنے لوگوں کو نماز اور زکوٰۃ کی تاکید کرتا تھا اور وہ اپنے رب کے نزدیک پسندیدہ تھا۔“

حضرت عیسیٰ علیہ السلام کہتے ہیں:

﴿وَأَوْصَنِي بِالصَّلوةِ وَالزَّكُوٰۃِ مَا دُمْتُ حَيَاً﴾ (۱۹/ مریم: ۳۱)

”اور خدا نے مجھ کو زندگی بھرنماز پر ہٹھے اور زکوٰۃ دینے کی تاکید کی ہے۔“
 تورات سے معلوم ہوتا ہے کہ بنی اسرائیل پر زمین کی پیداوار اور جانوروں میں ایک عشر یعنی دسوائی حصہ (احبار ۲۷-۳۰-۳۲) نیز ہر بیس برس یا اس سے زیادہ عمر والے پر خواہ امیر ہو یا غریب آدھا مقابل دینا واجب تھا۔ (خروج ۱۵-۲۰-۳۰) ساتھ ہی غلمان کا نئے وقت گرا پڑا انانج، کھلیان کی منتشر بالیں اور پھل والے درختوں میں کچھ پھل چھوڑ دیتے تھے جو مال کی زکوٰۃ تھی اور یہ عمل ہر تیس سال واجب الادا ہوتی تھی۔ یہ رقم بیت المقدس کے خزانہ میں جمع کی جاتی تھی، اس کا سامنہواں حصہ مذہبی عہدہ دار پاتے تھے، دسوائی حصہ حضرت ہارون کی اولاد (لاویین) قوی خاندانی کا ہے ہونے کی حیثیت سے لیتی تھی اور ہر تیس سال میں دسوائی حصہ بیت المقدس کے حاجیوں کی مہمانی کے لئے رکھا جاتا تھا۔ ۴۱ اسی مد سے عام مسافروں، غریبوں، بیواؤں اور تیکیوں کو روزانہ کھانا پکا کر تقسیم کیا جاتا تھا۔ ۴۲ اور نقد آدھے مقابل والی زکوٰۃ کی رقم جماعت کے خیمه (یا مسجد بیت المقدس) اور قربانی کے ظرف و آلات کی خریداری کے خرچ کے لئے رہتی تھی۔ ۴۳
 حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے شریعت موسوی کے ان ظاہری قواعد میں کوئی ترمیم نہیں کی، بلکہ ان کی روحانی کیفیت پر زیادہ زور دیا۔ انجیل لوقا (۱۰-۱۸) میں ہے کہ جو اپنا عشر (زکوٰۃ) ریا، نہائش اور فخر کے لئے دینا ہے، اس سے وہ شخص بہتر ہے جو اپنے قصور پر نادم ہے۔ اسی انجیل کے ۲۱ و ۲۲ باب کی پہلی آیت میں ہے:
 ”اگر کوئی دولت مندر یا کل کے خزانہ میں اپنی زکوٰۃ کی بڑی رقم ڈالے اور اس کے مقابلہ میں کوئی غریب یا ہو خلوص دل سے دودھڑی ڈالے تو اس کی زکوٰۃ کا رتبہ اس دولتند کی زکوٰۃ سے کہیں بڑھ کر ہے۔“

حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے لوگوں کو ترغیب دی کہ جس کے پاس جو کچھ ہو وہ خدا کی راہ میں لادے:
 ”کہ اونٹ کا سوئی کے ناکے سے گزر جانا آسان ہے، مگر دولت مندر کا خدا کی بادشاہت میں داخل ہونا مشکل ہے۔“ (متی ۱۹-۲۲)

ساتھ ہی انہوں نے خود اپنی طرف سے نیزاپنے رفیق کی طرف سے اپنی ناداری کے باوجود آدھے مقابل والی زکوٰۃ ادا کی ہے۔ (متی ۲۲-۲۷)

تورات کے زمانہ میں چونکہ دولت زیادہ تصرف زمین کی پیداوار اور جانوروں کے گلوں تک محدود تھی اس لئے انہیں دونوں چیزوں کی زکوٰۃ کا زیادہ ذکر کرایا ہے۔ سونا چاندی اور ان کے سکوں کی چونکہ قلت تھی، اس لئے ان کی زکوٰۃ کا ذکر ایک دو جگہ ہے۔ اسی بنا پر یہودیوں نے نقد زکوٰۃ کی اہمیت محض نہیں کی علاوہ بریں زکوٰۃ کی مدت کی تعمیل کر دی ہے جوہ ہر سال یادو سرے یا تیس سال واجب الادا ہے۔ تصریحًا معلوم نہیں ہوتی، نیز

۴۱ اسیکو پیداوار نایا طبع یا زرد ہم صورت ”خیرات“ (CHARITY) باب ”یہودیوں میں خیرات“۔

۴۲ تورات خروج ۳۰-۱۶۔ العهد القديم، ص: ۱۳۷ و ۲۶-۳۸، ص: ۱۵۳۔

۴۳ تورات خروج، ۱۶-۳۰، العهد القديم، ص: ۱۳۷ و ۲۶-۳۸، ص: ۱۵۳۔

یہ کہ اس زکوٰۃ کا مصرف کیا ہے یعنی وہ کہاں خرچ کی جائے، اس کی تفصیل بھی خود قوراۃ کی زبان سے کم سنائی دیتی ہے۔

غرض وجوہ جو کچھ ہوں، مگر حالت یہ تھی کہ یہود نے اس فرض کو بھلا دیا تھا اور خصوصاً عرب میں جہاں کی دولت کے وہ تنہا مالک بن پیٹھے تھے، چند کے سوا اکثر کو اس فرض کا دھیان بھی نہ تھا، قرآن نے ان کو یاد دلا یا کہ

﴿وَأَقِيمُوا الصَّلَاةَ وَأَثُوا الْزَكُوْةَ مُمْتَنِعِيْمُ الْأَقْلِيلًا مِنْكُمْ وَأَنْتُمْ مُغْرِضُونَ﴾ (۸۳: ۲)

(البقرة: ۸۳)

”(اور تم بھی اسرائیل سے معابدہ تھا کہ) نماز کھڑی رکھنا اور زکوٰۃ دیتے رہنا، پھر تم پھر گئے مگر تم میں سے تھوڑے اور تم دھیان نہیں دیتے۔“

عیسوی مذہب میں گوب سب کچھ دینے کا حکم تھا، مگر یہ حکم ہر ایک کے لئے موزوں نہیں ہو سکتا تھا اور نہ ہر شخص اس پر عمل کر سکتا تھا، دوسرا مذہب میں بھی اگرچہ خیرات اور دان کرنے کے احکام موجود تھے، تاہم ان کے لئے کوئی نظام اور اصول مقرر نہیں کیا گیا تھا اور نہ ہر شخص پر قانوناً کوئی رقم واجب الادا تھی جس کے ادا کرنے پر وہ مجبور ہو سکتا تھا۔

اسلام کی اس راہ میں تکمیل

محمد رسول اللہ علیہ السلام کی شریعت نے اس بارے میں بھی اپنا تکمیلی کارنامہ انجام دیا۔ اس نے نہایت خوبی اور وقت نظر کے ساتھ زکوٰۃ کا پورا نظام تیار کیا۔ انسان کے مالی کاروبار کا معیار عموماً سالانہ آمدنی سے قائم ہوتا ہے۔ اس لئے اسلام نے زکوٰۃ کی مدت سال بھر کے بعد مقرر کی اور ہر سال اس کا ادا کرنا ضروری قرار دیا۔ ساتھ ہی اس نے دولت کے تین سرچشمے قرار دیے سونا چاندی اور جانور اور پیداوار اور ان میں سے ہر ایک کی عیحدہ عیحدہ شخصیں مقرر کیں۔ سونے چاندی میں سے چالیسواں حصہ اور پیداوار میں دسوال حصہ معین کیا۔ جانوروں کی مختلف قسموں میں ان کی مختلف تعداد پر ان کی قدر و قیمت کی کمی بیشی کے لحاظ سے مختلف شخصیں قرار دیں۔ پھر اس زکوٰۃ سے ہر قسم کے مصارف کی تعین و تحدید کی اور اس کی تحریک و صول اور جمع و خرچ کا کام بیت المال سے متعلق کیا۔

یہ تو اہم تھا اب تفصیلی حیثیت سے ان میں سے ہر ایک پہلو پر شریعت محمدی علیہ السلام کی تکمیلی حیثیت کو نمایاں کرنا ہے۔

اسلام میں زکوٰۃ کی اہمیت

اسلام کی تعلیم اور محمد رسول اللہ علیہ السلام کے صحیہ وحی میں نماز کے ساتھ ساتھ جو فریضہ سب سے اہم نظر آتا ہے، وہ زکوٰۃ ہے، نماز حقوق الہی میں سے ہے اور زکوٰۃ حقوق عباد میں سے، ان دونوں فریضوں کا باہم

لازم و ملزم اور مربوط ہونا اس حقیقت کو منکشf کرتا ہے کہ اسلام میں حقوق اللہ کے ساتھ حقوق عباد کا بھی یکساں لاحاظہ رکھا گیا ہے۔ قرآن پاک میں جہاں کہیں نماز کا ذکر ہے، اس سے متصل ہی، ہمیشہ زکوٰۃ کا بھی بیان ہے۔ چنانچہ قرآن پاک میں بیس مقامات پر اقسام الصلوٰۃ کے بعد ایتاء الزکوٰۃ آیا ہے۔ مثلاً:

﴿أَقِيمُوا الصَّلَاةَ وَاتُّو الْزَكُوٰةَ﴾ (یا) ﴿أَقِمُوا الصَّلَاةَ وَاتُّو الْزَكُوٰةَ﴾

اور زکوٰۃ ادا کرنے کی مدح یا اس کے دینے اور نہ دینے والوں کا تذکرہ اس کے علاوہ ہے، اس سے معلوم ہو گا کہ اسلام میں زکوٰۃ کی کیا اہمیت ہے۔ بارگاہ بنوی میں آکر جب کسی نے اسلام کے احکام دریافت کئے ہیں تو ہمیشہ آپ نے نماز کے بعد زکوٰۃ کو سپلا درج دیا ہے۔ صحیحین کی کتاب الایمان میں اس قسم کی متعدد حدیثیں ہیں جن میں یہ ترتیب بخوبی ظریح ہے، بلکہ بھی بھی وہ اسلام کے شرائط اہمیت میں داخل کی گئی ہے۔ چنانچہ حضرت جریر بن عبد اللہ بھلی رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے بیعت تین باتوں پر کی تھی نماز پڑھنا، زکوٰۃ دینا اور ہر مسلمان کی خیر خواہی کرنا۔ ۲۱ و فد عبدالقیس نے ۵ ہمیں بیوت کے آٹھانہ پر حاضر ہو کر جب اسلام کی تعلیمات دریافت کیں تو آپ ﷺ نے اعمال میں پہلے نماز پھر زکوٰۃ کو جگہ دی۔ ۲۲

۹۳ میں جب آنحضرت ﷺ نے حضرت معاذ رضی اللہ عنہ کو اسلام کا داعی بنا کر یہیں بھیجا ہے تو اسلام کے مذہبی فرائض کی یہ ترتیب بتائی کہ پہلے ان کو توحید کی دعوت دینا، جب وہ یہ جان لیں تو ان کو بتانا کہ دن میں پانچ وقت کی نمازان پر فرض ہے جب وہ نماز پڑھ لیں تو انہیں بتانا کہ اللہ تعالیٰ نے ان کے مال پر زکوٰۃ فرض کی ہے، جو ان کے دولت مندوں سے لے کر ان کے غریبوں کو دی جائے گی۔ ۲۳

صحابہ رضی اللہ عنہم میں جو لوگ شریعت کے راز دان تھے وہ اس نکتہ سے اچھی طرح واقف تھے، چنانچہ آنحضرت ﷺ کی وفات کے بعد جب اہل عرب نے بغاوت کی اور زکوٰۃ ادا کرنے سے انکار کیا تو حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ نے ان کے خلاف تواریخ بھیخی۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے کہا کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا تھا کہ جو توحید کا قائل ہو اس کا خون رو انہیں، اس کا معاملہ خدا کے ساتھ ہے۔ حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ نے جواب دیا خدا کی قسم اجنبی زکوٰۃ میں فرق کرے گا، میں اس سے لڑوں گا کہ زکوٰۃ مال کا حق ہے، خدا کی قسم! جو رسول اللہ کے زمانہ میں بھیز کا ایک بچہ بھی دیتا تھا وہ اس کو دینا پڑے گا۔ ۲۴ حقیقت میں یہ ایک لطیف نکتہ تھا جس کو صرف شریعت کا محروم اسرار سمجھ سکتا تھا۔ ۲۵ اس نے سمجھا اور اس کو سمجھایا اور اس نے اس کے سامنے اطاعت کی گردن جھکا دی۔

۲۶ صحیح بخاری، کتاب الزکوٰۃ، باب البیعة على ایتاء الزکوٰۃ: ۱۴۰۱۔ ۲۷ ایضاً، باب وجوب الزکوٰۃ: ۱۳۹۵۔ ۲۸ صحیح بخاری، کتاب التوحید، باب ماجاء في دعاء النبي ﷺ امته الى توحيد الله: ۷۳۷۲۔

۲۹ صحیح بخاری، کتاب الزکوٰۃ، باب وجوب الزکوٰۃ: ۱۳۹۹۔ ۳۰ وحقیقت حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کے طرز میں کام اخذ قرآن پاک کی یہ آیت تھی: «فَاقْتُلُوا الْمُشْرِكِينَ حَيْثُ وَجَدُوكُمُوْهُمْ... فَإِنْ تَابُوْا وَأَقِمُوا الصَّلَاةَ وَاتُّو الْزَكُوٰةَ فَخُلُّوْا سَبِيلُهُمْ» (۹/اتوب۔۵) ”ان شرکوں کو مارو جہاں پاؤ۔ تو اگر وہ توبہ کریں اور نماز کھڑی کریں اور زکوٰۃ دیں تو ان کو آزادی دے دو۔“ ۳۱ میزدھ کمبوح صحیح بخاری، کتاب الاعتصام، باب قول اللہ امرہم شوری بینہم ترجمہ الباب: ۲۸۔

نماز اور زکوٰۃ کے باہمی ارتباط کی ایک اور وجہ بھی ہے اسلام کی تنظیمی زندگی صرف دو بنیادوں پر قائم ہے۔ جن میں سے ایک روحانی اور دوسری مادی ہے۔ اسلام کا نظام روحانی نماز باجماعت سے جو کسی مسجد میں ادا ہو، قائم ہوتا ہے اور نظام مادی زکوٰۃ سے جو کسی بیت المال میں جمع ہو کر تقسیم ہو، مرتب ہوتا ہے، اسی لئے یہ دونوں چیزوں اسلام میں ساتھ ساتھ نظر آتی ہیں اور ان کی انفرادی حیثیت کے ساتھ ان کی اجتماعی حیثیت پر بھی شریعت محمدی ﷺ نے خاص زور دیا ہے۔ نماز جس طرح جماعت اور مسجد کے بغیر بھی انجام پا جاتی ہے۔ لیکن اپنی فرضیت کے بعض مقاصد سے دور ہو جاتی ہے۔ اسی طرح زکوٰۃ بیت المال کی مجتمع صورت کے علاوہ بھی ادا ہو جاتی ہے۔ مگر اس کی فرضیت کے بعض اہم مقاصد فوت ہو جاتے ہیں۔ یہی سبب ہے کہ حضرت ابو بکر ؓ کے عہد خلافت میں جب بعض قبیلوں نے یہ کہا کہ وہ زکوٰۃ بیت المال میں داخل نہ کریں گے، بلکہ بطور خود اس کو صرف کر دیں گے تو شریعت محمدی ﷺ کے شناسائے راز نے ان کی اس تجویز کو قبول نہیں کیا اور بزرور ان کو بیت المال میں زکوٰۃ داخل کرنے پر مجبور کیا کہ اگر ان کی یہ بات تسلیم کر لی جاتی تو اسلام کی وحدت کا سر بر شدت اسی وقت پارہ اور مسلمانوں کی امامت و جماعت کا نظام اسی وقت درستہ ہو جاتا۔ الغرض زکوٰۃ یا دوسرے الفاظ میں غربیوں کی چارہ گری، مسکینوں کی دست گیری، مسافروں کی امداد، تیہوں کی خبر گیری، بیواؤں کی نصرت، غلاموں اور قیدیوں کی اعانت نماز کے بعد اسلام کی عبادات کا دوسرا رکن ہے اور اس فریضہ کی یہ سب سے پہلی اہمیت ہے جو مذاہب کی تاریخ میں نظر آتی ہے۔

زکوٰۃ کا آغاز اور تدریجی تکمیل

جس طرح عام نماز کا آغاز اسلام کے ساتھ ساتھ ہوا اور مدد آ کر وہ رفتہ رفتہ تکمیل کو پہنچی۔ اسی طرح زکوٰۃ یعنی مطلق مالی خیرات کی تغییر بھی ابتدائے اسلام اسی سے شروع ہوئی، لیکن اس کا پورا نظام آہستہ آہستہ فتح مکہ کے بعد قائم ہوا۔ بعض مورخوں اور محدثوں کو اس بنا پر کہ ۸ھ میں زکوٰۃ کی فرضیت کی تصریح ملتی ہے، اس سے پہلے کے واقعات میں جو زکوٰۃ کا لفظ آیا ہے، اس سے پریشانی ہوئی ہے۔ حالانکہ شروع اسلام میں زکوٰۃ کا لفظ صرف خیرات کا متراود تھا۔ اس کی مقدار، نصاب، سال اور دوسری خصوصیتیں جو زکوٰۃ کی حقیقت میں داخل ہیں، وہ بعد کو رفتہ رفتہ مناسب حالات کے پیدا ہونے کے ساتھ تکمیل کو پہنچیں۔ محمد رسول اللہ ﷺ کا پیغام صرف دلفتوں سے مرکب ہے۔ خدا کا حق اور بھائیوں کا حق، پہلے لفظ کا مظہر اعظم نماز اور دوسرے کا زکوٰۃ ہے۔ اس لئے محمد رسول اللہ ﷺ کی دعوت حق جب بلند ہوئی تو اس پکار کی ہر آوازان ہی دلفتوں کی تفصیل و تشریع تھی، آنحضرت ﷺ جس طرح بعثت سے پہلے غار حرام میں چھپ کر خدا کی یاد (نماز) میں مصروف رہتے تھے، اسی طرح بیکس اور لاچار انسانوں کی دشمنی (زکوٰۃ) بھی فرمایا کرتے تھے۔ حضرت خدیجہؓ الکبریؓ ﷺ نے بعثت کے وقت آپ ﷺ کی نسبت فرمایا، آپ قرابداروں کا حق پورا کرتے

ہیں، قرضداروں کا قرض ادا کرتے ہیں، غریب کو کمک کر دیتے ہیں، مہمان کو کھلاتے ہیں، لوگوں کو مصیبوں میں مدد دیتے ہیں۔ ۱۰ غور کرو، کیا زکوٰۃ انہیں فرائض کے مجموعہ کا نام نہیں ہے؟ اس بنا پر یہ کہنا بالکل صحیح ہے کہ نماز اور زکوٰۃ تو امام ہیں اور ان ہی دو اجتماعی حقیقتوں کی تشریع کا نام اسلام ہے۔ سورہ مدثر اگرچہ وحی کی ابتدائی سورہ ہے، لیکن اس سرزی میں میں وہ تمام شیخ موجود ہیں، جن سے آگے چل کر رفتہ رفتہ احکام اسلامی کا عظیم الشان تناؤ درخت تیار ہوا۔ اس میں نماز کی تمام تفصیلات کو صرف ایک لفظ میں ادا کیا گیا ہے:

﴿وَرَبَّكَ فَقَبِيزٌ﴾ (۷۴ / المدثر: ۳)

”اور اپنے پروردگار کی بڑائی کر۔“

پروردگار کی بڑائی نماز کی روح ہے، جو اس سورہ میں موجود ہے، اس کے بعد ہے:

﴿وَلَا تَنْهُنْ تَشْتَأْنُرُ﴾ (۷۴ / المدثر: ۶)

”اوہ بدلہ بہت چاہئے کے لئے کسی پر احسان نہ کر۔“

یہی وہ شیخ ہے جس سے مسائل زکوٰۃ کے تمام برگ و بار بیدا ہوئے ہیں۔ مدثر کے بعد سورہ مزمل اتری اس میں بہ تصریح دونوں حکم موجود ہیں اور زکوٰۃ کی کسی تدریج تفصیل بھی کی گئی ہے:

﴿وَأَقِيمُوا الصَّلَاةَ وَأُثُرُوا الزَّكُوٰۃَ وَأَفْرِضُوا اللَّهَ قُرْضاً حَسَنَاءً وَمَا تَقْرَرَ مُوَالِاً لِنَفْسِكُمْ مِنْ خَيْرٍ

تَجْدُودُهُ عِنْدَ اللَّهِ هُوَ خَيْرٌ وَأَعْظَمُ أَجْرًا﴾ (۷۳ / المزمل: ۲۰)

”اور نماز کھڑی کرو اور زکوٰۃ دو اور اللہ کو اچھا قرض دو اور جو تم آگے بھیجو گے اپنے واسطے اس کو خدا کے پاس بہتر اور ثواب میں زیادہ پاؤ گے۔“

بعثت کے پانچویں سال جب حضرت جعفر بنی ایوب وغیرہ بھارت کر کے جب شے گئے ہیں اور نجاشی نے اپنے دربار میں بلا کران سے اسلام کی حقیقت اور اس کی تعلیمات دریافت کی ہیں اور حضرت جعفر بنی ایوب نے اس کے جواب میں جو تقریر کی ہے اس میں ہے: ”اوہ پیغمبر ہم کو یہ سکھاتا ہے کہ ہم نماز پڑھیں، روزے رکھیں اور زکوٰۃ دیں۔“ ۱۱ اس سے معلوم ہوا کہ عام زکوٰۃ یا مالی خیرات کا آغاز اسلام کی ابتدائی میں ہو چکا تھا اور وہ عبد القیس کے (جوت قریبیاً همیں آیا تھا) سوال کے جواب میں آپ نے جن احکام کی تعلیم دی، ان میں ایک زکوٰۃ بھی تھی۔ ۱۲ میں جب نجاشی نے نام مبارک پہنچنے کے بعد ابوسفیان سے جو اس وقت تک کافر تھے اسلام کی تعلیمات دریافت کیں تو انہوں نے دوسری چیزوں کے ساتھ زکوٰۃ و صدقہ کا ۱۳ بھی تذکرہ کیا ان واقعات سے بخوبی واضح ہے کہ ۸۵ سے پہلے بلکہ بھارت سے بھی پہلے بعثت کے بعد ہی نماز کے ساتھ ساتھ زکوٰۃ کی تعلیم بھی موجود تھی۔ لیکن پونک محمد رسول اللہ ﷺ کا طریقہ تعلیم صرف نظریوں کا پیش کرنا نہ تھا بلکہ

۱۰ صحیح بخاری، کتاب بدء الوضیع: ۳۔ ۱۱ مسند احمد، ج ۱، ص: ۲۰۲۔ ۱۲ صحیح بخاری، کتاب الزکوٰۃ، باب وجوب الزکوٰۃ: ۱۳۹۸۔ ۱۳ صحیح بخاری، کتاب الفسیر: ۴۵۰۳۔

امت کو عملاً اسلام کی تعلیمات پر کار بند بنانا تھا۔ اس لئے حالات کے اقتضا اور مناسبت کے ساتھ ساتھ تعلیمات کے تفصیلی اجزاء اور ان کے متعلقہ احکام کی تشریع آہستہ آہستہ تکمیل کو پہنچائی گئی۔ مکہ معظمه میں مسلمانوں کی پریشانی، پر اگندگی، شکستہ حالی اور غربت مسکینی کی جو کیفیت تھی، اس کی بنا پر اتنا ہی ان کے لئے بہت تھا کہ وہ کسی تیمیم و مسکین اور بھوک کے کوکھانا کھلادیں، چنانچہ اس زمانہ میں اسی قسم کے خیرات کی تعلیم دی گئی:

«وَمَا أَذْرَكَ مَا الْعَقِيْدَةُ فَكُلْ رَقَبَةً أَوْ اطْعَمْ فِي يَوْمِ ذِي مَسْعَةٍ ۝ يَتَّهِمًا دَا مَقْرَبَةً ۝ أَوْ مُسْكِنَةً دَا مَتْرَبَةً ۝» (۹۰/البلد: ۱۲-۱۶)

”اور تو کیا سمجھا کہ وہ گھانی کیا ہے، کسی (قرض دار یا قیدی یا نعلام) کی گروہ چھڑانا یا بھوک کے دن میں ناتے کے کسی بن باپ کے بچہ کو یا خاک میں پڑے ہوئے کسی محتاج کو کھانا کھلانا، عام قریش پر جنہوں نے محمد رسول اللہ ﷺ کی اس انسانی ہمدردی کی پرکار نہیں سناء، عتاب آیا۔“

«فَذِلَّكَ الَّذِي يَدْعُ الْيَتَيْمَ ۝ وَكَيْخُضُ عَلَى طَعَامِ الْمُسْكِنِينَ ۝» (۱۰۷/الماعون: ۲-۳)

”وہی ہے جو بن باپ کے بچہ کو دھکا دیتا ہے اور غریب کے کھلانے پر اپنے کو آمادہ نہیں کرتا۔“

«كَلَّا كَلَّا لَا تَكُنْ مُؤْنَ الْيَتَيْمَ ۝ وَلَا تَخْصُ عَلَى طَعَامِ الْمُسْكِنِينَ ۝» (فجر: ۱)

”یہ بات نہیں بلکہ بن باپ کے بچہ کی تم عزت نہیں کرتے اور آپس میں محتاج کے کھلانے کی تاکید نہیں کرتے۔“

اور مسلمانوں کے اخلاص، باہمی ہمدردی اور ان کے جذبہ ترحم کی تعریف فرمائی کہ

«وَيَطْعَمُونَ الطَّعَامَ عَلَى حُسْنِهِ وَمُسْكِنَةً وَيَتَّهِمًا وَأَسِيرًا ۝ إِنَّمَا نُطْعِمُهُمْ لِوَجْهِ اللّٰهِ لَا تُرِيدُ

مِثْلُمَ جَزَاءً وَلَا شُكُورًا ۝» (۹-۸/الدھر: ۷۶)

”اور وہ حاجت مند ہونے کے باوجود محتاج، تیم اور قیدی کو کھانا کھلاتے ہیں اور کہتے ہیں

کہ ہم تم کو صرف خدا کے لیے کھلاتے ہیں، تم سے نہ بدلا چاہتے ہیں، نہ شکریہ۔“

مدینہ منورہ آ کر جب مسلمانوں کو کسی قدر اطمینان ہوا اور انہوں نے کچھ اپنا کاروبار شروع کیا تو روزہ کے ساتھ ساتھ ۲۲ھ میں صدقۃ الفطر واجب ہوا۔ یعنی یہ کہ سال میں ایک دفعہ عید کے دن نماز سے پہلے ہر مسلمان سیر سوا سیر غلمہ خدا کی راہ میں خیرات کرے، تاکہ غریب و محتاج بھی اپنی عید کا دن پیٹ بھر کر خوشی اور مسرت سے گزاریں۔ اس کے بعد مسلمانوں کو صدقہ اور خیرات کی عام طور سے تاکید کی گئی، انہوں نے دریافت کیا یا رسول اللہ ﷺ اہم کیا خیرات کریں؟

«وَسَأَلُوكَ مَاذَا يُنْفِقُونَ ۝» (۲/البقرة: ۲۱۹)

”وَهُوَ يُوْجِنُ مِنْ كُوْنِيْرَاتِ كُوْرِيْسِ۔“

ارشاد ہوا:

﴿قُلِ الْعَفْوُت﴾ (٢/ البقرة: ٢١٩)

”کہ دو (اے بیانبر) کہ تمہاری ضرورت سے جو کچھ نہ رہے (اس کو خیرات کرو)۔“

یہ زکوٰۃ کی تعین کی راہ میں اسلام کا پہلا قدم ہے۔ صحیح بخاری میں حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ کا قول نقل کیا ہے۔ جس کا مطلب یہ ہے کہ زکوٰۃ کی مقدار و نصاب کے احکام نازل ہونے سے پہلے مسلمانوں کو یہ حکم تھا کہ جو کچھ بچے وہ خدا کی راہ میں خیرات کروں۔ آیندہ کے لئے کچھ بچا کرنہ رکھیں۔ ﴿ کہ اس وقت اسلام اور مسلمانوں کی حالت اسی کی مقتضی تھی، کچھ دنوں کے بعد جب مسلمانوں کو فتوحات نصیب ہوئیں، زینیں اور جاگیریں ہاتھ آئیں، تجارت کی آمدنی شروع ہوئی تو حکم ہوا:

﴿يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا إِذْ قَوَاعِنَ طَيْبَتِ مَا كَسْبَتُمْ وَمَمَّا أَخْرَجَنَا اللَّهُمَّ مِنَ الْأَرْضِ سَ

(٢/ البقرة: ٢٦٧)

”اے مسلمانو! اپنی کمائی میں سے کچھ اچھی چیزیں اور جو تمہارے لئے زمین سے پیدا کریں اس میں سے کچھ خیرات میں دو۔“

مسلمانوں نے اس کی تعلیل کی تو خدا نے ان کی تعریف کی کہ

﴿وَهُمَّا رَّزَقْتَهُمْ يُنْفِقُونَ ۚ﴾ (٢/ البقرة: ٣)

”اور ہم نے ان کو جو روزی دی ہے، اس میں سے وہ کچھ خرچ (خیرات) کرتے ہیں۔“

صحابہ رضی اللہ عنہم کا یہ حال تھا کہ وہ بھی جن کے پاس کچھ نہ تھا خدا کی راہ میں کچھ نہ کچھ دینے کے لئے بے قرار رہتے تھے۔ چنانچہ جب یہ حکم ہوا کہ ہر مسلمان پر صدقہ دینا فرض ہے تو غریب و نادار صحابہ رضی اللہ عنہم نے آکر عرض کی اے خدا کے رسول! جس کے پاس کچھ نہ ہو وہ کیا کرے؟ فرمایا: ”وَهُمْ حَمْنَتٌ مَرْدُورٌ کر کے اپنے ہاتھ سے پیدا کرے، خود بھی فاکدہ اٹھائے اور دوسروں کو بھی صدقہ دے۔“ انہوں نے پھر گزارش کی کہ جس میں اس کی بھی طاقت نہ ہو وہ کیا کرے؟ فرمایا کہ ”وَهُمْ فَرِيَادٌ خَوَاهٌ حاجَتٌ مَنْدُكٌ مَدْكُرٌ۔“ انہوں نے پھر دریافت کیا کہ اگر اس کی بھی قدرت نہ ہو تو؟ ارشاد ہوا: ”تَوَهُّ مَلِكٌ كَامٌ كَرَءَ اور بِرَائِی سے بچے، یہی اس کا صدقہ ہے۔“ ﴿ آنحضرت ﷺ کی ان پر ارشتیمات اور نصیحتوں کا صحابہ پر یہ اثر ہوا کہ وہ اس غرض کے لئے بازار جا کر بوجھا اٹھاتے تھے اور اس سے جو کچھ ملتا تھا، اس کو خدا کی راہ میں خرچ کرتے تھے۔ ﴿ لیکن

﴿ كتاب الزكوة، باب ما ادى زكاته فليبيس بكتير: ١٤٠٤، مع فتح الباري، ج ٣، ص: ٢١٦۔

﴿ صحیح بخاری، كتاب الزكوة، باب على کل مسلم صدقۃ..... ١٤٤٥۔

﴿ صحیح بخاری، كتاب الزكوة، باب اتقوا النار ولو بشق تمرة: ١٤١٥، ١٤١٦۔

بایں ہے اب تک تمام عرب اسلام کے جھنڈے کے نیچے جمع نہیں ہوا تھا اور اس لئے اس کا کوئی مرتب قومی نظام بھی قائم نہ تھا۔ رمضان ۸ھ میں مکہ کی فتح نے تمام عرب کو ایک سرنشستہ میں مسلک کر دیا اور اب وہ وقت آیا کہ اسلام اپنا خاص نظام قائم کرے، اس وقت یہ آیت نازل ہوئی:

﴿خُذْ مِنْ أَمْوَالِهِمْ صَدَقَةً تُطَهِّرُهُمْ وَتُرْكِيْهُمْ بِهَا﴾ (۹/التوبۃ: ۱۰۳)

”(اے محمد رسول اللہ ﷺ) ان کے مال میں سے صدقہ (زکوٰۃ) وصول کرو کہ اس کے ذریعہ سے تم ان کو پاک و صاف کر سکو۔“

چنانچہ اس کے بعد نئے سال یعنی محرم ۹ھ میں زکوٰۃ کے تمام احکام و قوانین مرتب ہوئے اس کی وصولی کے لئے تمام عرب میں محصولوں اور عاملوں کا تقریر ہوا۔ ۲۸ اور باقاعدہ ایک بیت المال کی صورت پیدا ہوئی۔ یہ تمام احکام و قوانین سورہ براءت میں مذکور ہیں جو ۸ھ کے آخر میں نازل ہوئی ہے۔

زکوٰۃ کی مدت کی تعین

اسلام سے پہلے زکوٰۃ کی مدت کی تعین میں بڑی افراط و تفریط تھی، تورات میں جو عشر یعنی دسوال حصہ مقرر کیا تھا، وہ تین سال میں ایک دفعہ واجب ہوتا تھا۔ (استثناء ۲۸) اور انجیل میں کسی مدت اور زمانہ کی تعینیں ہی نہ تھیں۔ اس بنا پر زکوٰۃ کی تنظیم کے سلسلہ میں سب سے پہلی چیز اس کی مدت کا تعین تھا کہ وہ نہ تو اس قدر قریب اور مختصر زمانہ میں واجب الادا ہو کہ انسان بار بار کے دینے سے اکتا جائے اور بجائے خوشی اور دلی رغبت کے اس کو ناگوار اور جرم معلوم ہو اور نہ اس قدر لمبی مدت ہو کہ غریبوں، مسکینوں اور قابل امداد لوگوں کو اپنی ضرورت پوری کرنے کے لئے طویل انتظار کی سخت تکلیف اٹھانی پڑے، اسلام نے اس معاملہ میں دنیا کے دوسرے مالی کاروبار کو دیکھ کر ایک سال کی مدت مقرر کی۔ کیوں کہ تمام متمدن دنیا نے خوب سوچ سمجھ کر اپنے کاروبار کے لئے ۱۲ ماہیوں کا سال مقرر کیا ہے، جس کی وجہ یہ ہے کہ آدمی کا اصلی سرچشمہ میں کی پیداوار ہے اور اس کے بعد اس پیداوار کی خود یا اس کی بدلتی ہوئی شکلوں کی صنعتی صورت کا بنانا اور ان کا بیو پار کرنا ہے آدمی کے ان تمام ذریعوں کے لئے یہ ضروری ہے کہ سال کے مختلف موسم اور فصلیں، جائز، گرمی، برسات، ریپع اور خریف گزر جائیں، تاکہ پورے سال کے آمد و خرچ اور نفع و نقصان کی میزان لگ سکے اور زمیندار، کاشکار، تاجر، نوکر، صناع، هر ایک اپنی آدمی و سرمایہ کا حساب کتاب کر کے اپنی مالی حالت کا اندازہ لگا سکے بڑے جانوروں کی پیدائش اور نسل کی افزائش میں بھی اوس طाً ایک سال لگتا ہے ۲۹ ان تمام وجوہات سے ہر منظم جماعت ہر حکومت اور ہر قوی نظام نے محصول اور ٹکیس وصول کرنے کی مدت ایک سال مقرر کی ہے۔ شریعت محمدی ﷺ نے بھی اس بارہ میں اسی طبعی اصول کا اتباع کیا ہے اور ایک سال کی مدت کی آدمی

۲۸ ابن سعد، جلد مغازی، جز ثالثی، قسم اول، ص: ۱۱۵ و تاریخ طبری، ج ۴، ص: ۱۷۲۲ مطبوعہ بورپ۔

۲۹ بھری کی مدت حمل بچھے میتے گئے کی تو، اونت کی گیارہ اور بھینس کی بارہ میتے ہے۔

پر ایک دفعہ اس نے زکوٰۃ کی رقم عائد کی ہے۔ چنانچہ اس کا کھلا ہوا ارشاد سورہ توہہ میں موجود ہے، جس میں زکوٰۃ کے تمام احکام بیان ہوئے ہیں۔ زکوٰۃ کے بیان کے بعد ہی ہے:

﴿إِنَّ عَدَّةَ الشُّهُورِ عِنْدَ اللّٰهِ أَثْنَا عَشَرَ شَهْرًا فِي كِتَابِ اللّٰهِ يَوْمَ خَلَقَ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضَ﴾

(التوبہ: ۳۶)

”مبینوں کی گنتی اللہ کے نزدیک بارہ مہینے ہیں، جس دن اللہ نے آسمانوں کو اور زمین کو پیدا کیا۔“

زکوٰۃ کی مقدار

توراۃ سے معلوم ہوتا ہے کہ بنی اسرائیل میں زکوٰۃ کی مقدار پیداوار کا دسوال حصہ تھا اور نقد میں آدھا مشقال جو امیر و غریب سب پر یکساں فرض تھا۔ لیکن زمین کی مختلف قسمیں ہوتی ہیں، کہیں زمین صرف بارش سے سیراب ہوتی ہے اور کہیں نہر کے پانی سے جہاں مزدوری اور محنت کا اضافہ ہو جاتا ہے، نقد دولت کے بھی مختلف اصناف ہیں، بعض مرتبہ دولت بے محنت ہاتھ آ جاتی ہے اور بعض اوقات محنت کرنی پڑتی ہے اس لئے سب کا یکساں حال نہیں ہو سکتا۔ انجیل نے حسب دستور اس مشکل کا کوئی حل نہیں کیا۔ لیکن محمد رسول اللہ ﷺ کی شریعت کاملہ نے علم اقتصاد سیاسی (پوشیشکل اکانومی) کے نہایت صحیح اصول کے مطابق دولت کے فطری اور طبعی ذرائع کی تعین کی اور ہر ایک کے لئے زکوٰۃ کی مناسب شرح مقرر کر دی۔ اس سلسلہ میں سب سے پہلی بات یہ ہے کہ شریعت محمد یہ ﷺ نے توراۃ کی قانونی تعین اور انجیل کی اخلاقی عدم تعین، دونوں حقیقوں کو اپنے نظام میں جمع کر لیا، اس نے اخلاقی طور پر ہر شخص کو اجازت دے دی کہ وہ اپنا کل مال یا نصف مال یا کم و بیش جو وہ چاہے خدا کی راہ میں دے دے، اس کا نام اتفاق یا عام خیرات و صدقہ ہے۔ لیکن اسی کے ساتھ یہ بھی فرض کر دیا کہ ہر شخص کی دولت میں غریبوں اور محتاجوں اور دوسرا نیک کاموں کے لئے بھی ایک مقررہ سالانہ حصہ ہے اور اس کا نام زکوٰۃ ہے۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے قرآن پاک میں فرمایا:

﴿الَّذِينَ هُمْ عَلٰى صَلَاتِهِمْ دَآءِبُونَ ۗ وَالَّذِينَ فِي أَمْوَالِهِمْ حَقٌّ مَعْلُومٌ ۗ لِلْسَّاَلِيلِ وَالْمَحْرُومُونَ ۚ﴾

(المعارج: ۷۰)

”جو اپنی نماز ہمیشہ ادا کرتے ہیں اور جن کے مالوں میں مانگتے اور محروم کا معلوم حصہ ہے۔“

اس آیت سے صاف و صریح طریقہ سے یہ ثابت ہے کہ مسلمانوں کی دولت میں غریبوں کا جو حصہ ہے وہ متعین، مقرر، معلوم اور عملہ ارجح ہے۔ چنانچہ قرآن پاک میں مَعْلُومُ اور مَعْلُومَات کے الفاظ جہاں آئے ہیں، وہاں بھی مقصود ہے۔ اس سے ثابت ہوا کہ عرب میں جو قوم کسی نکسی طرح زکوٰۃ ادا کرتی تھی، اس کی جو شرح متعین اور رواج پذیر تھی، اس کو اسلام نے کسی قدر اصلاح کے بعد قبول کر لیا تھا۔ عرب میں اس قسم کی زکوٰۃ صرف بنی اسرائیل ادا کرتے تھے۔ جس کا حکم توراۃ میں مذکور ہے اور اس کی شرح بھی اس میں مقرر

ہے۔ یعنی پیداوار میں دسوال حصہ اور نقد میں نصف مشقاب۔ آنحضرت ﷺ نے اپنی حکمت ربانی سے اجناس زکوٰۃ پر مختلف شرطیں مقرر فرمائیں، جو قیمت کے لحاظ سے اسی شرح معلوم کے مساوی ہیں اور ان شرحوں کو فرایمن کی صورت میں لکھوا کر اپنے عمال کے پاس بھجوایا، یہی تحریری فرایمن مددوین حدیث کے زمانہ تک بعینہ محفوظ تھے اور مددوین حدیث کے بعد ان کو بعینہ کتب حدیث میں درج کیا گیا جو آج تک موجود ہیں۔ اس تمام تفصیل کا مخرج قرآن پاک میں بھی ایک حیثیت سے مذکور ہے۔

یہ ظاہر ہے کہ انسان کی دولت صرف اس کی محنت اور سرمایہ کی پیداوار ہے۔ اس لئے اصول کا اتنا یہ ہے کہ جس حد تک محنت اور سرمایہ کم لگتا ہو۔ زکوٰۃ کی مقدار اسی قدر زیادہ رکھی جائے اور جیسے جیسے محنت بڑھتی اور سرمایہ کا اضافہ ہوتا جائے زکوٰۃ کی شرح کم ہوتی جائے، عرب میں یہ دستور تھا کہ قبلوں کے سردار چوتھے وصول کرتے تھے۔ اسی لئے وہ اپنے سرداروں کو مرداب (یعنی چوتھے والا) کہا کرتے تھے۔ شاید دوسری پرانی قوموں میں بھی یہ دستور ہو۔ ہندوستان میں مرہٹوں نے بھی چوتھے کیوران پنج کیا تھا۔ مگر چونکہ اسلام کو حکوموں اور سپاہیوں کے ساتھ زیادہ رعایت مدد نظر تھی۔ اس لئے اس نے چار کو پانچ کر دیا۔ اس طرح چوتھے (۱/۲) کے بجائے دولت کا پانچواں حصہ خدا اور رسول کا حصہ قرار پایا، جس کو رسول اور ان کے بعد ان کے نائب اپنی ذاتی ضروریات، اہل و عیال کے ننان و نفقة اور نادار مسلمانوں کی امداد یا حکومت اور جماعت کی کسی اور ضروری مد میں صرف کر سکیں۔

اس زکوٰۃ کا نام جو غیمت کے مال پر عائد ہوتی ہے، خس ہے، قرآن نے کہا:

﴿وَاعْلَمُوا أَنَّهَا غِيمَةٌ قِنْ شَنِيٌّ فَأَنَّ لِلَّهِ الْحُمْسَةَ وَلِلرَّسُولِ وَلِذِي الْقُرْبَى وَالْيَتَامَى وَالْمَسْكِينُونَ وَأُنُّ السَّمِيلُ﴾ (۴۱: ۸/ الانفال)

”اور جان لو کہ جو کچھ تم کو غیمت ملے اس کا پانچواں حصہ خدا کے لئے اور رسول کے لئے اور قرابت مندوں کے لئے اور تبییوں اور مسکینوں اور مسافر کے لئے ہے۔“

نکتہ

اس موقع پر ایک خاص بات سمجھنے کے لائق ہے، جہادیا و شمنوں سے لا ای کا اصلی مقصد دین کی حمایت اور اعلاءے کلمۃ اللہ ہے۔ غیمت کا مال حاصل کرنا نہیں اور اگر کوئی صرف حصول غیمت کی نیت سے دشمن سے لڑے، تو اس کی یہ لا ای اسلام کی نگاہ میں جہاد نہ ہوگی اور نہ اس کا کوئی ثواب ملے گا۔ اس کی طرف خود قرآن پاک میں اشارہ موجود ہے اور آنحضرت ﷺ نے بھی متعدد حدیثوں میں اس کی تشریح فرمادی ہے۔ اس بنا پر درحقیقت وہ مال غیمت جو لا ای میں دشمنوں سے ہاتھ آتا ہے۔ ایک ایسا سرمایہ ہے جو بلا قصد اور بلا محنت اتفاقاً مسلمانوں کو مل جاتا ہے، اس سے یہ نکتہ حل ہو جاتا ہے کہ جو سرمایہ کسی محنت کے بغیر اتفاقاً ہاتھ آئے اس

میں پانچواں حصہ نظام جماعت کا حق ہے یا حکومت کے مقررہ بالا مصارف کے لئے ہے۔ یہ اصول کہ جو سرمایہ بلا کسی محنت کے اتفاقاً کسی مسلمان کے ہاتھ آجائے، اس میں سے پانچواں حصہ خدا اور رسول کا ہے تا کہ وہ جماعت کے مشترکہ مقاصد کے صرف میں آئے، وہی ہے جس کی بنا پر ”رکاز“ یعنی دفینہ میں جو کسی کو بلا محنت اتفاقاً غیر بے ہاتھ آجائے ہنس (یعنی پانچواں حصہ) جماعت کے بیت المال کا حق تدیم کیا گیا ہے۔ محنت اور سرمایہ سے جود دلت پیدا ہوتی ہے، اس میں سب سے پہلی چیز زمین کی پیداوار ہے۔ تورات نے ہر قسم کی پیداوار پر عشر یعنی دسویں حصہ مقرر کیا تھا۔ شریعت محمد یعنی نہایت نکتہ بخی کے ساتھ پیداوار کی مختلف قسموں پر مختلف شرح زکوٰۃ کی تفصیل کی۔ سب سے پہلے پیداوار کے ان اصناف پر زکوٰۃ مقرر ہوئی جو کچھ مزمانہ تک محفوظ رہ سکتے ہیں، تاکہ ان سے حسب نشوونما اور تجارتی فائدہ اٹھایا جاسکے اور نقصان کا ندیشہ نہ ہو، اسی بنا پر سبزیوں اور ترکاریوں پر جو ایک دو روز سے زیادہ نہیں رہ سکتیں کوئی زکوٰۃ مقرر نہیں فرمائی گئی، اسی طرح اس مالیت پر جس میں نشوونما اور ترقی کی صلاحیت نہیں، مثلاً: آلات، مکان، بس، سامان، اسباب، سواری، قیمتی ٭ پتھر ان پر بھی زکوٰۃ نہیں رکھی گئی، کچھ دنوں تک باقی رہنے والی اور نشوونما پانے والی چیزیں چار ہیں زمین، جانور، سونا، چاندی یا ان کے سکنے اور تجارتی مال، چنانچہ ان چاروں چیزوں پر زکوٰۃ مقرر ہوئی۔ زمین کی دو قسمیں کی گئیں ایک وہ جس کے جو تنے اور بونے کی محنت اور مزدوری کا خرچ گو کاشتکار کرتا ہے، مگر موسمی اور اقلیمی خصوصیت کی وجہ سے اس کے سیراب کرنے میں کاشتکار کی کسی بڑی محنت اور مزدوری کو دخل نہیں ہوتا۔ بلکہ وہ بارش یا نہر کے پانی یا زمین کی نمی اور شبنم سے آپ سے آپ سے سیراب ہوتی ہے، اس پر بلا محنت والی اتفاقی دولت سے آٹھی زکوٰۃ یعنی عشر (۱۰%) مقرر کیا گیا۔ زمین کی دوسری قسم یعنی وہ جس کی سیرابی کاشتکار کی خاصی محنت اور مزدوری سے ہو۔ مثلاً: کنوئیں سے پانی نکال کر لانا یا نہر بننا کر پانی لانا، تو اس میں قسم اول سے بھی

٭ قسمی پتھروں سے مراد جواہرات اور موتو وغیرہ ہیں، ان پر اس لئے زکوٰۃ نہیں ہے کہ اسلام نے ان کو صرف اسباب زینت قرار دیا ہے، فرمایا ”جِلْيَةٌ تَلْبِسُونَهَا“ (۱۶) انل: ۳۵: ۱۲۰، ”زیور جن کو تم سینتے ہو“ یا یہی بعض فقہاء کے نزد یہ کہ سونے چاندی کے استعمال زیوروں پر زکوٰۃ نہیں کیا گئی ان کے نزد یہ اسbab زینت میں ہیں، اب اگر کوئی شخص ہزاروں اور لاکھوں روپے کے جواہرات جمع کر لے تو اس کی تین صورتیں ہو سکتی ہیں۔ یا تو ان پر مال تجارت کی حیثیت سے ان کی قیمت کے لحاظ سے زکوٰۃ واجب ہوگی دوسری یہ کہ کوئی بد فسیب زکوٰۃ سے بچنے کے لیے اپنی دولت کو جواہرات کی صورت میں منتقل کرتا ہے تو گوانونا اس سے زکوٰۃ وصول نہیں کی جائے گی بلکن دیانت وہ اللہ تعالیٰ کے نزد یہ محنت گنگا ہو گا اور تیری صورت یہ ہے کہ وہ محض سامان تیش اور فخر و مباراث کے لیے جمع کرتا ہے، تو اس کی حالت وہ ہو گی جو بیش تیمت بیساوں اور سامانوں کا خیرہ جمع کر لے اس کا شمار اراف میں ہو گا اور اس پر دعید ہے۔ اصل یہ ہے کہ جواہرات کی قیمت کی گرانی نقدین (یعنی سونے چاندی) کی طرح طبعی نہیں ہے، بلکہ محض فرضی ہے، نہ وہ ضروریات زندگی میں ہیں، نہ ان سے ضروریات زندگی کا مادہ یا خیری اداری معموناً کی جاتی ہے، چند دولت مندوں کی طلب اور رہنمگ نے ان کی فرضی قیمت بنارکی ہے، اگر ان جواہرات کی آب جاتی رہی یادہ ثوٹ جائیں یا ان میں بال پر جائے تو ان کی قیمت فوراً اگر جائے گی، بخلاف سونے چاندی کے کان کی قیمت کی گرانی طبعی اسbab سے ہے اور وہ ضروریات زندگی کے لیے زر مباراہ ہے، وہ بھی ثوٹ جائے یا میلائی بھی ہو جائے تو بھی اس کی قیمت بہر حال میں باقی ہے، اسی لئے وہ معیار زر ہیں۔

نصف یعنی بیسواں حصہ (۱۲۰) مقرر ہوا۔ نقدی سرمایہ جس کی ترقی، حفاظت، نشوونما اور افزائش میں انسان کو شب و روز کی سخت محنت کرنی پڑتی ہے اور جس کی افزائش کے لئے بڑے سرمایہ کی ضرورت ہوتی ہے اور جس میں ہر قدم پر چوری، گم شدگی، لوٹ اور نقصان کا اندر یہ رہتا ہے، زمین کی دوسری قسم کا بھی آدھا یعنی چالیسوائیں (۱۲۰) حصہ مقرر ہوا۔ * (جانوروں کا ذکر آگے آتا ہے)۔

زمین پیداوار اور نقد سرمایہ میں شرح زکوٰۃ کی کمی بیشی کی ایک دقیق اقتصادی علت اور بھی ہے، انسان کی اصلی ضرورت جس پر اس کا جینا تنصر ہے، صرف غذا ہے، زمین کے مالکوں کو یہ چیز برآہ راست خود اپنی محنت سے حاصل ہوتی جاتی ہے اور زندگی کی سب سے بڑی ضرورت سے وہ بے پرواہ جاتے ہیں، لیکن سونے چاندنی کے مالکوں اور تاجریوں کی جودوں کی وجہ سے اس کی زندگی کی اصلی ضرورت کے کام میں نہیں آتی، بلکہ مبادلہ اور خرید و فروخت کے ذریعہ سے وہ اس کو حاصل کرتے ہیں، وہ کاشتکاروں کی پیداوار کو خرید کر ان کو نقد روپے دیتے ہیں، جس سے ان کی دوسری ضرورتیں پوری ہوتی ہیں، پھر وہ اس پیداوار کو لے کر گاؤں گاؤں، شہر شہر، ملک بملک پھرتے ہیں اور اس کی بھی اجرت ادا کرتے ہیں، نیز جو محنت زمین کی پیداوار حاصل کرنے میں صرف ہوتی ہے اس سے بدرجہ زیادہ نقد کے حصول میں صرف کرنی پڑتی ہے۔ سونا چاندنی صدیوں کے فطری انتقالات کے بعد کہیں پیدا ہوتی ہے اور غلہ ہر سال اور سال کی ہر فصل میں انسان کی کوشش سے پیدا ہوتا ہے، اس لئے سونا چاندنی کی قیمت کا معیار غلبہ سے گراں تر ہے، ایک اور بات یہ ہے کہ کاشتکار اور زمینوں کے مالک عموماً دیہاتوں میں رہتے اور شہروں سے دور ہوتے ہیں، نیز وہ عموماً سونا چاندنی اور سکون سے بھی محروم رہتے ہیں۔ اس لئے نسبتاً وہ قومی ضروریات، دین کی مالی خدمات اور مستحقین کی امداد میں اس اتفاق یعنی اخلاقی خیرات کی گرفت سے آزاد رہتے ہیں، جن کو عموماً نقد صورت میں دولت کے مالک اور تاجر پورا کیا کرتے ہیں، اس بنا پر کمی سخت ضرورت تھی کہ ان کے لئے قانونی خیرات کی شرح اہل زمین سے مختلف رکھی جائے۔ زکوٰۃ کی شرح مقدار کی تینیں میں اس خمس والی آیت سے ایک اور نکتہ معلوم ہوتا ہے کہ خمس میں چونکہ امامت و حکومت کے تمام ذاتی و قومی مصارف شامل ہیں، اس لئے وہ کل کامیس یعنی ۱/۵ مقرر ہوا اور زکوٰۃ کے مصارف جیسا کہ سورہ توبہ کو ع۸ میں مذکور ہیں صرف آٹھ ہیں، اس بنا پر ان آٹھ مصروفوں کے لئے مجموعی رقم چالیسوائیں حصہ رکھی گئی، پھر غور کیجئے کہ سونا چاندنی کی شرح ۲۰۰ درم یا اس کے مماثل سونا ہے ان دوسو در ہمبوں کو ۵ پر تقسیم کردیجئے تو ۲۰۰ ہو جائے گا یہ کل زکوٰۃ کی شرح میں ۱/۵ اور ۱/۲۰۰ ایک دوسرے کا نصف یا ایک دوسرے کا مضاعف ہوتی چلی گئی ہیں اس سے یہ اندازہ ہو گا کہ یہ تقسیم و تجدید حساب اور اقتصادیات کے خاص اصول پر مبنی ہے۔

جانوروں پر زکوٰۃ

توراۃ میں ہر قسم کے جانوروں میں دسوائی حصہ زکوٰۃ کا تھا۔ * لیکن چونکہ ہر قسم کے جانوروں میں

* یکمہ حافظ ابن القیم نے زاد المعاوی، ج ۱، ص ۱۵۲، ۱۵۳ میں بیان کیا ہے۔ * احیا: ۲۷۔ ۳۳؛ العہد القديم، ص: ۲۰۵۔

نسل کی افزائش کی صلاحیت اور مدت افزائش (زمانہ حمل) یکساں نہیں ہوتی، نیز جانوروں میں دسویں بیسویں کا حصہ، مثاں ہر قدر اپر چیپاں نہیں ہو سکتا۔ اس لئے ان میں دسویں بیسویں کے بجائے تعداد کے تعین کی ضرورت تھی۔ شریعت محمدیہ نے اس نقص کو پورا کیا۔ چنانچہ اسی پہلے اصول (بیداری اور افزائش کی مدت کیفیت اور کیت) کی بنا پر اولاد بے نسل یا کم نسل کے جانوروں کو زکوٰۃ سے مستثنیٰ کر دیا۔ مثلاً خچر گھوڑے پر کوئی زکوٰۃ نہیں، دوسرے جانوروں کی مالیت اور قوت و کیفیت افزائش کے لحاظ سے حسب ذیل شرح معین ہوئی، یہ وہ شرح نامہ ہے، جو خود آنحضرت ﷺ نے اپنی حکمت ربانی سے فصلہ فرمائے کرٹیا اور زبانی نہیں، بلکہ فرمائیں کی صورت میں لکھوا کر عمال کو عنایت فرمایا تھا اور خلافتے راشدین نے اسی کی نقلیں حدود حکومت میں بھجوائیں اور جس کی تعمیل آج تک برابر بلا اختلاف ہوتی آئی ہے:

نام جانور	تعداد	شرح زکوٰۃ	نام جانور	تعداد	شرح زکوٰۃ
اونٹ	اونٹ سے چار تک	چھپنیں	اونٹ	۲۰ سے ۲۲ تک	چار بکریاں
اونٹ	۵ سے ۹ تک	ایک بُری	//	۲۵ سے ۳۵ تک	اونٹ کا ایک سالہ پچ
//	۱۰ سے ۱۳ تک	دو بکریاں	//	۳۶ سے ۴۵ تک	اونٹ کا دوسالہ پچ
//	۱۵ سے ۱۹ تک	تین بکریاں	//	۳۶ سے ۶۰ تک	اونٹ کا تین سالہ پچ
۱۱ سے ۱۷ تک	چار سال کا اونٹ کا پچ				
۷۶ سے ۹۰ تک	دو سال کے دو پچ				
۹۱ سے ۱۲۰ تک	تین سال کے دو پچ	گائے،	ایک سے ۲۹	پچھنیں	
۱۲۰ کے بعد ہر جالیس پر	دو سال کا ایک پچ		//	۳۰ تک	ایک دوسالہ پچھرا
اوہ ہر پچاس پر	تین سال کا ایک پچ		//	۸۰ تک	تین سال کا ایک پچھرا
بُری	ایک سے ۳۹ تک	پچھنیں		۶۰ تک	دو سال کے دو پچھرے
۱۲۰ سے ۲۰۰ تک	ایک بُری		//	۷۰ تک	ایک تین سال اور ایک دوسالہ پچھرا
۱۲۱ سے ۲۰۰ تک	دو بکریاں		//	۸۰ تک	تین سال کے دو پچھرے
۲۰۰ سے ۳۰۰ تک	تین بکریاں		//	۹۰ تک	تین سال کے تین

۱. حنفیہ کے نزدیک خیل قاتل اور تجارت کے گھوڑوں میں زکوٰۃ ہے، سواری اور جہاد کے گھوڑوں میں نہیں۔
 ۲. یعنی جس کا دوسرا سال شروع ہو۔ ۳. جس کا تیرساں شروع ہو۔

دو سال کے دور اور تین سال کا ایک سال	۱۰۰ ایکٹ	//	ایک ایک بکری	پھر ہر دس پر	
ایک دو سالہ	پھر ہر دس پر	//			

غرض اصول یہ یہے کہ ہر تیس بننے والے عدد پر ایک دو سالہ اور ہر چالیس بننے والے عدد پر ایک سہ سالہ۔
نصاب مال کی تعین

شرع زکوٰۃ کے تعین کے سلسلہ میں شرعاً سبقہ میں ایک اور کمی تھی، جس کی تکمیل محمد رسول اللہ ﷺ نے کی۔
کی شریعت نے کر دی، جن دوسری شریعتوں میں قانونی خیرات کی تعین ہے۔ ان میں امیر و غریب اور کم اور زیادہ دولت والوں کی تفہیم کی گئی تھی۔ مثلاً: اگر دس میں روپے والوں یا دس پانچ گائے اور بکری والوں سے یہ زکوٰۃ وصول کی جاتی تو ان پر ظلم ہوتا، تورات میں غله اور مویشی پر جو عشر اور نقدر پر جو آدھا مشقال مقرر کیا گیا ہے، اس میں کمالاً نہیں کیا گیا ہے۔ بلکہ آدھے مشقال کی زکوٰۃ میں تو یہاں تک کہہ دیا گیا ہے کہ ”خداؤند کے لئے نذر کرتے وقت آدھے مشقال سے امیر زیادہ نہ دے اور غریب کم نہ دے۔“ (خروج ۳۰-۱۵)

لیکن شریعت محمدی ﷺ نے اس نکتہ کو لغو نہ رکھا اور غریبوں، ناداروں، مقرضوں اور ان غلاموں کو جو سرمایہ نہیں رکھتے یا اپنی آزادی کے لئے سرمایہ جمع کر رہے ہیں، اس سے بالکل مستثنی کر دیا، نیز دولت کی کم مقدار رکھنے والوں پر بھی ان کی اپنی حسب خواہش اخلاقی خیرات کے علاوہ کوئی باقاعدہ زکوٰۃ عائد نہیں کی اور کم مقدار کی دولت کا معیار بھی اس نے خود مقرر کر دیا۔ سونے کی زکوٰۃ وہی آدھا مشقال رکھا، لیکن بتا دیا کہ یہ آدھا مشقال اسی سے لیا جائے گا جو کم از کم پانچ او قیہ یعنی میں مشقال ۲۰ سونے کا مالک ہو اور ۵۰ او قیہ یعنی ۲۰ مشقال سونے کی متوسط قیمت دوسورا ہم چاندی کے سکے ہیں یعنی ایک او قیہ چالیس درہم کے برابر ہے۔ ۵۰ دہم کم سے کم معیار دولت جس پر زکوٰۃ نہیں حسب ذیل ہے:

نام	اس تعداد سے کم پر زکوٰۃ نہیں
غلہ اور پھل	پانچ و سو ۵۰ سے کم پر زکوٰۃ نہیں
اوٹ	پانچ عدد
گائے، بیتل، بھینس	۳۰ عدد
بھیڑ، بکری	۴۰ عدد

- ۱۔ موجودہ انگریزی حساب سے میں مشقال سونا ساز ہے سات تولہ کے اور دو سورہم چاندی ۵۲ روپے تو لے کے برابر ہے۔ مگر یہ کتاب کی تصنیف کے وقت انگریزی دور کے لحاظ سے ہے اب ایک تو لیجنی انگریزی سکے تفریباً سورہ پے کے برابر ہے اس فرق کو لغو رکھا جائے۔ ۲۔ سن ابی داود، کتاب الزکرة، باب من يعطى من الصدقة وحد الغنى: ۱۶۲۸۔
۳۔ ایک و سو جھبے جس کو عادنا ایک اوٹ اٹھا سکتا ہو۔

پانچ اوقیٰ (بیس مثقال) کے کم پر زکوٰۃ نہیں	سوتا
۲۰۰ درہم سے کم پر زکوٰۃ نہیں	چاندی

اس معیار سے امیر و غریب کی سطھوں میں جو یکساں زکوٰۃ کی ناہمواری تھی، وہ دوسرے ہو گئی اور جو غریب خود زکوٰۃ کے مستحق تھے، وہ اس تویی مصوٰل سے بری ہو گئے۔ ان مذکورہ بالاشیاء کی تعداد جنسیت کے اختلاف کی وجہ سے مختلف ہے۔ مگر مالی اعتبار سے وہ ایک ہی معیار پر مبنی ہیں۔ پانچ و سنت غله، دوسرہ ۴۰۰ درہم چاندی اور پانچ اوقیٰ سونا در حقیقت ایک ہی معیار ہے۔ ایک اوقیٰ جیسا کہ معلوم ہو پکا چالیس درہم کے برابر ہے۔ اس بنا پر پانچ اوقیٰ اور دوسرہ ۴۰۰ درہم برابر ہیں۔ اسی طرح ایک و سنت غله کی قیمت اس زمانہ میں چالیس ۴۰۰ درہم یا ۲۰۰ مثقال تھی یعنی پانچ اوقیٰ اور پانچ و سنت کی قیمت وہی دوسرہ ۴۰۰ مثقال ہو گی۔

زکوٰۃ کے مصارف اور ان میں اصلاحات

حضرت موسیٰ علیہ السلام کی شریعت میں تین قسم کی زکوٰۃ تھی، ایک آدمی مثقال سونے چاندی کی یہ رقم جماعت کے خیہہ یا پھر بیت المقدس کی تعمیر و مرمت اور قربانی کے طلاقی و فقری ظروف و سامان کے بنانے میں خرچ کی جاتی تھی۔ (خرود ۳۰-۱۳) دوسری خیرات یہ تھی کہ کھیت کاٹنے اور پھل توڑتے وقت حکم تھا کہ جا بجا کنوں اور گوشوں میں کچھ دانے اور پھل چھوڑ دیئے جائیں وہ غریبوں اور مسافروں کا حصہ تھا۔ (احجارت ۱۹) ۱۰) اور سوم یہ تھی کہ ہر تیس سال کے بعد پیداوار اور جانوروں کا دسوائی حصہ خدا کے نام پر نکالا جائے، اس کے مصارف یہ تھے کہ دینے والا من اہل دعیا کے بیت المقدس جا کر جشن منانے اور کھانے اور کھلانے اور لادیوں میں، جو مورثی کا ہن اور خدا کے گھر کے خدمت گزار ہیں، نام بنا مقصیم کیا جائے (اس کے بدالے میں وہ خاندانی دراثت سے محروم رکھے گئے تھے) اس کے بعد یہ چیزیں بیت المقدس کے خزانہ میں جمع کر دی جاتی تھیں کہ ان سے مسافروں ٹیکیوں اور بیواؤں کو کھانا کھلایا جائے۔ (استثناء ۲۶-۲۹ تک)

شریعت محمد یہ نے مذهب کی حقیقت میں سب سے بڑی جو اصلاح کی:

۱۱) وہ عبادت میں خدا اور بندہ کے درمیان سے واسطوں کا حذف کرنا تھا، یہاں ہر شخص اپنا آپ امام اور کاہن ہے۔ اس بنا پر مفت خور کا ہنون اور عبادت گاہوں کے خادموں کی ضرورت ساقط ہو گئی اور اس لئے زکوٰۃ کا یہ مصرف جو قطعاً بیکار تھا مکملیتہ اڑ گیا۔

۱۲) عبادت میں سادگی پیدا کر کے ظاہری رسماں اور نمائشوں سے اس کو پاک کر دیا گیا، اس لئے سونے چاندی کے سماں، قربانی کے برتوں اور محابوں کے طلاقی شمع دانوں کی ضرورت ہی نہیں رہی۔

۱۳) حج اُن ہی پرواجب کیا گیا جن کے پاس زادراہ ہو، اس لئے ہر شخص کو خواہ مخواہ بیت اللہ جانے کی حاجت نہ رہی اور اس لئے یہ رقم بھی خارج ہو گئی۔

* هدایۃ، باب الزکوٰۃ فی التجارة، فصل فی العروض، ج ۱، ص: ۸۰۔

- ۴ زکوٰۃ کی چیز کو مالک کی ذاتی ضروریات اور کھانے میں صرف ہونے کی ممانعت کر دی گئی کہ اگر وہ مالک ہی کے ضروریات میں خرچ ہوتی تو اس میں ایثار کیا ہوا۔
- ۵ اس طرح وہ تمام سامان اور قیم جوان مدعوں سے بچیں غریبوں، مسکینوں اور مسافروں وغیرہ کو دے دی گئیں۔

گزشتہ اصلاحات کے علاوہ شریعت محمد یہ نے زکوٰۃ کے سلسلہ میں بعض اور اصلاحیں بھی کی ہیں مثلاً:

- ۶ شریعت سابقہ میں ایک بڑی تیکی یہ تھی کہ زکوٰۃ خود مستحقین کے حوالہ نہیں کی جاتی تھی۔ بلکہ ذخیرہ میں جمع ہو کر اس کا کھانا پک کر غرباً میں تقسیم ہوتا تھا، لیکن عام انسانی ضرورتیں صرف کھانے تک محدود نہیں ہیں۔ اس لئے شریعت محمد یہ نے اس رسم میں یہ اصلاح کی کہ غلہ یا رقم خود مستحقین کو دے دی جائے، تاکہ وہ جس طرح چاہیں اپنی ضروریات میں صرف کریں۔

- ۷ ایک بڑی کی یہ تھی کہ نقد زکوٰۃ جو آدھے مقابل والی تھی، وہ بیت المقدس کے خرچ کیلئے مخصوص تھی، اس کے علاوہ کوئی دوسری نقد زکوٰۃ نہ تھی۔ شریعت محمد یہ نے میں مقابل پر آدھا مقابل نقد زکوٰۃ فرض کر کے اس کو بھی تمام ترمذیتین کے ہاتھوں میں دے دیا۔

- ۸ غلہ کی صورت یہ تھی کہ سارے کاسارا بیت المقدس چلا جاتا تھا اور وہیں سے وہ پکوا کر تقسیم کیا جاتا تھا۔ یہ انتظام بنی اسرائیل کی ایک چھوٹی سی قوم کے لئے تو شاید موزوں ہو سکتا ہو، مگر ایک عالمگیر مذہب کے تمام عالم میں منتشر پیروؤں کے لئے یہ بالکل ناممکن تھا، اس لئے مناسب سمجھا گیا کہ ہر جگہ کی زکوٰۃ اسی مقام کے مستحقین میں صرف کی جائے۔

- ۹ بعض منافقین اور دیہاتی بدؤوں کی یہ حالت تھی کہ وہ اس قسم کے صدقات کی لاٹی کرتے تھے۔ جب تک ان کو ادا ملتی رہتی خوش اور مطمئن رہتے اور جب نہ ملتی تو طعن وطنز کرنے لگتے۔ اسلام نے ایسے لوگوں کا منہ بند کرنے اور ان کی مفت خوری کی عادت بدکی اصلاح کے لئے زکوٰۃ کے جملہ مصارف کی تعین کر دی اور بتا دیا کہ اس کے مستحق کون لوگ ہیں اور اس رقم سے کس کس کو مدد دی جاسکتی ہے۔ چنانچہ سورہ توبہ کے ساتوں روئے میں اس کا مفصل ذکر ہے۔

- ۱۰ اگر زکوٰۃ کے مصارف کی تعین نہ کی جاتی اور اس کے مستحقین کے اوصاف نہ بتاویے جاتے تو یہ تمام سرمایہ خلفاً اور سلاطین کے ہاتھوں میں کھلونا بن جاتا اور سلطنت کی دوسری آمد نیوں کی طرح یہ بھی ان کے عیش و عشرت کے پر تکلف سامانوں کے نذر ہو جاتا، اس لئے تاکید کر دی گئی کہ جو غیر مستحق اس کو لے لے گا، اس کے لئے یہ حرام ہے اور جو شخص کسی غیر مستحق کو اپنی زکوٰۃ چان بوجھ کر دے گا تو اس کی زکوٰۃ ادا نہ ہوگی، اسی بندش کا نتیجہ یہ ہے کہ مسلمانوں میں زکوٰۃ تابامکان اب تک صحیح مصارف میں خرچ ہوتی ہے۔

۱۱۱ اس قسم کی مالی رقم جب کوئی اپنے پیروؤں پر عائد کرتا ہے تو اس کی نہایت قوی بدگمانی ہو سکتی ہے کہ وہ اس طرح اپنے اور اپنے خاندان کے لئے ایک داعی آمدی کا سلسلہ پیدا کرنا چاہتا ہے۔ حضرت موسیٰ کی شریعت میں زکوٰۃ کا سُقْعَۃ حضرت ہارون اور ان کی اولاد (بنو لادی) کو تھبیر ایا گیا تھا کہ وہ خاندانی کا ہن مقرر ہوئے تھے۔ مگر آنحضرت ﷺ نے اس قسم کی بدگمانیوں کا بیشہ کے لئے خاتمہ کر دیا اور اپنے خاندان کے لئے قیامت تک زکوٰۃ کی ہر مقدار قطعی طور پر حرام قرار دی۔

۱۱۲ قرآن مجید میں زکوٰۃ کے آٹھ مصارف قرار دیے گئے:

﴿إِنَّمَا الصَّدَقَاتُ لِلْفُقَرَاءِ وَالْمَسْكِينِ وَالْعِيلِينَ عَيْنَهَا وَالْمُؤْلَفَةُ قُلُوبُهُمْ وَفِي الْيَقَابِ وَالْغَرِيمِينَ وَفِي سَبِيلِ اللَّهِ وَابْنِ السَّبِيلِ طَرِيقَةً مِنَ اللَّهِ وَاللَّهُ عَلَيْهِ حَلِيمٌ﴾

(التوبہ: ۶۰)

”زکوٰۃ کا مال تو غریبوں مسکینوں اور زکوٰۃ کے صیغہ میں کام کرنے والوں اور ان لوگوں کے لئے ہے جن کے دلوں کو اسلام کی طرف ملتا ہے اور گردن چھڑانے میں جوتا و ان بھریں، ان میں اور خدا کی راہ میں اور مسافر کے بارہ میں یہ خدا کی طرف سے تھبیر ایا ہوا ہے اور خدا جانتے والا اور حکمت والا ہے۔ (اس لئے اس کی تقسیم علم و حکمت پر منی ہے)۔“

فقراء میں ان خوددار اور مستور الحال شرفا، کو ترجیح دی ہے جو دین اور مسلمانوں کے کسی کام میں مصروف ہونے کی وجہ سے کوئی نوکری چاکری یا بیو پارہ نہیں کر سکتے اور حاجت مند ہونے کے باوجود کسی کے آگے ہاتھ نہیں پھیلاتے اور اپنی آبرو اور خودداری کو ہر حال میں قائم رکھتے ہیں، چنانچہ فرمایا:

﴿لِلْفُقَرَاءِ الَّذِينَ أُخْرِجُوا فِي سَبِيلِ اللَّهِ لَا يَسْتَطِعُونَ ضَرِيًّا فِي الْأَرْضِ يَحْسَبُهُمْ

الْجَاهِلُونَ أَغْنِيَاءَ مِنَ التَّعْفُفِ تَعْرِفُهُمْ بِسِيمَهُمْ لَا يَسْكُنُونَ النَّاسَ إِلَيْهَا مَاطِ﴾ (۳۷۳: البقرۃ)

”ان مغلسوں کو دینا ہے جو اللہ کی راہ میں اٹک رہے ہیں اور زمین میں (روزی حاصل کرنے کے لئے) چل پھر نہیں سکتے، ناواقف ان کے نامانگنے کی وجہ سے ان کو بے احتیاج سمجھتے ہیں، تم ان کو ان کے چہرہ سے بیچانے ہو کر وہ حاجتمند ہیں وہ لوگوں سے لپٹ کر نہیں مانگتے۔“

تمام مستحقین کو درجہ بدرجہ ان کی اہمیت اور اپنے تعلق کے لحاظ سے دیتا چاہیے، چنانچہ اسی سورہ میں فرمایا:

﴿وَأَنَّ الْمَالَ عَلَى حُسْنِهِ ذَوِي الْقُرْبَى وَالْيَتَامَى وَالْمَسْكِينِ وَابْنَ الشَّبِيلِ وَالسَّاَلِيْلُ وَفِي

الْيَقَابِ﴾ (۲/ البقرۃ: ۱۷۷)

”اور جس نے خدا کی محبت پر (یا مال کی محبت کے باوجود) قرابت مندوں، قیمتوں، مسکینوں، مسافروں، مانگنے والوں اور (علاموں یا مقرر دھوں کی) گردن چھڑانے میں مال دیا۔“

اس کے تین چار رکوع کے بعد ہے۔

﴿قُلْ مَا أَنْفَقْتُمْ فِينَ خَيْرٍ فَلِلّٰهِ الْدُّنْيَا وَالآخِرَةِ وَالْيَمِينِ وَالْمَسْكِنِ وَأَبْنِ السَّبِيلِ ﴾

(۲۱۵/۲) البقرہ

”کہو جو تم مال خرچ کرو، وہ اپنے ماں باپ، رشتہ داروں، تیمور، مسکینوں اور مسافروں کے لئے۔“

ضرورت مندوں میں ترجیح

اسلام سے پہلے عام طور پر یہ سمجھا جاتا تھا کہ قرابت مندوں اور رشتہ داروں کے دینے سے انجمنی بیگانہ اور بے تعلق لوگوں کو دینا زیادہ ثواب کا کام ہے اور اس کی وجہ یہ سمجھی جاتی تھی کہ اپنے لوگوں کے دینے میں کچھ نہ کچھ نفسانیت کا اور ایک حیثیت سے خود غرضی کا شایدہ ہوتا ہے، کیوں کہ وہ اپنے ہی رشتہ دار ہیں اور ان کا نفع و نقصان اپنا ہی نفع و نقصان ہے۔ لیکن درحقیقت یہ ایک قسم کا اخلاقی مخالفہ اور فریب تھا۔ ایک انسان پر دوسرے انسان کے جو حقوق ہیں، وہ تمام تر تعلقات کی کمی و بیشی پر مبنی ہیں۔ جو جتنا قریب ہے اتنا ہی زیادہ آپ کے حقوق اس پر اور اس کے حقوق آپ پر ہیں، اگر یہ نہ ہو تو رشتہ داری اور قرابت مندی کے فطری تعلقات بالکل لغو اور مہمل ہو جائیں، انسان پر سب سے پہلے اس کا اپنا حق ہے۔ پھر اہل و عیال کا، ان کے جائز حقوق ادا کرنے کے بعد اگر سال میں کچھ فرق رہے تو اس میں حصہ پانے کے سب سے زیادہ مستحق قرابت دار ہیں۔ چنانچہ دراثت اور ترکی قسمیں میں اس اصول کی رعایت کی گئی ہے۔

یہ سمجھنا بھی کہ اگر قرابت داروں کو ترجیح دی جائے تو دوسرے غریبوں کا حق کون ادا کرے گا، ایک قسم کا مخالفہ ہے، دنیا میں ہر انسان کسی کا رشتہ دار ضرور ہے، اس بناء پر اگر ہر شخص اپنے رشتہ داروں کی خبر گیری کرے تو کل انسانوں کی خبر گیری ہو جائے گی، اس کے علاوہ اس مقام پر ایک اور غلط فہمی بھی ہے، جس کو دور ہو جانا چاہیے، مستحقین میں باہم ایک کو دوسرے پر جو فویت ہے، اس کا مدار و چیزوں پر ہے، ایک تو دینے والوں سے ان اشخاص کے قرب و بعد کی نسبت، دوسرے ان اشخاص کو حاجتوں اور ضرورتوں کی کمی و بیشی، قرابت مندوں کی ترجیح کے یہ معنی نہیں ہیں کہ خواہ ان کی ضرورت لکھنی ہی کم اور معمولی ہوان کو ان لوگوں پر ترجیح ہے جن کی ضرورت اور حاجتمندی ان سے کہیں زیادہ ہے، بلکہ مسئلہ کی صورت یہ ہے کہ اگر دو ضرورت مند برابر کے حاجت مند ہوں اور ان میں سے ایک آپ کا عزیز یادوست یا ہمسایہ ہو تو وہ آپ کی امداد کا زیادہ مستحق ہو گا۔ یعنی ضرورت اور حاجت کی مساوات کے بعد تعلقات کی کمی و بیشی ترجیح کا دوسرا سبب بنے گی نہ کہ پہلا سبب؟ اور یہ انسان کی فطرت ہے کہ ایسی حالت میں وہ اپنے عزیزوں اور دوستوں کو ترجیح دے۔ فقر اور مسکین میں سے ان لوگوں پر جو بے حیائی کے ساتھ در بذریعہ مانگتے پھرتے ہیں، ان کو ترجیح دی گئی ہے جو

نقووفا قہ کی تکلیف گوا رکرتے ہیں، لیکن اپنی عزت و آبرو اور خوداری کو ہاتھ سے نہیں جانے دیتے اور لوگوں کے سامنے ہاتھ نہیں پھیلاتے ہیں۔ یہ تعلیم خود قرآن پاک نے دی ہے۔ جیسا کہ اوپر بیان ہوا یہز آنحضرت ﷺ نے بھی اس کی تاکید فرمائی ہے، آپ ﷺ نے فرمایا: ”مسکین وہ نہیں ہے جس کو ایک دو لقے در بدر پھرایا کرتے ہیں۔“ صحابہ رضی اللہ عنہم نے دریافت کیا پھر کون مسکین ہے؟ ارشاد ہوا: ”وَهُجُسُكُو حاجَةٌ“ ہے لیکن اس کا پتہ نہیں چلتا اور وہ کسی سے مانگتا نہیں۔ ﴿۱﴾ اس تعلیم کے دو مقصد ہیں، ایک تو یہ کہ ان بھیک مانگنے والوں کو تو کوئی نہ کوئی دے ہی دے گا اور وہ کہیں نہ کہیں سے پاہی جائیں گے، اس لئے ان کی طرف اس قدر اعتنا ضروری نہیں، اصلی توجہ ان مستور الحال مسکینوں کی طرف ہونی چاہیے جو صبر و قاعات کے ساتھ فقر و فاقہ کی تکلیف برداشت کر رہے ہیں کہ ان کی خبر اکثریت نہیں ہو سکتی اور اکثر وہ امداد سے محروم رہ جاتے ہیں دوسرا مقصد یہ ہے کہ شریعت اپنی تعلیم اور عمل سے یہ ثابت کر دے کہ بے حیا گدا اگروں کی عزت اس کی نگاہ میں نہایت کم ہے اور وہ ہر حال میں اس بے حیا کی کو ناپسند کرتی ہے۔ شریعت نے مصارف زکوٰۃ کی تعین و تحديد اس غرض سے بھی کی ہے، تاکہ ہر شخص کو مانگنے کی بہت نہ ہو اور ہر کس و ناکس اس کو اپنی آمدنی کا ایک آسان ذریعہ نہ سمجھ لے۔ جیسا کہ بعض منافقین اور اہل بادیہ نے اس کو اپنے ایمان و اسلام کی قیمت سمجھ رکھا تھا۔ چنانچہ وحی الٰہی نے ان کی پردهہ دری ان الفاظ میں کی:

﴿وَمِنْهُمْ مَنْ يَكْلِمُكَ فِي الصَّدَقَاتِ إِنَّ أَعْطُهُو مِنْهَا رَصْوًا وَإِنَّ لَمْ يُعْطُهُو مِنْهَا إِذَا هُمْ يَسْخَطُونَ وَلَوْأَنَّهُمْ رَصْوًا مَا أَنْتُمْ اللَّهُ وَرَسُولُهُ لَا وَقَالُوا حَسْبُنَا اللَّهُ سَيُؤْتِنَا اللَّهُ مِنْ فَضْلِهِ وَرَسُولُهُ إِنَّا إِلَى اللَّهِ رَغُبُونَ إِنَّمَا الصَّدَقَاتُ لِفَقَرَاءِ الْمُسْكِنِينَ وَالْعَمِلِينَ عَلَيْهَا وَالْمُؤْلَفَةِ قُلُوبُهُمْ وَفِي الرِّقَابِ وَالْغُرَمِينَ وَفِي سَيِّلِ اللَّهِ وَابْنِ السَّيِّدِ فَرِيقَةٌ قِنَ الظِّلِّ﴾ (النور: ٩/ ٦٠ - ٥٨)

”اور بعض ان میں سے ایسے ہیں جو تجوہ کو (پیغمبر کو) زکوٰۃ بانٹنے میں طعن دیتے ہیں، اگر ان کو اس میں سے ملے تو راضی ہوں اور اگر نہ ملے تو وہ ناخوش ہو جائیں اور کیا خوب تھا اگروہ اس پر راضی رہتے جو خدا اور اس کے رسول نے ان کو دیا اور کہتے کہ: ”کم کو اللہ بس ہے، ان کو اللہ اپنی مہربانی سے اور اس کا رسول دیں گے، ہم کو تو خدا ہی چاہیے، زکوٰۃ تو حق ہے غریبوں کا، مسکینوں کا اور اس کا کام کرنے والوں کا اور ان کا جن کا دل (اسلام کی طرف) پر چانا ہے اور گردن چھڑانے میں اور خدا کی راہ میں اور مسافر میں، یہ ہستے خدا کی طرف سے ٹھہرائے ہوئے ہیں۔“

ایک دفعہ ایک شخص نے آنحضرت ﷺ سے زکوٰۃ کے مال میں سے کچھ پانے کی درخواست کی۔ آپ ﷺ نے فرمایا: ”اے شخص! اللہ تعالیٰ نے مالی زکوٰۃ کی تقسیم میں کسی انسان کو بلکہ پیغمبر تک کوئی اختیار

﴿صحيح مسلم، كتاب الزكوة، باب المسكينين الذي لا يجد غنى ولا يفطر له فيتصدق عليه: ٢٣٩٤، ٢٣٩٣﴾

نہیں دیا ہے۔ بلکہ اس کی تقسیم خود اپنے ہاتھ میں رکھی ہے اور اس کے آٹھ مصروف بیان کردیے ہیں، اگر تم ان آٹھ میں سے ہوتو میں تم کو دے سکتا ہوں۔*

اسلام میں زکوٰۃ کے مصارف ہشتگانہ

یہ آٹھوں مصارف نیکی، بھلائی اور خیر و فلاح کی ہر قسم اور ہر صنف کو محیط ہیں نقرہ اور ماسکین میں وہ تمام اہل حاجت داخل ہیں جو اپنی محنت کو کوشش سے اپنی روزی کمانے کی صلاحیت نہیں رکھتے، جیسے بوڑھے، یہاں، اندھے، لوئے، لنگرے، مقلوچ، کوڑھی، یادہ محنت کر سکتے ہیں، لیکن موجودہ حالت میں دین و ملت کی کسی ایسی ضروری خدمت میں مصروف ہیں کہ وہ اپنی روزی کمانے کی فرصة نہیں پاتے، جیسے مبلغین، مذہبی بالغ طالب اعلم جو «لِلْفُقَارَاءِ وَاللَّذِينَ أُحْصِرُوا فِي سَيِّئِ اللَّهِ لَا يَسْتَطِعُونَ ضَرَبًا فِي الْأَرْضِ» (۲/ البقرة: ۲۷۳) میں اسی طرح داخل ہیں، جس طرح آنحضرت ﷺ کے زمانہ مبارک میں اصحاب صفت داخل تھے اور وہ کم نصیب بھی داخل ہیں جو اپنی پوری محنت اور کوشش کے باوجود اپنی روزی کا سامان پیدا کرنے سے اب تک قاصر رہے ہیں اور فاقہ کرتے ہیں۔ «وَالْعَامِلِينَ عَلَيْهَا» (یعنی امام کی طرف سے صدقہ کی تحریص وصول کا کام کرنے والے بھی اس میں سے اپنے کام کی اجرت پا سکتے ہیں اور «وَالْمُؤْلَفَةُ قُلُوبُهُمْ» (یعنی جن کی تالیف قلوب کی جائے) میں وہ لوگ داخل ہیں جن کو ابھی اسلام کی طرف شامل کرنا ہے یا جن کو اسلام پر مضبوط کرنا ہے «وَفِي الرِّقَابِ» (گردن کے چھڑانے میں) اس سے مقصود وہ غلام ہیں، جن کی گرد نہیں دوسروں کے قبضہ میں ہیں اور ان کو خرید کر آزاد کرنا ہے اور وہ مقروض ہیں جو اپنا قرض آپ کسی طرح اوپر نہیں کر سکتے، «وَالْغَارِمِينَ» (تاوان اٹھانے والوں) سے مراد وہ نیک لوگ ہیں، جنہوں نے دوسرے لوگوں اور قبیلوں میں مصالحت کرنے کے لئے کسی مالی ضمانت کی ذمہ داری اپنے اوپر لے لی ہے، یہ مالی ضمانت ایک قومی نظام کی حیثیت سے زکوٰۃ کے بہت المال سے ادا کی جاسکتی ہے۔ «وَفِي سَيِّئِ اللَّهِ» (خدا کی راہ میں) ایک وسیع فہم ہے جو ہر قسم کے نیک کاموں کو شامل ہے۔* اور حسب ضرورت بھی اس سے مذہبی لڑائی یا سفر ج یا اور دوسرے نیک کام مراد لئے جاسکتے ہیں اور «وَأَبْنِ السَّيِّئِ» (مسافر میں) اس میں مسافروں کی ذاتی مدد کے علاوہ مسافروں کی راحت رسانی کے سامان کی تیاری مثلاً: راستوں کی درستی، پلوں اور مسافر خانوں کی تعمیر بھی داخل ہو سکتی ہے۔* یہ ہیں زکوٰۃ کے وہ آٹھ مقررہ مصارف جن میں اسلام نے اس قومی و مذہبی رقم

* ابو داؤد، و کتاب الزکوٰۃ باب من يعطى من الصدقة وحد الغنى: ۱۶۳۰۔ * اکثر ثقابی نے نبی ﷺ سے مراد صرف جہاد یا ہے، مگر یہ صحیح نہیں معلوم ہوتی، آیت گز بیکیل (لِلْفُقَارَاءِ وَاللَّذِينَ أُحْصِرُوا فِي سَيِّئِ اللَّهِ) بیان فی نبی ﷺ سے بالاتفاق صرف جہادی نہیں بلکہ ہر تسلی اور دینی کام مراد ہے، اکثر ثقابی نے یہ بھی کہا ہے کہ زکوٰۃ میں تملیک یعنی کسی شخص کی ذاتی ملکیت ہاتھا ضروری ہے، مگر ان کا استدلال جو للفقراء کے لام تملیک پر ہے، بہت کچھ مشتبہ ہے، وہ کتابے کلام اتفاق ہو جیسے «لَحَقَ لِكُمْ مَا فِي الْأَرْضِ حَمِيعًا»

* کتاب الخراج فاضی ابو یوسف فصل فی الصدقات باب فی النقصان والزيادة والضياع، ص: ۴۶۔

کو خرچ کرنے کی تاکید کی ہے۔
مسکینوں، فقیروں اور معدنوں کی امداد

زکوٰۃ کا سب سے اہم مصرف یہ ہے کہ اس سے لفڑے، لوئے، اندھے، بوڑھے، کوڑھی مفلوج اور دوسرے معدنوں کی امداد کی جائے۔ نادار، تینیوں، بیواؤں اور ان لوگوں کی خبر گیری کی جائے جو اپنی کوشش اور جد و جہد کے باوجود روزی کا سامان نہیں کر پاتے یہ زکوٰۃ کا وہ مصرف ہے جو تقریباً ہر قوم میں اور ہر مذہب میں ضروری خیال کیا گیا ہے اور ان مستحقین کی یہ قابل افسوس حالت خود کسی مزید تشریع کی محتاج نہیں۔ لیکن اسلام نے ان کے علاوہ زکوٰۃ کے چند اور ایسے مصارف مقرر کئے ہیں، جن کی اہمیت کو خاص طور سے صرف اسلام ہی نے محسوس کیا ہے۔

غلامی کا انسداد

غلامی انسان کے قدیم تمدن کی سب سے بوجھل زنجیر تھی، یہ زنجیر انسانیت کی نازک گردن سے صرف اسلام نے کاٹ کر الگ کی، غلاموں کے آزاد کرنے کے فضائل بتائے، ان کے ساتھ تینی، احسان اور حسن سلوک کی تاکید کی اور ان سب سے بڑھ کر یہ کہ زکوٰۃ کی آمدی کا ایک خاص حصہ اس کے لئے نامزد فرمایا کہ اس سے غلاموں کو خرپکڑا زاد کیا جائے، لیکن چونکہ غلاموں کو آزاد کرنے کی پوری قیمت یا اس کی آزادی کا پورا زردی یہ ہر ایک شخص برداشت نہیں کر سکتا تھا۔ اس لئے زکوٰۃ کی مجموعی رقم سے اجتماعی طور سے اس فرض کو ادا کرنے کی صورت تجویز کی، انسانوں کے اس درماندہ طبقہ پر یا تابعاً عظیم الشان احسان کیا گیا ہے کہ جس کی نظریہ دنیا کے محسینین کی فہرست میں نظر نہیں آ سکتی۔ پیغمبر اسلام علیہ السلام کی شریعت نے صرف اس لئے کہ انسانوں کے اس واجب الرحم فرقہ کو اپنی کھوئی ہوئی آزادی واپس ملے، اپنی امت پر ایک دائیٰ رقم واجب نہ ہرا دی کہ اس کے ذریعے سے نیکی کے اس سلسلہ کو اس وقت تک قائم رکھا جائے جب تک دنیا کے تمام غلام آزاد نہ ہو جائیں یا اس سرمکا دنیا کی تمام قوموں سے خاتمه نہ ہو جائے۔

مسافر

گزشتہ زمان میں سفر کی مشکلات اور دقتون کو پیش نظر رکھ کر یہ آسانی سمجھ میں آ سکتا ہے کہ مسافروں کی امداد اور ان کے لئے سفر کے وسائل و ذرائع کی آسانی کی کتنی ضرورت تھی۔ صحر اور بیان، جنگل اور میدان، آبادی اور ویرانی ہر جگہ آنے جانے والوں کا تاثنا لگا رہتا تھا اور اب تک یہ سلسلہ قائم ہے، یہ وہ ہیں جو اپنے اہل و عیال، عزیز وقارب، دوست و احباب، مال و دولت سے الگ ہو کر اتفاقات اور حوادث کے سیلاں سے بہرہ کر کہاں سے کہاں تکل جاتے ہیں، ان کے پاس کھانے کے لئے کھانا، پینے کے لئے پانی، سونے کے لئے بستر، اوڑھنے کے لئے چادر نہیں ہوتی اور یہ حالت ہر انسان کو کسی نہ کسی وقت پیش آ جاتی ہے۔ اس لئے

ضرورت تھی کہ ان کے آرام و آسائش کا سامان کیا جائے، اسی اصول پر سرائیں، کنوئیں، مسافرخانے پہلے بھی بنوئے جاتے تھے اور اب بھی بنوئے جاتے ہیں۔ آپ کہہ سکتے ہیں کہ اب اس اٹیم اور بجلی کے عہد میں یہ تمام مشکلیں افسانہ کہن اور داستان پار یہ ہو گئی ہیں، اب ہر جگہ اچھے سے اچھے ہوٹل، تیز سے تیز سواریاں، بڑے سے بڑے بناں اور آمد و رفت کا سامان کرنے والی کمپنیاں قائم ہو گئی ہیں اور سفر و حضر میں کوئی فرق نہیں رہا ہے۔ مگر غور تکچھے تو معلوم ہو گا کہ جو کچھ ہوا ہے یہ صرف دولتمندوں اور سرمایہ داروں کی راحت و آسائش کے لئے ہوا اور ان کے ان نئے طریقوں نے پرانے طریقوں کے پرانے آثار کو حرف ناطق کی طرح منا دیا ہے۔ آج متعدد دنیا کے بڑے سے بڑے پر رونق شہروں سے لے کر معمولی دیہاتوں تک میں جہاں امیر اور دولتمند مسافروں کے لئے قدم قدم پر ہوٹل، ریسٹوران، قبوہ خانے اور آرام خانے موجود ہیں، وہاں اس پورے میکی ملک میں حضرت مسیح کی طرح ایک غریب مسافر کے لئے کہیں سر رکھنے کی جگہ نہیں۔ کسی کی حیب میں جب تک کسی بناک کا نوٹ اور چیک نہیں اس کے لئے ہوٹلوں اور اقامت خانوں کے تمام دروازے بند ہیں۔ کیا یہ انسانیت کے لئے رحم ہے؟ کیا یہ بی نوع انسان کے ساتھ ہمدردی ہے؟ لیکن ان تمام ملکوں کے طوں و عرض میں جو محمد رسول اللہ ﷺ کے غلاموں کے قبضہ میں آئے سراؤں، مسافرخانوں، کنوؤں اور مہمان خانوں کا وہ وسیع سلسلہ قائم ہو گیا کہ ایک غریب مسلمان اچھیں کے کنارہ سے چل کر کاشغر کے ایک گاؤں میں بآرام و آسائش پہنچ جاتا تھا اور ہندوستان کے اس سرے سے روم کے اس سرے تک اہلہ باہل واو طاناً باو طانِ کہتا ہوا بے خطر چلا جاتا تھا اور آج بھی اس نظام کی بدولت ان اسلامی ملکوں میں جو ابھی یورپ کے سرمایہ دارانہ طور و طریق سے واقف نہیں ہیں۔ غریب مسافروں کو وہی آرام و آسائش حاصل ہے اور امراء اور دولتمندوں کے لئے کیا کہنا کہ ایک پرانے جہاں گرد سیاح بزرگ (سعدی) کے مقولہ کے مطابق منعم بکوہ و دشت و بیابان غریب نیست بہر جا کہ رفت خیمه زدو بارگاہ ساخت جماعتی کاموں کے اخراجات

جب تک منتشر افراد ایک شیرازہ میں نہیں بندھ جاتے، حقیقت میں جماعت کا وجود نہیں ہوتا، لیکن جماعت کے وجود کے ساتھ ہی افراد کی طرح جماعت کو بھی ضروریات پیش آتی ہیں، جماعت کے کمزوروں، معدوروں اور مفلسوں کی مدد جماعت اور اس کے اصول کی حفاظت کے لئے سفر و شانہ مجاہدہ کی صورت میں اس کے اخراجات کی کفالت، جماعت کی آمد و رفت اور سفر کے وسائل کی ترقی و تغیر، جماعت کی خاطر جماعت کے مالی نقصان اٹھانے والوں اور مقرضوں کی امداد کرنا، جماعت کے ان کارکنوں کو معاوضہ دینا جو جماعت کی مذہبی، علمی، تعلیمی، خدمات، بجالا میں اور اس رقم کی فراہمی اور نظم و نسق کے فرائض انجام دیں، زکوٰۃ اسی نظام جماعت کا سرمایہ دولت ہے۔

زکوٰۃ کے مقاصد، فوائد اور اصلاحات

زکوٰۃ کا اصلی اور مرکزی مقصد وہ ہے جو خود لفظ ”زکوٰۃ“ کے اندر ہے، زکوٰۃ کے لفظی معنی پاکی اور صفائی کے ہیں، یعنی گناہ اور دوسرا روحاںی قلبی اور اخلاقی برائیوں سے پاک و صاف ہونا، قرآن پاک میں یہ لفظ اسی معنی میں بار بار آیا ہے۔ سورہ واثقۃ میں ہے:

﴿قَذْ أَفْلَحَ مَنْ رَكِّهَا وَقَذْ حَابَ مَنْ دَشَّهَا﴾ (۹۱/الشمس: ۹-۱۰)

”مراد پایا وہ جس نے اپنے نفس کو پاک و صاف کیا اور نامراد ہوا وہ جس نے اس کو میلا اور گندہ کیا۔“

ایک اور سورہ میں ہے:

﴿قَذْ أَفْلَحَ مَنْ تَزَكَّ﴾ (۸۷/الاعلی: ۱۴)

”مراد پایا وہ جو پاک و صاف ہوا۔“

یہ تزکیہ اور پاکی و صفائی بوت کی ان تین عظیم الشان خصوصیتوں میں سے ایک ہے، جن کا ذکر قرآن پاک کی تین چار آیتوں میں آیا ہے:

﴿يَتَّلَوُ عَلَيْهِمَا لِيَتَكَ وَيَعْلَمُهُمُ الْكِتَبَ وَالْحِكْمَةَ﴾

(۲/البقرة: ۶۲ و ۱۲۹ / الجمعة: ۲)

”وَهُنَّى خدا کی آیتیں پڑھ کر ان کو سنا تا ہے اور ان کو گناہوں سے پاک و صاف کرتا ہے اور ان کو کتاب اور حکمت کی باتیں سمجھاتا ہے۔“

تزکیہ نفس

ان آیتوں سے اندازہ ہو گا کہ زکوٰۃ اور تزکیہ یعنی پاکی و صفائی کی اہمیت اسلام اور شریعت محمدی علیہ السلام میں کتنی ہے؟ یہ دل کی پاکی، روح کی صفائی اور نفس کی طہارت نہ ہب کی اصل غایت اور نبوتوں کا اصل مقصد ہے۔ انسانوں کی روحاںی و نفسانی بیماریوں کے بڑے حصہ کا سبب تو خدا سے خوف و رجاء اور تعلق و محبت کا نہ ہونا ہے اور اس کی اصلاح نماز سے ہوتی ہے۔ لیکن دوسرا بڑا سبب غیر اللہ کی محبت اور مال و دولت اور دیگر اسباب دنیا سے دل کا تعلق ہے۔ زکوٰۃ اسی دوسری بیماری کا علاج ہے، غزوہ جوک کے موقع پر جب بعض صحابہ رضی اللہ عنہم سے باغ و بستان کی محبت کے سبب سے، جوان کی دولت تھی، غزوہ میں عدم شرکت کا جرم ثابت ہوا ہے اور پھر ان کی صداقت اور سچائی کے باعث خدا نے ان کو معاف کیا ہے، وہاں محمد رسول اللہ علیہ السلام کو خطاب کر کے قرآن پاک میں ارشاد ہے:

﴿خُذْ مِنْ أَمْوَالِهِمْ صَدَقَةً تُطَهِّرُهُمْ وَتُزَكِّيَهُمْ بِهَا﴾ (۹/التوبہ: ۱۰۳)

”ان کے مالوں میں سے زکوٰۃ لے کر ان کو پاک و صاف بناء۔“

اس آیت سے ثابت ہوا کہ اپنے محبوب مال میں سے کچھ نہ کچھ خدا کی راہ میں دیتے رہنے سے انسانی نفس کے آئینہ کا سب سے بڑا نگہ جس کا نام محبت مال ہے، دل سے دور ہو جاتا ہے، بغل کی یماری کا اس سے علاج ہو جاتا ہے۔ مال کی حرص بھی کم ہو جاتی ہے۔ دوسروں کے ساتھ ہمدردی کرنے کا جذبہ ابھرتا ہے۔ شخصی خود غرضی کی بجائے جماعتی اغراض کے لئے اپنے اوپر ایسا کرنا انسان سیکھتا ہے اور یہی وہ دیواریں ہیں، جن پر تہذیب نفس اور حسن خلق کی عمارت قائم اور جماعتی زندگی کا نظام ہے۔

قرآن مجید میں سود اور صدقہ میں جو حمد فاصل قرار دی گئی ہے، وہ یہ ہے:

﴿يَعْلَمُ اللَّهُ الرِّبُّوْلَا وَيُؤْمِنُ الْصَّدَقَةُ ﴾ (۲۷۶) / البقرة: ۲)

”خدا سود کو کھناتا اور صدقہ کو بڑھاتا ہے۔“

لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ درحقیقت سود میں نقصان اور صدقہ کے مال میں اضافہ ہوتا ہے، کیوں کہ مشاہدہ بالکل برکت ہے۔ بلکہ اخروی ثواب و گناہ اور برکت و بے برکتی کے فرق کے علاوہ اصلی مقصد اس سے یہ ہے کہ سود گو شخصی دولت میں اضافہ کرتا ہے۔ لیکن جماعتی دولت کو برپا کر دیتا ہے۔ جس سے پوری قوم مفلس ہو جاتی ہے اور آخروہ شخص بھی بتاہ ہو جاتا ہے اور قومی صدقہ و عطاء قوم کے نہ کمانے والے افراد کی امداد ہو کر قومی دولت کا معمول نظام باقی رہتا ہے اور ساری قوم خوشی اور برکت کی زندگی برکرتی ہے۔ اگر سود لینے والا کبھی اتفاقی مالی خطرہ میں پڑ جاتا ہے تو اس کی مدد کے لئے جماعت ایک انگلی تک نہیں ہلاتی۔ لیکن صدقہ دینے والے کی امداد کے لئے پوری قوم کھڑی ہو جاتی ہے۔ ایک اور بات یہ ہے کہ سود خوار اس قدر حریص اور طماع ہو جاتے ہیں کہ ان کو مال کی کثیر مقدار بھی کم نظر آتی ہے اور جو لوگ صدقہ اور زکوٰۃ دینے کے خواگر ہوتے ہیں وہ اس قدر مستغنى اور قافع ہو جاتے ہیں کہ ان کے لئے تھوڑا مال بھی کافی ہوتا ہے۔ سود خوار اپنے مال کے اضافہ اور ترقی کی حرص میں اتنا آگے بڑھ جاتا ہے کہ جس توار سے دوسروں کو قتل کر کے اس کی دولت پر قبضہ کرتا ہے۔ آخر اسی توار سے دوسرا اس کو قتل کر کے اس کے تمام اصل و منافع پر بیک و فرع قبضہ کر لیتا ہے۔ لیکن صدقہ و خیرات دینے والا جو دوسروں کی دولت ناجائز طریق سے نہیں لوٹتا، بلکہ خود دوسروں کو اپنے مال سے دیتا ہے اور سلامت روی کے ساتھ اپنے کار و بار کو چلاتا ہے۔ اس کو کوئی دوسرا بھی نہیں لوٹتا وہ اپنے سرمایہ اور قلیل منافع کو تحفظ رکھتا ہے۔ دنیا کے بڑے بڑے تجارتی شہروں کی منڈیاں اور کوٹھیاں اس عبرت انگیز واقعہ کی پوری تصویر ہیں اور یہ ہر روز کا مشاہدہ ہے۔ پھر ظاہر ہے کہ استغنا اور قافت ایسی چیز ہے، جو تمام اخلاقی محاسن کا سنگ بنیاد ہے، بلکہ محمد رسول اللہ ﷺ نے نہایت بیان و حکیمانہ طریق سے یہ ارشاد فرمایا کہ

((ليس الغنى عن كثرة العرض ولكن الغنى غنى النفس))

”تو نگری دولت کی کثرت کا نام نہیں ہے، بلکہ مال کی بے نیازی کا نام ہے۔“

اس حدیث کا ترجمہ سعدی نے ان لفظوں میں کیا ہے، تو نگری بدل ست نہ بمال، دوسرے لفظوں میں یوں کہو کہ دولت آمدی کی زیادتی کا نام نہیں بلکہ ضروریات کی کمی کا نام ہے، لیکن یہ غیر فانی دولت حرص و طمع سے نہیں، بلکہ صبر و قناعت کی بدولت حاصل ہوتی ہے۔ اس بنا پر کیا کسی کوز کوہ و صدقہ کے مطہر مرد کی اور مصلح اخلاق ہونے میں شبہ ہو سکتا ہے؟ سود خور کو دوسروں کو لوٹنے سے اتنی فرصت کہاں ہلتی ہے کہ وہ دوسروں کی مدد کا فرض ادا کرے، وہ تو ہمیشہ اس تاک میں رہتا ہے کہ دوسرے مصیبتوں اور قتوں میں پھنسیں اور وہ ان کی اس حالت سے فائدہ اٹھائے۔ لیکن جو زکوہ ادا کرتے ہیں، وہ ہمیشہ قبل ہمدردی اشخاص کی ثوہ میں لگ رہتے ہیں، تاکہ وہ اپنے مال و دولت سے اس کی مدد کر کے ان کے زخم دل پر مرہم رکھ سکیں۔
باعہمی اعانت کی عملی تدبیر

زکوہ اور صدقات کے مصارف کا بڑا حصہ غربیوں اور حاجتمندوں کی امداد ہے۔ انسانیت کا یہ وہ طبقہ ہے، جس کے ساتھ تمام مدد ہوں نے ہمدردی کی ہے اور اس کی تسلی اور تسلیمان کے لئے دوسری دنیا کی توقع اور امید کے بڑے بڑے خوش آئند الفاظ استعمال کئے ہیں، لیکن یہ سمجھ لینا چاہیے کہ اس کی زندگی کی یہ تینی محض اہل نماہبہ کی شیریں کلامی سے دور نہیں ہو سکتی۔ محمد رسول اللہ ﷺ دنیا کے پہلے اور وہی پچھلے پیغمبر ہیں جنہوں نے اس طبقہ کے ساتھ اپنی عملی ہمدردی کا ثبوت دیا اور اس کی تکلیفوں اور مصیبتوں کو کم کرنے کے لئے عملی تدبیر جاری اور نافذ فرمائی۔ خود اپنی زندگی غربیوں اور مسکینوں کی صورت سے بسر کی اور دعا فرمائی کہ ”خداؤند! مجھے مسکین زندہ رکھ، مسکین اٹھا اور مسکینوں ہی کے زمرہ میں میرا حشر کر۔“ آپ کے گھر کا چبوترہ (صفہ) غربیوں اور مسکینوں کی پناہ کا سایہ تھا، وہی آپ کی بزم قدس کے مقرب درباری اور اسلام کے معروفوں کے مغلص جانباز تھے۔ آپ کی نظر میں کسی انسان کی غربت اور تنگ دستی اس کی ذلت اور رسوائی کے ہم معنی نہ تھی۔ نہ دولت و امارت عزت و وقار کے مترادف تھی، بلکہ صرف نیکی اور پرہیز گاری فضیلت و بزرگی کا اصلی معیار تھی۔ حضرت سعیج علیہ السلام نے فرمایا کہ ”مبارک ہیں وہ جو دل کے غریب ہیں، کیوں کہ آسمان کی باہشاہت انہیں کی ہے۔“ آنحضرت ﷺ نے اس سے زیادہ اختصار و ایجاز کے ساتھ اس مطلب کو افراطیا:

((ان المکثرين هم المقلون)) *

”جو دولت مند ہیں وہی غریب ہیں۔“

اس کے دوسرے معنی یہ ہوئے کہ جو غریب ہیں وہی دولت مند ہوں گے۔ پھر انہیں خوشخبری دی کہ غریب جن کو خدا کے آگے کی دولت کا حساب نہیں دینا ہے، دولت والوں سے ۳۰ سال پہلے جنت میں داخل ہوں گے۔ * اسلام نے ان روختانی تسلیوں اور بشارتوں کے ساتھ جو مزید کام کیا، وہ ان کی دنیاوی

* متن: ۵۔ العہد الجدید، ص: ۷۔ ** صحیح بخاری، کتاب الرفاق، باب المکثرون هم المقلون: ۶۴۴۳۔

جامع ترمذی، ابواب الزهد، ابیاب ما جاء ان فقراء المهاجرین یدخلون الجنۃ قبل اغیانہ هم: ۲۳۵۵۔

تکلیفوں اور مصیبتوں کو کم کرنے کی عملی تدبیریں ہیں۔ جن کا نام صدقہ اور زکوٰۃ ہے، اس کی تعلیم نے اس عملی ہمدردی اور اعانت کو صرف اخلاقی تغییب و تشویق تک محدود نہیں رکھا، بلکہ اس کے لئے دو قسم کی تدبیریں اختیار کیں۔ ایک یہ کہ ہر مسلمان کو نصیحت کی جس سے جتنا ہوا پنی دولت سے ان کی مدد کرے۔ یہ اخلاقی خیرات ہے جس کا نام قرآن کی اصطلاح میں اتفاق ہے، لیکن چونکہ یہ اخلاقی خیرات ہر شخص کو اس ضروری نیکی پر مجبور نہیں کرتی اس لئے ایک مقدار معین کے مالک پر ایک ایسا قانونی مخصوص عائد کیا، جس کا سالانہ ادا کرنا اس کا مذہبی فرض ہے اور اس مجموعی رقم کا بڑا حصہ غربیوں اور متحاجوں کی امداد و اعانت کے لئے مخصوص کیا اور رسول اللہ ﷺ نے اپنی اس تعلیم کو ایک ناقابل تغیر دستور اعمل کے طور پر اپنی امت کو ہمیشہ کے لئے سپرد فرمایا۔ چنانچہ آپ نے معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ کو اپنا نائب بن کریم بن بیہجات تو حید اور نماز کے بعد جس چیز کا حکم دیا وہ یہی زکوٰۃ ہے۔ پھر اس کی نسبت ان کو یہ ہدایت فرمائی کہ

((تَؤْخُذُ مِنْ أَغْنِيَاءِهِمْ وَتَرُدُّ عَلَى فَقَارِنِهِمْ))

”وَهُوَ الَّذِي نَسَأَلَنَا عَنِ الْمُنْدَوْلِ سَأَلْنَاهُ فَقَالَ لَنْ يَكُونَ لَكُمْ إِلَّا مَا كُنْتُ مَعَكُمْ“

صحابہ رضی اللہ عنہم نے آپ کی ہدایت کے بوجب ان دونوں قسموں کی خیراتوں پر اس شدت سے عمل کیا کہ جو استطاعت نہ بھی رکھتے تھے، وہ بازار جا کر مزدوری کرتے تھے، تاکہ جو رقم ہاتھ آئے وہ غریب و معدور بھائیوں کی اخلاقی اعانت میں خرچ کریں اور اس معاملہ میں خود آپ نے یہاں تک اس طبقہ کی دلجوی کی فرمایا: ”اگر کسی کے پاس کچھ اور نہ ہو تو لطف و مہربانی سے بات کرنا ہی اس کا صدقہ ہے۔“ اس سے زیادہ یہ کہ اس کی بھی ممانعت کی گئی کہ جو تمہارے سامنے ہاتھ پھیلائے، اس کوختی سے واپس نہ کیا کرو و خدا نے تعلیم دی:

((فَإِنَّمَا الْيَتِيمَ فَلَا تَقْهِرُهُ وَإِنَّمَا السَّآلِيلُ فَلَا تَنْهَهُ)) (۹۳/الضھی: ۹-۱۰)

”تو یتیم کو دبایا کر اور نہ مانگنے والے کو جھڑک۔“

ساتھ ہی یہ بھی حکم دیا کہ اگر تم کسی حاجت مند کی مدد کرو تو اس پر احسان مت دھرو کہ وہ شرمندہ ہو، بلکہ خدا کا شکر ادا کرو کہ اس نے تم کو یہ نعمت دی اور اس کی توفیق عنایت کی۔ احسان دھرنے سے وہ نیکی کا پیالہ حباب کی طرح ٹوٹ کر بیٹھ جائے گافرمایا:

((لَا تُبَطِّلُوا صَدَقَاتُكُمْ بِالْمُنْهَى وَالْأَذَى)) (۲۶۴/البقرة: ۲)

”تم اپنی خیرات کو احسان دھرنے کے بر باد نہ کرو۔“

اس لطف، اس مدارست اور اس دلجوی کے ساتھ محمد رسول اللہ ﷺ نے خدا کے حکم سے انسانیت کے قبل رحم طبقہ کی چارہ نوازی فرمائی اور ہم کو باہمی انسانی محبت اور ایک دوسرے کی مدد کا سبق پڑھایا۔ اگر یہ حکم

۱) صحیح بخاری، کتاب التوحید، باب ماجاء فی دعاء النبی ﷺ امته الی توحید الله تبارک وتعالی: ۷۳۷۲
وکتاب الزکاۃ: ۱۳۹۵۔

صرف اخلاقی حیثیت سے یا صرف بھم طریقہ سے ہوتا یا سب کو سب کچھ دے ڈالنے کا عام حکم دے دیا جاتا تو کبھی اس پر اس خوبی اس نظام اور اس پابندی کے ساتھ عمل نہ ہو سکتا اور آج بھی مسلمانوں کے سامنے یہ راه کھلی ہوئی ہے اور کچھ نہ کچھ ہر جگہ اس پر عمل بھی ہے، یہی سبب ہے کہ مسلمانوں میں اگر امیر کم ہیں تو ویسے غریب و محتاج بھی کم ہیں۔ جیسے دوسری قوموں میں نظر آتے ہیں، تاہم افسوس ہے کہ ایک مدت سے مسلمانوں کا یہ نظام خست اتری کی حالت میں ہے اور اس کی تنظیم کی طرف سے غفلت بڑھتی جا رہی ہے جس کا نتیجہ یہ ہے کہ ہمارا ہر قسم کا جماعتی کام منتشر و پرا گنده ہے۔

دولت مندی کی بیماریوں کا علاج

دولت مندی اور تحول کا مسئلہ ہمیشہ سے دنیا کے مذاہب میں ایک محركۃ الاراء بحث کی حیثیت سے چلا آ رہا ہے، یہودیت کی طرح بعض ایسے مذہب ہیں جن میں نہ دولت مندی کی کوئی تحقیر کی گئی اور نہ مغلی و غربت کو سراہا گیا ہے۔ بلکہ گویا اس بحث کو نامفصل چھوڑ دیا گیا ہے، لیکن عیسائیت اور بودھ مت دو ایسے مذہب ہیں، جن میں دولت کی پوری تحقیر کی گئی ہے۔ عیسائیت کی نظر میں دولت مندی اور تحول نجات کی راہ کا کائنات ہے، بلکہ کوئی انسان اس وقت تک نجات نہیں پاسکتا، جب تک وہ سب کچھ جو اس کے پاس ہے، خدا کی راہ میں لٹانہ دے۔ انجیل میں ہے کہ ایک نیکو کار دولت مند نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام سے نجات کا طریقہ دریافت کیا تو جواب میں فرمایا:

”اگر تو کامل ہوا چاہتا ہے تو جا کے سب کچھ جو تیرا ہے، نجی ڈال اور محتاجوں کو دے کہ تجھے آسمان پر خزانہ ملے گا تب آ کے میرے پیچپے ہو لے۔“

وہ دولت مند یہ تعلیم سن کر غمگین ہو کر چلا گیا۔ تب انجیل میں ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے فرمایا:

”میں تم سے نجی کہتا ہوں کہ دولت مند کا آسمان کی بادشاہت میں داخل ہونا مشکل ہے، بلکہ میں تم سے کہتا ہوں کہ اونٹ کا سوئی کے ناکہ سے گز رجانا اس سے آسان ہے کہ دولت مند خدا کی بادشاہت میں داخل ہو۔“ (متی ۱۹-۲۲)

بودھ مت نے نیک لوگوں کو ترک دنیا کی تلقین کی ہے اور ہر قسم کی دولت سے پاک رہنے کی پدایت کی ہے اور ایسے لوگوں کے لئے یہ سامان کیا ہے کہ جب وہ بھوکے ہوں تو بھیک کا پیالہ لے کر لوگوں کے دروازوں پر کھڑے ہو جائیں۔ لیکن محمد رسول اللہ ﷺ نے ان دونوں طریقوں کو ناپسند فرمایا، اصل یہ ہے کہ اگر دولت ایسی بری چیز ہے تو اس برائی کو دوسروں کی طرف منتقل کر دینا ان کی خیر خواہی نہ ہوئی، دشمنی ہوئی اور اگر غربت کوئی برائی کی چیز ہے تو سب کچھ دوسروں کو دے کر خود اسی حال میں ہن جانا کہاں کی داشتمدی اور اصلاح ہے، اس لئے یہ طریقہ ہر شخص کے لئے یکساں مفید نہیں ہے۔ نفس دولت فرشتہ کو شیطان اور نہ نفس غربت

شیطان کو فرشتہ بناتی ہے، جس طرح دولت مندی دنیا میں ہزاروں سیہ کاریوں کی محکم ہے، اسی طرح غربت بھی دنیا کے ہزاروں جرائم کا باعث ہے اور ان دونوں خرابیوں سے انسانوں کو چنان ایک نبوت عظیٰ کا فرض تھا۔ دولت بہ حیثیت دولت اور غربت بہ حیثیت غربت نیک و بد اور خیر و شر دونوں صفتوں سے پاک ہے۔ بلکہ نیک کرنے کی عام صلاحیت اور الہیت کے لحاظ سے دیکھا جائے تو ایک نیکو کار دولت مند ایک نیکو کار غریب سے بدر جہانیکی کے موقع زیادہ رکھتا ہے، اسی لئے دولت اسلام کی نگاہ میں خدا کی ایک نعمت ہے۔ لعنت نہیں، ہنر ہے عیب نہیں، خیر ہے شر نہیں۔ چنانچہ قرآن پاک میں متعدد موقوں پر دولت کو خیر اور فضل سے تعبیر کیا گیا ہے اور احادیث سے بھی دولت کی فضیلت ثابت ہوتی ہے۔

چنانچہ آنحضرت ﷺ کے ایک صحابی نے مرتب وقت یہ چاہا کہ اپنا سارا مال و اسباب خدا کی راہ میں دے دیں۔ آپ ﷺ نے فرمایا کہ ”تم اہل و عیال کو غنیٰ چھوڑ جاؤ، یہ اس سے بہتر ہے کہ وہ لوگوں کے سامنے ہاتھ پھیلاتے پھریں۔“ آپ کے حلقة بگوشوں میں دولت مند بھی تھے اور غریب بھی اور دونوں آپ کے دربار میں برابر کی حیثیت رکھتے تھے۔ ایک دفعہ غریبوں نے آکر عرض کی کہ یا رسول اللہ ﷺ! ہمارے دولت مند بھائی تو ہم سے سبقت لئے جاتے ہیں، ہم جو بھی کے کام کرتے ہیں وہ، وہ بھی کرتے ہیں اور اس کے علاوہ وہ خیرات بھی کرتے ہیں، جو ہم نہیں کر سکتے۔ آپ نے ان کو ایک دعا سکھائی کہ یہ پڑھ لیا کرو۔ دولت مند صحابیوں نے یہ سناؤ وہ بھی وہ دعا پڑھنے لگے۔ غریبوں نے پھر جا کر عرض کی تو آپ ﷺ نے فرمایا: ”یہ خدا کا فضل ہے جس کو چاہیے دے۔“

آنحضرت ﷺ نے اس عظیم الشان مسئلہ کو جو دنیا میں بھیش سے غیر منفصل اور ناطے شدہ چلا آ رہا تھا۔ اپنی روشن تعلیم اور تلقین کے ذریعہ سے بھیش کے لئے حل کر دیا۔ ایک دفعہ آپ ﷺ نے تقریر میں فرمایا کہ ”لوگو! مجھے تمہاری نسبت جوڑ رہے، وہ دنیا کے خیر و برکت کا ہے۔“ صحابے نے پوچھا، یا رسول اللہ دنیا کے خیر و برکت سے آپ کا کیا مقصود ہے؟ فرمایا: ”دنیا کا باغ و بہار“ (عیش و نشاط اور مال و دولت) ایک شخص نے کہا، یا رسول اللہ ﷺ لیکیا بھلانی سے بھی برائی پیدا ہوتی ہے؟ سائل کا منشاء تھا کہ دولت جو خیر و برکت ہے، وہ فتنہ کیوں کرہو سکتی ہے۔ آپ نے سوال سن کر ذرا تامل کیا پھر پیشانی سے بیسند کے قطرے پوچھے پھر فرمایا: ”بھلانی سے بھلانی ہی پیدا ہوتی ہے۔ لیکن دولت کی مثال ایک ہرے بھرے چڑاگاہ کی ہے، جس کو موم ہمارے سے سر بزرو شاداب بنایا ہو، جب بعض جانور حرص و طمع میں آ کر حد اعتدال سے زیادہ کھا لیتے ہیں، تو دیکھو ہی خیر و برکت کی چیز ان کی ہلاکت اور موت کا باعث ہو جاتا ہے، لیکن جو جانور اس کو اعتدال سے چرتا ہے، جب اس کا پیٹ بھر جاتا ہے تو وہ دھوپ کے سامنے ہو جاتی ہے اور کچھ دری جگائی کرتا ہے فصلہ باہر پھینک دیتا ہے اور

* بخاری، کتاب الوصالیا، باب ان یترك ورثة اغنياء خير من ان ینكفروا الناس: ۲۷۴۲۔ * صحيح بخاری، کتاب الاذان، باب الذکر بعد الصلوة: ۸۴۳؛ صحيح مسلم، کتاب المساجد، باب استحباب الذکر بعد الصلوة: ۱۳۴۷۔

پھر چنے لگتا ہے، دولت ایک خوشنگوار چیز ہے تو جو شخص اس کو صحیح طریقہ سے خرچ کرے تو یہ دولت اس کے لئے بہترین مددگار ہے، لیکن جو شخص اس کو صحیح طریقہ سے حاصل نہیں کرتا، اس کی مثال ایسی ہے جیسے کوئی کھاتا چلا جاتا ہے اور سیر نہیں ہوتا۔^۱ اس تقریر میں آنحضرت ﷺ نے مسئلہ کے اہم نتائج کو واضح فرمادیا اور بتا دیا کہ نفس دولت خیر و شر نہیں ہے۔ بلکہ اس کا درست و نادرست طریقہ حصول اور جائز و ناجائز مصرف خیر و شر ہے۔ اگر درست طریقہ سے وہ حاصل کی جائے اور صحیح طریقہ سے خرچ کی جائے، تو وہ نیکیوں اور بھلائیوں کا بہتر سے بہتر ذریعہ ہے، اگر اس کے حصول و صرف کا طریقہ صحیح نہیں تو وہ بری اور شر انکیز ہے۔ اخلاقی محاسن و معاف امیر و غریب دونوں کے لئے یکساں ہیں۔ ایک سخن و فیاض و متواضع امیر اور ایک فناعت پسند اور صابر و شاکر غریب اسلام کی نظر میں فضیلت کے ایک ہی درجہ پر ہیں، اسی طرح ایک مشکر، بخیل، امیر اور خوشامدی اور لاپچی فقیر پتی کی ایک ہی سطح پر ہیں۔ اس لئے ضرورت تھی کہ دولت کی اجازت کے ساتھ ساتھ ایک طرف امرا اور دولت مندوں کے اخلاق کی اصلاح کی جائے اور دوسری طرف غریبوں اور فقیروں کی امداد اور دشکری کے ساتھ ان کے اخلاق و عادات کو بھی درست کیا جائے، اسلام میں زکوٰۃ اسی عظیم الشان و دو طرفہ اصلاح کا نام ہے۔

اس سلسلہ میں آنحضرت ﷺ کی تعلیم نے سب سے پہلے حصول دولت کے ناجائز طریقوں و ہوکا، فریب، خیانت، لوث مار، جوا، سود وغیرہ کی سخت سے سخت ممانعت کی۔ سرمایہ داری کے اصول کی حمایت نہیں کی اور اس کا سب سے آسان ترین ذریعہ اور غریبوں کے لونے کے سب سے عام طریقہ سود کو حرام مطلق اور خدا اور رسول سے لڑائی کے ہم سختی فرمایا۔ جوز میں یونہی پڑی ہوئی ہے اس کو جو بھی اپنی کوشش سے آبادو سیراب کرے اسی کی ملکیت قرار دی۔ چنانچہ فرمایا: ”زمین خدا کی ہے اور سب بندے خدا کے بندے ہیں، جو کسی مردہ زمین کو زندہ کرے وہ اسی کی ہے۔^۲“ متروہ کے جائیداد کا مالک کسی ایک نہیں بلکہ بقدر احتجاق تمام عزیزوں کو اس کا حصہ دار بنا دیا۔ ممالک مفتوحہ کو امیر اسلام کی شخصی ملکیت نہیں بلکہ پوری جماعت کی ملکیت قرار دیا۔ فطرت کی ان بخششوں کو جو انسانی محنت کی ممنون نہیں، جیسے پانی، تلالب، گھاس، چراگاہ، نمک کی کان، معدنیات وغیرہ جماعتی تصرف میں دیا اور بن لڑائی کے ذہنوں سے حاصل کی ہوئی زمینوں کو امراء اور دولت مندوں کے بجائے خالص غریبوں اور نیکوں کا حق قرار دیا اور اس کی وجہ بھی ظاہر کر دی، فرمایا:

﴿مَا أَفَاءَ اللَّهُ عَلَى رَسُولِهِ مِنْ أَهْلِ الْقُرْبَىٰ فَلِلَّهِ وَلِرَسُولِهِ وَلِذِي الْقُرْبَىٰ وَالْيَتَامَىٰ وَالْمَسَاكِينُ وَالْمُسَيْلِيلُ لِمَنْ لَا يَكُونَ دُوَّلَةً بَيْنَ الْأَغْنِيَاءِ وَمِنْكُمْ﴾ (۵۹/ الحشر: ۷)

”بستیوں والوں کی ملکیت سے اللہ جو اپنے رسول کو ہاتھ لگادے، وہ خدا اور اس کے رسول اور رشتہ داروں اور نیکوں اور غریبوں اور مسافروں کا حق ہے، تاکہ وہ اُلٹ پھر کرتم میں سے

^۱ صحیح بخاری، کتاب الرزکۃ، باب الصدقۃ علی الیتامی: ۱۴۶۵؛ کتاب الرفاقت، باب ما یحذر من زهرة الدنيا: ۶۴۲۷۔ ^۲ مسند ابی داود الطیالسی، ص: ۲۰۴، الجزء السادس۔

دولتمدوں ہی کے لینے دینے میں نہ رہ جائے۔“

اس کے بعد اس سلسلہ میں دولت مندی کی سب سے بڑی بیماری بخل کو دنیا میں انسانیت کا بدترین مظہر اور آخرت میں بڑی سے بڑی سزا کا مستوجب قرار دیا اور جو اس گناہ سے پاک ہو، اسی کو کامیابی کی بشارت دی، فرمایا:

﴿وَمَنْ يُؤْمِنْ شَهَّ نَفْسِهِ فَأُولَئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُونَ ﴾ (٥٩) الحشر: ٩

”اور جو اپنے جی کے لائق سے بچایا گیا وہی لوگ ہیں مراد پانے والے۔“

بخل کا بتلا دوسروں کے ساتھ بخل نہیں کرتا، بلکہ درحقیقت وہ خود اپنے ساتھ بخل کرتا ہے، وہ اس کی بدولت اس دنیا میں اپنے آپ کو ہر دفعہ زیستی اور نیک نامی بلکہ جائز آرام و راحت تک سے اور آخرت میں ثواب کی نعمت سے محروم رکھتا ہے، فرمایا:

﴿وَمَنْ يَتَعَقَّلْ فَإِلَيْهَا يَبْقَىْ عَنْ نَفْسِهِ ۖ وَاللّٰهُ الْغَنِيُّ ۖ وَالنَّاسُ هُنَّ الْفَقَارُ أَعْوَى﴾ (٤٧) محمد: ٣٨

”اور جو بخل کرتا ہے وہ اپنے آپ ہی سے بخل کرتا ہے، اللہ تو غنی ہے اور تم ہی محتاج ہو۔“

اس آیت پاک میں در پردہ یہ بھی واضح کر دیا کہ جس دولت کو تم اپنی سمجھتے ہو، وہ در حقیقت تمہاری نہیں، اصل مالک خدا ہے اور تم خود اس کے محتاج ہو، پھر جو شخص مال کا اصلی مالک نہ ہو، بلکہ محض امین ہو، وہ اصلی مالک کے حکم کے مطابق اس کو صرف نہ کرے اور یہ سمجھے کہ یہ خود اس کی ملکیت ہے اور اس کو اپنی ملکیت میں سے کسی کو کچھ دینے نہ دینے کا اختیار ہے، خائن اور بے ایمان نہ کہا جائے گا؟ در حقیقت یہی تصور کہ یہ مال میرا ہے اور میری شخصیت اور انسانیت کی طرف اس کی نسبت ہے۔ دنیا کی تمام برائیوں اور بدیوں کی جڑ ہے، اس آیت پاک کی یہ تعلیم اسی جڑ کو کھو دی اور بخ دن سے اکھاڑ کر پھینک دیتی ہے۔ پھر دولت کے ان مجازی مالکوں اور امینوں کو یہ بتا دیا گیا کہ ان کو خدا کی عدالت میں اپنی دولت کے ایک ایک ذرہ کا حساب دینا پڑے گا، فرمایا:

﴿فَمَنْ لَتَسْتَكْنَ يَوْمَ مَبْدِئِ عَنِ التَّعْبُوْنَ ﴾ (١٠٢) التکاثر: ٨

”پھر اس دن تم سے تمہاری نعمت کا حساب پوچھا جائے گا۔“

اس لئے ان کو خوب سمجھ لینا چاہیے کہ وہ اپنی دولت کو کہاں اور کس طرح صرف کرتے ہیں، ان لوگوں کو جو اپنے روپے کی تھیلیوں کو اپنی نجات کا ذریعہ سمجھتے ہیں، تنبیہ کی:

﴿وَيْلٌ لِّلْجُلُونَ هُمَّةٌ لَّمَرَّةٌ إِلَذِي جَمَعَ مَالًا وَعَدَدَةٌ يَحْسَبُ أَنَّ مَالَةَ أَخْلَدَةٌ كُلًا لَّيْلَيْلَدَنَّ فِي الْحُطْمَةِ﴾ (١٠٤) الهمزة: ٤-١

”برائی ہو اس کی جو طعنہ دیتا اور عیب چلتا ہے، جو مال کو سینت کر رکھتا ہے اور اس کو گن گن کروہ خیال کرتا ہے کہ اس کا مال اس کے ساتھ سدار ہے کا ہر گز نہیں۔“

فرمایا: ”رشک کرنا صرف دوآدمیوں پر جائز ہے ایک تو اس پر جس کو خدا نے علم دیا ہے اور وہ اس کے

مطابق شب و روز عمل کرتا ہے اور دوسرے اس پر جس کو خدا نے دولت دی ہے اور وہ اس کو دن رات خدا کی راہ میں خرچ کرتا ہے۔ ۴ جو لوگ سونے چاندی کو زمین میں گاڑ کر رکھتے ہوں اور کارخیر میں خرچ نہ کرتے ہوں ان کو خطاب کیا:

﴿وَالَّذِينَ يَكْنُزُونَ الْأَرْضَ وَالْفَضَّةَ وَلَا يُنْفِقُونَهَا فِي سَيِّئِ الْأَعْمَالِ فَبَشِّرْهُمْ بِعَذَابٍ أَلِيمٍ﴾ (التوبۃ: ۳۴) (۹)

”وہ لوگ جو سونا اور چاندی گاڑ کر رکھتے ہیں اور اس کو خدا کی راہ میں خرچ نہیں کرتے، ان کو دردناک عذاب کی بشارت دے دو۔“

اس آیت پاک نے صحابہ میں دو فریق پیدا کر دیے، ایک کہتا تھا کہ جو کچھ ملے سب خدا کی راہ میں خرچ کر دینا چاہیے۔ کل کے لئے کچھ نہ رکھنا چاہیے، درنہ جو شخص ایسا نہ کرے گا وہ اس آیت کے تحت میں عذاب کا مستحق ہو گا۔ دوسرا کہتا تھا، خدا نے ہماری دولت میں جو حق واجب ٹھہرایا ہے (یعنی زکوٰۃ) اس کے ادا کرنے کے بعد سرمایہ جمع کرنا عذاب کا مستوجب نہیں۔ لیکن اہل راز صحابہ اور علمائے امت نے اپنے قول و عمل سے اس مشکل کی پوری گرفتاری کھوں دی۔ حضرت مولیٰ علیہ السلام کی تورات میں مقررہ زکوٰۃ ادا کرنے کے سوا مال کی خیرات کی کوئی تعلیم نہیں اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی انجیل میں آسمانی پادشاہی کی کنجیاں اسی کے حوالہ کی گئی ہیں جو سب کچھ خدا کی راہ میں لٹا دے۔ یہ دونوں تعلیمات اپنی اپنی جگہ پر صحیح و درست ہیں، لیکن جس طرح پہلی تعلیم بعض بلند ہمت حوصلہ مندوں کے حوصلہ سے کم ہے، اسی طرح دوسری تعلیم جو یقیناً ایک بلند روحاںی تخلیل ہے، مگر وہ عملاً عام انسانوں کے حوصلہ سے بہت زیادہ ہے۔ اسی لئے کہا جا سکتا ہے کہ وہ ایک گونہ انسانی فطرت کے دائرہ سے باہر ہے اور اسی لئے بہت کم لوگ اس پر عمل کر سکے۔ محمد رسول اللہ ﷺ کی تعلیم موسوی اور عیسیٰ دو نوں شریعتوں کی جامع ہے۔ اسلام نے خیرات کے درجے مقرر کر دیے، ایک قانونی اور دوسری اخلاقی، قانونی خیرات کی وہی مقدار باقی رکھی جو موسوی شریعت میں لحوظتی۔ یعنی نصف مشقال نقد میں اور عشر پیداوار میں، یہ وہ کم سے کم خیرات ہے جس کا سالانہ ادا کرنا ہر منقطع اور صاحب نصاب پر واجب ہے اور اس کا وصول اور خرچ کرنا جماعت کا فرض ہے اور اخلاقی خیرات جس کو ہر انسان کی مرشی اور خوشی پر محصر کھا ہے۔ اس کو حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی تعلیم کی طرح بلند سے بلند روحاںی تخلیل کے مطابق قرار دیا اور بلند ہمت انسانوں کو اس پر عمل کرنے کی ترغیب دی۔ صحابہ رضی اللہ عنہم میں دونوں قسم کے لوگ تھے، وہ بھی تھے جو کل کے لئے آج اٹھا کر رکھنا حرام بھختے تھے۔ جیسے حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ ۱ اور وہ بھی تھے جو وقت پر اپنی تمام دولت اسلام کے قدموں پر لا کر ذال دیتے تھے۔ جیسے حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ ۲ اور ایسے بھی تھے جو اپنی تجارت کا تمام سرمایہ خدا کی راہ میں بیک

۱ بخاری، کتاب العلم، باب الاغتباط فی العلم والحكمة۔ ۷۲۔

۲ بخاری، کتاب الزکوة، باب ما ادى زکوٰۃ فليس بكتنز: ۱۴۰۶۔ ۳ ترمذی، ابواب المناقب: ۳۶۷۵۔

وقت لشادیتے تھے، جیسے حضرت عبد الرحمن بن عوف رضی اللہ عنہ اور وہ بھی تھے جو خود بھوکے رہ کر دوسروں کو کھلا دیتے تھے۔ اور خود تکلیف انہا کر دوسروں کو آرام پہنچاتے تھے۔ جیسے حضرت علی مرضی رضی اللہ عنہ اور بعض انصار کرام، خدا نے ان کی مدح فرمائی:

﴿وَيُطْعِمُونَ الطَّعَامَ عَلَى حُجَّةٍ مُسْكِنًا وَيَتَمَّا وَأَسْبَرُوا﴾ (الدھر: ۸) (۷۶)

”اور وہ اپنی ذاتی حاجت کے باوجود اپنا کھانا مسکین اور یتیم اور قیدی کو کھلا دیتے ہیں۔“

﴿وَيُبَرِّوْنَ عَلَى أَنْفُسِهِمْ وَكُوْكَانَ يُهُمْ خَصَّاصَةً﴾ (الحضر: ۹) (۵۹)

”اور وہ اپنے آپ پر دوسروں کو ترجیح دیتے ہیں، اگرچہ وہ خود حاجت مند ہوں۔“

غرض محمد رسول اللہ ﷺ کی تعلیم مختلف انسانی طبیعتوں کے موافق اور فطرت سلیمانیہ کے مطابق ہے اور ہر ایک کے لئے اس کی استعداد اور الہیت کے مطابق نجات کا دروازہ کھلوتی ہے۔ اس نے وہ طریقہ سکھایا ہے جس سے اہل حاجت اور نیک کاموں کے لئے عملاء ہر وقت امد اہل سکے اور ساتھ ہی اہل ول اور اہل استعداد کے مرتبہ کمال کے لئے بلند سے بلند روحاںی معيار کی دعوت اور ترغیب بھی پیش کر دی ہے اور اس کی خوبیاں اور برا بیان بھی بیان کر دی ہیں، تاکہ امت کے با حوصلہ افراد بہت کے شہپروں سے اڑ کر اس سدرۃ النعمتی تک پہنچنے کی کوشش کریں۔

حضرت شیخ شرف الدین میکی میری رحمۃ اللہ علیہ اپنے مکتوبات میں اسلام کے اس آخری مرتبہ کمال کی شرائع ان الفاظ میں فرماتے ہیں:

وایں طائفہ، جان و مال در باختہ اند و بابیچ کس ماسوا اللہ نہ پر
داختہ اند گفتہ ایشان است الفقیر مائلہم مباح و دمه هدر یعنی
درویش صادق آن بود کہ بخون و مال ادعوی نبود... اگر مالش
برند خوش گرد گوید الحمد لله کہ حجا بیر از پیش من برداشتند
تاگفتہ اند زکوہ نعمت دنیا نزدیک این طائفہ محمود نباشد از آنکہ
بخل ناستوده است، وبخلی تمام باید درم را در بند کند، ویکسال
سحبوس دارد آنگاہ پنج درم ازان بد بد.

”اس فرقہ نے اپنی جان اور مال کو ہار دیا ہے اور خدا کے سوا کسی سے دل نہیں لگایا۔ اس کا مقولہ ہے کہ درویش وہ ہے جس کا مال وقف اور جس کا خون معاف ہو۔ اس کو اپنی جان و مال پر کوئی دعویی نہ ہو۔ اگر لوگ اس کا مال انھا لے جائیں تو خوش ہو کہ الحمد للہ، اس کے اور خدا کے درمیان جو ایک پرده پڑا تھا وہ اٹھ گیا۔ یہاں تک کہ ان کا کہنا یہ ہے کہ دنیا کی دولت کو جمع کر

کے زکوٰۃ دینا کچھ اچھا نہیں ہے۔ کیوں کہ بخالت تعریف کے قابل نہیں اور اس کے لئے کہ سال میں دوسو درہم جمع ہوں اور پھر وہ ایک سال تک بند پڑے رہیں، تب جا کر ایک سال کے بعد پانچ درہم ان میں سے خدا کی راہ میں دے، بڑی بخالت کی ضرورت ہے۔“
اس کے بعد حضرت شبیل بن عثیمینؓ کا ایک فتویٰ نقش کیا ہے:

یکے ازفقہا برسبیل آزمانش شبیلی را پرسید کہ زکوٰۃ در چند لازم آید گفت جواب بر مذہب فقیہاں خواہی، یا بر مذہب فقیران؟ گفت برہر دو جواب فرماء، شبیلی گفت بر مذہب فقیہاں از دویست درم بعد از حولان حول پنجدرم باید داد و بر مذہب فقیران درحال بر دویست درم باید داد و جان بشکرانہ برسر باید نہاد فقیہ گفت ما ایں مذہب از ائمہ دین گرفتیم شبیلی گفت ما ایں مذہب از صادق رب العالمین گرفتیم یعنی ابی بکر صدیق رضی اللہ عنہ او ہر چہ داشت پیش سید عالم نہاد و جگر گوشہ خویشتن بشکرانہ داد۔

”کسی نے حضرت شبیل بن عثیمینؓ سے امتحاناً پوچھا کہ زکوٰۃ کتنے پر ہوتی ہے، فرمایا فقہا کے مسلک پر جواب چاہتے ہو یا فقراء کے؟ کہا دونوں کے، فرمایا: فقہا کے مذہب کے مطابق ایک سال گزرنے پر دو درہم میں سے پانچ درہم اور فقراء کے مسلک پر فوراً پورے کے پورے دوسو اور اس نذرانہ کی خوشی میں اپنی جان بھی سر پر رکھ کر پیش کرنی چاہیے۔ فقیہ نے کہا: ہم نے یہ مذہب ائمہ دین سے حاصل کیا ہے، فرمایا: ہم نے یہ مسلک صدیق اکبرؒ سے حاصل کیا ہے کہ جو کچھ خدا و سب سور عالم علیؑ کے سامنے رکھ دیا اور اپنی جگر گوشہ (حضرت عائشہؓ صدیقہؓ) کو شکرانہ میں دیا۔“

محمد رسول اللہ علیؑ کی ذاتی مثال اسی دوسرے فریق کے مطابق تھی۔ آپ کے پاس عمر بھر کیھی اتنا جمع نہ ہوا کہ زکوٰۃ کی نوبت آئے، جو کچھ ہوتا وہ اسی دن اہل استحقاق میں تقسیم ہو جاتا۔ اگر گھر میں رات کو سونے چاندی کے چند خزف ریزے بھی پڑے رہتے تو، تو گھر میں آرام نہ فرماتے۔ مگر عام امت کے لئے اپنے مسلک کو فرض نہیں قرار دیا، بلکہ اتنا ہی ان کے لئے مقرر کیا گیا جو ان کی قوت، استطاعت اور رہمت کے مطابق ہو، تاکہ نجات کا دروازہ غریبوں اور دولت مندوں کے ہر طبقہ کے لئے یکساں کھلارے ہے اور اس لئے، تاکہ بے

قیدی و عدم پابندی لوگوں کی سستی اور عدم عمل کا باعث نہ ہو۔ مقدار میعنی کے مالک پر ایک رقم قانوناً فرض کی گئی، تاکہ جماعت کے مجبور و معمود افراد کی لازمی طور سے دشگیری ہوتی رہے۔

اشتراکیت کا علاج

دنیا میں امیر و غریب کی جگہ ہمیشہ سے قائم ہے۔ ہر تمدن کے آخری دور میں قوم کے مختلف افراد کے درمیان دولت کی غیر مساوی صورت یقینی طور سے پیدا ہو جاتی ہے۔ بعض طبقے نہایت دولت مند ہو جاتے ہیں جن کے خزانوں کے لئے زمین کا پورا طبقہ بھی کافی نہیں ہوتا اور دوسرا طرف وہ غریب ہوتے ہیں جن کے پاس کھانے کے لئے ایک سو کھاٹکڑا اور سونے کے لئے ایک بالشت زمین بھی نہیں ہوتی اور دولت مند طبقوں کی خود غرضی، خود پسندی اور عیاشی اس حد تک پہنچ جاتی ہے کہ وہ اپنے بھوکے اور ننگے بھائیوں کے لئے روٹی کا ایک ٹکڑا اور کپڑے کا ایک چھیڑھاٹک دینے کے روا دار نہیں ہوتے اور وہ یہ سمجھتے ہیں کہ یہ اتفاقی دولت خدا کی طرف سے نہیں، بلکہ ان کے علم و ہنر، سعی و کوشش اور دست و بازو سے حاصل ہوئی ہے۔ اس لئے ان ستو ناکارہ افراد کا اس میں کوئی حصہ نہیں۔ قارون کو جب زکوٰۃ و خیرات کا حکم ہوا تو اس نے جواب میں یہی کہا:

﴿إِنَّمَا أُوْتِتُهُ عَلَىٰ عِلْمٍ بِعِنْدِيٖ ط﴾ (۲۸) / القصص: ۷۸)

”بمحظہ کو ایک ہنر سے جو میرے پاس ہے یہ سب ملا ہے۔“

چنانچہ ہر زمانہ کے قارنوں کا اپنی دولت کے متعلق یہی تصور اور اعتقاد ہوتا ہے۔

یومنان کے آخری دور میں یہی صورت پیدا ہوئی، ایران کے انتہائی زمانہ میں یہی شکل نمودار ہوئی، پورپ کی موجودہ فضائیں یہی آب و ہوا اقتصادی مشکلات کی ابر و باد کا طوفان اور سیلا ب پیدا کر رہی ہے۔ مزدور سرمایہ دار کی جگہ پورے زور پر قائم ہے اور سو شلزم، کمیوزم، انارکزم اور بالشوزم کے طوفان جگہ جگہ اٹھ رہے ہیں، لیکن دنیا میں مساوات اور برابری پیدا کرنے کے لئے یہ دنیا کے نئے خاکے تیار کرنے والے جو نقشے بنار ہے ہیں وہ انسانی فطرت و تربیت کے اس درجہ مخالف ہیں کہ ان کی دائیٰ کامیابی حدود جسم مشکوک ہے۔

محمد رسول اللہ ﷺ کی تعلیم نے دنیا کی اس مشکل کا اندازہ کر لیا تھا اور اس نے اسی کے حل کرنے کے لئے یہ اصول مقرر کر دیا کہ ذائقی و شخصی ملکیت کے جواز کے ساتھ جس کی انسانی فطرت متقاضی ہے، دولت و سرمایہ کو چند اشخاص کے ہاتھوں میں جانے سے روکا جائے۔ سو دو کو حرام قرار دیا، مترو کے جائد اور صرف ایک ہی شخص کی ملکیت قرار نہیں دیا۔ نفع عام کی چیزیں اشخاص کے بجائے جماعت کی ملکیت قرار دیں۔ قبصہ بیت اور شہنشاہیت کی بجائے جماعت کی حکومت قائم کی۔ زمینداری کا پرانا اصول جن میں کاشتکار غلام کی حیثیت رکھتا تھا، بدی دیا اور اس کی حیثیت اجیر اور مزدور کی رکھی۔ انسانی فطرت کے خلاف نہیں کیا کہ سرمایہ کو لے کر تمام انسانوں میں برابر قسم کر دیا جائے، تاکہ دنیا میں کوئی ننگا اور بھوکا باتی نہ رہے، بلکہ یہ کیا کہ ہر سرمایہ دار پر جس

کے پاس سال کے مصارف کے بعد مقررہ رقم باقی تھے جائے اس کے غریب بھائیوں کی امداد کے لئے ایک سالانہ رقم قانونی طور سے مقرر کر دی، تاکہ وہ اس کے ادا کرنے پر مجبور ہو اور جماعت کا فرض قرار دیا کوہ وہ اس رقم سے قبل اعانت لوگوں کی دلیلیتی کرے، یہی وہ راز ہے، جس کی بنا پر اسلام کے تمدن کا دروس قسم کی اقتصادی مصیبتوں سے محفوظ رہا اور آج بھی اگر اسلامی ممالک میں اس پر عمل درآمد ہو تو یہ فتنے زمین کے اتنے رقبہ میں جتنے میں محمد رسول اللہ ﷺ کی روحاںی حکومت ہے پیدا نہیں ہو سکتے، خلافت راشدہ کے عہد میں حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی حکومت کا درودہ زمانہ ہے جب عرب میں دولت افراط کی حد تک پہنچ گئی تھی۔ حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ عنہ نے شام میں قرآن پاک کی اس آیت کے مطابق کہ ”جو لوگ سونا چاندی گاڑ کر رکھتے ہیں اور خدا کی راہ میں خرچ نہیں کرتے“ یہ تو ممکن دیا کہ دولت کا جمع کرنا حرام ہے۔ ۲ اور ہر شخص کے پاس جو بچھے اس کی ضرورت سے زیادہ ہو وہ خدا کی راہ میں دے کر بچاتے ہیں تو حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ کی یہ آواز عام پسند نہ ہو سکی اور نہ عوام میں کوئی فتنہ پیدا کر سکی، کیوں کہ زکوٰۃ کا قانون پورے نظام کے ساتھ جاری تھا اور عرب کے آرام و آسائش کا یہ حال تھا کہ ایک زمانہ میں کوئی خیرات کا قبول کرنے والا باقی نہیں رہا۔ ۳

اقتصادی اور تجارتی فائدے

زکوٰۃ میں ان روحاںی اور اخلاقی فائدوں کے ساتھ اقتصادی حیثیت سے دنیاوی فائدے کے پہلو بھی ملحوظ ہیں، اور گزر چکا ہے کہ زکوٰۃ انہیں چیزوں میں واجب ہوتی ہے جن میں دھنیتیں پائی جائیں، یعنی بقا اور نہمو۔ بقاء سے یہ مقصود ہے کہ وہ ایک مدت تک اپنی حالت پر باقی رہ سکیں، کیوں کہ ہر چیز ایسی نہ ہو گی اس کی تجارت میں نہ چند اس فائدہ ہے اور نہ دوسروں کے استعمال کے لئے دیر تک ذخیرہ بن سکتی ہے، اسی لئے سبزیوں اور ترکاریوں پر زکوٰۃ نہیں ہے اور نہ موسمے یہ مقصد ہے کہ ان میں یا تو پیدا اور یا تناصل یا مبادلہ کی بنا پر افزائش کی صلاحیت ہو۔ اسی لئے جواہرات اور دیگر قیمتی معدنی پتھروں میں یا غیر مزروعہ زمین اور مکان میں بھی زکوٰۃ نہیں ہے، ان دونوں نکتوں سے یہ بات حل ہوتی ہے کہ شریعت نے زکوٰۃ کے فرض کرنے سے یہ مقصد بھی پیش نظر رکھا ہے کہ لوگ اپنے سرمایہ کو بیکار نہ رکھیں، بلکہ محنت، کوشش اور جدوجہد سے اس کو ترقی دیں ورنہ اصل سرمایہ میں سال بسال کی ہوتی جائے گی جس کو فطرتاً کوئی برداشت نہیں کر سکتا، اس طرح زکوٰۃ کا ایک بالاو۔ طہ مقصد یہ بھی ہے کہ تجارت و زراعت کو جو دولت کا اصل سرچشمہ ہیں ترقی دی جائے، کیوں کہ جب ہر شخص کو لازمی طور پر سال میں ایک خاص رقم ادا کرنا پڑے گی تو وہ کوشش کرے گا کہ جہاں تک ہو یہ رقم منافع سے ادا کرے اور اصل سرمایہ محفوظ رکھے، اسی بنا پر اسلام نے زکوٰۃ کو انہیں چیزوں کے ساتھ مخصوص کیا ہے جن

۱ مسند ابن حنبل، ج ۵، ص: ۱۷۶۔ ۲ فتح الباری شرح بخاری، ج ۶، ص: ۴۵۱ و طبقات ابن

سعد، ترجمة عمر بن عبدالعزیز، ص: ۲۵۶ جزء خامس فی اهلالمدینة من التابعين۔

میں نہوا راضا فار کی قابلیت ہوا اور اسی بنا پر زکوٰۃ کے ادا کرنے کے لئے ایک سال کی وسیع مدت مقرر کی، تاکہ ہر شخص اپنے ماں یا جائیداد سے کامل طور پر فائدہ اٹھا سکے۔ صحابہ کرام علیہم السلام اس نکتہ کو سمجھ کر بھیشہ تجارت اور کاروبار میں معروف رہتے تھے۔ حضرت عمر بن الخطبؓ نے اپنے زمانہ خلافت میں ان لوگوں کو جو قبیلوں کے سرمایوں کے متولی تھے، ہدایت کی کہ وہ ان کو تجارت میں لگائیں، تاکہ ان کے بالغ ہونے تک ان کا اصل سرمایہ زکوٰۃ میں سب صرف نہ ہو جائے۔

یورپ نے بڑی تحقیق کے بعد ایشیا کے تجارتی اور تمدنی تخلی کی یہ وجہ بتائی ہے کہ یہاں ماں کا اکثر حصہ بیکار زمین میں مدفون رکھا جاتا ہے۔ لیکن محمد رسول اللہ ﷺ کی زبان وحی ترجمان نے آج سے تیرہ سو برس پہلے زکوٰۃ کو فرض کر کے یہ نکتہ بتا دیا تھا:

﴿وَالَّذِينَ يَكْنِزُونَ الْدَّهَبَ وَالْفِضَّةَ وَلَا يُنْفَقُونَهَا فِي سَبِيلِ اللهِ فَبَيْرُهُمْ بِعَذَابٍ﴾

(آلیم ۹) (۳۴ / التوبۃ)

”اور جو لوگ چاندی اور سونے کو گاڑ کر رکھتے ہیں اور اس کو خدا کی راہ میں نہیں صرف کرتے، ان کو خفت در دن اک عذاب کی بشارت دو۔“

یہ در دن اک عذاب قیامت میں تو جو کچھ ہو گا، وہ ہو گا اس دنیا میں بھی ان کے لئے اقتصادی در دن اک عذاب یہ ہے کہ وہ اس مدفون سرمایہ کو دبا کر ملک کی دولت کوتاہ کرتے ہیں اور اس سے دولت کی افزائش اور ترقی کا کام لینے کے بجائے اس کو پیکار اور معدوم کر کے ملک کو فقر و محتاجی کے عذاب الیم میں بٹلا کرتے ہیں اور بالآخر خود بٹلا ہوتے ہیں، اس لئے امراء کی اخلاقی اصلاح اور مالی ترقی اسی میں ہے کہ وہ اپنی دولت کو مناسب طور سے صرف کریں۔

فقراء کی اصلاح

اب دوسرا طرف فقراء کا گروہ ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ دنیا کے تمام شارعین مذاہب نے انسانوں کے اس قابل رحم فرقہ کی جانب ہمدردی اور ترحم کی لگاہ سے دیکھا ہے اور اس کی طرف امداد و اعانت کا ہاتھ بڑھایا ہے، مگر در حقیقت ان کے رحم، ہمدردی اور محبت کی مثال ایسی ہے، جیسے کسی کے پھوٹا یا زخم ہوا اور اس کا دوست اس کی محبت اور خیر خواہی کی بنا پر بھیشہ اس کے پھوٹے اور زخم کی حفاظت کرتا ہے کہ اس کو شخص نہ لگے اور نوٹنے نہ پائے اور نہ کسی جراح کا نشتر اس کو کچیرے کے ان با توں سے ان کو تکلیف ہو گی، کیا کوئی عقل مند کہہ سکتا ہے کہ اس نادان دوست کا یہ عمل اس کے ساتھ دوستی کا ثبوت ہو گا؟

گزشتہ مصلحین نے عموماً اس میں افراط و تفریط سے کام لیا ہے۔ بعض نے تو اس زخم میں صرف نشرتی لگایا ہے اور مرہم کا کوئی چھاہا نہیں رکھا۔ چنانچہ زر دشی مذہب میں سوال قطعاً منوع قرار دیا گیا ہے اور اس کے

بالقابل بودہ مذہب میں اس زخم کو سرتاپا مادہ فاسد بننے دیا گیا ہے اور بھکشوؤں کا ایک مذہبی گروہ ہی سوال اور بھیک کے لئے پیدا کیا گیا ہے۔ لیکن اسلام نے نہایت حکمت کے ساتھ اس زخم کو بھرنے اور پھوڑنے کو دور کرنے کے لئے ایک تجربہ کار اور ماہر جراح کی طرح دونوں عمل کئے ہیں۔ اس نے اس غمگین اور درد مند طبقہ کے زخم میں نشر بھی لگایا ہے اور اس پر مر، ہم بھی رکھا ہے، یہ رہم اس کی وہ مہربانیاں، تسلیاں، بشارتیں اور عملی امداد و اعانت کی تدبیریں ہیں، جو اس کے دل کی ڈھارس اور اس کی امیدوں کا سہارا ہیں اور نشرت اس کی وہ اصلاحات ہیں جو اس نے اس طبقہ کو دنائت، پستی، کم ہمتوںی، لائق، دوسروں کی دست نگری اور ان کے سہارے جینے کی ذلت سے بچانے کے لئے جاری کیں، اس نے اہل حاجت کے لئے دوسروں سے سوال اور مانگنے کی قانونی ممانعت نہیں کی۔ لیکن ہر اخلاقی طریق سے ان کو اس ذلت سے باز رکھنے کی کوشش کی ہے اور ان کی کفالت کا بار خود جماعت کے سر پر ڈالا ہے۔ عام طور سے اس قسم کا وعظ جیسا کہ عیسائی مذہب میں ہے کہ جو کچھ ہے لٹا دو اور غریبوں اور مسکینوں کو دے ڈالو۔ نہایت اعلیٰ اخلاقی تعلیم اور حرم و محبت کا نہایت بلند مظہر نظر آتا ہے، لیکن غور سے تصور کا دوسرا رخ دیکھنے تو معلوم ہو گا کہ جس شدت سے آپ دولت مندوں کو سب کچھ غریبوں اور مسکینوں کو دے دینے کی ترغیب دے رہے ہیں اور اس سے دینے والوں کے جذبہ ایثار اور ان کے جود و سخا اور فیاضی کے جو ہر کوتری دے رہے ہیں، اسی شدت سے آپ انسانیت کے کثیر التعداد طبقہ کو گداگری کی لعنت، بھیک، مانگنے کی پستی اور دوسروں کے سہارے جینے کی ذلت کا خونگر بنا رہے ہیں اور بے محنت کھانے اور بے تلاش پانے کا سبق پڑھا رہا ہے ہیں، اس طرح ان کے لیے گداگری، دنائت، پستی، ذلت، سفلہ پن، کم ہمتوںی، نامردی اور تمام رذیل پست اخلاقی کا گڑھاتیار کر رہے ہیں، جہاں یہ تمام نجاتیں آ کر جمع ہوں گی، کیا یہ انسانیت کے ساتھ حرم ہے؟ کیا یہ نوع بشر کے ساتھ محبت ہے؟ کیا یہ حس بندی آدم کے ساتھ ہمدردی ہے؟

پیغمبر اسلام ﷺ کی بعثت کسی ایک طبقہ کی اصلاح کے لئے نہیں ہوئی، وہ انسانوں کے ہر طبقہ کے مصلح اور معتمم بنا کر بھیجے گئے ہیں۔ غریب و امیر اور مسکین و دولت مندوں آپ کی نگاہ میں یکساں ہیں، اس لیے آپ نے کسی ایک، ہی طبقہ کی اصلاح کا فرض انجام نہیں دیا۔ بلکہ دونوں طبقوں کو ترازو کے دونوں پلڑوں میں رکھ کر برابر باث سے ناپا ہے اور اپنی تعلیمات اور اصلاحات میں سے دونوں کو مساوی حصہ دیا ہے۔ یہ اخلاقی اصلاح کی وہ نازک پل صراط ہے، جس پر نبیوں کے خاتم اور دینوں کے مکمل کے سواد نیا کے کسی اخلاقی معلم اور روحاںی مصلح کے قدم نہ جم سکے اور نہ وہ اپنے ہاتھ میں ترازو کے دونوں پلڑوں کو رکھ سکا۔ اگر غریبوں کی اصلاح کی خاطر صدقہ اور خیرات اور دوسروں کی اعانت و ہمدردی کے تمام دروازے بند کر دیے جائیں تو انسانی جو ہر شرافت کی بر بادی کے ساتھ امرا کا طبقہ اپنے اخلاقی معاہد کی فروانی اور کثرت سے ہلاک اور اخلاقی محسن سے تمام تر تباہی مایہ ہو جائے گا اور اگر غریب اور فقر کو ہر قسم کی گداگری اور دلیزہ گری کی اجازت دے دی

جائے تو انسانوں کی وسیع آبادی کی اخلاقی زندگی تباہ و بر باد ہو جائے گی۔ اسی لیے رائی اسلام علیہ السلام نے انسانوں کے دلوں طبقوں کے سامنے خدا کی بنائی ہوئی وہ تعلیم پیش کی، جس سے دلوں طبقوں کو اپنی اپنی جگہ پر اپنے اپنے اخلاقی معیار کی ترقی کا موقع مل گیا اور دلوں کو اپنی اپنی شرافت کے جو ہر کو پیش اور اپنے اپنے نقائص اور کمزوریوں کو دور کرنے کی صورت ہاتھ آئی۔ ایک طرف تو اسلام نے امر اور دوستیوں کے طبقہ کو خطاب کر کے کہا:

«وَأَنَّا إِلَيْكُمْ فَلَا تَنْهَرُونَ» (٩٣: الصحنی)

”ما نکنے والے کو جھڑک نہ دے۔“

دوسری طرف خوددار و بے نیاز قفر اور غریبوں کے طبقہ کی مدح فرمائی:

«يَحْسِبُهُمُ الْجَاهِلُونَ أَغْنِيَاءَ مِنَ الْقَعْدَفُ تَعْرِفُهُمْ بِسِيمُهُمْ لَا يَسْكُنُونَ الثَّالِثَ إِحْقَافًا»

(٢٧٣: البقرة)

”ناواقف ان کی خودداری اور سوال کی ذلت سے بچنے کے سبب سے ان کو دولت مند سمجھتے ہیں تو ان کو ان کی پیشانی سے بچا ستا ہے، وہ لوگوں سے پشت کرنیں مانگتے۔“

اور بھیک مانگنے کو ظلافِ تقویٰ قرار دیا، جو لوگ بھیک مانگ کر حج کرتے تھے ان کو خطاب کر کے کہا:

«وَلَئِزَقْ دُوَافِيَنَ خَيْرَ الرَّأْدِ التَّقْوَىٰ» (١٩٧: البقرة)

”اور زادراہ لے کر چلو کہ بہترین زادراہ تقویٰ (بھیک نہ مانگنا) ہے۔“

ایک طرف دولتمندوں کو فرمایا کہ تمہارا حسن اخلاق یہ ہے کہ جو تمہارے سامنے ہاتھ پھیلانے اس کو خالی مت لوتا وہ (ولو بیشق تمرۃ) ۲۱۳ ”اگرچہ جو ہمارے کی ایک بچا تک ہی کیوں نہ ہو۔“ دوسری طرف فقیروں کو فرمایا کہ ”تمہاری خودداری ہبھی ہونی چاہیے کہ کسی کے سامنے بھی ہاتھ نہ پھیلاو کہ، ((الید العليا خیر من اليد السفلی)) ۲۱۴ ”اوپر کا ہاتھ بیچ کے ہاتھ سے بہتر ہے۔“ (یعنی لینے والے ہاتھ سے دینے والا ہاتھ بہتر ہے) یہ ہے وہ تعلیم جس نے انسانوں کے دلوں طبقوں کو اپنے فیض سے معمور کیا اور دلوں کے لئے اپنے اخلاق کی اصلاح کا موقع بھیم پہنچایا۔ صدقہ و خیرات و رحمۃ و پانی ہے، جو دینے والوں کے قلوب دن گوں کے تمام میں اور گندہ پن کو چھانٹ کر ان کو پاک و صاف بنادیتا ہے۔ لیکن، وہ خود جب اس میں اور گندہ پن کو لے کر باہر نکلتا ہے تو حرص و طمع کے پیاسے اس کو چلو میں لے کر پینے لگتے ہیں، اسی لئے آنحضرت علیہ السلام نے فرمایا:

((ان هذه الصدقات إنما هي اوساخ الناس))

۲۱۳ بخاری، کتاب الزکوة، باب اتقوا النار ولو بشق تمرة: ۱۴۱۷۔ ۲۱۴ ایضاً، باب لا صدقة الا عن ظهر غنى: ۱۴۲۹۔ ۲۱۵ مسلم، کتاب الزکوة، باب ترك استعمال آل النبي ﷺ علی الصدقة: ۲۴۸۲۔

”یہ صدقہ تو لوگوں کا میل ہے۔“

اگر آج ان فقیروں اور گداگروں کی صورتوں اور سیرتوں پر نظر ڈالو جو اتحاقات شرعی کے بغیر اس مال سے فائدہ اٹھاتے ہیں تو نظر آ جائے گا کہ محمد رسول اللہ ﷺ نے اس کو لوگوں کے دلوں کا میل کہہ کر کتنی بڑی حقیقت کو آشکارا کیا ہے۔

حرص، طمع، لاثق، فریب، بے حیائی، بے غیرتی اور وہ تمام باتیں جو ان کے لازمی اخلاقی نہائیں ہیں، ان میں سے کوئی چیز ہے۔ جو غیر مسخر ایناء اسیل، فقر اور مہذب گداگروں کا تمغاے انتیاز نہیں اور درحقیقت یہی وہ میل ہے جو زکوٰۃ دینے والوں کے دامن سے چھٹ کر فقر اور گداگروں کے دامن دل کو خبیث بنا دیتا ہے۔ تاہم اس سے کون انکار کر سکتا ہے کہ بعض دفعہ قدر راتاں میں مجبوریاں پیش آ جاتی ہیں، جب نفس الطمع سے نفس الطمع انسان کو اپنی جان بچانے کے لئے گندے سے گندہ اور میلے سے میلا پانی کے پی لینے پر مجبور ہوتا پڑتا ہے اور اس وقت اس اجازت کی ضرورت پیش آتی ہے کہ ایسے مجبور اشخاص کو شخصی طور سے صدقہ و خیرات کے قبول کرنے کی اجازت دی جائے۔ شریعت محمد یہ نے اسی اصول پر اسی حیثیت سے لوگوں کو اس کے قبول کرنے کی اجازت دی ہے اور اس مجبورانہ قبول سے اس گروہ کے اخلاق و عادات پر جو برے اثرات طاری ہو سکتے ہیں، ان کے انسداد اور دفعیہ یا ان کو کم سے کم مضر بنانے کے لئے مفیدہ ایک اختیار کی ہیں اور چند نہایت مناسب احکام جاری کئے ہیں جن کی تفصیل حسب ذیل ہے:

۱۔ اسلام کی پہلی تعلیم یہ ہے کہ صدقہ اور زکوٰۃ کو خالصتاً الجہة التدادا کیا جائے، یعنی لینے والے پر نہ کسی قسم کا احسان کا بار رکھا جائے نہ اس کو ممنون کرم بنا جائے، نہ عام مجع میں اس کو ذیلیں ورسا کرنے کے لئے دیا جائے، کیوں کہ اس سے ایک طرف اگر دینے والے کی اخلاقی پستی اور دنائی ظاہر ہوتی ہے تو دوسرا طرف خود اس طرح کے لینے والے کی خودداری کی روح اور اخلاقی غیرت کی حس کو صدمہ پہنچتا ہے اور بجائے اس کے لینے والا اس طرح دینے والے کا ممنون ہو، اس کو اس کے اس فعل سے پہلے تو نفرت ہوگی، پھر رفتہ رفتہ شاکد اس کی یہ اخلاقی حس غیرت اور شرمندگی کا شریفانہ جو ہر ہمیشہ کے لئے فنا ہو جائے یا ان میں بڑے ظرف کے شریف انسف لوگ ہوں، وہ اپنی نظر میں اپنی ذلت آپ محسوس کر کے اپنی جان پر کھیل نہ جائیں۔

اسلام نے انہیں با توں کو سامنے رکھ کر یہ تعلیم دی کہ دینے والوں کے سامنے یہ نظریہ ہو کہ

﴿إِنَّمَا أَنْطَعِمُكُمْ لِوَجْهِ اللَّهِ لَا تُبِيدُونَكُمْ جَزَاءَ وَلَا شُكُورٌ﴾ (۹) (الدهر: ۷۶)

”بهم تم کو خدا کے لئے کھلاتے ہیں، بہم تم سے کوئی بدله اور شکر نہیں چاہتے۔“

اس شریفانہ تعلیم کو دیکھو کہ بدله تو کہا ہم تو تمہاری احسان مندی اور شکرگزاری بھی نہیں چاہیے۔ پھر صدقہ دینے والوں کو بے تصریح بتا دیا کہ تمہارے احسان دھرنے، طعنہ دینے یا لینے والے کو ذیلیں ورسا کرنے سے

تمہارے اس عظیم الشان کارنامہ کی حقیقت باطل ہو جائے گی اور تمام ثواب حرف غلط کی طرح تمہارے نامہ اعمال سے مت جائے گا۔ فرمایا:

«الَّذِينَ يُفْقِدُونَ أَمْوَالَهُمْ فِي سَيِّئِ الْأَعْمَالِ لَا يُتَّعِنُونَ مَا آنْفَقُوا مَنَّا وَلَا أَذْنِي لَهُمْ أَجْرٌ هُمْ عِنْدَ رَبِّهِمْ وَلَا خُوفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزُنُونَ ۝ قُوْلٌ مَعْرُوفٌ وَمَغْفِرَةٌ خَيْرٌ مَّا صَدَقُوا يَتَّبِعُهَا أَذْنِي ۝ وَاللَّهُ غَنِيٌّ حَلِيمٌ ۝» (۲/ البقرة: ۲۶۳)

”جو لوگ خدا کی راہ میں اپنا مال خرچ کرتے ہیں اور اس کے بعد نہ احسان جاتے ہیں، نہ طعنہ دیتے ہیں، ان کا اجران کے خدا کے پاس امانت ہے اور نہ ان کو قیامت میں کوئی خوف ہے اور نہ وہ غمکھیں ہوں گے، کچھ زمی کی بات کہہ کر اور جسم پوشی کر کے سائل کوٹاں دینا اس صدقہ سے بہتر ہے، جس کے بعد طعنہ دیا جائے یا احسان جتایا جائے، خدا تمہاری ایسی خیرات سے بے نیاز ہے اور تمہارے ایسے کاموں پر برو باری سے درگز کرنے والا ہے۔“

اس حقیقت کو قرآن پاک نے ایک دل نشین تشبیہ سے واضح کیا ہے:

«يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تُبْطِلُوا صَدَقَاتُكُمْ بِالْمُنْ وَالْأَذْنِي ۝ كَالَّذِي يُنْفِقُ مَالَهُ يَرْكَأُ النَّاسَ وَلَا يُؤْمِنُ بِاللَّهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ ۝ فَمَثَلُهُ كَمَثَلِ صَفَوْلَنِ عَلَيْهِ تُرَابٌ فَأَصَابَهُ وَإِلَيْ فَتَرَكَهُ صَلْدَاطٌ لَا يَقْدِرُونَ عَلَى شَيْءٍ مِّمَّا كَسْبُوا وَاللَّهُ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الْكَافِرِينَ ۝»

(۲/ البقرة: ۲۶۴)

”مسلمانو! اپنے صدقوں کو احسان جتا کر اور طعنہ دے کر، بر بادنہ کرو، جیسے کہ وہ اپنے صدقوں کو بر باد کرتا ہے، جو محض لوگوں کے دکھلانے کو دیتا ہے اور خدا پر اور قیامت پر ایمان نہیں لاتا اس قسم کی خیرات کی مثال اس چٹاں کی ہے جس پر کچھ گرد پڑی ہوئی ہو اور اس پر ایک پانی پڑ گیا ہو جس نے اس کو صاف اور چھیل کر دیا کہ اب اس پر کوئی چیز جنم نہیں سکتی ہے، ان لوگوں نے جو کام کیا اس سے کچھ فائدہ نہیں اٹھا سکے، خدا کافروں کو وہ ایتیاب نہیں کرتا۔“

مجملہ اور اس اسباب کے یہ بھی ایک سبب ہے کہ اسلام نے زکوٰۃ ادا کرنے کا صحیح طریقہ یہ مقرر کیا کہ دینے والے خود کسی کو نہ دیں، بلکہ وہ اس کو امیر جماعت کے بیت المال میں جمع کریں اور وہ امیر حسب ضرورت مستحقین کو بانٹ دے، تاکہ اس طرح غریب لینے والا مگر شریف مسلمان ذاتی طور سے کسی دوسرے شخص کا ممنون احسان بن کر اپنی ذلت نہ محسوس کرے اور دینے والے کو ذاتی طور سے کسی پر منت رکھنے کا موقع نہ ملے اور اس طرح پوری قوم کا اخلاقی معیار اپنی پوری بلندی پر قائم رہے، ساتھ ہی یہ کہ نظر اور معذوروں کو در بدر کی خوکر کھانے کی رسائی اور ہر ضرورت کے لئے ایک ایک پیسہ کی بھیک جمع کرنے کی ذلت سے بچایا جائے۔

۲۳ اسی لیے صدقہ دینے کا دوسرا اصول اسلام نے یہ بتایا کہ صدقہ چھپا کر دیا جائے۔ کہ علانیہ دینے میں بھی سائل ہے جیاً اور بے غیرتی کا عادی ہو جاتا ہے۔ کیوں کہ جب کسی کی ذلت اور فقر و فاقہ کی راستان عام ہو جاتی ہے تو پھر اپنے فعل سے اس کو غیرت اور شرم نہیں آتی اور اس لئے اس کا ذرخوا کہ اگر اس کا اندازہ کیا جائے تو اظہار و اعلان کا یہ طریقہ دنیا میں گداگری، دریوزہ گری اور بھیک مانگنے کے پیشہ کی اشاعت کا سبب بن جائے گا اور یہ اخفا اور چھپا کر دینے کی صورت اس لئے بھی اچھی ہے کہ دینے والا نماش اور شہرت طلبی کی آلاتشوں سے اپنے اخلاق کو حفظ رکھ سکے گا۔ اسی لئے آنحضرت ﷺ نے فرمایا کہ ”بہتر صدقہ وہ ہے کہ داہنے ہاتھ سے دو قوبائیں ہاتھ کو بھی خبر نہ ہو۔“ * لیکن بعض موقعے ایسے بھی ہیں کہ جہاں صدقہ خیرات اور زکوٰۃ کے اعلان کی ضرورت پیش آتی ہے اور وہ یہ کہ دوسروں کو ترغیب اور تشویق دلانے کی خالص نیت ہو، یا خود سائل پیش دتی کر کے مجتمع میں سوال کر بیٹھے یا اور کوئی نیک غرض شامل ہو۔ چنانچہ قرآن پاک نے اس حقیقت کو ان الفاظ میں ظاہر کیا:

﴿إِنْ تُبَدِّلُ الصَّدَقَاتِ فَيَنْعَمُّ أَهْلَهُ وَإِنْ تَعْنُوْهَا الْفُقَرَاءُ إِنَّهُمْ بِهِ خَيْرٌ لِّكُمْ﴾

(۲۷۱/ البقرة)

”اگر تم صدقہ کو حلم کلا دو تو یہ بھی اچھا ہے لیکن اگر تم اس کو چھپا کر فقر کو دو تو یہ بہت ہی بہتر ہے۔“

مفسرین نے اس آیت کی تفسیر میں صدقہ کے اخفا کو عام خیرات کے ساتھ مخصوص کیا ہے۔ مگر فرض زکوٰۃ کے لئے اس بنا پر اظہار و اعلان کو مستحب قرار دیا ہے کہ اس سے اسلام کے ایک رُنگ کی اشاعت اور تبلیغ اور دوسروں میں اس کی بیرونی کی ترغیب و تشویق ہوتی ہے اور زکوٰۃ دینے والے عدم ادائے زکوٰۃ کی تہمت سے بری خیال کے جاتے ہیں، لیکن ہمارے نزدیک آیت کریمہ کا مفہوم صاف ہے۔ زکوٰۃ کے ادا کرنے کا اصلی طریقہ تو ہی ہے جو عہد نبوی میں تھا، یعنی یہ کہ زکوٰۃ کی رقم بیت المال یا بیت المال کے عاملوں کے پسروں کی جائے، اس لئے اخفا کا جو فائدہ فقر کے حق میں ہے، وہ اس طرح خود بخود حاصل ہو جاتا ہے۔ لیکن آیت کا اشارہ یہ ہے کہ اگر تم خود براہ راست فقیروں کو دو تو چھپا کر دینا بہتر ہے کہ لینے والے کی عزت سلامت رہے اسی لئے جس آیت میں اعلان کی اجازت ہے، اس میں فقر کو براہ راست دینے کا حکم نہیں اور جہاں اخفا کے ساتھ دینے کا ذکر ہے، وہاں فقر کو دینے کی تصریح ہے۔ اس لئے اعلان اور اخفا کا اصلی فرق زکوٰۃ اور عام خیرات کے درمیان نہیں ہے، بلکہ ادا کرنے کے طریقہ میں ہے کہ اگر بیت المال اور ناسیں بیت المال کے ذریعہ سے ادا کرو تو ظاہر کر کے دو کر دینے والے اور صول کرنے والے دونوں کا حساب پاک رہے اور تہمت اور بدگمانی کا موقع نہ ملے۔ لیکن اگر کسی سبب سے تم کو براہ راست مستحقین کو دینا پڑے، جس میں حساب کتاب

* صحیح مسلم، کتاب الزکوٰۃ، باب فضل اخفاء الصدقة: ۲۳۸۰۔

کی ضرورت نہیں اور برآ راست آپ ہی کو ان کو دینا ہے۔ بیت المال کا پردہ بیچ میں نہیں ہے، اس لئے تم پر یہ فرض عائد ہوتا ہے کہ چھپا کر دو، تاکہ دیئے والا نمائش سے اور لینے والا ذلت و خواری سے محفوظ رہے۔ پھر ترغیب اعلان اور اظہار کی ضرورت اس وقت ہے جب مسلمان کا مذہبی احساس اس قدر کمزور ہو جائے کہ حقوقی اسلام ادا کرنے میں اس قسم کی فقیہاں ٹھوکروں کی ضرورت ہو، ورنہ صحابہ کرام ﷺ کی ترغیب کے لئے صرف اسلام کا خالص جوش کافی تھا۔ مگر آج تو یہ حالت ہے کہ معمولی ہی معمولی رقم کے لئے جب تک اخباروں کے پورے کالم سیاہ نہ کر دیے جائیں، دینے والوں کے نزدیک خدا کو ان کے عطیہ کی خبر ہی نہیں ہوتی۔

۳ تمام اخلاقی اور تمدنی ترقی کا دار و مدار صرف بلند ہمتی اور عالی خیالی پر ہے۔ بلند ہمتی کا اقتضا یہ ہے کہ مسلمان کی نگاہ بلند سے بلند نقطہ پر بھی پہنچ کر نہ تھہرے اور اس کو دنیا کی تمام چیزیں بیچ نظر آئیں، اس بنا پر اسلام نے یہ اصول قرار دیا کہ زکوٰۃ و صدقہ میں مال کا عمدہ اور بہتر حصہ دیا جائے، تاکہ مبتدل اور ادنیٰ درج کی چیزوں کے دینے اور لینے سے دینے والے اور لینے والے کے اندر رخصتی اور دناتست نہ پیدا ہو۔ کیوں کہ اس سے لینے والے کے اندر حد درج کا لائق اور چھپھور پن پیدا ہو گا کہ معمولی اور سڑی گلی چیزیں اس کے لائق سے نہیں بیچ سکتی اور دوسرا طرف دینے والے کی روح میں بھی اس قسم کی خیرات سے بلندی اور علوکے بجائے بخالت حرص اور کینہ پن اور ترکیہ کے بجائے اور زیادہ نجاست اور گندگی پیدا ہو گی، کیوں کہ کوئی بری چیز کسی کو دے دینے کا منشاء دوسرا کی مدد اور خدا کی خوشنودی کا خیال نہیں ہوتا۔ بلکہ اس پیکار اور سڑی گلی چیز سے اپنے دامن اور ٹھکن خانہ کو صاف کرنا ہوتا ہے، اس لئے اس سے دینے والے کے دل میں صفائی کی بجائے اور گندگی پیدا ہوتی ہے۔ روایتوں میں ہے کہ صاحب صفت کو جنہوں نے اپنی زندگی کا مقصد صرف اسلام کی خدمت اور خدا کی عبادت قرار دیا تھا، کب معاش کا موقع نہیں ملتا تھا، اس لئے لوگ کھجوروں کے بد مزہ خوشے لا کر مسجدوں میں لٹکا دیتے تھے اور جب وہ گروہ بھوک کی شدت سے بے تاب ہو جاتا تھا تو مجبوراً ان میں سے دو چار کھجور میں تو زکر کھالیتا تھا، جو کہ یہ نہایت ذلیل حرکت تھی، اس بنا پر یہ آیت نازل ہوئی:

﴿يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا إِنَّفِقُوا مِنْ طَيِّبَاتِ مَا كَسَبْنَاهُ وَمِنْ أَخْرَ جُنَاحَ الْأَرْضِ وَلَا
يَنْهَاوُوا عَنِ الْغَيْرِ يَعْلَمُونَ تُنْفِقُونَ وَلَسْتُمْ بِأَخْذِيْهِ إِلَّا أَنْ تُعِظُّوا فِيهِ طَوْعًا وَأَعْلَمُوا أَنَّ اللَّهَ غَنِيٌّ
عَنِّيْهِمْ﴾ (۲/ البقرة: ۲۶۷)

”مسلمانو! اپنی کمائی سے اور اس چیز سے جو تمہارے لئے ہم نے زمین سے نکالی ہے۔ بہتر حصہ خیرات کرو اور ان میں سے روزی مال کی خیرات کا قصد نہ کرو۔ حالانکہ اگر وہی تم کو دیا جائے تو خدمت نہ لو گے، لیکن یہ کہ جنم بوشی کر جاؤ اور یقین کرو کہ خدا تمہاری اس قسم کی خیرات سے بے نیاز ہے اور وہ خوبیوں والا ہے۔ (خوبیوں ہی والی چیز پسند کرتا ہے)۔“

۵۲ فقر اور مساکین کی دنائت اور حرص و طمع کے زائل کرنے کا بہترین طریقہ یہ ہے کہ انہیں لوگوں کو زکوٰۃ اور صدقہ کا حقیقی متحقق قرار دیا جائے جو باوجود رنگ و سی اور بے بضاعتی کے خودداری اور قیامت کو ہاتھ سے جانے نہیں دیتے، کیوں کہ جب قوم کی توجہ اس قسم کے اشخاص کی طرف مبذول ہوگی تو ہر شخص خود خود ان اخلاق کی تقلید پر مجبور ہوگا، صحابہ کرام میں سب سے زیادہ مغلس اور نادار اصحاب صفت تھے۔ لیکن ان کی خودداری اور قیامت کا یہ حال تھا کہ پریشانی صورت کے علاوہ کوئی چیزان کے فقر و فاقہ کا راز فاش نہیں کر سکتی تھی۔ اس بنا پر اسلام نے ان کو زکوٰۃ کا بہترین متحقق قرار دیا:

﴿لِلْفُقَرَاءِ الَّذِينَ أُخْرِجُوا فِي سَيِّئِ الْأَيُّوبِ لَا يَسْتَطِعُونَ ضَرِيًّا فِي الْأَرْضِ إِنَّهُمْ إِلَّا هُنَّ أَعْنَيُّ أَهْلَهُمْ مِنَ التَّعْفِيفِ تَعْرُفُهُمْ بِإِيمَانِهِمْ لَا يَسْكُنُونَ الْأَنَاسِ إِلَّا فَاطِمَةٌ﴾ (۲/ البقرہ: ۲۷۳)

”صدقة ان فقراء کے لئے ہے جو خدا کی راہ میں گھرے ہوئے ہیں۔“ (بغرض معاش و تجارت) سفر کی قدرت نہیں رکھتے جو لوگ ان سے ناواقف ہیں، خودداری اور عدم سوال کی وجہ سے ان کو مالدار سمجھتے ہیں، تم صرف ان کے بشرہ سے ان کو پہچانتے ہو، وہ لوگوں سے گزر گرا کر کچھ نہیں مانگتے۔“

آج مسلمانوں نے اس اصول کو چھوڑ دیا ہے، جس کا یہ نتیجہ ہے کہ سینکڑوں شریف آدمی در در کی شکوہ کریں کھاتے ہیں اور قوم اور خاندان کا نام بیچتے ہیں۔

۵۳ لیکن با ایس ہمسہ جرم و اعتیاٹ لگا اگری درحقیقت ایک نہایت مبتدل شیوه ہے، اس بنا پر اسلام نے سخت مجبوری کی حالت میں اس کی اجازت دی اور جہاں تک ممکن ہو الوگوں کو اس سے باز رکھنے کی کوشش کی ہے۔ چنانچہ آنحضرت ﷺ نے بعضوں سے اس کی بیعت بھی لی کہ وہ کسی سے کچھ نہیں مانگیں گے انہوں نے اس بیعت کی اس شدت سے پابندی کی کہ راستے میں اگر ان میں سے کسی کا کوڑا اگر جاتا تھا تو بھی وہ کسی سے نہیں کہتے تھے کہ اٹھا دو۔ * ایک دفعہ آپ ﷺ نے فرمایا: ”جو شخص مجھ سے یہ ضمانت کرے کہ وہ کسی سے مانگے گا نہیں تو میں اس کے لئے جنت کی ضمانت کرتا ہوں۔“ آپ کے آزاد کردہ غلام ثوبان بولے، میں یہ ضمانت کرتا ہوں۔ چنانچہ اس کے بعد وہ کبھی کسی سے کچھ نہیں مانگتے تھے۔ *

حکیم بن حرام رضی اللہ عنہ ایک صحابی تھے۔ انہوں نے ایک دفعہ آنحضرت ﷺ سے سوال کیا، آپ نے عنایت کیا، پھر مانگا، پھر دیا، پھر تیسری دفعہ یہ صورت پیش آئی تو فرمایا: ”اے حکیم! یہ مال بظاہر نہایت شیرین اور خوش رنگ چیز ہے، جو اس کو شرافت کے ساتھ لے گا اس کو اس میں برکت دی جائے گی اور جو لائج کے ساتھ لے گا اس کو برکت نہ ملے گی اور اس کی حالت ایسی ہوگی جیسے کوئی کھاتا چلا جائے اور اس کا پیٹ نہ بھرے، اور کہا تھے یچھے کے ہاتھ سے بہتر ہے۔“ حکیم نے کہا، یا رسول اللہ! آج سے میں پھر کسی سے کچھ نہ

ابوداؤد، کتاب الزکوٰۃ، باب کراہیۃ المسئلۃ: ۱۶۴۲۔ ۲ ایضاً: ۱۶۴۳۔

مالگوں گا۔ اس کے بعد ان کا یہ حال ہوا کہ خلافت راشدہ کے زمانہ میں خلفا ان کو اپنا وظیفہ لینے کے لئے بلا تھے اور وہ انکار کرتے رہے اور آخوندک اس انکار پر قائم رہے۔ ❶

اس کی اور متعدد مثالیں ہیں اس عمومی ممانعت کے ساتھ خصوصیت سے ان تمام لوگوں کے لئے جو صاحب دست و بازو ہوں، یعنی جن کے ہاتھ پاؤں اور آنکھیں صحیح و سالم ہوں، بھیک مانگنے سے ختم ممانعت کر دی گئی، فرمایا کہ

((لا تحل الصدقة لغنى ولا للذى مرّة سويٰ)) ❷

”غیر محتاج اور صحیح و سالم آدمی کے لئے بھیک مانگنا حلال نہیں۔“

صحیح بخاری میں ہے کہ، آپ ﷺ نے فرمایا:

((والذى نفسي بيده لأن يأخذ أحدكم حبله فيحتطب على ظهره خير له من

ان يأتي رجالاً فيسألـه أعطاءه أو منعه)) ❸

”قتم ہے اس ذات کی جس کے ہاتھ میں میری جان ہے کہ تم میں کسی کاری لے کر اپنی پیچھے پر لکڑی کا بوجھا ٹھانا، اس سے بہتر ہے کہ دوسرا سے بھیک مانگنے وہ اسے دے یا نہ دے۔“

آنحضرت ﷺ نے اپنے زمانہ میں اس پر عمل بھی فرمایا۔ ایک دست گمراحتی نے خیرات مانگی آپ ﷺ نے فرمایا: ”تمہارے پاس کچھ ہے؟“ عرض کی، ایک ناث اور ایک پیالہ ہے۔ آپ نے ان کو منگو کر نیلام کیا اور ان کی قیمت سے ایک کلہاڑی خرید دی اور فرمایا کہ ”جنگل سے لکڑی کاٹ لاؤ اور پہنچو۔“ انہوں نے اس پر عمل کیا تو خدا نے ان کو یہ برکت دی کہ وہ گداگری کی ذلت سے ہمیشہ کے لئے بیج گئے۔ ❹

❻ لیکن جو لوگ بد قسمی سے کسب معاش نہیں کر سکتے۔ ان کو بھی الحاج، کثرت سوال، بجاجت اور گزگز اکر زبردستی مانگنے کی نہایت سختی کے ساتھ ممانعت کی، آپ ﷺ نے فرمایا:

((ليس المـسـكـيـنـ الـذـى تـدـىـ الاـ كـلـةـ وـالـاـ كـلـتـانـ وـلـكـنـ المـسـكـيـنـ الـذـى لـيـسـ

لـهـ غـنـىـ وـيـسـتـحـىـ اوـ لـاـ يـسـأـلـ النـاسـ الـحـافـاـ)) ❺

”مـکـيـنـ وـنـهـيـنـ ہـےـ جـسـ کـلـقـمـهـ دـلـقـهـ درـواـزـوـںـ سـےـ واـپـسـ لـوـٹـادـیـتـیـ ہـیـںـ۔ مـسـكـيـنـ وـہـ ہـےـ جـوـگـوـ بـےـ نـیـازـ نـہـیـنـ ہـےـ، لـیـکـنـ حـیـاـ کـرـتـاـ ہـےـ اـوـ لـوـگـوـںـ سـےـ گـرـگـرـاـ کـرـنـیـںـ مـانـگـتـاـ۔“

پھر یہ بھی بتا دیا کہ گداگری اور بھیک کا طریقہ جو سخت مجبوری کی حالت کے علاوہ ہو، وہ ہر حال میں

❶ صحیح بخاری، کتاب الزکوة، باب الاستعفاف عن المسئلة: ۱۴۷۲۔ ❷ ترمذی، کتاب الزکوة، باب ما جاءه من لا تحل له الصدقة: ۱۵۲۔ ❸ کتاب الزکوة، باب الاستعفاف عن المسئلة: ۱۴۷۰۔

❹ ابو داود، کتاب الزکوة، باب ماتجور فيه المسئلة: ۱۶۴۱۔

❺ بخاری، کتاب الزکوة، باب قول الله عزوجل: لا يسألوب الناس الحافا: ۱۴۷۶۔

انسان کی شرم و حیا اور غیرت و آبرو کو برپا کر دیتا ہے، فرمایا:

((ما زال الرَّجُلُ يَسْأَلُ النَّاسَ حَتَّىٰ يَأْتِي يَوْمُ الْقِيَامَةِ لَيْسَ فِي وِجْهِهِ مَزْعَةٌ
لَّهُمَّ))

”آدمی ہمیشہ مالکتا پھرتا ہے، یہاں تک کہ وہ قیامت کے روز اس طرح آئے گا کہ اس کے
چہرہ پر گوشت کا ایک ٹکڑا نہ ہو گا۔“

یہ اس کی سزا ہو گی کہ اس نے دنیا میں مالک مالک کرائے چہرے سے عزت و آبرو کی رونق خود ہو دی تھی۔

ان ضروری اصلاحات کے ساتھ اسلام نے زکوٰۃ کے نظام کو قائم کیا اور ان تمام برائیوں اور
بداخلاقوں کی جڑ کاٹ دی جو اس مفت خوری سے انسانوں میں پیدا ہو سکتی تھیں اور ساتھ ہی انسانی برادری
کے دونوں طبقوں کو ترازو کے پلڑے میں برابر کر کر ان کو باہمی معاونت، باہمی مشارکت، باہمی ہمدردی اور
امداد کا سبق سکھایا اور اس طرح پوری جماعت انسانی کو باہم جوڑ کر ایک کر دیا۔ پست ولند کے تفرقة ممکن حد
تک کم کر دیے اور اس اقتصادی بر بادی سے جماعت کو محفوظ رکھنے کا طریقہ بتادیا جو اکثر اپنی بھیانک شکلوں
سے اس کو ڈرایا کرتی ہے۔

آنحضرت ﷺ کی اس تعلیم کا نتیجہ یہ ہوا کہ دولت مند صحابہ رضی اللہ عنہم میں یہ فیاضی آگئی کہ وہ دین و ملت
کی خدمت کے لئے اپنی ساری دولت اتنا کر بھی سیرہ ہوتے تھے اور غریب صحابیوں میں یہ تقاضت اور خودداری
پیدا ہو گئی کہ وہ کسی کسی کام کا سوال کرنا بھی عیب سمجھتے تھے۔ دولت مند اپنی زکوٰۃ آپ لے کر بیت المال
کے دروازوں تک خود آتے تھے اور غریب اپنے افلاس و حاجت کو خدا کے سواد و سروں کے سامنے پیش کرنا
تو کل کے منافی سمجھتے تھے اور تیسری طرف آنحضرت ﷺ کے بعد جب فراغت آئی تو جماعت کے بیت
المال میں اتنا سرما یہ رہتا تھا کہ زکوٰۃ کے کسی مصروف کے لئے کمی محسوس نہیں ہوتی تھی۔ ضرورت مندوں کو
اسی رقم سے قرض بھی دیا جاتا تھا ۱ اس طرح یہ ایک ایسا مالی و اقتصادی نظام تھا کہ بلا فرع قرض دینے میں انہوں کو
جو تمل ہوتا ہے، وہ اس جماعتی نظام کے ماتحت آسان تھا اور سود کی لعنت کے بغیر داد دست کار استہ کھلا ہوا تھا۔

۱ بخاری، کتاب الزکوٰۃ، باب من سأل الناس تكثراً ۱۴۷۴:-
۲ تفسیر کبیر، سورہ توبہ، ج ۴، ص: ۶۸۱۔

روزہ

﴿كِتَابٌ عَلَيْكُمُ الصِّيَامُ﴾ (٢/ البقرة: ١٨٣)

روزہ کا مفہوم

روزہ اسلام کی عبادت کا تیسرا رکن ہے، عربی میں اس کو صوم کہتے ہیں، جس کے لفظی معنی رکنے اور چپ رہنے کے ہیں۔ بعض مفسرین کی تفاسیر کے مطابق قرآن پاک میں اس کو کہیں کہیں ”صبر“ بھی کہا گیا ہے، جس کے معنی ضبط نفس، ثابت قدی اور استقلال کے ہیں۔ ان معنوں سے ظاہر ہوتا ہے کہ اسلام کی زبان میں روزہ کا کیا مفہوم ہے؟ وہ درحقیقت نفسانی ہوا وہ سو اور یہی خواہشون سے اپنے آپ کو روکنے اور حرص و ہوا کے ذمگانیے والے موقعوں میں اپنے آپ کو ضابط اور ثابت قدم رکھنے کا نام ہے۔ روزانہ استعمال میں عام طور سے نفسانی خواہشون اور انسانی حرص و ہوا کا مظہر تین چیزیں ہیں، یعنی کھانا، پینا اور عورت و مرد کے جنسی تعلقات، انہیں سے ایک مدت متعینہ تک رکے رہنے کا نام شرعاً روزہ ہے۔ لیکن دراصل ان ظاہری خواہشون کے ساتھ باطنی خواہشون اور برائیوں سے دل اور زبان کا محفوظ رکھنا بھی خواص کے زد یک روزہ کی حقیقت میں داخل ہے۔

روزہ کی ابتدائی تاریخ

روزہ کی ابتدائی تاریخ معلوم نہیں۔ انگلستان کا مشہور حکیم ہربرٹ اپنے راپنی تصنیف پر سید آف سوشیالوجی (اصول معاشرت) میں چند حصی قابل کی تمثیل اور استقرائی بنا پر قیاس کرتا ہے کہ روزہ کی ابتداء حاصل میں اسی طرح ہوئی ہو گی کہ لوگ دھشت کے زمانہ میں خود بھوکے رہتے ہوں گے اور سمجھتے ہوں گے کہ ہمارے بدلہ ہمارا کھانا اس طرح مردوزن کو تکمیل جاتا ہے۔ لیکن یہ قیاس ارباب خرد کی نگاہ میں سند قبول حاصل نہ کر سکا۔ بہر حال مشرکانہ مذاہب میں روزہ کی ابتداء اور حقیقت کے خواہ پچھتیں اسباب ہوں، لیکن اسلام کا روزہ اپنی ابتداء یا عایت کی تشریع میں اپنے پیروؤں کی وکالت کا تھانج نہیں، وہ بہ آواز بلند مدعا ہے:

﴿يَا أَيُّهَا الَّذِينَ أَمْنَوْا كِتَابَ عَلَيْكُمُ الصِّيَامُ كَمَا كِتَابَ عَلَى الَّذِينَ مِنْ قَبْلِكُمْ لَعَلَّكُمْ تَتَفَقَّنُونَ﴾ (٢/ البقرة: ١٨٣)

”مسلمانو! روزہ تم پر اسی طرح فرض ہوا جس طرح تم سے پہلی قوموں پر فرض کیا گیا، تا کہ تم

”پڑھیز گار بنو۔“

﴿شَهْرُ رَمَضَانَ الَّذِي أُنْزِلَ فِيهِ الْفُرْqَانُ هُدًى لِّلنَّاسِ وَرَحْمَةً مِّنَ الْهُدَى وَالْفُرْقَانِ فَمَنْ شَهَدَ مِنْكُمُ الشَّهْرَ فَلَيَصُمُّهُ وَمَنْ كَانَ مَرِيضًا أَوْ عَلَى سَفَرٍ فَعَدْدَهُ مِنْ أَيَّامٍ أُخْرَهُ يُرِيدُ اللَّهُ يَكُمُ الْيُسْرَ وَلَا يُرِيدُ يَكُمُ الْعُسْرَ وَلَيُكْلِمُوا الْعِدَّةَ وَلَيُشَكِّرُوا اللَّهَ عَلَى مَا هَدَى لَهُمْ

انسانیکلوپیڈیا بریتانیکا، ج ۱۰، ص: ۱۹۴ طبع ۱۱۔

وَلَعْلَكُمْ تَشَكُّرُونَ ﴿١٨٥﴾ (بقرة: ٢)

”ماہ رمضان وہ مہینہ ہے جس میں قرآن اتار گیا جو انسانوں کے لیے سرتاپا ہدایت، ہدایت کی دلیلیں اور حق و باطل میں فارق بن کے آیا تو جو اس رمضان کو پائے وہ اس مہینہ بھر کے روزہ رکھے، اور جو بیمار ہو یا سفر پر ہو وہ دوسرے دنوں میں رکھ لے۔ خدا آسانی چاہتا ہے سختی نہیں، تاکہ تم روزوں کی تعداد پوری کر سکو اور (یہ روزہ اس لیے فرض ہوا) تاکہ تم خدا کے اس ہدایت دینے پر اسکی بڑائی کرو اور تاکہ تم شکر بجالا و“

ان آیات پاک میں نہ صرف روزہ کے چند احکام بلکہ روزہ کی تاریخ، روزہ کی حقیقت، رمضان کی ہیئت اور روزہ پر اعتراض کا جواب یہ تمام امور مفصل بیان ہوئے ہیں، ذیل کے صفحات میں بترتیب ہم ان پر روشنی ڈالتے ہیں۔

روزہ کی مذہبی تاریخ

قرآن پاک نے ان آیتوں میں تصریح کی ہے کہ روزہ اسلام کے ساتھ مخصوص نہیں، بلکہ اسلام سے پہلے بھی وہ کل مذاہب کے مجموعہ احکام کا ایک جزو رہا ہے۔ جاہل عرب کا پیغمبر امی میں یعنی جو بقول مخالفین عالم کی تاریخ سے ناقص تھا، وہ مذہبی ہے کہ دنیا کے تمام مذاہب میں روزہ فرض عبادت رہا ہے۔ اگر یہ دعویٰ تمام ترسحت پر منی ہے تو اس کے علم کے مافق ذرائع میں کیا تکمیل رہ جاتا ہے؟ اس دعویٰ کی تصدیق میں یورپ کے محقق ترین مأخذ کا ہم حوالہ دیتے ہیں۔ اسی یکلوپیڈیا برٹائز کا مضمون نگار روزہ (فائلنگ) کے بارے میں لکھتا ہے:

”روزہ کے اصول اور طریقے گواہ و ہواتمیت و تہذیب اور گرد و پیش کے حالات کے اختلاف سے بہت کچھ مختلف ہیں، لیکن بہ مشکل کسی ایسے مذہب کا نام ہم لے سکتے ہیں، جس کے مذہبی نظام میں روزہ مطلقاً تسلیم نہ کیا گیا ہو۔“

آگے چل کر لکھتا ہے:

”گوکر روزہ ایک مذہبی رسم کی حیثیت سے ہر جگہ موجود ہے۔“

ہندوستان کو سب سے زیادہ قدامت کا دعویٰ ہے، لیکن بریت یعنی روزہ سے وہ بھی آزاد نہیں، ہر ہندی مہینہ کی گیارہ بارہ کو برہمنوں پر اکا دشی کا روزہ ہے۔ اس حساب سے سال میں چوٹیں روزے ہوئے۔ بعض برہمن کا تکمیل کے مہینے میں ہر دو شنبہ کو روزہ رکھتے ہیں۔ ہندو جوگی چلہ کشی کرتے ہیں، یعنی چالیس دن تک اکل و شرب سے احتراز کرتے ہیں۔ ہندوستان کے تمام مذاہب میں جیتنی دھرم میں روزہ کے سخت شرائط ہیں۔ چالیس چالیس دن تک کا ان کے یہاں ایک روزہ ہوتا ہے۔ گجرات و دکن میں ہر سال جیتنی کئی کئی ہفتہ کا

روزہ رکھتے ہیں۔ قدیم مصریوں کے ہاں بھی روزہ دیگر مذہبی تہواروں کے شمول میں نظر آتا ہے۔ یونان میں صرف عورتیں قسموفیریا کی تیسری تاریخ کو روزے رکھتی ہیں، پارسی مذہب میں گو عام پیروں کی پر روزہ فرض نہیں لیکن ان کی الہامی کتاب کی ایک آیت سے ثابت ہوتا ہے کہ روزہ کا حکم ان کے ہاں موجود تھا، خصوصاً مذہبی پیشواؤں کے لیے تو پنج سالہ روزہ ضروری تھا۔ **✿** یہودیوں میں بھی روزہ فریضۃ اللہی ہے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے کوہ طور پر چالیس دن بھوکے پیاسے گزارے۔ (خرود ۳۲-۱۲۸) العهد القديم، ص: ۱۳۵) چنانچہ عام طور سے یہود حضرت موسیٰ علیہ السلام کی پیروی میں چالیس دن روزہ رکھنا اچھا سمجھتے ہیں۔ لیکن چالیس دن کا روزہ ان پر فرض ہے۔ جوان کے ساتوں مہینہ (تشرین) کی دسویں تاریخ کو پڑتا ہے اور اسی لیے اس کو عاشورہ (دسوں) کہتے ہیں۔ بھی عاشورا کا دن وہ دن تھا جس میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کو تورات کے دس احکام عنایت ہوئے تھے۔ اسی لیے تورات میں اس دن کے روزہ کی نہایت تاکید آئی ہے۔ **✿** اس کے علاوہ یہودی صحیفوں میں اور دوسرے روزوں کے احکام بھی بصریت مذکور ہیں۔ **✿**

عیسائی مذہب میں آکر بھی ہم کو روزوں سے دوچار ہونا پڑتا ہے۔ چنانچہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے بھی چالیس دن تک جنگل میں روزہ رکھا۔ **✿** حضرت یسوع علیہ السلام جو حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے گویا پیشوڑ تھے، وہ بھی روزہ رکھتے تھے اور ان کی امت بھی روزہ دار تھی۔ **✿** یہود نے مختلف زمانوں میں مختلف واقعات کی یادگار میں بہت سے روزے بڑھا لیے تھے اور وہ زیادہ تر غم کے روزے تھے اور اس غم کو ظاہر کرنے کے لیے اپنی ظاہری صورت کو بھی وہ اداں اور غمگین بنا لیتے تھے **✿** حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے اپنے زمانے میں غم کے ان مصنوعی روزوں کو منع کر دیا۔ غالباً اسی قسم کے کسی روزہ کا موقع تھا کہ بعض یہودیوں نے آکر حضرت عیسیٰ علیہ السلام پر اعتراض کیا کہ بڑے شاگردیوں روزہ نہیں رکھتے۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے اس کے جواب میں فرمایا:

”کیا برائی جب تک دولہا ان کے ساتھ ہے، روزہ رکھ سکتے ہیں، جب تک دولہا ان کے پاس ہے، روزہ نہیں رکھ سکتے پر وہ دن آئیں گے کہ جب دولہا ان سے جدا کیا جائے گا، تب انہیں دنوں میں روزہ رکھیں گے۔“ (مرقس ۱۸-۲۹ و ۲۰ العہد الجدید، ص: ۵۹)

اس تلمیح میں دولہا سے مقصود خود حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی ذات مبارک اور برائی سے مقصود ان کے پیروں اور حواری ہیں، ظاہر ہے کہ جب تک پیغمبر علیہ السلام اپنی امت میں موجود ہے، امت کو غم منانے کی ضرورت نہیں۔ انہیں فقردوں سے ظاہر ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے موسوی شریعت کے فرض و مستحب روزوں کو نہیں بلکہ غم کے

❶ ان تمام حوالوں کے لیے دیکھو ان کا یک پیدا یا برائی کا جلد، صفحہ: ۱۹۳، ۱۹۷، ۱۹۸، ۱۹۹ طبع یازدهم۔ **❷** سورات، سفر الاخبار:

۱۶-۲۹، ۳۴-۲۴ و ۲۷-۲۲، ص: ۱۹۶ (لاؤین) العہد القديم، ص: ۱۷۵۔ **❸** سموائل اول: ۶-۷

العہد القديم، ص: ۴۳۶ ویرمیا: ۳۶-۶، ص: ۱۱۳۴۔ **❹** متى: ۴-۲، العہد الجدید، ص: ۶-۷

❺ مرقس: ۲-۱۸، العہد الجدید، ص: ۵۹۔ **❻** قضاۃ: ۲۰-۲۶، ص: ۱۶۴ (العہد القديم) سموائل اول: ۶-۷

العہد القديم، ص: ۴۳۶ و ۳۱-۳۲، ص: ۴۸۱ ولو قاف: ۶-۱۶ وغیرہ۔

مبتدعانہ روزوں کو منع فرمایا۔ انہوں نے خود اپنے پیر و دل کو بے ریا اور مخلصانہ روزہ رکھنے کی نصیحت فرمائی ہے، چنانچہ آپ اپنے حواریوں کو فرماتے ہیں:

”پھر جب تم روزہ رکھو یا کاروں کی مانند اپنا چہرہ اداں نہ بناؤ، کیوں کہ وہ اپنا منہ بگاڑتے ہیں کہ لوگوں کے نزدیک روزہ دار ٹھہریں، میں تم سے سچ کہتا ہوں کہ وہ اپنا بدلہ پا چکے، پر جب تم روزہ رکھو اپنے سر میں تیل لگاؤ اور منہ دھوو، تاکہ تم آدمی پر نہیں بلکہ اپنے باپ پر جو پوشیدہ ہے، روزہ دار ظاہر ہو اور تیرا باپ جو پوشیدگی میں دیکھتا ہے تھجھ کو آشکارا بدلہ دے۔“ (متین ۱۶۔ ۱۷ و ۱۸ العهد)

الجديد، ص: (۱۱)

ایک دوسرے مقام پر حضرت عینی علیہ السلام سے ان کے شاگرد پوچھتے ہیں کہ ہم پلیدروں کو کس طرح نکال سکتے ہیں۔ وہ اس کے جواب میں فرماتے ہیں:

”یہ جس سوائے دعا اور روزہ کے کسی اور طرح نہیں ملک سکتی۔“ (متین ۲۱۔ ۲۲ العهد الجديد: ۳۲) اہل عرب بھی اسلام کے پہلے سے روزہ سے کچھ نہ کچھ منوس تھے۔ مکہ کے قریش جاہلیت کے دنوں میں عاشورا (یعنی دسویں محرم کو) اس لیے روزہ رکھتے تھے کہ اس دن خانہ کعبہ پر نیا غلاف ڈالا جاتا تھا۔ مدینہ میں یہود اپنا عاشورا الگ مناتے تھے۔ یعنی وہی اپنے ساتویں مہینہ کی دسویں تاریخ کو روزہ رکھتے تھے۔ ان تصریحات سے ثابت ہو گا کہ قرآن کی یہ آیت:

﴿كُتِبَ عَلَيْهِمُ الصِّيَامُ كَمَا كُتِبَ عَلَى الَّذِينَ هُنَّ قَبْلُكُمْ﴾ (۲/ البقرة: ۱۸۳)

”مسلمانو! تم پر روزہ اس طرح کھسا گیا جس طرح تم سے پہلوں پر لکھا گیا۔“
کس قدر تاریخی صداقت پرمنی ہے۔
روزہ کی حقیقت

انسان کی ہر قسم کی روحانی بدجھتوں اور ناکامیوں کے علل و اسباب کی اگر تحلیل کی جائے تو آخری نتیجہ یہ نکلے گا وہ دنیا میں مختلف ضرورتوں کا محتاج ہے۔ وہ مختلف اغراض کا پابند ہے۔ اس کے دل کی کوئی جنس اور اس کے عضو کی کوئی کوشش ضرورت اور غرض سے خالی نہیں۔ اخلاق جس کا ایک حد تک روحانیت سے تعلق ہے۔ اگر تحقیق کی جائے تو اس کی بینا بھی عموماً کسی ضرورت یا غرض انسانی پر منظر آئے گی، اس لیے ہماری ہر قسم کی بدجھتیاں اور آسودگیاں صرف ایک ہی علت کا نتیجہ ہیں، ضرورت اور غرض۔ اگر انسان ہر چیز سے بے نیاز ہو جائے تو وہ انسان نہیں فرشتہ ہے۔ قابل غور امر یہ ہے کہ انسان کی ضرورتوں اور اس کے مختلف اغراض و مقاصد کا جو ایک وسیع اور غیر متناہی سلسلہ نظر آتا ہے، اس کی اصل حقیقت کتنی ہے؟ ہمارے دل میں آرزوں کا ایک ڈھیر ہے۔ تھناوں کی ایک بھیڑ ہے اور خود ساختہ ضرورتوں کا ایک ابزار ہے۔ لیکن کیا خوشناس کپڑوں، عالی

١) مسند احمد، ج ۶، ص: ۲۴۴۔ ۲) صحیح بخاری، کتاب الصوم، باب صوم یوم عاشوراء: ۲۰۰۴، ۲۰۰۵۔

شان عمارتوں لذیذ غذاوں اور تیز رفتار سواریوں کے بغیر ہم جی نہیں سکتے؟ فرزند و عیال، زرمال اور خدم و حشم سے اگر ہمارے کاشانے خالی ہوں تو کیا ہماری زندگی کا خاتمہ ہو جائے گا؟ بادشاہوں نے فقروں کی زندگی برکی اور زندہ رہے ہیں، برولیتِ عام اپر ایم او ہم بادشاہ سے فقیر ہو گئے اور نہایت پرسرت روحاںی زندگی برکی۔

خود ساختہ ضرورتوں کی نفعی اور تحلیل کے بعد شاید انسانی حقیقی ضرورتوں کا وسیع دائرہ ایک دونظوظوں میں محدود ہو کر رہ جائے اور وہ مایہ قوت و غذا یعنی کھانا اور پینا ہے جس کے بغیر انسان زندہ نہیں رہ سکتا، روح اور جان کا جسم میں باقی رہنا صرف سدہ رمق پر موقوف ہے اور سدہ رمق صرف کھانے کے چند لقموں اور پانی کے چند گھونٹوں پر موقوف ہے اور جی یہ ہے کہ اس کے بعد کی تمام انسانی ضرورتوں کا مولد و منشا انہیں چند لقموں اور چند گھونٹوں میں افراط و سمعت تلفن اور تیش کا نتیجہ ہے۔ اس بنا پر ایک انسان اور ایک فرشته یعنی عالم ناسوت اور عالم ملکوت کے دو باشندوں میں اگر فرق و امتیاز کی دیوار قائم کی جائے تو صرف یہی چیز تمام فروق و امتیاز کو محیط ہو گی۔ انسان کے تمام جرائم اور گناہوں کی فہرست اگر تیار کی جائے اور اس کی حرص و ہوس اور قتل و خونریزی کے آخری اسباب ڈھونڈھے جائیں تو انہیں دو چیزوں کے افراط اور تیش کی مزید طلب اس سلسلہ کی آخری کڑی ہو گی۔ اس بنا پر دنیا کے تمام مذاہب میں مادیات کی کثافتوں سے بری اور پاک ہونے کے لیے اکل و شرب سے ایک حد تک امتناع اور پرہیز سب سے پہلی شرط رکھی گئی ہے، جس سے اصل مقصود یہ ہے کہ انسان رفتہ رفتہ اپنی ضرورتوں کا دائرہ کم کر دے اور آخر یہ کہ قوت و غذا کی طلب و حرص سے بھی بے نیازی کے لیے متواتر کوشش جاری رکھے کہ انسانوں کے تمام گناہ اور جرائم صرف اسی ایک قوت کے نتائج مابعد ہیں، اگر یہ طلب و ضرورت فتا ہو جائے تو ہم کو دھننا عالم ناسوت میں عالم ملکوت کی جھلک نظر آنے لگے، لیکن جب تک انسان انسان ہے، اس کو غذا سے قطعی بے نیازی ہونی ناممکن ہے۔ اسی بنا پر تمام مذاہب نے اس سے احتساب اور بے نیازی کی ایک مدت محدود کر دی ہے، اس مدت کے اندر انسانوں کو ایسے تمام انسانی ضروریات سے جن سے استغنا کسی تھوڑے زمانہ تک ممکن ہے۔ مجتبی ہو کر تھوڑی دیر کے لیے مائے اعلیٰ کی مقدس مخلوقات میں داخل ہو جانا چاہیے اور چونکہ ان مخلوقات کا فرض زندگی محض خدائے پاک کی اطاعت و عبادت ہے، اس لیے انسان بھی اتنی دیرینک اپنی زندگی کا حتی الامکان یہی فرض قرار دے۔

قرآن مجید نے ان تمام حقائق و رموز کو صرف ایک لفظ تقویٰ سے بے نقاب کر دیا ہے اور چونکہ روزہ کی یہ حقیقت تمام مذاہب میں مشترک تھی، اس بنا پر قرآن مجید نے دیگر مذاہب کو بھی اشارتاً اس حقیقت میں شریک کر لیا ہے:

﴿كُلُّتُ عَلَيْكُمُ الصِّيَامُ كُلُّتُبَ عَلَى الَّذِينَ مِنْ قَبْلِكُمْ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُونَ ﴾

”مسلمانوں اتم پر روزہ لکھا گیا جس طرح تم سے پہلی اموتوں پر لکھا گیا، تا کہ تم تقویٰ حاصل کرو۔“

روزہ کی غرض و غایت تقویٰ ہے، یعنی اپنی خواہشوں کو قابو میں رکھنا اور جذبات کے تلاطم سے اپنے کو بچا لینا، اس سے ظاہر ہوا کہ روزہ ہمارے لیے ایک قسم کے روحانی علاج کے طور پر فرض ہوا۔ لیکن آگے چل کر قرآن پاک اسلامی روزہ کی دو اور مخصوص حقیقتوں کو بھی واضح کرتا ہے۔ فرمایا:

﴿وَلَيَكُنْ لِّلَّهِ عَلَىٰ مَا هَدَيْتُمْ وَلَعَلَّمُتُمْ شَكْلَوْنَ ﴾ (۱۸۵) (آل البقرة: ۲)

”تا کہ خدا نے جو تم کو راہ دکھائی اس پر تم اس کی بڑائی کرو اور شکرا دا کرو۔“

اس مفہوم کی توضیح کے لیے ہم کو رمضان مبارک کی طرف رجوع کرنا پڑے گا۔

رمضان کی حقیقت

یہ ماڈی عالم جس طرح ماڈی نظام اور قانون کا پابند ہے، خدا نے پاک نے عالم روحانی میں بھی اسی قسم کا ایک اور نظام، قانون اور عمل و اسباب کا سلسلہ قائم کر رکھا ہے، جس طرح یقین کے ساتھ آپ یہ دعویٰ کر سکتے ہو کہ زہر انسان کے لیے قاتل ہے۔ اسی یقین کے ساتھ طب روحانی کا واقف کار کہتا ہے کہ گناہ انسان کی روح کو قتل کر دیتا ہے۔ پیغمبر فیضان نبوت کے قبول کے لیے اپنی روح میں کس طرح استعداد پیدا کرتا ہے۔ دنیا میں کب مجموعت ہوتا ہے۔ مجذرات کا ظہور اس سے کن اوقات میں ہوتا ہے اور اپنے دعویٰ کو وہ کس طرح پیش کرتا ہے۔ انکار و مراجحت پر وہ کیوں کر مہاجرۃ الی اللہ کرتا ہے اور پھر کیوں کر دعوت کے مکرنا کام و خسار اور الہ ایمان فلاح یا ب دکایا ب ہوتے ہیں، ان میں سے ہر ایک چیز مرتب اور منظم قواعد کے مطابق بر ترتیب ظہور میں آتی ہے۔ قرآن مجید میں تیرہ مقام پر سنتہ اللہ کا لفظ آیا ہے۔ لیکن ان میں زیادہ تر اسی روحانی نظام و ترتیب کی طرف اشارہ ہے۔ فلسفہ تاریخ جس طرح یا سی و اتفاقات کی تکرار اور حادث کے بار بار اعادہ سے اصول اور نتائج تک پہنچ کر ایک عام تاریخی قانون بنالیتا ہے۔ بالکل اسی طرح انبیاء ﷺ کے سوانح اور تاریخیں بھی اپنے اتفاقات کے بار بار کے اعادہ سے خصائص نبوت کا اصولی قانون ہمارے لیے مرتب کرتی ہیں۔ پیغمبر انتاریخ کے انہیں اصول و قوانین میں سے ایک یہ ہے کہ نبی جب اپنے کمال انسانیت کو پہنچ کر فیضان نبوت کے قبول اور استعداد کا انتظار کرتا ہے تو وہ ایک مدت تک کے لیے عالم انسانی سے الگ ہو کر ملکوتی خصائص میں جلوہ گر ہوتا ہے، اسی وقت سے اس کے دل و دماغ میں وحی الہی کا سرچشمہ موجود مارنے لگتا ہے۔ کوہ سینا کا پر جلال پیغمبر حضرت موسیٰ علیہ السلام جب توراۃ لینے جاتا ہے تو چالیس شبانہ روز بھوکا اور پیاسا سارہ تا ہے۔ کوہ سعیر کا مقدس آنے والا (حضرت عیسیٰ علیہ السلام) اس سے پہلے کہ اس کے مندیں انجلیل کی زبان گویا ہو، وہ چالیس روز و شب بھوکا اور پیاسا سارہ۔ اسی طرح فاران کا آتشین شریعت والا پیغمبر (حضرت علیہ السلام) نزول قرآن

* خروج: ۳۴، ۲۸، ص: ۱۴۵۔ ۲ متن: ۴۔ ۲: العهد الجديد، ص: ۶۔

سے پہلے پورا ایک مہینہ حرام مکہ کے ایک غار میں ہر قوم کی عبادتوں میں مصروف رہتا ہے اور بالآخر اسی اثنائیں ناموں اکبر «إِقْرَأْ يَا سُلْطَانَكَ الَّذِي خَلَقَ» کا مرشدہ جانفزا لے کر نمودار ہوتا ہے۔ یہ واقعہ کس ماہ مبارک کا تھا؟

﴿شَهْرُ رَمَضَانَ الَّذِي أُنْزِلَ فِيهِ الْقُرْآنُ﴾ (۲/ البقرة: ۱۸۵)

”رمضان کا وہ مہینہ جس میں قرآن اتراء“

یہ کس شبِ اقدس کی داستان ہے؟

﴿إِنَّا أَنْزَلْنَاهُ فِي لَيْلَةٍ مُّبِيرَةٍ﴾ (۴۴/ الدخان: ۳)

”ہم نے قرآن کو ایک برکت والی رات میں اتراء۔“

اس مبارک شب کو ہم کس نام سے جانتے ہیں؟

﴿إِنَّا أَنْزَلْنَاهُ فِي لَيْلَةٍ الْقُدْرَةِ﴾ (۹۷/ القدر: ۱)

”ہم نے قرآن کو شبِ قدر میں اتراء۔“

ان آجیوں سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ رمضان وہ مقدس مہینہ ہے، جس میں قرآن سب سے پہلی بار دنیا میں نازل ہوا اور پیغمبر امی علیہ السلام کو عالم کی راہنمائی اور انسانوں کی دشگیری کے لیے دستور نامہ الہی کا سب سے پہلا صفحہ عنایت کیا گیا۔ قرآن کا حائل اور اس وجی الہی کا مہبٹ۔ ان دونوں ایک غار کے کونے میں یکدی وہنا بھوکا اور پیاسا سر بر زانو تھا۔ اس بناء پر اس ماہ مقدس میں بھوکا اور پیاسا سارہنا (روزہ) کسی عبادت گاہ میں یکدی وہنا رہنا (اعتكاف) نزول وجی کی رات میں (لیلۃ القدر) بیدار و سر بخود رہتا تمام پیروانِ محمدی ﷺ کے لیے ضروری تھا کہ

﴿إِنْ كُلُّ نُوحٍ مُّجْهُونٌ اللَّهُ فَإِنَّمَا يُعَوِّنُ يُحِبِّبُكُمُ اللَّهُ﴾ (۳/آل عمران: ۳۱)

”اگر خدا کو پیار کرتے ہو تو میری پیروی کرو، خدا تمہیں پیار کرے گا۔“

اُس سے واضح ہوتا ہے کہ روزہ، اعتكاف اور لیلۃ القدر کی حقیقت اسلام میں کیا ہے؟ اور رمضان مبارک میں روزوں کی تخصیص اسلام میں کس بناء پر ہے؟ اس لیے اس ماہِ قدس میں بذریعہ امکان انہیں حالات و جذبات میں تنکیف ہونا چاہیے، جس میں وہ حامل قرآن متفکف تھا، تاکہ وہ دنیا کی ہدایت یا بی اور راہنمائی کی

• صحیح بخاری، کتاب بدء الوضیع، آیک ماہ کا بیان صحیح مسلم، کتاب الایمان، باب بدء الوضیع: ۴۰۹، ۴۰۳ میں اور سیرۃ ابن هشام بدء بعثۃ، ج ۱، ص: ۱۵۰ میں ہے۔

• روایت سے اگرچہ تقریباً یہ نہیں معلوم ہوتا کہ آپ غارِ حرام میں روزے رکھتے تھے، تاہم قرآن و اشارات سے سمجھا جاتا ہے کہ آپ اور عبادت کے ساتھ غارِ حرام میں روزے بھی رکھتے تھے۔ جیسا کہ بخاری (بدء الوضیع) اور سیرۃ ابن هشام سے واضح ہے کہ آپ ان دنوں میں تحنت اور اعتكاف کرتے تھے جس کا ایک جزو ہے۔ آج تک کے بعض علمائے مصطفیٰ نے بھی ان قرآن سے بھی سمجھا ہے کہ آپ ان دنوں روزے سے رنجیت تھے۔ (دیکھو خضری مصری کی تاریخ تصریح الاسلامی، صفحہ ۲۶ و صفحہ ۳۱)۔

یادگار تاریخ ہو۔ یہ جذبات دحالت جن کو قرآن کے مبلغ کی پیروی میں ہم اپنے اوپر طاری کرتے ہیں، یہی اس ہدایت کے ملنے پر ہماری شکرگزاری اور خدا کی بڑائی ہے۔

فرضیت صیام کا مناسب موقع ۲۲

اگر اسلامی عبادات کا قالب روح سے خالی ہوتا اور ان سے صرف جسم کی ریاضت مقصود ہوتی تو نماز سے پہلے روزہ فرض کیا جاتا، روزہ عرف عام میں فاقہ کشی کا نام ہے اور عرب کو ملک کی اقتصادی حالت کی وجہ سے اکثر یہ سعادت نصیب ہو جایا کرتی ہے۔ ظہور اسلام کے بعد کفار نے مسلمانوں کو جن پر یثانیوں میں بتلا کر دیا تھا۔ اس نے ان کو عرب کے معمولی طریقہ کسب معاش کی طرف سے بھی غیر مطمئن کر دیا تھا، جن لوگوں نے آنحضرت ﷺ کی حمایت کی تھی تمام قبائل نے ان سے تمدنی تعلقات منقطع کر لیے تھے، اس حالت میں صرف روزہ ایک ایسا فریضہ تھا، جو عرب کی عام حالت اور مسلمانوں کی موجودہ زندگی کے لیے موزوں ہو سکتا تھا۔ نمازو حج کی طرح اس میں کسی قسم کی مراحت کا بھی اندر یہ نہ تھا، وہ ایک خاموش طریقہ عبادت تھا، جو بلا روک نوک جاری رہ سکتا تھا۔ لیکن اسلام نے عبادات کو امراض رو حانی کی دو قرار دیا ہے، جن کا استعمال صرف اس وقت ہو سکتا ہے جب امراض رو حانی پیدا ہو جاتے ہیں یا ان کے پیدا ہونے کا زمانہ شروع ہوتا ہے۔ قوائے شہوانیہ اور زخارف دنیا کی شیفتشی اور لذات ہی کے انہاں دوغل سے جو رو حانی مرض پیدا ہو سکتے تھے، مکہ میں یہ تمام ساز و سامان متفقہ تھے۔ بلکہ خود کفار کے جور و ستم نے ان جذبات کا استیصال کر دیا تھا۔ اس لیے وہاں اس رو حانی علاج کی ضرورت پیش نہیں آئی۔ آنحضرت ﷺ مدینہ میں تشریف لائے تو کفار کے مظالم سے نجات ملی۔ انصار کی ایثار فسی نے مسلمانوں کو بوجہ کاف سے بے نیاز کر دیا۔ فتوحات کا سلسہ بھی شروع ہوا اور اس میں روز بروز وسعت پیدا ہوتی گئی، اب وہ وقت آگیا عنقریب آئے والا تھا کہ دنیا اپنی اصلی صورت میں مسلمانوں کے سامنے آ کر ان کو اپنا فریضہ بتائے اس لیے درحقیقت یہ داخل کا موسم تھا، جس میں مرض کے پیدا ہونے سے پیشتر پر ہیز کی ضرورت تھی اور وہ پر ہیز روزہ تھا جو ۲۲ ھی میں فرض ہوا۔

● اس سے یہ شبہ دور ہو جاتا ہے جو بعض ناواقفوں کو ہوا ہے کہ چونکہ آغاز اسلام میں مسلمانوں کو اکثر فاقوں سے دوچار ہونا پڑتا تھا، اس لیے ان کو روزہ کا خوگر کیا گیا، حالانکہ اصول اسلام کی رو سے فاقہ مستوں کو روزہ کی جتنی ضرورت ہے۔ شکم سیروں کے لیے وہ اس سے زیادہ ضروری ہے۔ علامہ ابن قیم نے زاد المعاد میں لکھا ہے کہ مرغوبات شہوانیہ کا ترک کرنا نہایت مشکل کام تھا، اس لیے روزہ و سط اسلام میں فرض کیا گیا جب کہ لوگ تو حید نماز اور احکام قرآنی کے خوگر ہو چکے تھے۔ اس لیے احکام کا یہ اضافہ اسی زمانے کے لیے موزوں تھا۔

● تاریخ ابن جریر طبری و اتعاب ۳ هجری، ص: ۱۲۸۱ اوزرقانی بر موسیٰ بہبج، ج ۱، ص: ۲۷۷ مصر، وزاد العاد ابن قیم ج ۱، ص: ۱۵۸۔

● زاد المعاد، ج ۱، ص: ۱۵۸۔

ایامِ روزہ کی تحدید روزہ ایک فرض کی دوائے اور دوائے بقدر دوائے ہی ہونا چاہیے تھا، اگر پورا سال اس دوائے میں صرف کردیا جاتا تو یہ ایک غیر طبعی علاج ہوتا اور مسلمانوں کی جسمانی جدوجہد کا خاتمه ہو جاتا اور ان کی شکنگی مزاج مث جاتی جو عبادات کا اثر قبول کرتی ہے، لیکن اگر ایک دو روز کا نیگ اور محدود زمانہ رکھا جاتا تو یہ اتنی کم مدت تھی کہ اس میں دوا کا فائدہ بھی ظاہرنہ ہوتا، اس لیے اسلام نے روزہ کے لیے سال کے ۱۲ مہینوں میں سے صرف ایک مہینہ کا زمانہ اس کے لیے مقرر کیا اس ایک مہینہ کی تخصیص کی بھی ضرورت تھی، تاکہ تمام افراد امت بیک وقت اس فرض کو ادا کر کے اسلام کے نظام وحدت کا مظاہرہ کریں اور اس کے لیے وہی زمانہ موزوں تھا، جس میں خود قرآن نازل ہونا شروع ہوا۔ یعنی رمضان چنانچہ آخر حضرت ﷺ اس کے بعد جب تک زندہ رہے اور تمام صحابے نے یہ مہینہ مہینہ روزہ میں گزارا اور آج تک کل امت محمد یہ پوری دنیا میں اسی مہینہ کو ماہ صیام مانتی ہے اور پورے مہینہ بھر حسب توفیق روزہ رکھتی ہے۔ چونکہ روزہ بہر حال مشقت کی چیز ہے، اس لیے قرآن پاک میں ماہ رمضان کے روزوں کی تحدید اور فرضیت نہایت بلاغت کے ساتھ مدد رتیگی طور سے کی گئی ہے، تاکہ نفس انسانی آہستہ آہستہ اس اہم ذمہ داری کو اٹھانے کے قابل ہو۔ پہلے تو زمانہ کی تخصیص کے بغیر یہ کہا گیا ہے:

﴿يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا إِذْ تَبَعَّذُ عَلَيْكُمُ الصِّيَامُ﴾ (۲/ البقرة: ۱۸۳)

”اے ایمان والو! تم پر روزہ فرض کیا گیا ہے۔“

اس کے بعد تسلی دی گئی کہ یہ کچھ تم ہی پر اسکیے فرض نہیں کیا گیا بلکہ

﴿كَمَا أَتَيْتَ عَلَى الَّذِينَ مِنْ قَبْلِكُمْ﴾ (۲/ البقرة: ۱۸۴)

”جیسا کہ تم سے پہلی قوموں پر بھی فرض کیا گیا تھا۔“

اب بھی مدت نہیں بتائی گئی، اس کے بعد فرمایا گیا:

﴿أَيَّامًا مَعْدُودَاتٍ﴾ (۲/ البقرة: ۱۸۴)

”چند گئے ہوئے دن۔“

مدت کی تعیین اب بھی نہیں، البتہ اس بلیغ انداز سے زمانہ صیام کی تخفیف کا ذکر کیا گیا، جس سے سننے والے پر فوراً بوجہ نہ پڑ جائے اور فرمایا چند گئے ہوئے دن۔ اس کے بعد اسلامی روزوں کی آسانیوں کا ذکر شروع کر دیا گیا، تاکہ طبیعت متوجہ رہے۔ فرمایا:

﴿فَإِنْ كَانَ مِنْكُمْ مُؤْمِنًا أَوْ عَلَى سَفَرٍ فَعَذَّلَهُ اللَّهُ أَيَّامًا أُخْرَى﴾ (۲/ البقرة: ۱۸۴)

”تو جو بیمار ہو با سفر ہو تو دوسرے دنوں کی گئی۔“

مگر اسی طرز ادا سے معلوم ہو گیا کہ یہ روز کے کسی ایک خاص زمانہ میں فرض ہوں گے کہ اگر خاص زمانہ ہوتا

تو یہ کہنا بے کار ہوتا کہ اگر تم بیمار یا مسافر ہو تو دوسرے دنوں میں رکھو، نیز یہ بھی اشارہ تاپتہ چلتا ہے کہ جو دن ہوں گے وہ گئے ہوئے مقرر ہوں گے، ورنہ «مَعْدُودَاتٍ» (گئے ہوئے) «إِعْدَادٌ مِّنْ أَيَّامٍ أُخْرَ» (دوسرے دنوں کی گئنی) اور پھر آگے چل کر «وَلْتُكُمْلُوا الْعِدَةَ» (تا کہ تم شمار کو پورا کرو) نہ کہا جاتا، پھر اس کے بعد دوسری آسانی بتائی:

﴿وَعَلَى الَّذِينَ يُطِيقُونَهُ فِي دِيَّةٍ طَعَامٌ مِّسْكِينٌ﴾ (۱۸۴/ البقرة)

”اور جو بمشکل روزہ رکھتا ہو وہ ایک مسکین کا کھانا فدیدے۔“

اب کہا جاتا ہے کہ مگر اس اجازت کے بعد بھی روزہ ہی رکھو تو بہتر ہے:

﴿فَإِنْ تَطَوعُ خَيْرًا فَهُوَ خَيْرٌ لَّهُ وَأَنْ تَصُومُوا خَيْرٌ لِّكُمْ إِنْ تَنْتَمْ تَعْلَمُونَ﴾ (۱۸۵/ البقرة)

(۱۸۴/ البقرة)

”تو جو کوئی شوق سے کوئی نیکی کرے، تو یہ بہتر ہے اس کے لیے اور روزہ رکھنا تمہارے لیے بہتر ہے، اگر تم جانو۔“

ان آئیوں میں دیکھئے کہ قضا اور کفارہ کی اجازت کے باوجود روزہ رکھنا محسن فرمایا اور روزہ کی اہمیت ظاہر کی اتنی تمهیدیوں کے بعد روزہ کے گئے ہوئے دنوں کی تیزیں کی جاتی ہے کہ وہ ایک مہینہ ہے اور جس کو ہلاک کر کے دکھانے کے لیے فرمایا گیا تھا کہ «أَيَّامًا مَعْدُودَاتٍ» چند گئے ہوئے دن ظاہر ہے کہ سال کے ۳۶۵ دنوں میں انیس اور تین دنوں کے روزے چند گئنی کے دن ہی تو ہیں۔ * بہر حال رمضان کو ما صیام قرار دینے سے پہلے اس مہینہ کی عظمت اور اہمیت بتائی گئی فرمایا:

﴿شَهْرُ رَمَضَانَ الَّذِي أُنزِلَ فِيهِ الْقُرْآنُ هُدًى لِّلْكَافِرِ وَبَيِّنَاتٍ لِّلْهُدِّيِّ وَالْفُرْقَانِ﴾

(۱۸۵/ البقرة)

”وہ رمضان کا مہینہ جس میں قرآن اتنا راگیا اس قرآن میں لوگوں کے لیے ہدایت ہے اور

* عربی زبان سے کوئی ناقص اگر یہ کہے کہ ایامِ حجت قلت ہے، جس کا اطلاق دس دنوں سے زیادہ پڑتی ہو تو اس کو چاہیے کہ ایامِ العرب کو جو تعداد میں پیکروں میں، زیادہ سے زیادہ نولے ایکیں میں محدود کر دے، اسی طرح قرآن میں اللہ تعالیٰ نے جہاں دنیا کے اور بڑارہ اتفاقات کو ایامِ اللہ کہا ہے (۱۲/ ابراءہم۔۵) ان کو نو تک کے اتفاقات عالم میں محدود کر دے، میکن سے شام تک کے سرہ زر است کو جو مہینوں میں طے ہوتے تھے، اللہ تعالیٰ نے احسان کے موقع پر چند دن اور چند راتیں فرمایا: (سَيِّدُوا فِي هَذَا لَيَلَى وَأَيَّامًا مِّنْهُنَّ) (۳۴/ السیا: ۱۸) اور (فِي الْأَيَّامِ الْعَالِيَّاتِ) (۶۹/ الحاقة: ۲۴) ”گزرے ہوئے دن۔“ جس کا اطلاق قرآن نے پوری انسانی عمر پر اور (وَيَلْكُمُ الْأَيَّامُ نَدَأْ وَلَهَا بَيْنَ النَّاسِ) (۳/ ال عمران: ۱۴۰) کو زمانہ کے برسوں اور صدیوں پر کیا ہے، وہ دنوں سے زیادہ نہ بڑھ سکیں، حجت قلت و کثرت کا یہ قاعدہ وہ بھی کلی نہیں، بلکہ عمومی ان الفاظ کے لیے ہے جن کی حجت قلت و کثرت دنوں مستعمل ہیں، یا ام کا لفظ ان میں نہیں، اس کی صرف ایک ہی حجت آتی ہے اور وہ ایام ہے، جو تغییل کے بعد ایام بولا جاتا ہے، سند کے لیے دیکھو رضی شرع کافی، جلد و مم، ص: ۱۵۵، جمع مکسر اور لسان العرب لظیفورم، ج ۳، ص: ۱۰۲۱۔

ہدایت اور حق و باطل کی تیزی کی دلیلیں ہیں۔“

اب وہ مناسب موقع آیا جس میں یہ فرمایا جائے کہ ان چند روزوں کے روزے اسی رمضان میں، جس کی عظمت ہے، تم پر فرض کیے گئے، ارشاد ہوا:

﴿فَمَنْ شَهِدَ مِنْكُمُ الشَّهْرَ فَلِيَصُمِّهِ﴾ (۱۸۵/ البقرة)

”تو جو اس مہینہ کو پائے تو اس مہینہ بھر کے روزہ رکھے۔“

اب پورے ماہ رمضان کے روزوں کی تیزیں و تحدید اور ایام امداد و دات کی تشریح ہو گئی، عربی کا محاورہ یہ ہے کہ جو ظرف زمان ॥ ترکیب نجومی میں اپنے فعل کا مفعول فیہ ہوتا ہے، وہ فعل اس ظرف زمان کو محیط ہوتا ہے۔ مثلاً: اگر یہ کہنا ہو کہ اس نے مہینے بھر روزہ رکھا تو کہیں گے: صَامَ شَهْرًا۔ اس کے یہ معنی نہ ہوں گے کہ مہینہ میں چند دن روزے رکھے، بلکہ ایک مہینہ پورا سمجھا جائے گا اور اگر یوں کہنا ہو کہ اس نے ایک سال روزہ رکھا تو عربی میں یوں کہیں گے: صَامَ سَنَةً (سال بھر روزہ رکھا) اس سے یہ ثابت ہوا کہ اس آیت پاک میں پورے رمضان بھر روزہ رکھنے کا ذکر ہے اور چونکہ لفظ شهر یعنی مہینہ کہا گیا ہے، اس لیے مہینہ کے شروع سے ان روزوں کا آغاز اور مہینہ کے ختم پر ان کا خاتمه ہو گا، قمری سال جس کا عرب میں رواج تھا، ॥ اس کے مہینے کبھی تیس اور کبھی ۲۹ دن کے ہوئے ہیں، جیسی روایت ہو وہی ماہ صیام پر بھی صادق آئے گا۔ جیسا کہ سرور کائنات ﷺ تمام صحابہ کرام خلافے راشدین اور جمیع فرق اسلام کے علم اور تو اتر سے ثابت اور واضح ہے اور احادیث صحیح میں اس کی پوری تصریحات مذکور ہیں۔

ایک نکتہ

قرآن پاک نے اس رمضان کے روزہ کا حکم ان الفاظ میں دیا ہے:

﴿فَمَنْ شَهِدَ مِنْكُمُ الشَّهْرَ فَلِيَصُمِّهِ﴾ (۱۸۵/ البقرة)

”تو جو اس مہینہ کو پائے تو اس مہینہ بھر کے روزہ رکھے۔“

لفظ شہزاد کے لغوی معنی کسی مقام یا زمانہ میں موجود اور حاضر ہنے کے ہیں، اسی سے شہادت اور شاہد کے الفاظ نکلے ہیں، اس سے معلوم ہوا کہ یہ روزے اسی پر واجب ہیں، جو اس ماہ صیام میں موجود اور حاضر ہوا اس ماہ صیام میں غیر موجود اور غیر حاضر ہونے کی دو صورتیں ہیں، ایک یہ کہ ماہ صیام آئے اور شخص غیر حاضر ہو یعنی اس دنیا میں موجود نہ ہو، جس میں وہ ماہ صیام آیا یا دوسری صورت یہ ہے شخص اپنی جگہ پر موجود ہو، مگر ماہ صیام کا وہاں گزرنہ ہو، یہ صورت ان قطعات ارضی میں پیش آئے گی، جہاں شب و روز کا وہ نظام موجود نہیں، جو باقی ممتد ان

• تفصیل کے لیے دیکھو رضی جلد اول بحث مفعول فی و ظرف زمان صفحہ ۱۸۲ مطبع نوکشہ ۱۸۲۸ء) ॥ جیسا کہ قرآن پاک کی اس آیت کریمہ سے ثابت ہے (یَسْأَلُنَّكُمْ عَنِ الْآيَةِ ۖ قُلْ هُنَّ مُوَافِقُنَّ لِلَّاتِیۤ اَیُّۤ) (۱۸۹/ البقرة) ”لوگ آپ سے پوچھتے ہیں پہلی رات کے چاند (ہلال) کے بارے میں کہہ دیجئے کہ وہ لوگوں کو وقت اور جگ کی تاریخ بتانے کے لیے ہے۔“

دنیا میں ہے۔ مثلاً: جن مقامات میں کئی مہینوں کے دن اور کئی مہینوں کی راتیں ہوتی ہیں کہ وہاں رمضان کی آمد کا سوال ہی نہیں۔ ہاں اگر وہاں کے مسلمان چاہیں تو بقیہ متمدن ممالک کے کینڈر (تقویم) کو معیار مان کر روزے رکھیں اور کھولیں (جیسا کہ حدیث وصال سے جو صحاح میں ہے ثابت ہے۔ ۱ لیکن جہاں اٹھارہ اٹھارہ اور بیس بیس گھنٹوں کے دن ہوتے ہیں، وہاں اللہ تعالیٰ کی عجیب قدرت ہے کہ وہاں موسم ٹھہرنا اور باہر بنا یا ہے، تاکہ روزہ کی تکلیف دن کی مدت بڑھنے سے جو ہو سکتی تھی، وہ موسم کی برودت سے کم ہو جائے، چنانچہ انگلستان میں بھی خود اور بہت سے مسلمانوں کو روزہ رکھنے کا اتفاق ہوا اور بالکل تکلیف محسوس نہیں ہوئی۔ ۲

معدورین

جو لوگ حقیقت میں اس فریضہ صایم کے ادا کرنے سے معدور ہوں، ان کے لیے اللہ تعالیٰ نے آسانیاں رکھی ہیں، اس لیے ارشاد ہے:

﴿يُؤْيِدُهُ اللَّهُ بِكُمُ الْيُسْرَ وَلَا يُؤْيِدُ بِكُمُ الْعُسْرَ﴾ (۲/ البقرة: ۱۸۵)

”اللہ تعالیٰ تمہارے ساتھ آسانی چاہتا ہے اور حتیٰ تمہارے ساتھ نہیں چاہتا۔“

اس اصولی تمہید کے بعد مسافر اور بیمار کو خصت عطا فرمائی ہے کہ رمضان کے کسی روزہ کے یا پورے رمضان کے روزوں میں اگر کوئی سفر یا بیماری کے عذر کی بنا پر روزہ نہ رکھ سکے تو وہ اس عذر کے دفعہ ہونے کے بعد قضا روزے کو پورا کر لے۔

بیمار کے دو معنی ہیں، یا تو وہ فعلًا بیمار ہو یا یہ کہ کسی مسلمان متین طبیب کا مشورہ ہو کہ اگر یہ شخص روزے رکھے گا تو بیمار ہو جائے گا یا بار بار کے تجریبوں کے بعد، شخص کو خود غالب گمان ہو جائے کہ وہ اس سے بیمار ہو جاتا ہے، تو اس کے لیے مناسب ہے کہ رمضان کا روزہ عذر کی موجودگی تک قضا کرے اور اس کے بجائے دوسرے مناسب موقع پر قضا کر کے، فرمایا:

﴿وَمَنْ كَانَ مَرِيضًا أَوْ عَلَى سَفَرٍ فَعَذَّلَهُ اللَّهُ أَكْبَرُ﴾ (۲/ البقرة: ۱۸۴)

”تو جو تم میں سے بیمار ہو یا سفر پر ہو تو دوسرے دنوں میں روزہ کی گنتی پوری کرے۔“

اسی سلسلہ میں ایک اور آیت ہے جس کی تفسیر اور تاویل میں صحابہ کے عہد سے اختلاف ہے، وہ آیت یہ ہے:

﴿وَعَلَى الَّذِينَ يُطِيقُونَهُ فِدْيَةٌ طَعَامٌ مُسْكِنٌ﴾ (۲/ البقرة: ۱۸۴)

”او، جن لوگوں کو روزہ کی طاقت نہ ہو فندیہ ادا کریں ایک مسکین کا کھانا۔“

بعض صحابہ کی روایتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ اول رمضان سے پہلے چند روزے فرض ہوئے تھے، ان

۱ صحیح مسلم، کتاب الفتن، باب ذکر الرجال: ۷۳۷۳۔

۲ سلسلہ اور دوسرے یہ میں میں اس موقع پر ان لوگوں کے لیے جو اتنی مدت کے دن میں روزہ کے بجائے کفارہ کی اجازت لکھی گئی تھی دوسری تعلیٰ تھی جس سے میں رجوع کرتا ہوں۔ ”س“

روزوں کے متعلق یہ اجازت تھی کہ چاہے روزے رکھیں، چاہے روزے کے بجائے ایک مسکین کا کھانا ہر روزہ کی جگہ دیں، رمضان کی فرضیت کے بعد یہ اجازت منسوخ ہو گئی۔

② دوسری روایت یہ ہے کہ «یطیقونہ» کی ضمیر صوم کی طرف نہیں بلکہ طعام کی طرف ہے اس صورت میں آیت کا یہ مطلب ہوا کہ جو لوگ فدیہ کی طاقت رکھتے ہوں، وہ روزہ کے ساتھ ایک مسکین کا کھانا بھی فدیہ ادا کریں، بعد کو یہ حکم منسوخ ہو گیا، حضرت شاہ ولی اللہ صاحب جیسا نے اس طعام مسکین کے فدیہ سے صدقۃ الفطر مراد لیا ہے جو رمضان کے بعد بر مستطیع روزہ دار اپنی اور اپنی نابالغ اولاد کی طرف سے ادا کرتا ہے۔

③ تیسرا روایت یہ ہے کہ یہ حکم غیر منسوخ ہے اور یہ اجازت ان لوگوں کے لیے ہے جو روزوں سے معدود ہوں، جیسے بڑھے اور حاملہ۔

اصل یہ ہے کہ لفظ «یطیقون» کے لغوی معنی کی تحقیق نہیں کی گئی ہے، اطاقت کو وضع کے معنی میں سمجھا گیا ہے اور یطیقوں کا ترجیح یوں کرتے ہیں کہ جو روزہ رکھ سکتے ہیں، وہ ایک مسکین کا کھانا دیں تو اس ترجیح کے مطابق یا تو فرض ناتاپڑے گا اور یا آج کل کے بعض آزاد خیالوں کی رائے کے مطابق یہ کہنا پڑے گا کہ جو روزہ کی طاقت رکھتے ہیں، وہ بھی روزہ کے بجائے فدیہ کے روزہ سے بچ سکتے ہیں، حالانکہ یہ صریح غلط ہے اس کے معنی تو ہوں گے کہ غرباً روزے رکھیں اور امر افادیہ کے روزہ سے مستثنی ہو جائیں، ایسی تفہیق اسلام کے فرانض میں کبھی روایتیں رکھی گئی ہیں اور اسلام کا تواتر عمل اس کے بالکل خلاف ہے اور آیت مابعد کہ «فَمَنْ شَهِدَ مِنْكُمُ الشَّهْرَ فَلِيصُبُّهُ» (۱۸۵/ البقرة)

”جو رمضان کے مہینہ میں ہو وہ مہینہ بھر روزہ رکھے۔“ کے سراہ منافی ہے۔

تحقیق یہ ہے کہ اطاقت کے معنی کسی کام کو مشکل کے ساتھ کر سکنے کے ہیں اس لیے یطیقوں کا ترجیح یہ ہو گا کہ جو بخشکل روزے رکھ سکتے ہیں، وہ روزہ کے بجائے ایک مسکین کا کھانا فدیہ کے دیں۔ اب روزہ کے سلسلے میں معدود روزوں کی دو صورتیں ہوئیں، ایک یہ کہ یہ عذر بزرگامی اور عارضی ہو، جیسے مرض یا خوف یا سفر تو ان

الفزور الكبير، باب ناسخ و منسوخ، ص: ۱۹۔ ۲ اطاقت طاقة کا باب افعال سے مصدر ہے اس کے ثلاثی مصدر سے فعل نہیں بناتا، فعل بنانے کے لیے باب افعال مستعمل ہے اور طاقت کے معنی لسان العرب (ج ۲، ص: ۲۲۸) اور تاج العرب (ج ۲، ص: ۳۲۷) وغیرہ میں یہ لکھتے ہیں: والطوق الطاقت ای اقصیٰ غایہ و هو اسم لمقدار ما يمكن ان يفعله به بمشقة منه طوق کے معنی طاقت کے ہیں یعنی قوت کی انجامی نایت اور وہ اس مقدار کا نام ہے جو کوئی مشقت و مشکل کے ساتھ کر سکے۔ طاقت کے اس معنی کی تائید قرآن پاک سے بھی ہوتی ہے۔ قرآن پاک میں ہے: «رَبَّنَا وَلَا تَجْهِنَّنَا مَا لَكَ طَاقَةَ لَكَ تَيْهٌ» (۲۸۶/ البقرة) اے ہمارے پروگار اور ہم پر وہ بوجہ سر کھنکی ہم کو طاقت نہیں ہے۔ ”جس کی ہم کو طاقت نہیں“ کے یہ معنی ہیں جس کی ہم کو سمعت نہیں، یعنی جس کو ہم کرنی نہیں سکتے، کیونکہ قرآن پاک کے نص سے ثابت ہے کہ الل تعالیٰ ہندہ کو کوئی حکم ایسا نہیں دیتے جس کو وہ کرنی نہیں سکتا، فرمایا:

﴿لَا يَكُلُّ اللَّهُ نَفْسًا إِلَّا وُعَاهَا﴾ (۲/ البقرة)

”اللہ کسی نفس کو عکس نہیں دیتا، لیکن اس کا جواب اس کی سمعت میں ہو۔“

اس سے ظاہر ہے کہ اب یہ دعا کہ اے اللہ! ہم پر وہ بوجہ نہ ڈالیے جس کو، ہم انھا ہی نہیں سکتے ہوں، (بیت عاشیرا گلے صفحہ پر) ۴

کے لیے یہ آیت ہے:

﴿فَإِنْ كَانَ مِنْكُمْ مُّرِيضًا أَوْ عَلَى سَفَرٍ فَعِدَّهُ مِنْ آيَاتِ أُخْرَاط﴾ (۱۸۴: البقرة)

”تو جو تم میں سے مریض ہو یا سفر پر ہو تو دوسرے دنوں میں گفتہ ہے۔“

یعنی عذر کے وقت وہ روزہ نہ رکھئے اور اس چھوڑے ہوئے روزے کی گفتہ دوسرے مناسب وقت قضا رکھ کر پوری کر لے، اس میں حاملہ اور مرضعہ (دو دھپلانے والی عورت) بھی داخل ہو گئی۔ اگر حاملہ یا مرضعہ کو اپنی بیماری یا چچ کی بیماری..... کا خوف ہو تو وہ عذر کی موجودگی تک روزہ نہ رکھئے اور اس عذر کے دور ہونے کے بعد قضا رکھ لے۔

دوسری صورت یہ ہے کہ وہ عذر دائی ہو اور ناقابل ازالہ ہو، جیسے کوئی دائمی مرض ہو، بہت ہی کمزور ہو اور بوڑھا (شیخ فانی) ہو جو بمشکل روزہ رکھتا ہو، تو وہ روزہ قضا کرے اور ہر روزہ کے بد لے ایک مسکین کا کھانا دے دے، اس کے لیے یہ آیت ہے:

﴿وَعَلَى الَّذِينَ يَطْبِعُونَهُ فِدْيَةً طَعَامٌ مُسْكِنٌ ۝﴾ (۱۸۴: البقرة)

”اور ان پر جو بمشکل روزہ رکھ سکتے ہیں، ایک مسکین کا کھانا دندی ہے۔“

(﴿كَمْرٌ شَرِسٌ سَبِيلٌ﴾) صحیح ہو گا بلکہ اس دعا میں طاقت نہ ہونے کے معنی یہ ہوں گے جس کو تم بمشکل اٹھا سکتے ہوں، اسی طرح طالوت کے لٹکر یوں کا کہنا کر کر

﴿لَا طَاقَةَ لِلَّٰهِ بِجَاهِ الْمُؤْمِنِينَ ۝﴾ (۲۴۹: البقرة)

”آج ہم میں جاولت اور اس کی فوج کے مقابلہ کی طاقت نہیں۔“

اس کے معنی یہ نہیں کہ ہم مقابلہ نہیں کر سکتے، بلکہ یہ معنی ہیں کہ ہم بمشکل مقابلہ کر سکتے ہیں۔ حدیثوں سے بھی ایسا معلوم ہوتا ہے ابوداؤد، کتاب الصیام، باب من قال مشیۃ للشیخ والحلبی: ۱۸-۲۳ میں ہے:

(عن ابن حبیر عن ابن عباس ﴿وَعَلَى الَّذِينَ يَطْبِعُونَهُ فِدْيَةً طَعَامٌ مُسْكِنٌ﴾ قال كانت رخصة للشيخ الكبير والمرأة الكبيرة وهما يطبقان الصيام إن يفطرا ويطعما مكان كل يوم مسكنينا)

”ابن حبیر حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ سے روایت کرتے ہیں کہ ان لوگوں پر جو روزہ بمشکل رکھ سکتے ہیں، ایک مسکین کا کھانا فدیہ ہے، فرمایا کہ یہ بوڑھے مراد اور بوڑھی عورت کے لیے اجازت ہے کہ وہ دنوں بمشکل روزہ رکھ سکتے ہیں اور وہ روزہ نہ رکھیں اور ہر روز کے بد لے ایک مسکین کو کھانا کھائیں۔“

اس حدیث میں ظاہر ہے کہ بطبقان الصیام کے معنی یہ نہیں ہو سکتے کہ جو روزہ رکھ سکتے ہوں کہ استطاعت کے ساتھ اجازت جمع نہیں ہو سکتی، اس کے معنی یہی ہوں گے کہ جو بمشکل روزہ رکھ سکتے ہوں۔

پہلا ایڈیشن لکھتے وقت دوسرے علماء کی تائید مجھے نہیں مل سکی اب الحمد للہ یہ تائید بھی ہاتھ آگئی ہے، سرآمد علمائے اہل حدیث شارح عون المعبود، شرح ابی داؤد، ج ۲، ص ۲۶۶ میں اس حدیث کی شرح میں لکھتے ہیں:

لکن مع شدة و تعب و مشقة عظيمة، اسی طرح مددثین حنفیہ کے سب سے دفع الخظر شیخ الحدیث مولانا اور شاہ صاحب بیانیہ کے متعدد تلامذہ نے اس کی تصدیق کی کہ شاہ صاحب کی بھی تحقیق تھی، فائدہ اللہ۔

ان وجوہ سے ﴿وَعَلَى الَّذِينَ يَطْبِعُونَهُ فِدْيَةً﴾ کا ترجیح یہ ہو گا کہ جو روزہ رکھ سکتے ہوں، بلکہ یہ تو گا کہ جو بمشکل روزہ رکھ سکتے ہوں۔

اور ظاہر ہے کہ جب بہ مشکل روزہ پر قادر ہو، اس کو فدیہ کی اجازت ہے تو جو بالکل قادر نہ ہو تو اس کو تو بالاوی فدیہ کی اجازت ہوگی «لَا يُكْلِفُ اللّٰهُ نَفْسًا إِلَّا وُسْعَهَا» (۲۸۶: البقرة) (۲/ البقرة: ۲۸۶)

روزہ پر اعتراض اور اس کا جواب

علم اور فطرت شناسی کے بعض مدعی جو عام عبادات و پرستش کی غرض و غایت یہ قرار دیتے ہیں کہ وحشی انسانوں کا خیل یہ ہے کہ خدا ہماری جسمانی تکلیف اٹھانے سے خوش ہوتا ہے، وہ روزہ کی حقیقت بھی صرف اسی قدر سمجھتے ہیں کہ وہ خدا کی خوشنودی کے لیے جسمانی رحمت کشی ہے اور ان غلط فہمیوں کے لیے دیگر مذاہب میں گو لغزش گاہیں موجود ہیں، چنانچہ جو گیوں اور جمیوں میں روزہ کی غیر معمولی مدت اور اس کی تخفیاں اس معنی کی طرف اشارہ کرتی ہیں، یہودیوں کی اصطلاح میں روزہ کے لیے نفس کو دکھ دینے کی اصطلاح جاری ہے۔ چنانچہ تورات میں روزہ کے لیے اکثر اسی قسم کا نفرہ مستعمل ہے۔ سفر الاحبار (۱۶-۲۲۹)۔ العهد القديم، ص: ۱۸۵) میں ہے:

”اور یہ تمہارے لیے قانون دا گئی ہو گا کہ ساتویں مہینے کی دسویں تاریخ میں تم سے ہر ایک خواہ وہ تمہارے دلیں کا ہو خواہ پر دیسی، جس کی بودو باش تم میں ہے، اپنی جان کو دکھ دے۔“

تورات کے سفر العدد (۲۹)۔ العهد القديم، ص: ۲۴۳) میں ہے:

”اور اس ساتویں مہینے کی دسویں تاریخ مقدس جماعت ہوگی اور تم اپنی جانوں کو دکھ دو اور پچھے کام نہ کرو۔“

یہ اصطلاح تورات کے اور مقامات میں بھی مذکور ہے، لیکن قرآن مجید نے اس کے لیے جو لفظ استعمال کیا ہے وہ صوم ہے۔ صوم کے لغوی معنی احتراز و اجتناب اور خاموشی کے ہیں، جس سے صاف ظاہر ہے کہ اسلام کا روزہ کس حقیقت کی طرف اشارہ کرتا ہے، خدا نے قرآن پاک میں مسلمانوں کو جہاں روزہ کا حکم دیا ہے، وہاں یہ الفاظ بھی اضافہ فرمادیے ہیں:

«لَيُؤْذِدُ اللّٰهُ يَكْمُلُ الْيُسْرَ وَلَا يُؤْذِدُ يَكْمُلُ الْعُسْرَ» (۲/ البقرة: ۱۸۵)

”خدا تمہارے ساتھ زمی چاہتا ہے جتنی نہیں چاہتا۔“

اسلام کا عام قانون ہے:

«لَا يُكْلِفُ اللّٰهُ نَفْسًا إِلَّا وُسْعَهَا» (۲/ البقرة: ۲۸۶)

”خدا کسی جان کو اس کی طاقت سے زیادہ تکلیف نہیں دیتا۔“

قرآن نے اپنے مبلغ کی توصیف ان الفاظ میں کی ہے:

«يَأَمُّهُمْ بِالْمَعْرُوفِ وَيَنْهَا مُّعْنَى الْبَنِّرِ وَيَحْلُّ لَهُمُ الطَّيْبَاتِ وَيَجْرِمُ عَلَيْهِمُ الْخَبَّاثَ

وَيَضْعُمُ عَنْهُمْ أَصْرَهُمْ وَالْأَغْلَلُ الَّتِي كَانَتْ عَلَيْهِمْ» (۷/ الاعراف: ۱۵۷)

”وہ ان کو نکیوں کا حکم دیتا ہے برا نیوں سے روکتا ہے اور گندی چیزوں کو حرام کرتا ہے اور اس طبق اور زنجیروں کو جوان کے اوپر پڑی ہیں، ان سے اتراتا ہے۔“
ان امور کا منشایہ ہے کہ اسلامی عبادات و احکام میں کوئی چیز بھی اس غرض سے نہیں رکھی گئی کہ اس سے انسان کی جان کو دکھ پہنچایا جائے، روزہ بھی اسی سلسلہ میں داخل ہے اور اسی لیے اسلام نے روزہ کی ان خیتوں کو جو لوگوں نے بڑھا رکھی تھیں بتدریج کم کر دیا۔

روزہ میں اصلاحات

اسلام نے روزہ کی خیتوں کو جس حد تک کم کیا اور اس میں جو کوئی تین پیدائیں وہ حسب ذیل ہیں:
① سب سے اول یہ کہ اسلام سے پہلے جو الہامی یا غیر الہامی مذاہب تھے۔ ان میں اکثر روزہ صرف پیروؤں کی کسی خاص جماعت پر فرض تھا۔ مثلاً ہندوؤں میں غیر برہمن کے لیے کوئی روزہ ضروری نہیں پارسیوں کے بیان صرف دستور اور پیشوائے کے لیے روزہ ہے۔ یونانیوں میں صرف عورتوں کے لیے روزہ تھا لیکن سوال یہ ہے کہ اگر روزہ کوئی اچھی چیز ہے تو تمام پیروؤں مذہب کے لیے برا بر طور سے ضروری ہے۔ اسلام میں پیشوائے غیر پیشوائے، عورت، مرد کی کوئی تخصیص نہیں، اس نے تمام پیروؤں کو عام حکم دیا اور اس میں کسی چیز کی کوئی تخصیص نہیں کی۔

﴿فَمَنْ شَهِدَ مِنْكُمُ اللَّهُ أَكْبَرُ فَلَيَصُمِّدْهُ﴾ (۲/ البقرة: ۱۸۵)

”اس مہینہ میں جو مو جود ہو وہ مہینہ بھر روزہ رکھے۔“

② اسلام کے علاوہ دیگر مذاہب میں عموماً تینی سال معتبر ہے۔ ستمی سال میں روزہ کی جوتا رجیں جن موسووں میں متین ہوں گی، ان میں تغیر و تبدل ناممکن ہے، اس بنا پر اگر وہ گرم یا سردی کے موسم میں چھوٹے یا بڑے دنوں میں واقع ہوتے ہیں، تو یہ تو وہ مختلف ملکوں میں بیمه کے لیے تکلیف دہ یا بیمه کے لیے آرام دہ ہیں۔ اسلام کے روزوں کی تاریخیں قمری مہینوں سے ہیں، جو موسم اور چھوٹے اور بڑے دنوں کے لحاظ سے بدلتے رہتے ہیں۔ اس سے اسلامی روزہ کا مہینہ ہر ملک میں ہر موسم میں آتا ہے اور اس بنا پر اس کی تحقیق و مرجیٰ بدلتی رہتی ہے۔

③ جہاں تک دیگر مذاہب کی الہامی کتابوں کے پڑھنے کا موقع ملا ہے، روزہ کی تاکید اور حکم کے متعلق کسی حالات انسانی کی تخصیص و استثناء نظر سے نہیں گزری، تورات میں تو یقیناً نہ کوئی نہیں، بلکہ یہاں تک ہے کہ اگر کسی وجہ سے روزہ نہ رکھ کر تو وہ کٹ جائے گا، بلکہ یہ ہے کہ اس پر دیسی پر بھی روزہ فرض ہو گا جو کو یہودی نہیں، بلکہ یہودیوں کے پاس آ کر رہا ہو۔ لیکن قرآن مجید نے نہایت فطرت شناسی کے ساتھ ہر قسم کے مغذو و مجبور لوگوں کو اس حکم سے مستثنیٰ کر دیا۔ پچھے مستثنیٰ ہیں، عورتیں ایام حمل و رضاعت اور دیگر مخصوص

• سفر الاحبار: ۱۶-۲۹؛ العهد القديم، ص: ۱۸۵۔

ایام میں روزہ سے مستثنی ہیں۔ بڑھے، بیمار اور مسافر مستثنی ہیں، کمزور اشخاص جو روزہ پر فطرت ناقادر نہیں، مستثنی ہیں بیمار اور مسافر اور عارضی معذور، بیماری، حالت سفر اور عذر کے دفعہ ہونے کے بعد اتنے دنوں کی قضا بعد کو رکھیں اور جو داعی طور سے معذور ہیں، وہ روزہ کے بجائے ایک مسکین کو کھانا کھلادیں، فرمایا:

﴿فَمَنْ كَانَ مِنْكُمْ مُّرِيضًا أَوْ عَلَى سَفَرٍ فَعِدَّهُ مِنْ آيَامِ أُخْرَ وَعَلَى الَّذِينَ يُطْبِقُونَهُ فِي دِيَةٍ طَعَامُ مِسْكِينِهِ﴾ (۲/ البقرة: ۱۸۴)

”اگر تم میں کوئی بیمار ہو یا مسافر ہو وہ رمضان کے بعد اور دنوں میں روزہ رکھ لے اور وہ لوگ جو بمشکل روزے رکھ سکتے ہوں، ان پر ایک مسکین کا کھانا ہے۔“

ترمذی میں ہے:

عن انس قال النبي ﷺ: ((إن الله وضع عن العامل والمريض الصوم)) *
حضرت انس رضي الله عنه سے مردی ہے کہ فرمایا نبی ﷺ نے کہ خدا نے حاملہ اور دودھ پلانے والی سے روزہ اتنا لیا۔*

یعنی رمضان میں روزہ رکھنے سے ان کو اپنی یا بچکی جان کا خطرہ ہوتا روزہ قضا کر کے رفع عذر کے بعد فشار کھیں۔

④ اور نہ ہوں میں روزہ کے ایام نہایت غیر معتدلانہ تھے، یا تو چالیس چالیس روزہ کا فاقہ تھا یا روزہ کے دنوں میں غلہ اور گوشت کے علاوہ بھل تک کھانے کی اجازت تھی، اسلام نے اس میں بھی توسط اختیار کیا یعنی روزہ کے اوقات میں گوہر قسم کے کھانے پینے سے روک دیا، مگر اس کی مدت ایک مہینہ تک صرف آفتاب * کے طلوع سے غروب تک چند گھنٹوں کی رکھی۔

⑤ یہودیوں کے یہاں ایک ایک روزہ ہفتوں کا ہوتا تھا، عرب کے عیسائی راہب کئی کئی روز کا روزہ رکھتے تھے۔ یہودیوں کے ہاں پورے چوپیں گھنٹے کا روزہ تھا۔ اسلام نے صرف سعی سے شام تک کا ایک روزہ قرار دیا۔

﴿نُهُّ أَتَيْوَ الظِّيَامَ إِلَى الظَّلَلِ﴾ (۲/ البقرة: ۱۸۷)

”پھر روزہ کو رات تک ختم کرو۔“

⑥ یہودیوں کے ہاں یہ روزہ تھا کہ روزہ کھولنے کے وقت ایک دفعہ جو کھا لیتے، کھا لیتے، پھر نہیں کھا سکتے تھے یعنی اسی وقت سے دوسرا روزہ شروع ہو جاتا، عرب میں یہ رواج تھا کہ ہونے سے پہلے جو کھا لیتے، کھا لیتے سو جانے کے بعد کھانا پھرنا جائز تھا۔ ابتداء اسلام میں بھی یہی قاعدہ تھا۔ ایک دفعہ رمضان کا زمان تھا، ایک صحابی کے گھر میں شام کا کھانا نہیں تیار ہوا تھا، ان کی بیوی کھانا پکارنی تھیں، وہ انتظار کرتے کرتے سو گئے، کھانا پک

* ترمذی، ابواب الصوم: ۷۱۵ معناہ۔ * مصنف کی مراد طلوع نجم سے ہے۔

چکا تو ان کی بیوی کھانا لے کر آئی، وہ سوچ کے تھے۔ اس لیے کھانا نہیں کھا سکتے تھے، دوسرا روز پھر روزہ کا دن تھا ان کو غش آگیا۔ اس پر یہ آیت اتری:

﴿وَكُلُوا وَاشْرِبُوا حَتّٰ يَتَبَيَّنَ لَكُمُ الْخَيْطُ الْأَيْضُ مِنَ الْحَيْطِ الْأَسْوَدِ مِنَ الْفَجْرِ﴾

(۲/ البقرة: ۱۸۷)

”اور اس وقت تک کھاؤ اور پیو جب تک رات کا تاریک خط صح کے پیدا خٹ سے ممتاز نہ ہو جائے۔“

⑦ جاہلیت میں دستور تھا کہ روزہ کے دنوں میں راتوں کو بھی میاں بیوی علیحدہ رہتے تھے، لیکن چونکہ یہ مدت غیر فطری تھی، اکثر لوگ اس میں مجبور ہو کر نفسانی خیانت کے مرٹکب ہو جاتے تھے۔ اس لیے اسلام نے صرف روزہ کی حالت تک کے لیے یہ ممانعت محدود کر دی اور رات کو جائزت دے دی:

﴿أَجَلَ لَكُمْ لَيْلَةَ الصِّيَامِ الرَّاقِثَ إِلَى نَاسِكُمْ هُنَّ لِيَاسٌ لَكُمْ وَأَنْتُمْ لِيَاسٌ لَهُنْ طَعَلَمَ اللَّهُ أَكْلَمُ كُنْتُمْ كُنْتُمْ حَتَّى أَنْتُمْ أَنْفَسَكُمْ فَتَابَ عَلَيْكُمْ وَعَفَّا عَنْكُمْ فَالَّذِينَ كَانُوكُمْ هُنَّ وَابْتَغُوا مَا كُتِبَ اللَّهُ لَكُمْ﴾

(۲/ البقرة: ۱۸۷)

”روزہ کی شب میں بیویوں سے مقاربت تمہارے لیے حلال کی گئی، وہ تمہاری پوشک ہیں اور تم ان کی، خدا جانتا تھا کہ تم اپنے نفس سے خیانت کرتے تھے تو اس نے معاف کیا، اب بیوی سے ملوظاً اور خدا نے تمہارے مقدار میں جو کچھ رکھا ہے (یعنی اولاد) اس کی تلاش کرو۔“

⑧ بھول چوک اور خطاؤ نیسان اسلام میں معاف ہے، اس بنا پر اگر بھولے سے روزہ دار کچھ کھا پی لے یا کوئی اور کام بھول کر ایسا کر جیسے جو روزہ کے خلاف ہے، تو اس سے روزہ نہیں ٹوٹتا۔

عن ابی هریرہ ((من أكل او شرب ناسيما فلا يفطر فانيما هو رزق رزقه الله)) ❶
”ابو ہریرہ ؓ سے مردی ہے جو بھول کر کھائے یا پئے تو اس سے روزہ نہیں ٹوٹتا کہ یہ تو خدا کی روزی ہی تھی۔“

⑨ اسی طرح ان افعال سے جو گوروزہ کے منافی ہیں، لیکن وہ قصد اسر زدنہیں ہوئے، بلکہ بلا ارادہ از خود سرزد ہوئے ہیں، روزہ نہیں ٹوٹتا۔

قال النبی ﷺ: ((اَلَا لَا يَفْطَرُ مِنْ قَاءٍ وَلَا مِنْ اَحْتَلَمْ)) ❷

”پیغمبر خدا مصطفیٰ نے فرمایا: جس کو قے ہو گئی ❸ یا سوتے میں غسل کی ضرورت پیش آگئی اس کا روزہ نہیں ٹوٹتا۔“

❶ ترمذی، ابواب الصوم، باب ما جاء في الصائم يأكل او يشرب ناسيما: ۷۲۱۔

❷ ابو داود، کتاب الصیام، باب فی الصائم بحتلمن نهارا فی رمضان: ۲۳۷۶۔

❸ تے ہونے کی فحفلی میں کئی صورتیں ہیں ان میں سے بعض میں روزہ ٹوٹ جاتا ہے اور بعض میں نہیں۔

⑩ یہود یوں میں اکثر روزے چونکہ مصائب کی یادگار اور غم کی علامت تھے، اس لیے روزہ کی حالت میں وہ زیب و زینت نہیں کرتے تھے اور غم کی صورت بنائے رہتے تھے۔ حضرت علیؓ علیہ السلام نے فرمایا:

”پھر جب تم روزہ رکھو، ریا کاروں کے مانند اپنا چہرہ ادا س نہ بناؤ کیوں کہ وہ اپنا منہ بگاڑتے ہیں کہ لوگوں کے نزدیک روزہ دار ظاہر ہوں، میں تم سے سچ کہتا ہوں کہ وہ اپنا بدله پا چکے، پر جب تو روزہ رکھنے اپنے سر پر چکنا لگا اور منہ دھوتا کہ تو آدمی پر نہیں بلکہ اپنے باپ پر جو پوشیدہ ہے روزہ دار ظاہر ہوا اور تیرا باپ جو پوشیدگی میں دیکھتا ہے، آشکارا تجھے بدله دے۔“ (متی ۶-۱۸ تا ۱۶)

(العہد الجدید، ص: ۱۱)

اسلام میں بھی روزہ کی اصل خوبی یہی ہے۔ اس لیے روزہ کی حالت میں سر میں تیل ڈالنا، سرمہ لگانا، خوشبو مانا اسلام میں روزہ کے منافی نہیں، منہ دھونے اور مسوک کرنے کی بھی تاکید ہے۔ اس سے طہارت اور پاکی کے علاوہ یہ غرض بھی ہے کہ روزہ دار ظاہری پر یثان حالی اور پر اگندگی کی نمائش کر کے ریا میں گرفتار نہ ہو اور نہ یہ ظاہر ہو کہ وہ اس فرض کے ادا کرنے میں اور خدا کے اس حکم کے بجالانے میں نہایت تکلیف، مشقت اور کوافت برداشت کر رہا ہے، بلکہ بُھی، خوش رضا مندی اور سرت ظاہر ہو۔

⑪ روزہ دوسری عبادتوں کے مقابلہ میں ظاہر ہے کہ کچھ نہ کچھ تکلیف اور مشقت کی چیز ہے، اس لیے ضرورت ہی کہ عام افراد امت کو اس میں غلو اور تعمق سے باز رکھا جائے، خود آنحضرت ﷺ کا تکلیف اکثر دیشتر روزے رکھتے تھے۔ مہینوں میں کچھ دن مقرر تھے، ہفتوں میں بھی کچھ دن مقرر تھے، ان کے علاوہ کبھی کبھی رات دن کا متصل روزہ بھی رکھتے تھے۔ لیکن دوسرے روزوں کو صرف انتخاب تک رکھا اور رات دن کے متصل روزہ کی تو مطلقاً ممانعت فرمائی۔ بعض صحابہ نے سبب دریافت کیا تو فرمایا:

((ایکم مثلی اني ابیت بطعمی ربی ویسفینی))

”تم میں مجھ ساکون ہے؟ مجھے تو میرا خدا کھلاتا پلاتا ہے (یعنی روحانی غذا)۔“

لوگوں نے اصرار کیا تو آپ نے کئی کئی دن تک متصل روزے رکھنے شروع کیے۔ جب مہینہ گزر گیا تو بطور سرزنش کے فرمایا کہ اگر مہینہ ختم نہ ہو گیا ہوتا تو میں اس سلسلہ کو اور بھی بڑھاتا۔ ❷ روزہ کے مقاصد

اس تفصیل کے بعد ہم کو خور کرنا ہے کہ اسلام میں روزہ کے کیا مقاصد ہیں، گو سطور بالا سے کسی قدر ان کا انکشاف ہو چکا ہے۔ مگر ہم مزید تفصیل سے ان کی وضاحت کرنا چاہتے ہیں۔

محمد رسول اللہ ﷺ کی کوئی تعلیم رہائی محض حکم کے طور پر نہیں ہے۔ بلکہ وہ سرتاپ حکمتوں اور مصلحتوں پر مبنی ہے اس کے فرائض کی عمارت روحانی، اخلاقی، اجتماعی اور ادی فوائد اور منفعتوں کے چهار گانہ ستونوں پر

❸ بخاری، کتاب الصوم، باب التشكیل لمن اکثر الوصال: ۱۹۶۵۔

قائم ہے اور ان مصلحتوں ان متفقتوں کے اصول اور جو ہر کو خود محمد رسول اللہ ﷺ کے صحیفہ الہامی نے ظاہر کر دیا ہے اور بتا دیا ہے۔ چنانچہ روزہ کے مقاصد اور اس کے اغراض بھی اس نے جیسا کہ ابھی کہا گیا ہے، تین محض فقرتوں میں بیان کر دیے ہیں:

﴿وَلِتَكُنْ وَاللَّهُ عَلَىٰ مَا هَدَكُمْ﴾ (۲/ البقرة: ۱۸۵)

”تاکہ خدا نے جو تم کو ہدایت کی ہے، اس پر اس کی بڑائی اور عظمت ظاہر کرو۔“

﴿وَلَعَلَّكُمْ تَشَكَّرُونَ﴾ (۲/ البقرة: ۱۸۵)

”تاکہ اس ہدایت کے ملنے پر تم خدا شکر کرو۔“

﴿لَعَلَّكُمْ تَكَفَّنَ﴾ (۲/ البقرة: ۱۸۳)

”تاکہ تم پر ہیزگار بنو (یا تم میں تقویٰ پیدا ہو)۔“

اوپر گزر چکا ہے کہ شریعت والے پیغمبروں کے حالات سے ظاہر ہوتا ہے کہ ان میں سے ہر ایک نے شریعت کے اتنے سے پہلے ایک مدت متعینہ تک ملکوتی زندگی برسکی اور تابہ امکان کھانے پینے کی انسانی ضرورتوں سے وہ پاک رہے اور انہوں نے اس طرح اپنی روح کو عالم بالا سے اتصال کے لائق بنایا۔ یہاں تک کہ وہ مکالمة الہی سے سرفراز ہوئے اور پیغام رب اُنے ان پر نزول کیا۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے چالیس روز اسی طرح برس کیے، تب توراة کی لوحیں ان کے سپرد ہوئیں، حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے بھی چالیس روز اسی طرح گزارے، تب حکمت کا سرچشمہ ان کی زبان اور سینہ سے آبلہ، محمد رسول اللہ ﷺ غارہ رام میں ایک مہینہ یعنی ۳۰ دن مصروف عبادت رہے، اس کے بعد فیضان الہی کا نور اس غار کے دہانے سے طلوع ہوا۔

حامل قرآن کی پیروی

اس سے معلوم ہوا کہ اس روزہ کی فرضیت سے سب سے پہلا مقصود انہیا علیہما السلام کے ان متبرک و مقدس ایام کی تقلید اور پیروی ہے۔ یہودی بھی حضرت موسیٰ علیہ السلام کی پیروی میں ۳۰ دنوں کا روزہ مناسب اور صرف چالیسویں دن کا روزہ فرض کرتے ہیں۔ عیسائیوں کو بھی حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی تقلید اور پیروی میں یہی چاہیے تھا۔ گرانہوں نے پال کی پیروی میں یہی حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے اور ادکام و سنن کی اتباع نہیں کی اس کی بھی نہ کی۔ اسی طرح مسلمانوں کو بھی یہ حکم ہوا کہ وہ اپنے رسول ﷺ کی پیروی میں یہ چند دن اسی طرح گزاریں، چنانچہ فرمایا:

﴿يَا أَيُّهَا الَّذِينَ أَمْنَوْا لِكِتبَ عَلَيْكُمُ الصِّيَامُ كَمَا كُتِبَ عَلَى الَّذِينَ مِنْ قَبْلِكُمْ﴾

(۲/ البقرة: ۱۸۳)

”اے مسلمانو! جیسے تم سے پہلے لوگوں پر (ان کے رسولوں کی پیروی اور ہدایت ملنے کے شکریہ

میں) روزہ فرض کیا گیا تھا تم پر بھی فرض کیا گیا۔“

دین الٰہی کی تکمیل، نبوت کے اختتام اور تعلیمِ محمدی ﷺ کے کمال کی یہ بھی بڑی دلیل ہے کہ گزشتہ امتوں نے اپنے اپنے پیغمبروں کی تلقید اور پیرودی کے جس سبق کو چند ہی روز میں بھلا دیا۔ محمد رسول اللہ ﷺ کی لاکھوں اور کروڑوں امت اس کو اب تک یاد رکھے ہوئے ہے اور اپنے رسول کی پیرودی میں وہ بھی ایک مہینہ تک اسی طرح دن کو کھانے پینے اور دوسرا نفاسی خواہشوں سے اپنے کو پاک رکھتی اور ملکوتی زندگی بسر کرتی ہے۔

شکر یہ

یہ روزہ انبیاء ﷺ کی صرف پیرودی اور تلقید ہی نہیں ہے۔ بلکہ درحقیقت اللہ تعالیٰ کے اس عظیم الشان احسان کا جو اس نے اپنے پیغمبر صادق کے ذریعہ انسانوں پر کیا شکر یہ ہے اور اس کی احسان شناسی کا احساس ہے۔ وہ کتاب الٰہی، وہ تعلیم ربیٰ، وہ ہدایت روحانی جوان ایام میں انسانوں کو عنایت ہوئی، جس نے ان کو شیطان سے فرشتہ اور ظلماتی سے نورانی بنایا، پستی و ذلت کے عیسیٰ غار سے نکال کر ان کو اونچ کمال تک پہنچایا، ان کی وحشت کو تہذیب و اخلاق سے، ان کی جہالت کو علم و معرفت سے، ان کی نادانی کو حکمت و دانائی سے اور ان کی تاریکی کو بصیرت اور روشنی سے بدل دیا، جس نے ان کی قمتوں کے پانے الٹ دیئے اور فضل و دولت اور خیر و برکت کے خزانوں سے ان کے کاشانوں کو معمور کر دیا، جس نے ذرہ بے مقدار کو آفتاب اور مشت خاک کو ہم دوش شریا بنا دیا۔ قرآن پاک اپنے ان الفاظ میں اسی حقیقت کی طرف اشارہ کرتا ہے:

﴿وَلَيَكُلُّوْا عَلٰى مَا هَدَّنَا مُّلْكُمْ وَلَعَلَّكُمْ تَكَلُّرُوْنَ﴾ (۲/ البقرة: ۱۸۵)

”اور (یہ رمضان کا روزہ) اس لیے (فرض ہوا) تاکہ تم اللہ کی بڑائی کرو کہ تم کو اس نے ہدایت دی اور تاکہ تم اس کا شکر یہ ادا کرو۔“

اس ہدایت ربیٰ اور کتاب الٰہی کے عطیہ پر شکرگز اری کا یہ مزدراشارہ ہے کہ اس مہینہ کی راتوں میں مسلمان اس پوری کتاب کو نمازوں (تراتع) میں پڑھتے اور سنتے ہیں اور اس مہینہ کے خاتمه پر اللہ اکبر، اللہ اکبر کا ترانہ بلند کرتے ہوئے، عیدگاہوں میں جاتے اور خوشی و مسرت کے والوں کے ساتھ عید کا دوگانہ شکر ادا کرتے ہیں۔

تقویٰ

روزہ کا سب سے بڑا معنوی مقصد تقویٰ اور دل کی پرہیزگاری اور صفائی ہے۔ محمد رسول اللہ ﷺ کے

ذریعہ فرمایا گیا:

﴿يٰ أَيُّهَا الَّذِينَ أَمْنَوْا كُتُبَ عَلَيْكُمُ الصِّيَامُ كَمَا كُتُبَ عَلَى الَّذِينَ مِنْ قَبْلِكُمْ لَعَلَّكُمْ

تَكْفُونَ ۝ ۚ) ۲ / البقرة: ۱۸۳(

”اے ایمان والو! تم پر بھی اسی طرح روزہ فرض کیا گیا جس طرح تم سے پہلے لوگوں پر فرض کیا گیا، تاکہ تم تقوی حاصل کرو۔“

① تقوی دل کی اس کیفیت کا نام ہے، جس کے حاصل ہونے کے بعد دل کو گناہوں سے بچھک معلوم ہونے لگتی اور نیک باتوں کی طرف اس کو بے تاباہ تڑپ ہوتی ہے اور روزہ کا مقصود یہ ہے کہ انسان کے اندر یہی کیفیت پیدا ہو، بات یہ ہے کہ انسانوں کے دلوں میں گناہوں کے اکثر جذبات بھی قوت کی افراط سے پیدا ہوتے ہیں، روزہ انسان کے ان جذبات کی شدت کو کمزور کرتا ہے۔ اسی لیے آنحضرت ﷺ نے ان نوجوانوں کا علاج جوانپی مالی مجبوریوں کے سبب نکاح کرنے کی قدرت نہیں رکھتے اور ساتھ ہی اپنے نفس پر بھی قابو نہیں رکھتے روزہ بتایا ہے اور فرمایا ہے کہ ”روزہ شہوت کو توڑنے اور کم کرنے کے لیے بہترین چیز ہے۔“ *

② اسلام کے مختلف احکام پر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ روزہ کی مشردیت میں ایک خاص نکتہ یہ ہے کہ اس میں اس بات کا خاص اشارہ ہے کہ ۱۲ مہینوں میں ایک مہینہ ہر مسلمان کو اس طرح برکرنا چاہیے کہ دن رات میں ایک وقت کھانا کھائے اور ہو سکے تو ایک وقت کا کھانا اپنے فاقہ زدہ محتاج اور غریب بھائیوں کو کھلانے۔ ان تمام احکام پر نظر ڈالیے جو فدیہ اور کفارہ سے متعلق ہیں تو معلوم ہو گا کہ ان سب موقع میں روزہ کا بدلت غریبوں کو کھانا کھلانا قرار دیا گیا ہے۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ روزہ اور غریبوں کو کھانا کھلانا یہ دونوں باہم ایک دوسرے کے قائم مقام ہیں، ایسے لوگ جو فطرتاً کمزور یا دامِ المرض یا بہت بڑھے ہیں اور جو بے مشکل روزہ رکھ سکتے ہوں ان کو روزہ کے بجائے حکم ہوتا ہے:

﴿وَعَلَى الَّذِينَ يُطِيقُونَهُ فِدْيَةٌ طَعَامٌ مُسْكِنٌ ۝ ۲ / البقرة: ۱۸۴(

”اور جو لوگ مشکل سے روزہ رکھ سکتے ہوں، وہ ایک مسکین کا کھانا فدیہ دیں۔“

حج میں اگر کسی عذر یا بیماری کے سبب سے احرام سے پہلے سرمند اناپڑے:

﴿فِيدِيَةٌ مِّنْ صَيَامٍ أَوْ صَدَقَةٍ﴾ ۲ / البقرة: ۱۹۶)

”تو روزہ یا خیرات یا قربانی فدیہ دے۔“

جو لوگ حج اور عمرہ ایک احرام میں ادا کریں، جس کو تسع کہتے ہیں، ان پر قربانی واجب ہے جو غریبوں ہی میں تقسیم کی جاتی ہے، اگر یہ نہ ہو سکتے تو:

﴿فَصِيَامٌ ثَلَاثَةٌ أَيَّامٌ فِي الْحِجَّةِ وَسَبْعَةٌ إِذَا رَجَعْتُمْ﴾ ۲ / البقرة: ۱۹۶)

”تو دس روزے رکھیں، تین حج میں اور سات گھر آ کر۔“

* صحیح بخاری، کتاب الصوم، باب الصوم لمن خاف على نفسه العزبة: ۱۹۰۵۔

حج میں جانور کا شکار منع ہے، اگر کوئی جان بوجھ کر ایسا کرے تو اس پر اسی جانور کے مل کی قربانی لازم آتی ہے، جو منی لے جا کر ذبح کی جائے، اگر یہ شہو سکتے تو:

﴿أَوْ لَفَّارَةٌ طَعَامٌ مَسْكِينَ أَوْ عَذْلُ ذِلْكَ صَيَّاماً﴾ (۵/ المائدۃ: ۹۵)

”یا چند مسکینوں کا کھانا یا اسی کے برابر روزے۔“

اگر کوئی بالارادہ قسم کھا کر توڑے تو اس پر دس مسکینوں کا کھانا واجب ہے یا ایک غلام کو آزاد کرنا، اگر یہ نہ ہو سکے:

﴿فَصِيَّامُ ثَلَاثَةِ آتِيَامٍ﴾ (۵/ المائدۃ: ۸۹)

”تو تین دن کے روزے۔“

اگر کوئی شخص اپنی بیوی کو محترمات سے تشییدے کر اس کو اپنے اوپر حرام کر لے اور پھر اس کی طرف رغبت کرے تو اس پر ایک غلام کا آزاد کرنا لازم ہے، لیکن اگر یہ اس کی قدرت میں نہ ہو:

﴿فَصِيَّامُ شَهْرَيْنِ مُتَنَابِعَيْنِ﴾ (۵۸/ المجادلہ: ۴)

”تو دو میсяنے متواتر روزہ رکھے۔“

اور یہ بھی ممکن نہ ہو:

﴿فَإِطَاعَمُ سَيِّدِنَا مُسْكِينَاتٍ﴾ (۵۸/ المجادلہ: ۴)

”تو سائچھے مسکینوں کو کھانا کھلانا۔“

ان احکام سے یہ بخوبی ظاہر ہے کہ روزہ درحقیقت صدقہ و خیرات غریبوں کے کھلانے بلکہ غلاموں کو آزاد کرنے کا قائم مقام ہے۔

③ روزہ ہی امیروں اور پیٹ بھروں کو بتاتا ہے کہ فاقہ میں کیسی اذیت اور بھوک اور پیاس کی تکلیف ہوتی ہے اور اسی وقت اس کو اپنے غریب اور فاقہ سے مدد حال بھائیوں کی تکلیف کا احساس ہوتا ہے اور معلوم ہوتا ہے کہ چند لقوں سے ان کی تکلیف کو دور کرنا کتنا بڑا ثواب ہے۔ جو خود بھوکانہ ہواں کو بھوک کی اور جو خود پیاسا نہ ہواں کو پیاس کی تکلیف کا احساس کیوں کر ہوگا۔ بقول حافظ ابن قیم رحمۃ اللہ علیہ سوز جگر کے سمجھنے کے لیے پہلے سوختہ جگر ہونا ضروری ہے۔ روزہ اسی احساس کو زندہ اور ایثار، رحم اور ہمدردی کے جذبہ کو بیدار کرتا ہے۔ چنانچہ خود آنحضرت ﷺ کا حال یہ تھا کہ بعض صحابہ کہتے ہیں کہ رمضان میں آپ کی سخاوت با درواں کی طرح ہوتی تھی۔ اور اسی کا اثر ہے کہ آج تک مسلمانوں کے ہاں اس مہینے میں غریبوں اور فقیروں کی امداد و اعانت اور ان کو شکم سیر کیا جاتا ہے۔

❶ صحیح بخاری، کتاب بدء الوضع: ۶، و کتاب الصوم، باب اجود ماکان النبی ﷺ یکون فی رمضان: ۲۹۰۔

④ انسان گوکتنا ہی نعمت و ناز کے گودوں میں پلا ہوا اور مال و دولت سے مالا مال ہو، تاہم زمانہ کا انقلاب اور زندگی کی کشمکش اس کو مجبور کرتی ہے کہ وہ اپنے جسم کو مشکلات کا عادی اور خیتوں کا خونگر بنائے، جہاد کے ہر موقع میدان کے لیے بھوک اور پیاس کے تحمل اور صبر اور ضبط سے اپنے آپ کو آشنا رکھنے کی ضرورت ہے۔ یہی سبب ہے کہ مسلمان مجاهد اور سپاہی میدان جنگ میں بھوک اور پیاس کی تکلیف کو جس طرح اُسی خوشی برداشت کرتا ہے، دوسرا نہیں کرتا، یہ گویا ایک قسم کی جبری فوجی ورزش ہے جو ہر مسلمان کو سال میں ایک مہینہ کرائی جاتی ہے، تاکہ وہ ہر قسم کے جسمانی مشکلات کے اٹھانے کے لیے ہر وقت تیار رہے اور دنیا کی کشمکش، جدو جہد، سختی و محنت کا پوری طرح مقابلہ کر سکے، اسی لیے روزہ کو قرآن پاک نے کبھی صبر کے لفظ سے بھی ادا کیا ہے، تاکہ اس سے روزہ کی یہ حقیقت بھی ظاہر ہو جائے۔

⑤ جس طرح حد سے زیادہ فاقہ اور بھوک انسان کے جسم کو کمزور کر دیتی ہے، اس سے کہیں زیادہ، حد سے زیادہ کھانا انسان کے جسم کو مختلف امراض اور بیماریوں کا شانہ بنا دیتا ہے۔ طب کے تجربے اور مثالاً ہدے یہ ثابت کرتے ہیں کہ اکثر حالتوں میں انسان کا بھوکار ہنا اس کی صحت کے لیے ضروری ہے۔ مختلف بیماریوں کا یہ طبعی علاج ہے۔ طبی ہدایت ہے کہ کم از کم ہفتہ میں ایک وقت کھانا کا نامہ کیا جائے، اسلام میں ہفتہوار مسنون و منتخب روزے بھی ہیں، مگر اسی کے ساتھ سال میں ایک دفعہ جسمانی فضلہ کی تخفیف کے لیے فرض اروزہ رکھنا نبایت نفع بخش ہے، جو مسلمان رمضان کے روزے رکھتے ہیں، ان کو ذاتی تجربہ ہو گا کہ ایک مہینہ کا روزہ کتنی بیماریوں کو دور کر دیتا ہے۔ بشرطیکہ انہوں نے از خود کھانے پینے اور افطار و سخور میں بے اعتدالی نہ کی ہو، اس لیے یہ ایک قسم کا سالانہ جبری جسمانی علاج بھی ہے۔

⑥ انسان اگر اپنے دن رات کے اشغال اور مصروفیتوں پر غور کرے تو اسے معلوم ہو گا کہ اس کے وقت کا ایک اچھا خاصہ حصہ بھی کھانے پینے اور اس کے اہتمام میں صرف ہو جاتا ہے۔ اگر انسان ایک وقت کا کھانا پینا کم کر دے تو اس کے وقت کا بڑا حصہ بچ جائے، یہ وقت خدا کی عبادت اور مخلوق کی خدمت میں صرف کیا جا سکتا ہے، اگر ہمیشہ نہیں تو کم از کم سال میں ایک دفعہ تو اس غیر ضروری ضرورت کو کم کر کے یہ سعادت حاصل کی جائے۔

⑦ انسان کی دماغی اور روحانی یکسوئی اور صفائی کے لیے مناسب فاقہ بہترین علاج ہے۔ جب انسان کا معدہ خضم اور فتور سے خالی اور دل و دماغ تباہی و معدہ کی مصیبت سے پاک ہو، چنانچہ بڑے بڑے اکابر کا تجربہ اس حقیقت پر گواہ صادر ہے۔

⑧ روزہ بہت سے گناہوں سے انسان کو محفوظ رکھتا ہے، اس لیے یہ بہت سے گناہوں کا کفارہ بھی ہے۔ چنانچہ اور پر جہاں روزہ اور خیرات کی یکسوئی اور باہم بدل ہونے کا ذکر کیا گیا ہے، وہی سے یہ بھی ظاہر

ہوتا ہے کہ وہ گناہوں اور غلطیوں کا کفارہ بھی ہے۔ بلکہ تورات میں تو اس کو خاص کفارہ ہی کہا گیا ہے۔ ۹ اور اسلام میں بھی بہت سے موقوں میں یہ کفارہ بتایا گیا ہے۔ چنانچہ اگر قسم کما کرو کوئی اس کو توڑنے کا گناہ کرے تو اس گناہ کی معافی کی یہ صورت ہے کہ دس مسکینوں کو کھانا کھلائے اگر اس کی سکت نہ ہو:

﴿فَصِيَامُ مِنْ لَيْلَةٍ أَيْكَمْ ذَلِكَ لَغْرَافَةٌ أَيْمَانُكُمْ إِذَا حَلَّتِ الظُّرُفُّ وَاحْفَظُوهُ أَيْمَانَكُمْ﴾

(۸۹/ المائدۃ)

”تو تین دنوں کے روزے یہ تمہاری قسموں کا کفارہ ہے، جب قسم کھا بیٹھو اور اپنی قسموں کا لحاظ رکھو۔“

اسی طرح جو کی حالت میں شکار کرنے پر اگر قربانی نہ ہو سکے اور چند مسکینوں کو کھانا نہ کھلایا جائے تو:

﴿أَوْ عَدْلٌ ذَلِكَ صِيَامًا مَالِيدًا وَبَالْأَمْرِهِ عَفَّ اللَّهُ عَنْ أَسْلَفٍ﴾ (۹۵/ المائدۃ)

”یا اس کے برابر روزہ تا کردہ اپنے گناہ کی سزا کھچے اللہ نے معاف کیا جو ہو چکا۔“

علی ہذا اگر کوئی ذمی کسی مسلمان کے ہاتھ سے غلطی سے قتل ہو جائے تو اس مسلمان پر خون بہا یعنی ایک

مسلمان غلام کا آزاد کرنا لازم آتا ہے، اگر غلام آزاد کرنے کی صلاحیت نہ ہو:

﴿فَصِيَامُ شَهْرَيْنِ مُتَتَابِعَيْنِ تَوْبَةً مِنَ اللَّهِ﴾ (۴/ النساء)

”تو اس گناہ کو اللہ سے بخواہنے کے لیے دو میہنے کے لگاتار روزے رکھے۔“

اس سے اندازہ ہو گا کہ روزہ بہت سے گناہوں کا کفارہ بھی ہے۔

۹ اس حقیقت کو ایک اور روشنی میں دیکھئے تو روزہ کی یہ امتیازی خصوصیت نمایاں ہو جائے گی روزہ کی بھوک اور فاقہ ہمارے گرم مشتعل قوی کو تھوڑی دیر کے لیے سرد کر دیتا ہے۔ کھانے اور پینے کی مصروفیت سے ہم آزاد ہوتے ہیں، دوسرے سخت کاموں سے بھی ہم اس وقت پرہیز کرتے ہیں، دل و دماغ شکم سیر معدہ کے فاسد بخارات کی پریشانی سے حفظ ہوتے ہیں۔ ہمارے اندر وہی جذبات میں ایک قسم کا سکون ہوتا ہے، یہ فرصت کی گھڑیاں، یہ قوی کے اعتدال کی کیفیت، یہ دل و دماغ کی جیعت خاطر، یہ جذبات کا سکون ہونا۔ ہمارے غور و فکر، اپنے اعمال کے محاصلہ، اپنے کاموں کے انجام پر نظر اور اپنے کی پرندامت اور پیشیانی اور خدائے تعالیٰ کی باز پرس سے ڈر کے لیے بالکل موزوں ہے اور گناہوں سے توبہ اور ندامت کے احساس کے لیے یہ فطری اور طبعی ماحول پیدا کر دیتا ہے اور یہی اور نیک کاموں کے لیے ہمارے وجدانی ذوق و شوق کو ابھارتا ہے۔ یہی سبب ہے کہ رمضان کا زمان تمام تر عبا و قول اور نیکیوں کے لیے مخصوص کیا گیا ہے۔ اس میں تراویح ہے۔ اس میں اعتکاف رکھا گیا ہے۔ اس میں زکوٰۃ نکالنا مستحب ہے اور خیرات کرنا سب سے بہتر

ا) اجبار ۱۶۔ ۳۰ سے ۳۲ تک العبد الدقیق، ج: ۸۵ و ۸۶، ص: ۲۲ و ۲۳۔

ہے، حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ آنحضرت ﷺ کی فیاض تو گوسدا بھار تھی لیکن، رمضان کے موسم میں وہ تیز ہواؤں سے بھی زیادہ ہو جاتی تھی۔

⑩ ان باقوٰ کو سامنے رکھ کر یہ آسانی سے سمجھا جاسکتا ہے کہ روزہ صرف ظاہری بھوک اور پیاس کا نام نہیں ہے، بلکہ یہ درحقیقت دل اور روح کی بھوک اور پیاس کا نام ہے کہ اللہ تعالیٰ نے روزہ کی متوقع غرض و غایت تقویٰ قرار دی ہے، اگر روزہ سے روزہ کی یہ غرض و غایت حاصل نہ ہو تو یہ کہنا چاہیے کہ گویا روزہ ہی نہیں رکھا گیا یا یوں کہنا چاہیے کہ جسم کا روزہ ہو گیا، لیکن روح کا روزہ نہ ہوا۔ اسی کی تشرع محمد رسول اللہ ﷺ نے اپنے ان الفاظ میں فرمائی ہے کہ ”روزہ رکھ کر بھی جو شخص جھوٹ اور فریب کے کام کو نہ چھوڑے تو خدا کو اس کی ضرورت نہیں ہے کہ انسان اپنا کھانا پینا چھوڑ دے۔“ * ایک اور حدیث میں ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا: ”روزہ برائیوں سے روکنے کی ڈھال ہے تو جو روزہ رکھے اس کو چاہیے کہ لغو اور خوش باتیں نہ کہے اور نہ جھالت (غصہ) کرے، یہاں تک کہ اگر کوئی اس سے لڑنے مرنے پر آمادہ ہو اور کافی بھی دے تو یہی کہے کہ میں روزہ سے ہوں۔“ * بعض حدیثوں میں ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا: ”روزہ اس وقت تک ڈھال ہے، جب تک اس میں سوراخ نہ کرو۔“ * صاحبہنے دریافت کیا یا رسول اللہ! اس میں سوراخ کسی چیز سے ہو جاتا ہے فرمایا: ”جھوٹ اور غیبت سے۔“ * چنانچہ بعض علماء کی رائے میں جس طرح کھانے اور پینے سے روزہ ٹوٹ جاتا ہے اسی طرح گناہ سے بھی روزہ ٹوٹ جاتا ہے۔

⑪ تمام عبادات میں روزہ کو تقویٰ کی اصل اور بنیاد اس لیے بھی قرار دیا گیا ہے کہ یہ ایک مخفی خاموش عبادت ہے، جو ریا اور نمائش سے بری ہے، جب تک خود انسان اس کا اظہار نہ کرے، دوسروں پر اس کا راز افشا نہیں ہو سکتا اور یہی چیز تمام عبادات کی جزا اور اخلاق کی بنیاد ہے۔

⑫ اسی اخلاص اور بے ریائی کا یہ اثر ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اس کی نسبت فرمایا کہ روزہ دار میرے لیے اپنا کھانا پینا اور ملذات کو چھوڑتا ہے، اس لیے:

((الصوم لى وانا اجزى به)) *

* صحیح بخاری، کتاب الصوم، باب اجود ما کان: ۱۹۰۲۔ * صحیح بخاری، کتاب الصیام، باب من لم يدع قول الزور: ۱۹۰۳؛ ترمذی، ابواب الصوم، باب ما جاء في التشديد في الغيبة: ۷۰۷؛ ابو داود، کتاب الصیام، باب الغيبة للصائم: ۲۳۶۲؛ ابن ماجہ، ابواب الصیام، باب ما جاء في الغيبة والرث للصائم: ۱۶۸۹۔ * صحیح بخاری، کتاب الصوم، باب هل يقول انى صائم اذا شتم: ۱۹۰۴؛ صحیح مسلم، کتاب الصیام، باب حفظ اللسان للصائم: ۲۷۰۳؛ نسائی، کتاب الصیام: ۲۲۱۹، ۲۲۱۸؛ ابو داود، باب الغيبة للصائم: ۲۳۶۳؛ مؤطا امام مالک، کتاب الصیام، باب جامع الصیام: ۶۸۹۔ * سنن دار می، کتاب الصوم، باب الصیام یفتا بفخر صومه: ۱۷۳۲؛ نسائی، کتاب الصیام: ۲۲۳۵۔ ۲۲۳۷۔

* طرانی فی الاوسط: ۴۵۳۶۔ * فتح الباری، ج ۴، ص: ۸۸۔

* صحیح بخاری، کتاب الصوم، باب هل يقول انى صائم: ۱۹۰۴؛ ومؤطا امام مالک: ۶۹۰۔

”روزہ میرے لیے ہے اور میں اس کی جزا دوں گا۔“
جز اتوہر کام کی وہی دیتا ہے، لیکن صرف اس کی عظمت اور براہمی کو ظاہر کرنے کے لیے اس کی جزا کو خود اپنی طرف منسوب فرمایا اور بعض علماء کے نزدیک اسی کا اشارہ قرآن پاک کی اس آیت میں ہے:

﴿إِنَّمَا يُؤْمِنُ الصَّابِرُونَ أَجْرُهُمْ بِعِظِيرٍ حَسَابٍ﴾ (آل الزمر: ۱۰۰)

”صبر کرنے والوں کو مزدوری بے حساب پوری کی جائے گی۔“

اور اتنا ظاہر ہے کہ روزہ کی مشقت اٹھانا بھی صبر کی ایک قسم ہے، اس لیے روزہ دار بھی ”صابرین“ کی جماعت میں داخل ہو کر اجر بے حساب کے مستحق ہوں گے۔

⑬ روزہ بھی چونکہ صبر کی ایک قسم ہے، بلکہ یہ کہنا چاہیے کہ صبر اور تحمل و برداشت کی مشق اور ورزش کی ایک بہترین اور آسان ترین صورت ہے، اسی لیے مشکلات کے حل کرنے کے لیے دعا اور صبر کرنے کی خاص ہدایت ہوئی ہے:

﴿وَاسْتَعِينُوا بِالصَّابِرِ وَالصَّلُوةِ﴾ (آل البقرة: ۴۵)

”اور (مشکلات پر) دعا اور صبر کے ذریعے سے مدد حاصل کرو۔“

دعایاں کنکنی کی ریاضت توہر وقت ممکن ہے کہ وہ انسان کی اختیاری چیز ہے، لیکن صبر کرنے کی مشق کرنا اختیاری نہیں، کیوں کہ قدرتی مشکلات اور مصائب کا پیش آنا انسان کے اختیار میں نہیں، اس لیے اس کی مہارت اور مشق کے لیے شریعت نے روزہ رکھا ہے، اسی لیے اس آیت بالا کی تفسیر میں صبر کے معنی روزہ کے بھی لیے گئے ہیں۔

⑭ یہی وجہ ہے کہ روزہ بھی ان اعمال حسنے میں سے ہے، جن کے بدله میں اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں سے خطاب پوشی، گناہوں کی معافی اور اجر عظیم کا وعدہ فرمایا ہے۔ ارشاد ہے:

﴿وَالصَّابِرِينَ وَالصَّمِيمِ وَالْخَفِيظِينَ فُرُوجُهُمْ وَالْخَفِظُ وَالذِكْرِينَ اللَّهُ كَفِيرًا

وَالذِكْرِيَتْ لَا عَذَابَ اللَّهُ لَهُمْ مَغْفِرَةٌ وَأَجْرٌ أَعْظَمُهُمْ﴾ (آل احزاب: ۳۵)

”اور روزہ دار مرد اور روزہ دار عورتیں اور اپنی شرم گاہوں کی حفاظت کرنے والے مرد اور حفاظت کرنے والی عورتیں، ان کے لیے اللہ نے تیار کھی ہے معافی اور بڑی مزدوری۔“

اس سے ظاہر ہوا کہ روزہ جس طرح ہمارے بعض مادی جرائم کا کفارہ ہے۔ اسی طرح ہمارے روحانی گناہوں کا بھی کفارہ ہے۔

• تفسیر ابن جریر طبری، تفسیر آیت مذکورہ، ج ۱، ص: ۱۹۹ مصر۔

حج

﴿وَلِلّٰهِ عَلٰى النَّاسِ حِجُّ الْبَيْتِ﴾ (۳/۱۱ عمران: ۹۷)

حج اسلام کی عبادت کا چوتھا رکن اور انسان کی خدا پرستی اور عبادت کا پہلا اور قدیم طریقہ ہے۔ اس کے لفظی معنی "قصد اور ارادہ" کے ہیں اور اس سے مقصود خاص نہیں بھی قصد اور ارادہ سے کسی مقدس مقام کا سفر ہے لیکن اسلام میں یہ ملک عرب کے شہر مکہ میں جا کر وہاں کی حضرت ابراہیم علیہ السلام کی بنائی ہوئی مسجد خانہ کعبہ کے گرد چکر لگانے اور مکہ کے مختلف مقدس مقامات میں حاضر ہو کر کچھ آداب اور اعمال بجالانے کا نام ہے۔

انسانی تمدن کی ابتدائی تاریخ پڑھنے والوں کو معلوم ہے کہ انسانی جماعت کی ابتدائی شکل خاندان اور خانوادہ کی صورت میں تھی، اس سے آگے بڑھی تو چند خیموں اور جھونپڑیوں کی ایک مختصری آبادی بنی۔ پھر وہ شہر کی صورت میں منتقل ہوئی، اس سے ترقی کر کے اس نے ایک قوم ایک ملک کا قابل اختیار کیا اور بالآخر وہ تمام دنیا پر چھا گئی۔ مکہ انسانی ترقی کے تمام مدارج اور مراتب کی ایک مرتب تاریخ ہے، وہ حضرت ابراہیم خلیل علیہ السلام کے عہد میں ایک خاندان کا تبلیغی مستقر بننا۔ پھر حضرت اسماعیل علیہ السلام کے زمانہ میں وہ چند خیموں اور جھونپڑیوں کی مختصری آبادی کی صورت میں ظاہر ہوا۔ پھر رفتہ رفتہ اس نے عرب کے نہیں بھر کی جگہ حاصل کر لی اور محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کے بعد وہ اسلامی دنیا کا نہیں مركز قرار پایا۔ دنیا کی ابتدائی آبادی کے عہد میں یہ دستور تھا کہ ہر آبادی کے محصورہ اہم احاطہ میں دو خاص باعظیمت مکان بنائے جاتے تھے۔ ایک اس آبادی کے بادشاہ کا محل یا قلعہ اور دوسرے اس آبادی کے کاہن کا معبد ہوتا تھا۔ عموماً ہر آبادی کسی نہ کسی دیوتا یا ستارہ کی طرف منسوب ہو کر اس کی حفاظت اور پناہ میں ہوتی تھی اور اسی حافظ دیوتا یا ستارہ کی وہاں پوجا ہوتی تھی۔ اس کے معبد کا صحن دارالامن ہوتا تھا۔ نذر رانہ کی تمام رقمیں اور پیداواریں اس میں جمع ہوتی تھیں اور جیسے جیسے اس آبادی کی بادشاہی اور حکمرانی برحقی جاتی تھی، اس دیوتا کی حکومت کا رقبہ بھی بڑھتا جاتا تھا۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام کا آبائی وطن عراق تھا، جہاں کلدانیوں کی آبادی اور حکومت تھی۔ یہاں بھی بدستور ستاروں کی پوجا ہوتی تھی۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے بہوت پا کر ستارہ پرستی کے خلاف دنیا میں سب سے پہلی آواز بلند کی اور ایک خدا کی پرستش کی دعوت دی، ان کے خاندان اور قوم کے لوگوں نے ان کو اس کے لیے تکلیفیں دیں اور بالآخر ان کو اپنا وطن جھوٹ کر شام مصر اور عرب کی طرف ہجرت کرنی پڑی۔ یہ تمام وہ مقامات تھے، جن میں سام کی اولاد پھیلی ہوئی تھی اور مختلف ناموں سے ان کی حکومتیں قائم تھیں، آثار، قومیات، لسانیات اور دوسرے تاریخی قرائن سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ عرب کا ملک سامی اقوام کا پہلا مسکن اور پہلی آبادی تھی اور یہیں سے نکل کر وہ یمن اور خلیج فارس کے سواحل سے عراق پہنچی تھیں اور شام و فلسطین گئی تھیں اور مصر میں بکوس یا چڑا ہے (بدو) بادشاہوں کے نام سے حکمران تھیں۔

۱۔ تورات اور بابل، کلدان و یونان وغیرہ کی پرانی تاریخوں اور آثار قدیمہ میں اس بیان کے شواہد میں گے اور میری تصنیف "ارض القرآن" میں ان کے اقتباسات مذکور ہیں۔ ۲۔ میری تصنیف ارض القرآن، حج امام: ۱۰۰۰ءے اور بعد میں اس پر مفصل بحث ہے۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام نے مختلف شہروں کے سفر کے بعد عرب و شام کی سرحد کارخ کیا اور بحر میت کے پاس اردن میں اپنے تسبیح حضرت لوط علیہ السلام کو آباد کیا۔ اپنے بیٹے حضرت اسحاق، کو نکان (فلسطین) میں بسایا۔ اپنے دوسرے بیٹوں مدین وغیرہ کو جہاز کی طرف بھرا ہر کے ساحل پر اس مقام پر جگہ دی، جس کو ان کے انتساب سے آج تک مدین کہتے ہیں اور اس سے آگے بڑھ کر فاران کی وادی میں حضرت اسماعیل علیہ السلام کی سکونت مقرر کی۔ یہ تمام مقامات وہ شاہراہ تھی، جس پر سے مصر و شام سے جاز و بیکن اور جاز و بیکن سے مصر و شام آنے جانے والے تراجموں سوداگروں اور قافلوں کا تنا تکارہتا تھا۔ اپنی اولاد کو اس خاص سلسلہ سے آباد کرنے سے حضرت ابراہیم علیہ السلام کے دو مقصد تھے، ایک یہ کہ تجارتی قافلوں کی آمد و رفت کی بنا پر اس کو غله اور شروری سامان کے ملنے میں تکلیف نہ ہو اور ساتھ ہی وہ بھی اس سوداگری میں بہ آسانی شریک ہو سکے اور دوسرا یہ کہ خدا ہمی خالص توحید کی تبلیغ کے لیے قوموں کے یہ گزرگاہ، بہترین تبلیغی مرکز تھے، یہاں وہ عراق و شام کی چہار و قہار قوموں کے حدود سے جو مشہور بہت پرست اور ستارہ پرست تھیں، علیحدہ رہ کر لوگوں میں دین حق کو پھیلا کر تھیں۔

بیت اللہ

حضرت ابراہیم علیہ السلام کا و�्तور یہ تھا کہ جہاں کہیں ان کو روحا نیت کا کوئی جلوہ نظر آتا، وہاں خدا کے نام سے ایک پھر کھڑا کر کے خدا کا گھر اور قربان گاہ بنانے لیتے تھے۔ چنانچہ تورات کتاب پیدائش میں ان کی تین قربان گاہوں یا خدا کا گھر بنانے کے واقعات مذکور ہیں۔

”تب خداوند نے ابرام کو دھکائی دے کے کہا کہ یہی ملک میں تیری نسل کو دوں گا اور اس نے وہاں خداوند کے لیے جو اس پر ظاہر ہوا ایک قربان گاہ بنائی اور وہاں سے روانہ ہو کے اس نے بیت ایل (بیت اللہ) کے پورب کے ایک پہاڑ کے پاس اپناؤرہ یہ کھڑا کیا، بیت ایل اس کے پچھم اور عین اس کے پورب تھا اور وہاں اس نے خدا کے لیے ایک قربان گاہ بنائی اور خداوند کا نام لیا، (۱۲۔۷۶ و ۱۸ العهد القديم، ص: ۱۹) اس کے بعد ہے۔

”اور وہ (ابراہیم) سفر کرتا ہوا کھن سے بیت اللہ میں اس مقام تک پہنچا، جہاں اس نے شروع میں ایک قربان گاہ بنائی اور وہاں ابراہیم نے خدا کا نام لیا۔“ (۱۳۔۳، ۲۰، ص: ۲۰)

پھر ایک اور جگہ پہنچے جہاں ان کو خدا کی وجی اور برکت کا پیام پہنچا اور حکم ہوا:

”انھوں اور اس ملک کے طول و عرض میں پھر کہ میں اسے تجوہ کو دوں گا اور ابراہیم نے اپناؤرہ اٹھایا اور صدرے کے بلوطوں میں جو جبروں میں ہیں، جارہا اور وہاں ایک قربان گاہ بنائی۔“ (۱۴۔۷۶، ۱۸، ص: ۲۰)

ای قسم کی قربان گاہیں اور خدا کے گھر حضرت اسحاق، حضرت یعقوب، اور حضرت موی علیہ السلام نے بھی

بنائے اور آخ ر حضرت داؤد علیہ السلام اور حضرت سلیمان علیہ السلام نے بیت المقدس کی تعمیر کی جو بنی اسرائیل کا کعبہ اور قبلہ قرار پایا۔ حضرت اسحاق علیہ السلام کے حال میں ہے کہ جہاں ان پر وحی اور وعدہ کی بشارت نازل ہوئی: ”اور اس نے وہاں مذبح بنایا اور خداوند کا نام لیا اور وہاں اپنا خیمہ کھڑا کیا اور وہاں اسحاق علیہ السلام کے نوکروں نے کنواں کھودا۔“ (پیدائش ۲۵-۲۶، ص: ۳۱)

حضرت یعقوب علیہ السلام کو جہاں مقدس رویا ہوئی، وہاں: ”اور یعقوب صحن سوریہ ائمہ اور اس پتھر کو جسے اس نے اپنا تکمیل کیا تھا، کھڑا کیا اور اس کے سرے پر تیل ڈالا اور اس مقام کا نام بیت ایل رکھا اور یہ پتھر جو میں نے ستون کھڑا کیا خدا کا گھر ہو گا اور سب میں سے جو تو مجھے دے گا دسویں حصہ (عشر) تجھے (خدا کو) دوں گا۔“ (۲۸-۲۲، ص: ۳۵)

حضرت موسیٰ علیہ السلام کو حکم ہوتا ہے:

”اور اگر تو میرے لیے پتھر کی قربان گاہ بنائے تو ترا شے ہوئے پتھر کی مت بنا بیو، کیونکہ اگر تو اس کے لیے اوزار لگائے گا تو اسے ناپاک کرے گا اور تو میری قربان گاہ پر سیڑھی سے ہرگز مت چڑھیو، تاکہ تیری برٹنگی اس پر ظاہر نہ ہو۔“ (خروج ۲۰-۲۵، ص: ۱۲۰)

حضرت موسیٰ علیہ السلام نے خدا کے حکم کے بوجب ”اور پہاڑ کے تلے ایک قربان گاہ اور بنی اسرائیل کے بارہ فرقوں کے لیے بارہ ستون بنائے اور سلامتی کے ذیع بیلوں سے خداوند کے لیے ذنگ کیے اور موسیٰ علیہ السلام نے آدھا خون لے کے ہانسوں میں رکھا اور آدھا قربان گاہ پر چھڑکا۔“ (خروج ۲۳-۲۷، ص: ۱۲۵)

اوپر کے اقتباسات میں اس قسم کی تعمیر یا مکان کا ایک نام (مذبح، قربان گاہ) بتایا گیا ہے اور وسرا بیت ایل یعنی بیت اللہ اور خدا کا گھر، اس سے ثابت ہوا کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام اور ان کی نسل میں اس قسم کی قربان گاہ اور بیت اللہ بنانے کا مستور تھا، اسی قسم کا وہ گھر ہے جو مکہ مکتبہ میں، کعبہ، مسجد حرام اور مسجد ابراہیم کے نام سے آج تک قائم ہے، بلکہ اس کی نسبت اسلام کا یہ دعویٰ ہے کہ وہ دنیا میں خدا کا پہلا گھر ہے۔

حضرت اساعیل علیہ السلام کی قربانی اور اس کے شرائط

اس کتاب کی پہلی جلد کے مقدمہ میں یہ بحث تفصیل سے آچکی ہے کہ قرآن پاک کے بوجب حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اپنے جس محبوب اور اکلوتے بیٹے کی قربانی کا خواب دیکھا تھا اور توراة کے مطابق جس کی قربانی کا حکم ہوا تھا، وہ حضرت اساعیل علیہ السلام تھے اور یہ بحث بھی وہیں گزر چکی ہے کہ قربانی کرنے سے توراة کے محاورہ میں یہ مقصود ہے کہ وہ خدا کی عبادت گاہ کی خدمت کے لیے نذر کر دیا جائے، وہ نذر کر دو،

جانوروں پر ہاتھ رکھ دیتا تھا اور وہ جانور اس کی طرف قربانی کیے جاتے تھے، جو لوگ خدا کی عبادت گاہ کی خدمت کے لیے نذر کیے جاتے تھے، وہ نذر کے دنوں میں سرخیں منڈاتے تھے، جب نذر کے دن پورے ہو جاتے تھے تو ان کا سر منڈا جاتا تھا، جو قربانی یا نذر پیش کی جاتی تھی وہ پہلے قربان گاہ پر ہلائی یا پھرائی جاتی تھی، اس کے بعد وہ قربانی کی جاتی یا جلائی جاتی تھی۔

ملت ابراہیم کی حقیقت قربانی ہے

توراۃ اور قرآن پاک دونوں سے یہ ثابت ہے کہ ملت ابراہیم کی اصلی بنیاد قربانی تھی اور یہی قربانی حضرت ابراہیم علیہ السلام کی پیغمبرانہ اور روحانی زندگی کی اصلی خصوصیت تھی اور اسی امتحان اور آزمائش میں پورے اترنے کے سبب سے وہ اور ان کی اولاد ہر قسم کی نعمتوں اور برکتوں سے مالا مال کی گئی، توراۃ کی کتاب پیدائش میں ہے:

”خداؤند فرماتا ہے، اس لیے کہ تو نے ایسا کام کیا اور اپنا بیٹا ہاں اپنا اکھوتا بیٹا درلخ نہ رکھا، میں نے اپنی قسم کھائی کر میں برکت دیتے ہی تجھے برکت دوں گا اور بڑھاتے ہی تیری نسل کو آسمان کے ستاروں اور دریا کے کنارے کے ریت کے مانند بڑھاؤں گا اور تیری نسل اپنے دشمنوں کے دروازوں پر قابض ہو جائے گی اور تیری نسل سے زمین کی ساری قوم برکت پائے گی، کیونکہ تو نے میری بات مانی۔“ (۲۳-۲۴-۲۷-۲۸، ص: ۲۳)

قرآن پاک میں ہے:

﴿وَإِذَا أَبْتَلَ إِبْرَاهِيمَ رَبُّهُ يَكْلِمُهُ فَأَتَمَّهُنَّ مَقَالَ إِلَيْهِ جَاعِلُكَ لِلنَّاسِ إِمَاماً﴾

(۲/ البقرة)

”اور جب ابراہیم کے پورو دگار نے چند باتوں میں اس کی آزمائش کی، پھر اس نے ان کو پورا کیا، تو خدا نے اس سے کہا، کہ میں تجھ کو لوگوں کے لیے پیشوں بنا نے والا ہوں۔“

﴿وَلَقَدْ أَصْطَفَنِي فِي الدُّنْيَا وَإِلَهٌ فِي الْآخِرَةِ لِمَنِ الْصَّلِحُونَ إِذَا قَالَ لَهُ رَبُّهُ أَسْلِمْ لِمَنِ الْعَلِيُّونَ﴾ (۲/ البقرة)

”اور ہم نے ابراہیم کو دنیا میں چنا اور وہ آخرت میں یقیناً یکیوں میں سے ہے، جب اس کے خدا نے اس سے کہا کہ اپنے کو سپرد کر دے، اس نے کہا میں نے اپنے کو دنیا کے پورو دگار کے سپرد کر دیا۔“

﴿إِنَّ إِبْرَاهِيمَ قَدْ صَدَقَ الرُّؤْيَا إِنَّا كَذَلِكَ نَجِيزُ الْمُحْسِنِينَ﴾

(۴: الصَّفَّات)

”اے ابراہیم! تو نے اپنا خواب حق کر دکھایا، ہم یونہی اچھے کام کرنے والوں کو بدلمہ دیتے ہیں۔“

یہی وہ برکت ہے جس کو مسلمان دن میں پانچ مرتبہ خدا کے سامنے یاد کرتے ہیں:

((اللَّهُمَّ بَارِكْ عَلَى مُحَمَّدٍ وَعَلَى إِلٰي مُحَمَّدٍ كَمَا بَارَكْتَ عَلَى إِبْرَاهِيمَ وَعَلَى إِلٰي إِبْرَاهِيمَ))

”خدا یا! تو محمد اور محمد ﷺ کی (جسمانی و روحانی) نسل پر برکت نازل کر، جس طرح تو نے ابراہیم اور ابراہیم کی (جسمانی و روحانی) نسل پر برکت نازل کی۔“

لیکن یہ قربانی کیا تھی؟ یہ حض خون اور گوشت کی قربانی نہ تھی، بلکہ روح اور دل کی قربانی تھی، یہ ماسوی اللہ اور غیر کی محبت کی قربانی خدا کی راہ میں تھی، یہ اپنی عزیز ترین متاع کو خدا کے سامنے پیش کر دینے کی نہ تھی، یہ خدا کی اطاعت، عبودیت اور کامل بندگی کا بے مثال مظہر تھا، یہ تسلیم و رضا اور صبر و شکر کا وہ امتحان تھا، جس کو پورا کیے بغیر دنیا کی ”پیشوائی“ اور آخوت کی ”یکی“ نہیں مل سکتی، یہ باپ کا اپنے الگوتے بیٹے کے خون سے زمین کو رنگین کر دینا تھا، بلکہ خدا کے سامنے اپنے تمام جذبات اور خواہشوں، تمناؤں اور آرزوؤں کی قربانی تھی اور خدا کے حکم کے سامنے اپنے ہر قسم کے ارادے اور مرضی کو معدوم کر دینا تھا اور جانور کی ظاہری قربانی اس اندر وہی نقش کا ظاہری عکس اور اس خورشید حقیقت کا ظاہل مجاز تھا۔

اسلام قربانی ہے

اسلام کے لفظی معنی ”اپنے کو کسی دوسرا کے سپرد کر دینا اور اطاعت اور بندگی کے لیے گردن جھکا دینا ہے“ اور یہی وہ حقیقت ہے جو حضرت ابراہیم اور اسماعیل علیہما السلام کے اس ایثار اور قربانی سے ظاہر ہوتی ہے، یہی سبب ہے کہ ان باپ بیٹوں کی اس اطاعت اور فرمانبرداری کے جذبہ کو حیفہ محمدی علیہ السلام میں اسلام کے لفظ سے تعبیر کیا گیا ہے، فرمایا:

﴿فَلَمَّا آتَيْنَاهُمَا وَنَّلَهُ لِلَّيْلَيْنِ ۝﴾ (الصفات: ۳۷ / ۳۷)

”جب ابراہیم علیہ السلام اور اسماعیل اسلام لائے، (یا فرمانبرداری کی یا اپنے کو خدا کے سپرد کر دیا) اور ابراہیم نے اپنے بیٹے (اسماعیل) کو پیشانی کے بل زمین پر لانا یا۔“

﴿وَمَن يَرْغَبُ عَنْ قِلَّةِ إِبْرَاهِيمَ الْأَمْنَ سَفَهَ نَفْسَهُ طَ وَلَقَدِ اصْطَفَيْنَاهُ فِي الدُّنْيَا وَإِنَّهُ فِي الْآخِرَةِ لَوْلَيْنَ الصَّلِحِينَ إِذَا قَالَ لَهُ رَبُّهُ أَسْلِمْ ۝ قَالَ أَسْلَمْتُ لِرَبِّ الْعَالَمِينَ ۝﴾

(البقرة: ۱۳۰ - ۱۳۱)

”اور کون ابراہیم کی ملت کو پسند نہ کرے گا، لیکن وہ جو خود یوقوف بنے، ہم نے اس کو دنیا میں مقبول کیا اور وہ آخوت میں بھی نیکوں میں سے ہو گا، جب اس کے رب نے اس سے کہا کہ اسلام لا، (یا فرمانبرداری کریا اپنے کو سپرد کر دے) اس نے کہا: میں نے پرو درگار عالم کی فرمانبرداری کی، (یا اپنے کو اس کے سپرد کر دیا)۔“

الغرض ملت ابراہیم کی حقیقت ہیں اسلام ہے کہ انہوں نے اپنے کو خدا کے ہاتھ میں سونپ دیا اور اس کے آستانہ پر اپنا سر جھکا دیا تھا، یہی اسلام کی حقیقت ہے اور یہی ابراہیم ملت ہے اور اسی بارہ امانت کو اٹھانے کے لیے حضرت ابراہیم علیہ السلام بار بار خدا سے دعا فرماتے تھے، کہ ان کی نسل میں اس بوجھ کے اٹھانے والے ہر زمانہ میں موجود ہیں اور بالآخر ان کی نسل میں وہ امین پیدا ہو، جو اس امانت کو لے کر تمام دنیا میں وقف عام کر دے، چنانچہ دعا فرمائی تو یہ فرمائی:

«رَبَّنَا وَاجْعَلْنَا مُسْلِمِينَ لَكَ وَمِنْ ذُرِّيَّتَنَا أَمَّةً مُسْلِمَةً لَكَ سَوْاً نَا مَنَّا سِلَّمَنَا وَلَنْ يَنْهَا
إِنَّكَ أَنْتَ التَّوَكُّبُ الرَّحِيمُ» رَبَّنَا وَابْعَثْ فِيهِمْ رَسُولًا فِي هُمْ يَتَّلَوْ عَلَيْهِمْ لِيَكَ وَيَعْلَمُهُمْ
الْكِتَابُ وَالْحِكْمَةُ وَيَزِدُهُمْ إِنَّكَ أَنْتَ الْعَزِيزُ الْحَكِيمُ» (۸/ البقرة: ۱۲۸-۱۲۹)

”ہمارے پروردگار! ہم کو مسلمان (یا اپنافرماں بردار) بنا اور ہماری نسل میں سے ایک مسلمان (یا اپنی فرمانبردار) جماعت بنا اور ہم کو مناسک (حج کے دستور) بنا اور ہم کو معاف کر، بے شک تو معاف کرنے والا اور حکم کرنے والا ہے، ہمارے پروردگار! اس میں اپنا ایک رسول بھیج جو تیری آئیں ان کو پڑھ کر سنائے اور ان کو کتاب اور حکمت سکھائے اور ان کو پاک اور صاف کرے، تو غالب اور حکمت والا ہے۔“

یہ رسول محمد رسول اللہ ﷺ تھے، یہ کتاب قرآن پاک تھی، یہ حکمت سینہ محمدی علیہ السلام کا خزانہ علمی و عملی تھا اور یہ مناسک اسلام کے اركان حج تھے۔
قربانی کہاں ہوئی؟

حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اپنے اکلوتے بیٹے کی قربانی کہاں کی، توراة میں اس مقام کا نام مورہ یا موریہ بتایا گیا ہے، بعض بے احتیاط مترجموں نے اس نام کا بھی ترجمہ کر دیا ہے اور بلوطون کے جھنڈ، یا لندز میں اس کا ترجمہ کیا ہے، لیکن محتاط مترجموں نے اصل عبری نام کو قائم رکھا ہے، چنانچہ اس وقت ہمارے پیش نظر توراة کا وہ عربی ترجمہ ہے، جو عبرانی، کلدانی اور یونانی زبانوں کے مقابلہ میں ۱۸۹۰ء میں اوکسفرڈ یونیورسٹی کے مطبع میں چھپا ہے، اس میں اس مقام کا نام ”مریا“ لکھا ہے اور اس کے فارسی ترجمہ میں جوانہی زبانوں کے مقابلہ سے باعکل سوسائٹی لندن کی طرف سے ۱۸۸۵ء میں لندن میں چھپا ہے، اس کا تلفظ ”موریا“ کیا ہے اور درحقیقت یہ لفظ مروہ ہے جو مکہ میں بیت اللہ کعبہ کے پاس ایک پہاڑی کا نام ہے، اس فارسی ترجمہ کی عبارت یہ ہے:

”خدا ابراہیم را امتحان کرده بددگفت اے ابراہیم! عرض کرد لبیک، گفت کہ اکنون پسر خودرا کہ یگانہ تست و اورادوست می داری یعنی اسحاق را بردار و بزمین موریا برد، و اور ادر آن جابریکے از کوہ ہائے کہ بتونشان می دہم برائے قربانی سوختنی بگذران،

بامدادان (صبح) ابراہیم برخاسته الاغ (گدھا) خود را بیمار است و دونفر از نوکر ان خود را با پسر خویش "اسحاق" برداشتہ وہیزم برائے قربانی سوختنی شکستہ روانہ شد، و بسوئے آن مکانی کہ خدا اور را فرمودہ بود، رفت، و در روز سوم ابراہیم چشم ان خود را بلند کر دہ آن مکان را از دور دید، آنگاہ ابراہیم بخدمان گفت شما ایں جا بمانیں، تامن با پسر بد انجا رویم، و عبادت (دوسرے ترجموں میں سجدہ ہے) کردہ نزد و شما باز آئیم" (پیدائش ۲۲)

اس عبارت میں اسحاق کا نام یہودی تحریف اور اضافہ ہے اور مسلمان متکلمین نے قطعی دلیلوں سے اس تحریف و اضافہ کو ثابت کیا ہے، اس کتاب کی پہلی جلد کے مقدمہ میں اس پر مختصر بحث گزر چکی ہے اور ہماری جماعت میں سے، جناب مولانا حمید الدین صاحب مرحوم نے "الرأي الصحيح في من هو الذبيح" نام ایک عربی رسالہ خاص اس مسئلہ پر مدل و مفصل لکھا ہے، اس لیے یہاں بحث بے کل ہے، بہر حال حضرت ابراہیم علیہ السلام کی قربانی کے لیے جو مقام بتایا گیا تھا، وہ سرزی میں مردہ تھی، وہ اس مقام سے چہاں وہ قیام پذیر تھے، چند روز کی مسافت پر تھی، حضرت ابراہیم علیہ السلام اور حضرت موی علیہ السلام کی شریعتوں کے مطابق ضروری تھا کہ جس مقام پر قربانی گزاری جائے، وہ کوئی قربان گاہ اور بیت اللہ ہو، خاص کر اس لیے بھی کہ وہاں حضرت ابراہیم علیہ السلام نے خدا کی عبادت کی اور سجدہ کیا اور وہ قربان گاہ یا بیت اللہ ایسا معروف و مشہور ہو کہ ساتھ کے نوکروں کو کہا جاسکے کہ "میں وہاں جا کر عبادت کر کے داپس آتا ہوں"۔ یہ خصوصیتیں کعبہ کے سوا کہیں اور نہیں پائی جاتیں اور نہ یہود و نصاری اس کے لیے کسی دوسرے مقام کو ثابت کر سکے اور نہ عظیم الشان واقع کی کسی قسم کی بھی یادگار حضرت اسحاق علیہ السلام کی نسل (بنی اسرائیل) میں موجود تھی اور نہ ہے اور نہ بیت المقدس یا سعیج علیہ السلام کی یادگاری اثر کا تعلق پہلے تھا، نہاب ہے۔

برخلاف اس کے بنو اساعیل یعنی اساعیلی عربوں میں اس قربانی اور اس کے خصوصیات کی ایک ایک یادگار ہزارہا برس سے محفوظ چلی آئی تھی اور گواں میں امتداد زمانہ اور تغیرات کے سبب سے کسی قدر کی بیشی، یا بعد کی گمراہیوں کے سبب سے اس میں بعض مشرکانہ رسم کی آمیزش ہو گئی تھی، تاہم اصل شے باقی تھی، عرب میں بت پرست بھی تھے، ستارہ پرست بھی تھے، کافر بھی تھے، مشرک بھی تھے، بلکہ عیسائی بھی تھے اور یہودی بھی تھے، مگر عربوں کے قدیم اشعار سے ثابت ہے، کہ ان سب کو خانہ کعبہ اور حج کے مراسم کی اہمیت کا یکساں اعتراض تھا، یہاں تک کہ عیسائی عرب بھی اس کی فضیلیں کھاتے تھے اور غالباً یہی وجہ ہے کہ خانہ کعبہ میں جہاں مشرکوں کے ہتوں کی صفائی تھیں، حضرت ابراہیم علیہ السلام حضرت عیسیٰ علیہ السلام اور حضرت مریم علیہ السلام کی تصویریں بھی تھیں۔

* اخبار مکہ للازرقی، ج ۱، ص ۴؛ وفتح البازی ابن حجر، کتاب المغازی، باب این رکز النبی ﷺ، ج ۸، ص ۱؛ وسیرۃ ابن هشام، ذکر الاسباب الموجۃ للمسیر الى مکة وفتح مکة، ج ۲، ص ۲۷۳۔

مکہ اور کعبہ

کعبہ و مقام ہے جو مسلمان عرفان کے خیال کے مطابق عرشِ الہی کا سایہ اور اس کی رحمتوں اور برکتوں کا "ست القدم" ہے، وہ ازل سے اس دنیا میں خدا کا معبد اور خدا پرستی کا مرکز تھا، سب بڑے بڑے پیغمبروں نے اس کی زیارت کی اور بیت المقدس سے پہلے اپنی عبادتوں کی ست اس کو فرا دیا کہ

﴿أَوَّلَ بَيْتٍ وَّضْعَةً لِّلثَّالِبِ﴾ (۹۳ آل عمران: ۹۳)

"سب سے پہلا خدا کا گھر جو لوگوں کے لیے بنایا گیا۔"

وہ وہی تھا، لیکن حضرت ابراہیم علیہ السلام سے بہت پہلے دنیا نے اپنی گمراہیوں میں اس کو بھلا کر بے نشان کر دیا تھا، حضرت ابراہیم علیہ السلام کے وجود سے جب اللہ تعالیٰ نے اس ظلمت کدھ میں توحید کا چرانغ پھر وشن کیا، تو حکم ہوا کہ اس گھر کی چہار دیواری بلند کر کے، دنیا میں توحید کا پتھر پھر نصب کیا جائے، چنانچہ قرآن پاک کے بیان کے مطابق کعبہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے زمان میں بھی ﴿بِالْبَيْتِ الْعَتِيقِ﴾ (۲۲ / الحج: ۲۹) (پرانا گھر) تھا، کوئی نیا گھر نہ تھا، حضرت ابراہیم علیہ السلام اور حضرت اسماعیل علیہ السلام نے مل کر، اس گھر کی پرانی نیادوں کو ڈھونڈ کر، پھر نئے سرے سے ان پر چہار دیواری گھری کی، فرمایا ﴿إِذْ يَرْفَعُ إِلَيْهِمُ الْقَوَاعِدَ مِنَ الْبَيْتِ﴾ (۲ / البقرة: ۱۲۷) (abraہیم علیہ السلام و اسماعیل علیہ السلام نے اس افتادہ نیاد کو از سر نو بلند کیا، حضرت ابراہیم علیہ السلام نے عراق، شام، مصر، ہر جگہ پھر کر، آخر اسی گنمگ کوشک منصب کیا، جو باسطوت جباروں اور بت پرست اور ستارہ پرست قوموں کے حدود سے دور ایک بے نام و نشان حصر میں ہر چار طرف سے پھاڑیوں سے گھرا تھا، اس لیے قرآن پاک نے کہا:

﴿وَإِذْ يَرْفَعُ إِلَيْهِمُ مَكَانَ الْبَيْتِ أَنْ لَا تُشْرِكُنِي شَيْئًا﴾ (۲۲ / الحج: ۲۶)

"اور ہم نے ابراہیم کے لیے اس گھر کی جگہ کوٹھکانا بنا یا کہ میرے ساتھ کسی کو شریک نہ بنا۔"

اس سے معلوم ہوا کہ گھر کی جگہ تو پہلے سے معین تھی، البتہ دیواریں بے نشان تھیں، تو ہم نے ابراہیم علیہ السلام کو اسی گھر کی جگہ بتا دی اور اس کی جا پناہ اور نہ کانا بنا دیا کہ بت پرستوں کے شر اور قتنہ سے محفوظ رہ کر دین حق کی تبلیغ کریں۔ تورات سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام سے پہلے یہ معبد موجود تھا، کیوں کہ سماں دستور کے مطابق یہ ضروری تھا کہ جس مقام پر خدا کی قربانی یا نذر یا عبادت کی جائے وہ کوئی معبد یا قربانی گاہ ہو، اس بنا پر وہ مقام جہاں حضرت ابراہیم علیہ السلام اسماعیل علیہ السلام کو قربانی کرنے کے لیے لائے تھے اور جس کے متعلق اپنے خادموں سے کہا تھا کہ وہاں جا کر عبادت کر کے واپس آتا ہوں، ضروری ہے کہ وہ کوئی معبد ہو، اسی لیے قرآن نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کی طرف اس گھر کی ایجاد نہیں، بلکہ تجدید اور تطہیر کی نسبت کی ہے۔ ﴿وَطَهَرْ رَبِّيْتَى﴾ "اور میرے گھر کو عبادت گا ہوں کے لیے پاک و صاف کر۔" اس وقت تک اس

سر زمین کے لیے عرب کا لفظ بھی پیدا نہیں ہوا تھا، یہ لفظ تو مجموعہ توراۃ میں حضرت سلیمان علیہ السلام کے زمانہ سے ملتا ہے، اس سے پہلے اس کا نام پورب یا کھن کا ملک تھا کہ یہ شام کے جنوبی و مشرقی سمت میں واقع تھا اور بھی اس کا نام بیابان تھا اور آخر یہی بیابان اس کا نام پڑ گیا لفظ عرب (عربیہ) کے اصلی معنی بیابان و صحرائی کے ہیں۔ اس لیے حضرت ابراہیم علیہ السلام نے جس وقت یہ فرمایا تھا:

﴿رَبَّنَا إِنِّي أَسْكَنْتُ مِنْ دُرْيَتِنِ يَوَادِ غَيْرِي ذَنِ رَزْعٍ﴾ (۱۴ / ابراهیم: ۳۷)

”خداوند ایں نے اپنی کچھ اولاد کو ایک بن کھن کی تراہی میں لا کر بسا یا ہے۔“

تو حقیقت میں یہ بن کھن کی تراہی اور بے آب و گیاہ میدان اس وقت اس کی ایک انتیازی صفت تھی اور آنر بھی صفت اس ملک کا خاص نام بن گئی اور اس لیے حضرت ابراہیم علیہ السلام نے یہاں حضرت اسماعیل علیہ السلام کو آباد کرتے ہوئے یہ دعا مانگی تھی:

﴿وَارْذُقْ أَهْلَهُ مِنَ التَّمَرِيتِ﴾ (۲ / البقرۃ: ۱۲۶)

”اور خداوند ایہاں کے رہنے والوں کو پھلوں کی روزی پہنچا۔“

مکہ قدیم زبانوں کے بعض محققوں کے نزدیک بالی یا کلدانی لفظ ہے، جس کے اصلی معنی ”گھر“ کے ہیں ۱ اس سے دو حقیقتیں ظاہر ہوتی ہیں، ایک تو یہ کہ یہ آبادی اس وقت قائم ہوئی، جب بال یا کلدان کے قافے ادھر سے کر رتے تھے اور یہ اس کی ابراہیمی نسبت کی ایک اولغوی دلیل ہے۔ دوسرے یہ معلوم ہوتا ہے کہ اس شہری آبادی اسی گھر کے تعلق سے وجود میں آئی اور یہ اس خانہ کعبہ کی قدامت اور تقدیس اور اہل عرب کی روایات کی صحت پر دلیل قاطع ہے۔ مکہ کا کہ نام حضرت داؤد علیہ السلام کی زبور میں سب سے پہلے نظر آتا ہے۔ پہلی جلد کے مقدمہ میں اس کا حوالہ گزر چکا ہے۔ یہاں یہ اضافہ کرنا ہے کہ قدیم شامی زبان میں بک کے معنی آبادی یا شہر کے ہیں، جیسا کہ آج بھی شام کے ایک نہایت قدیم شہر کا نام بعلک ہے، یعنی بعل کا شہر (بعل دیوتا کا نام ہے) یہ اس آبادی کی قدامت کی دوسری لغوی شہادت ہے اور کعبہ کی ابتدائی تغیر کے وقت یہی نام قرآن پاک میں آیا ہے:

﴿إِنَّ أَوَّلَ يَنْيَتُ وُضْعَمَ لِلَّاتِي لَلَّذِي يَبْكِهُ﴾ (۳ /آل عمران: ۹۶)

”پہلا گھر جلوگوں کی عبادت کے لیے بنایا گیا، وہ وہی ہے جو مکہ میں ہے۔“

کعبہ کے لغوی معنی چوکھوئے کے ہیں، چونکہ یہ گھر جو کھوٹا بنا تھا اور اب بھی اسی طرح ہے اس لیے کعبہ کے نام سے بھی مشہور ہوا۔

۱ اس تحقیق پر مفصل بحث میری تصنیف ارض القرآن کی پہلی جلد میں ہے ارجمند: ۵۵ تا صفحہ: ۴۰ طبع اول۔

۲ تاریخ العرب قبل الاسلام جرجی زیدان، ص: ۲۴۴ مصر۔

یونانی تاریخوں میں بھی کعبہ کا حوالہ موجود ہے، یونان کا مشہور مؤرخ ذیوڈورس جو حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے ایک صدی پہلے گزر ہے، وہ عرب کے ذکر میں کہتا ہے:
 ”شود یوں اور سبادلوں کے درمیان ایک مشہور معبد ہے، جس کی تمام عرب بہت بڑی عزت کرتے ہیں۔“

شود کا مقام شام و ججاز کے حدود میں تھا اور سباد کا یہیں میں، ظاہر ہے کہ ان دونوں ملکوں کے درمیان ججاز ہی ہے اور وہاں کا مشہور معبد جس کی عزت سارے عرب کرتے ہوں، خانہ کعبہ ہے، رومیوں کی تاریخ میں بھی خانہ کعبہ کا ذکر ملتا ہے، پر وہ پس مورخ لکھتا ہے کہ ۵۷۵ء میں رومی سپہ سالار ریزیر نے اپنے تمام فوجی افسروں کا ایک جلسہ مشاورت کیا، اس میں شام کے دافروں نے اٹھ کر کہا کہ وہ آئندہ لڑائی میں شریک نہیں ہو سکتے، کیوں کہ اگر وہ اپنی جگہ سے بٹے تو عرب کا بادشاہ منذر سوم فوراً حملہ کر دے گا، اس پر سپہ سالار نے کہا:
 ”تمہارا یہ خطہ صحیح نہیں ہے کہ عنقریب وہ موسم آنے والا ہے، جس میں عرب اپنے دو مینے عبادت کے لیے خاص کرتے ہیں اور اس زمانہ میں ہر قسم کے تھیاروں سے وہ پر ہیز کرتے ہیں۔“ *
 ظاہر ہے کہ یہ صاف حج کا بیان ہے۔

ان تمام شہادتوں سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ اہل عرب یا نی اسماعیلیہ بیشہ سے اپنے ان موروٹی مراسم کو ادا کرتے تھے اور اس کی اکثر خصوصیات کو پوری حفاظت کے ساتھ باقی رکھے ہوئے تھے۔ جاہلیت کے اشعار میں حج اور ارکان حج کا ذکر بکثرت ملتا ہے۔ * یہاں تک کہ عیسائی عرب شعر ابھی عزت کے ساتھ ان کا تذکرہ کرتے تھے۔ عرب کے بازاروں اور میلوں کی روایات کے قائم رکھنے میں بھی اس موسم حج کا اچھا خاصہ حصہ تھا۔ * اور اسی کے سب سے محمد رسول اللہ ﷺ کی دعوت کو بھرت سے پہلے ہی عرب کے دور دراز گوشوں میں یہاں تک کہ یہیں وہرین تک میں پہنچنے میں کامیابی ہوئی، کیوں کہ حج کے موسم میں عرب کے تمام قبلیہ مکہ کی وادی میں اس موروٹی رسم کو ادا کرنے کے لیے جمع ہو جاتے تھے۔
 حج ابراہیمی یادگار ہے

حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اپنے بیٹے کی قربانی کا جو خواب دیکھا اور اس پر بیک کہا تھا اور جس کی تعییں کے لیے وہ اس دور دراز مقام میں آئے تھے اور یعنی اس وقت جب چھری لے کر بیٹے کو خدا کی راہ میں قربان کرنا چاہتا اور بیٹے نے بھی خدا کا حکم کر گردن جھکا دی تھی، تو آواز آئی تھی:

- * کسی تاریخ عروج و زوال روم، باب: ۵۰۔ * نتائج الافہام فی تقویم العرب قبل الاسلام محمود پاشا فلکی مطبع امیریہ بولاق مصر، ص: ۳۵ بحوالہ (فرنج) ایشیاتک جریل اپریل ۱۸۸۲ء۔ * مولانا حیدر الدین صاحب نے اپنے تصنیف الامان فی اقسام القرآن، ص: ۳۶۸ میں اس قسم کے اشعار جمع کر دیے ہیں۔ * کتاب الامکنة والازمنة امام مرزوقي طبع حیدر آباد، ج ۲، ص: ۱۶۱ باب: ۴۰۔

﴿أَن يَأْبِهِمْ قَدْ صَدَقُتِ الرُّعْيَا إِنَّا كَذَلِكَ تَجْزِي الْمُحْسِنِينَ إِن هَذَا هُوَ الْبَلْوَى
الْمُؤْمِنُونَ وَفَدَيْنَهُ بِذِبْحٍ عَظِيمٍ﴾ (الصفات: ۳۷-۱۰۴) (۱۰۷-۱۰۷)

”یہ کہ اے ابراہیم علیہ السلام! تو نے اپنا خواب بچ کر دکھایا، ہم ایسا ہی نیکو کاروں کو بدلتے دیتے ہیں اور ایک بڑی قربانی دے کر ہم نے اس کے بیٹے کو چھڑایا۔“
اس وقت ان کو معلوم ہوا کہ اس خواب کی تعبیر یہی کو خدا کے گھر کی خدمت اور توحید کی دعوت کے لیے مخصوص کر دیتا اور اس کے ذریعہ سے اس گھر کو دارہ ارضی میں خدا پرستی کا مرکز بنانا ہے:

﴿وَإِذْ جَعَلْنَا الْبَيْتَ مَثَابَةً لِلْكَافِرِ وَآمِنَاتٍ وَآتَيْدُوا مِنْ مَقَامَ إِبْرَاهِيمَ مُصْلَى وَعَهْدُنَا إِلَى
إِبْرَاهِيمَ وَإِسْعَيْلَ إِنْ طَهَرَا بَيْتَنَا لِلطَّاهِرِينَ وَالْعَلِيقَيْنَ وَالرَّكْعَ الشَّجُودُ وَإِذْ قَالَ
إِبْرَاهِيمُ رَبِّيْ أَجْعَلْ هَذَا بَلَدًا أَمَنًا وَأَرْزُقْ أَهْلَهُ مِنَ الشَّرَرِ مَنْ أَمَنَ مِنْهُمْ بِاللَّهِ وَالْيَوْمِ
الْآخِرِ طَقَالَ وَمَنْ كَفَرَ فَأَمْتَقَهُ قَلِيلًا ثُمَّ أَضْطَرَهُ إِلَى عَذَابِ النَّارِ وَيَسَّرَ الْمَصِيرُ وَإِذْ
يَرْفَعُ إِبْرَاهِيمُ الْقَوَاعِدَ مِنَ الْبَيْتِ وَإِسْعَيْلَ رَبَّنَا نَقْبَلَ وَنَائِكَ أَنْتَ السَّمِيمُ الْعَلِيُّمُ
رَبَّنَا وَاجْعَلْنَا مُسْلِمَيْنَ لَكَ وَمَنْ ذُرَّتِنَا أَمَّةً مُسْلِمَةً لَكَ سَوَّا نَا مَنَسِكَنَا وَثَبَ عَلَيْنَا
إِنَّكَ أَنْتَ التَّوَابُ الرَّحِيمُ رَبَّنَا وَبَعْثَ فِيهِمْ رَسُولًا فَتَلَوَّ عَلَيْهِمُ أَنْتَكَ وَيَعْلَمُمُ
الْكِتَبَ وَالْحِكْمَةَ وَيَزَّرُهُمُ طَائِكَ أَنْتَ الْعَزِيزُ الْحَكِيمُ وَمَنْ يَرْغَبُ عَنْ وِلَةِ إِبْرَاهِيمَ الْأَ
مَنْ سَفَهَ نَفْسَهُ طَوَّلَ أَصْطَفَيْنَهُ فِي الدُّنْيَا وَإِنَّهُ فِي الْآخِرَةِ لِمَنِ الظَّلَّمِينَ إِذْ قَالَ
لَهُ رَبُّهُ أَسْلِمْ قَالَ أَسْلَمْتُ لِرَبِّ الْعَلَيْمِينَ﴾ (البقرة: ۱۲۵-۱۳۱)

”اور یاد کرو جب ہم نے اس گھر کو لوگوں کا مرچع اور امن بنایا اور (کہا کہ) ابراہیم کے کھڑے ہونے کی جگہ کونماز کی جگہ بناؤ اور ابراہیم و اساعیل سے عہد لیا کہ تم دونوں میرے گھر کو طواف اور قیام اور رکوع اور سجدہ کرنے والوں کے لیے پاک کرو اور یاد کرو جب ابراہیم نے کہا کہ میرے پروردگار! اس کو امن والا شہر بناؤ اور اس کے لئے والوں کو کچھ بچلوں کی روزی دے جو ان میں سے خدا اور پیچھے دن پر ایمان لائے، خدا نے کہا اور جس نے انکار کیا اس کو تھوڑا فائدہ پہنچاوں گا، پھر اس کو دوزخ کے عذاب کے حوالہ کروں گا اور وہ کتنی بری بازگشت ہے اور یاد کرو جب ابراہیم اور اساعیل اس گھر کی بہیادیں اٹھا رہے تھے (اور یہ دعا مانگ رہے تھے کہ) ہمارے رب! (ہماری اس تعمیر کو) ہم سے قبول فرمائے شک تو ہی سننے والا اور جانے والا ہے۔ اے ہمارے رب! اور ہم کو اپنا ایک تابع دار (مسلم) فرقہ بناؤ اور ہم کو اپنے حج کے ارکان بتاؤ ہم پر اپنی رحمت رجوع کر (ہماری توبہ قبول کر) تو توبہ قبول کرنے والا اور رحم والا ہے،

اے ہمارے رب! ان میں انہیں میں سے ایک کو رسول بنا کر بھیج جوان کو تیری آئیں سنائے اور ان کو کتاب اور حکمت کی تعلیم دے اور ان کو پاک و صاف بنائے، بے شک تو غالب اور دانا ہے اور ابراہیم علیہ السلام کے دین سے کون منہ پھیرے گا، بھروس کے جواب نے آپ کو نادان بنائے، حالانکہ ہم نے اس کو (ابراہیم کو) دنیا میں چنان آخوت میں وہ نیکوکاروں میں سے ہو گایا کہ وہ جب اس کے رب نے اس سے کہا کہ تابع دار (مسلم) بن جا، اس نے کہا کہ عالم کے پروگار کا میں تابع دار (مسلم) بن گیا۔“

﴿وَإِذْ يَوْمًا لَا يُرْهِمُ مَكَانَ الْبَيْتِ أَنْ لَا تُشْرِكُ بِنِ شَيْئًا وَطَهِرْ بَيْتَنِي لِطَّاهِيرِي فِيْنَ وَالْقَابِيْنَ وَالرَّحِيمَ الشُّجُودَ وَأَدْوْنَ فِي النَّاسِ بِالْحَجَّ يَا تُولُوكَ رِجَالًا وَعَلَى كُلِّ صَامِيرٍ يَأْتِيْنَ مِنْ كُلِّ فَيْرِ عَمِيقٍ لِيَشَهِدُوا مَنَافِعَهُ لَهُمْ وَيَدْكُرُوا السَّمْوَاللُّوْفَ فِي أَيَّامٍ مَعْلُومَتٍ عَلَى مَارَزَ قَهْمُمْ قِنْ بَهِيمَةَ الْأَنْعَامِ فَكَلُوا مِنْهَا وَأَطْعُمُوا الْبَآسِ الْفَقِيرَ ثُمَّ لِيَقْضُوا لَفْتَهُمْ وَلِيُوْفُوا نُدُورَهُمْ وَلِيُظْوَقُوا بِالْبَيْتِ الْعَتِيقِ ذَلِكَ وَمَنْ يَعْظُمْ حُرْمَتَ اللَّهِ فَهُوَ خَيْرُهُ عِنْدَ رَبِّهِ﴾

(۲۲/ الحج: ۳۰-۲۶)

”اور یاد کرو جب ہم نے ابراہیم کے لیے اس گھر کی جگہ کو نہ کانا بنا لیا کہ کسی کو میرا سمجھی نہ بنا تا اور میرے گھر کو طواف قیام اور رکوع اور سجدہ کرنے والوں کے لیے پاک کر اور لوگوں میں حج کا اعلان کر دے، وہ تیرے پاس پیدا ہو اور (دور کے سفر سے تھکی ماندی) دبی سواریوں پر ہر دور دراز راستے سے آئیں گے، تاکہ وہ اپنے نفع کی بھجوں پر حاضر ہوں اور ہم نے ان کو جو چوپائے جانور روزی دیے ہیں، ان پر ان (کی قربانی) پر چند جانے ہوئے دنوں میں خدا کا نام لیں تو ان میں سے کچھ تم کھاؤ اور بدحال فقیر کو کھلاؤ، اس کے بعد اپنا میل کچیل دور کریں اور اپنی منتیں پوری کریں اور اس قدیم گھر کا چکر لگائیں، یہ سن چکے اور جو کوئی اللہ کے آداب کی برائی رکھے تو وہ اس کے لیے اس کے رب کے پاس بہتر ہے۔“

﴿وَإِذْ قَالَ إِبْرَهِيمُ رَبِّيْ اجْعَلْ هَذَا الْبَلَدَ أُمِّيَّا وَاجْنِيْيَ وَيَسِّيَ أَنْ تَعْبُدَ الْأَصْنَامَ رَبِّيْ إِنَّهُنَّ أَضْلَلُنَّ كَثِيرًا قِنَ النَّاسِ فَمَنْ تَعْبُدُ فَإِنَّهُ مَنِيْ وَمَنْ عَصَانِيْ فَإِنَّكَ نَغْوُرْ رَحِيمُو رَبِّنَا إِنِّيْ أَسْكَنْتُ مِنْ دُرِّيْتِنِيْ بُوَادِ غَيْرِ ذُنِيْ زُرْعَ عِنْدَ بَيْتِكَ الْحَرَمَ لَرِبِّنَا لِيَقِيمُوا الصَّلَاةَ فَاجْعَلْ أَفْيَدَهُ قِنَ النَّاسِ تَهْوَيَ الْيَهُمْ وَأَرَزَ قَهْمُمْ مِنَ الْعَمَرَتِ لَعَلَّهُمْ يَشْكُرُونَ رَبِّنَا إِنَّكَ تَعْلَمُ مَا لَعْفُونَ وَمَا نَعْلِنَ وَمَا يَعْلَفُ عَلَى اللَّهِ مِنْ شَيْءٍ فِي الْأَرْضِ وَلَا فِي السَّمَاءَوَهُ﴾ (۱۴/ ابراہیم: ۳۵-۳۹)

”اور یاد کرو جب ابراہیم نے یہ دعا کی کہ، اے میرے پروردگار! اس شہر کو امن والا بنا اور مجھ کو اور میری اولاد کو بتوں کی پرستش سے بچا، میرے پروردگار! ان بتوں نے بہتوں کو گمراہ کیا ہے تو جو میری بیرونی کرے گا، وہ مجھ سے ہو گا اور جو میری نافرمانی کرے گا تو، تو بخشندہ الامہ ربان ہے، اے ہمارے پروردگار! ہم نے اپنی کچھ اولاد کو اس بنی ہٹھی کی تراہی میں تیرے مقدس گھر کے پاس بسا یا ہے، اے ہمارے پروردگار! یہ اس لیے، تاکہ یہ تیری نماز کھڑی کریں، تو کچھ لوگوں کے دلوں کو ایسا بنا کر وہ ان کی طرف مائل ہوں اور ان کو کچھ بچلوں کی روزی دے، تاکہ یہ تیرے شکرگز ار رہیں، اے ہمارے پروردگار! تجھے معلوم ہے جو ہم جھپا کیں اور جو ظاہر کریں اور اللہ سے زمین میں اور نہ آ سان میں کچھ چھپا ہے۔“

﴿فَلْ صَدَقَ اللَّهُ فَأَتَيْعَوْهُ مِلَةً إِبْرَاهِيمَ حَنِيفًا وَمَا كَانَ مِنَ الْمُشْرِكِينَ ۝ إِنَّ أَوَّلَ بَيْتٍ وُضْعَهُ لِلثَّالِثِ بِيَكْلَةٍ مُبَرَّكَةٍ وَهُدًى لِلْعَلَمِينَ ۝ فِيهِ أَيْتُ بَيْتَنِي مَقَامٌ إِبْرَاهِيمَ وَمَنْ دَخَلَهُ كَانَ أَمَّاًطَ وَلَذُو عَلَى التَّالِسِ حِجَّةُ الْبَيْتِ مَنْ اسْتَطَاعَ إِلَيْهِ سَيْلًا وَمَنْ كَفَرَ فَإِنَّ اللَّهَ خَيْرٌ عَنِ الْعَالَمِينَ ۝﴾ (آل عمران: ۹۵-۹۷)

”کہہ کہ خدا نے سچ فرمایا، تو ابراہیم کے دین کی بیرونی کر، شرک سے منہ موز کر اور ابراہیم مشرکوں میں سے نہ تھا، بے شک وہ پہلا گھر جو لوگوں کے لیے بنایا گیا، وہی ہے جو مکہ میں ہے باہر کرت اور دنیا کے لیے راہ نہ ماس میں کچھ کھلی ہوئی نشانیاں ہیں، ابراہیم کے کھڑے ہونے کی جگہ اور جو اس میں داخل ہوا وہ امن پا جائے اور خدا کا لوگوں پر اس گھر کا قصد کرنا فرض ہے، جس کو اس کے راستے (سفر) کی طاقت ہو اور جو اس قدرت کے باوجود اس سے باز رہے، تو خدادنیا والوں سے بے نیاز ہے۔“

یہ وہ آیتیں ہیں جن کا تعلق اس موضوع سے ہے، ان میں نہایت وضاحت کے ساتھ یہ بیان کیا گیا ہے کہ ہم نے ابراہیم ﷺ کو بت پرست اور ستارہ پرست ملکوں سے ہنا کہ جن میں وہ سرگردان اور آوارہ پھر رہے تھے اور ایک امن کے سنسان مقام کی تلاش میں تھے، تاکہ وہ خدا نے واحد کی پرستش کے لیے ایک گھر بنائیں، یہ مکانا عنایت کیا، جو ازال سے اس کام کے لیے منتخب تھا، تاکہ وہ یہاں خدا کے گھر کی منہدم چہار دیواری کو کھڑی کریں اور پھر اس کو تو حید کا مرکز اور عبادت گزاروں کا مسکن بنائیں۔

یہ مقام ویران اور پیداوار سے خالی تھا، اس لیے حضرت ابراہیم ﷺ نے دعا مانگی کہ خداوند! یہاں تیرے مقدس گھر کے پڑوں میں اپنی کچھ اولاد بساتا ہوں، ان کو روزی پہنچانا اور لوگوں کے دلوں کو مائل کرنا کہ وہ ادھر آتے رہیں اور ان کو اس لیے یہاں بساتا ہوں، تاکہ وہ آس پاس کی بت پرست قوموں کی بت پرستی

سے بچ رہیں اور تیری خالص عبادت بجالا میں، ان میں جو نیکوکار ہوں، وہ میرے ہیں اور جو بد کار اور مگراہ ہوں ان کا تو مالک ہے، تو حرم والا اور معاف کرنے والا ہے اور خداوند! میری اولاد میں ایک رسول بھیجا، جو ان کو نیک تعلیم دے۔

قرآن کا دعویٰ ہے کہ اس مقام اور اس گھر میں حضرت ابراہیم علیہ السلام کی بہت سی یادگار نشانیاں ہیں اور ان کے گھرے ہونے اور نماز پڑھنے کی جگہ اور قربانی کا مقام ہے، اس لیے لوگوں کو چاہیے کہ دور دور سے بیہاں آئیں اور اپنے دینی و دنیاوی فائدوں کو حاصل کریں اور اس قدیم خانہ خدا کا طواف کریں اور یہاں اسماعیل علیہ السلام کی یادگار میں قربانی کر کے غریبوں کو کھلا میں اپنی نذر پوری کریں اور اس حالت میں وہ امن و سلامتی کے بھرم پکر ہوں، ندوہ کسی پر تھیار اٹھاسکتے ہوں، نہ ایک چیزوں تک کو مار سکتے ہوں اور وہ اس حالت میں ظاہری زیبائش و آرائش اور پر تکلف مصنوعی زندگی سے بھی پاک ہوں اور چند روز یہاں ابراہیمی یادگاروں پر تھہر تھہر کر ابراہیمی زندگی بس کر کے ابراہیمی طریقہ پر خدا کو یاد کریں۔

اوپر توراة کے حوالوں سے گزر چکا ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام اور ان کی اولاد کا دستور تھا کہ وہ جہاں کہیں کوئی ربانی کر شدہ دیکھتے تھے، تمدن کے اس ابتدائی عہد میں کسی بڑی تعمیر کے مجاہے وہ بن گھرے پتھر کو گھر اکر کے خدا کا گھر بنایتے، وہاں قربانی کرتے اور خدا کی عبادت کرتے تھے۔ اس قسم کا گھر یہ خانہ کعبہ تھا، یہ بھی توراة کے حوالوں سے گزر چکا ہے کہ خدا کے گھر کی خدمت اور عبادت کے لیے جو شخص نذر کیا جاتا تھا، وہ اتنے دنوں تک سر نہیں منڈا تا تھا، نذر پوری کر لینے کے بعد وہ سر پر اسٹرالگاتا تھا، پھر جہاں یہ نذر ہے کہ اس گھر کی چھت پر نہ چڑھنا کہ تیری برہنگی نہ ظاہر ہو۔ (خروج ۲۶-۲) اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ اس وقت بن سلا کپڑا اپنیتے تھے اور کریں تہ بند باندھتے تھے۔ توراة کے فارسی اقتباس میں جو اوپر نقل ہوا ہے، مذکور ہے کہ جب اللہ تعالیٰ نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کو حضرت اسماعیل علیہ السلام کی قربانی کے لیے آواز دی تو حضرت ابراہیم، نے جواب میں ”لبیک“ کہا اور اردو میں ہے کہ ”میں حاضر ہوں“ کہا یہی صدا لبیک اللہم لبیک اسلامی حج میں اٹھتے بیٹھتے لگائی جاتی ہے، یہ بھی گزر چکا ہے کہ جس کو نذر یا قربانی کرتے تھے، اس کو قربان گاہ کے چاروں طرف پھراتے تھے یا نثار کرتے تھے۔ حج میں یہ طواف کہلاتا ہے، غرض ان ہی سب ابراہیمی مراسم کے مجموعہ کا نام اسلام میں حج ہے۔

حج کی حقیقت

ان تفصیلات کے بعد معلوم ہوا ہو گا کہ حج کی حقیقت خدا کی رحمتوں اور برکتوں کے مورد خاص میں حاضری، حضرت ابراہیم علیہ السلام کی طرح خدا کی دعوت پر لبیک کہنا اور اس عظیم الشان قربانی کی روح کو نزدہ کرنا ہے، یعنی ان دو برگزیدہ بندوں کی پیروی میں اللہ تعالیٰ کے حکم کے سامنے تسلیم و رضا اور فرمانبرداری اور اطاعت کیشی کے ساتھ اپنی گردن جھکا دینا اور اس معاهدہ کو اور عبودیت کے انہیا کو اسی طرح بجالا نا جس طرح

وہ ہزاروں برس پہلے بجالائے اور خدا کی نوازشوں اور بخششوں سے مالا مال ہوئے، یہی ملت ابراہیمی اور یہی حقیقی اسلام ہے، یہی روح اور یہی باطنی احساس اور جذبہ ہے جس کو حاجی ان بزرگوں کے مقدس اعمال اور قدیم دستوروں کے مطابق حج میں اپنے عمل اور کیفیت سے جسم کر کے ظاہر کرتے ہیں، تمدن کے اسی ابتدائی دور کی طرح وہ ان دونوں بن سلے اور سادہ کپڑے پہنتے ہیں، وہ خود اپنے کو حضرت اسماعیل علیہ السلام کی طرح خدا کے حضور میں نذر کرنے جاتے ہیں، اس لیے اتنے دونوں تک سر کے بال نہ منڈاتے ہیں، نہ ترشواتے ہیں، دنیا کے عیش و نشاط اور تکلف کی زندگی سے پرہیز کرتے ہیں، نہ خوشبو لگاتے ہیں، نہ رکھنیں کپڑے پہنتے ہیں، نہ سر چھپاتے ہیں اور اسی والہانہ انداز سے جس طرح ابراہیم و اسماعیل علیہما السلام تین دن کے سفر کے گروغبار میں اٹے ہوئے دوڑے ہوئے خدا کے گھر میں آئے تھے، آتے ہیں اور جس طرح حضرت ابراہیم علیہ السلام نے خدا کی پکار پر بلیک کہا تھا، وہی تین ہزار برس پہلے کا ترانہ ان کی زبانوں پر ہوتا ہے:

(لَّبِيْكَ اللَّهُمَّ لَبِيْكَ، لَبِيْكَ لَا شَرِيكَ لَكَ لَبِيْكَ، إِنَّ الْحَمْدَ وَالنِّعْمَةَ لَكَ
وَالْمُلْكُ لَا شَرِيكَ لَكَ) ﴿۱﴾

”میں حاضر ہوں اے اللہ! میں حاضر ہوں، میں حاضر ہوں، تیرا کوئی شریک نہیں، سب خوبیاں اور سب فرمیں تیری ہی ہیں اور سلطنت تیری ہی ہے، تیرا کوئی شریک نہیں۔“
یہ خدمت کی آمادگی کا ترانہ اور یہ توحید کی صدائیں تمام مقامات اور حدود میں بلند کرتے پھرتے ہیں جہاں جہاں ان دونوں بزرگوں کے نقش قدم پڑے تھے اور چونکہ وہ خود اپنے آپ کو روحانی طور پر خدا کی قربان گاہ پر نذر کرنے چلتے ہیں۔ اس لیے اپنے آپ کو سات دفعہ اس بیت ایل یا بیت اللہ کے چاروں طرف پھرا کر تصدیق کرتے ہیں، پھر جہاں سے جہاں تک (صفا سے مرود تک) حضرت ابراہیم علیہ السلام دوڑ کر گئے تھے کہ مرودہ پر پہنچ کر بیٹھ کر قربانی کریں گے، وہاں ہم دوڑتے ہیں اور دعا کرتے ہیں اور گناہوں کی بخشش چاہتے ہیں اور عرفات کے سب سے بڑے میدان میں جمع ہو کر اپنی تمام گرگشته عمر کے گناہوں اور کوتا ہیوں کی معافی چاہتے ہیں، خدا کے حضور میں گردگڑاتے ہیں، روتے ہیں، قصور معاف کراتے ہیں اور آینہ زندگی کے لیے خدا کے ہاتھ پر اس کی عبودیت، بندگی اور اطاعت کا نیا عہد دیا جان باندھتے ہیں اور یہی درحقیقت حج کا اصلی رکن ہے ﴿۲﴾ یہ تاریخی میدان اس تاریخی عہد کی یاد ان بزرگوں کے نقش قدم اور ان کی دعا کے مقامات اور تحلیلات ربانی کے مناظر دور راز سفر اور ہر قسم کی محنت کے بعد اکثر وہ کو عمر میں ایک دفعہ اس مقام پر آسکنے کا موقع اور لاکھوں بندگان خدا کا ایک ہی وحدت کے رنگ میں، ایک ہی لباس اور شکل و صورت ایک ہی حالت

﴿۱﴾ صحیح مسلم، کتاب الحج، باب التلبیة وصفتها ووقتها۔ ۲۸۱۱۔

﴿۲﴾ ترمذی، ابواب الحج، باب ما جاء فی من ادرک الامام بجمعه فقد ادرک الحج: ۸۸۹۔

اور جذبہ میں سرشار ایک بے آب و گیاہ اور خشک میدان اور جلے ہوئے پھاؤں کے دامن میں اکٹھے ہو کر دعا و مغفرت کی لپکار، گزشتہ عمر کی کوتا ہیوں اور بر باد یوں کا ماتم، اپنی بد کاریوں کا اقرار اور پھر اس احساس کے ساتھ کہ یہی وہ مقام ہے جہاں ابراہیم خلیل اللہ سے لے کر محمد رسول اللہ علیہ السلام تک بہت سے انبیاء اسی حالت اور اسی صورت میں اور ہمیں پر کھڑے ہوئے تھے۔ یہ روحانی منظر، ایسا کیف، ایسا اثر، ایسا گداز، ایسی تاثیر پیدا کرتا ہے جس کی لذت تمام مرفا موش نہیں ہوتی، پھر اپنی نذر کے دن پورے کر کے اپنی طرف سے ایک جانور حضرت ابراہیم علیہ السلام کی پیروی اور اپنی روحانی قربانی کی تمثیل میں جسمانی طور سے ذبح کرتے ہیں اور اس وقت اسی اطاعت، اسی فدویت، اسی سرفوشی اور اسی قربانی کا اپنی زبان سے اقرار کرتے ہیں، جو کبھی اسی میدان میں اسی موقع پر اور اسی حالت اور اسی شکل میں دنیا کے سب سے پہلے داعی توحید نے اپنے عمل اور اپنی زبان سے ظاہر کی تھی اور وہی جذبات اس وقت حاجیوں کے دلوں میں موجز ن ہوتے ہیں اور ان کی زبانوں سے حضرت ابراہیم علیہ السلام کے الفاظ کی صورت میں ظاہر ہوتے ہیں:

﴿إِنَّ وَجْهَكُ وَجْهٌ لِّلَّدِيْ فَطَرَ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضَ حَيْنًا وَمَا آتَا هِنَّ الْمُشْرِكُونَ ﴾

(الانعام: ۸۰)

”میں نے ہر طرف سے منہ موڑ کر اس کی طرف منہ کیا جس نے آسمانوں کو اور زمین کو پیدا کیا،
موحد بن کر اور میں ان میں نہیں جو خدا کا شریک ہنا تے ہیں۔“

﴿إِنَّ صَلَاتِنِ وَنُسُكِ وَهَجَّةَنِ وَمَمَّا يَأْتِي لِلَّهِ رَبِّ الْعَالَمِينَ لَا شَرِيكَ لَهُ وَبِذِلِّكَ أُهْرُكُ وَأَنَا أَوَّلُ الْمُسْلِمِينَ ﴾

(الانعام: ۱۶۲-۱۶۳)

”میری نماز اور میری قربانی اور میرا جننا اور میرا مناسب اللہ کے لیے ہے، جو تمام دنیا کا پروردگار ہے، اس کا کوئی شریک نہیں اور یہی حکم مجھ کو ہوا ہے، میں سب سے پہلے فرمانبرداری (اسلام کا) اقرار کرتا ہوں۔“

یہی حج کی حقیقت اور یہی اس عظیم الشان عبادت کے مراسم اور اركان ہیں۔
حج کی اصلاحات

حج کی فرضیت دوسری عبادات سے باکل مختلف تھی، عام الہ عرب نماز کے اوقات، اركان اور خصوصیات سے عملآ نابدد تھی۔ اس لیے آنحضرت علیہ السلام نے ان کو تعلیم دی اور بتدریج ان کو ترقی دی، زکوٰۃ ان میں سرے سے موجود تھی۔ اس لیے عام صدقہ اور خیرات کے آغاز سے زکوٰۃ کی عملی فرضیت تک متعدد منزلیں طے کرنی پڑیں، روزے نے بھی یوم عاشورا سے لے کر رمضان تک مختلف قابل بدالے، لیکن حج

صحیح مسلم، کتاب الحج، مختلف ابواب۔

عرب کا ایک ایسا عام شعار تھا، جس کے تمام اصول و ارکان پہلے سے موجود تھے، صرف ان کا محل اور طریقہ استعمال بدل گیا تھا، یا ان میں بعض مشرکانہ رسم داخل ہو گئی تھیں، اسلام نے ان مفاسد کی اصلاح کر کے بہ کیک دفعہ حج کے فرض ہونے کا اعلان کر دیا۔

ان اصلاحات کی تفصیل حسب ذیل ہے:

① ہر عبادت کی اصلی غرض ذکرِ اللہ، طلب مغفرت اور اعلائے کلمۃ اللہ ہے، لیکن اہل عرب نے حج کو ذاتی و خاندانی نام و نمود کا ذریعہ بنالیا تھا۔ چنانچہ جب تمام مناسکِ حج سے فارغ ہو چکتے تھے تو تمام قبائل میں آ کر قیام کرتے تھے، مفاخرت عرب کا ایک قومی خاصہ تھا اور اس مجتمع عام سے بڑھ کر اس کے لیے کوئی موقع نہیں مل سکتا تھا، اس بنابر ہر قبیلہ ذکرِ اللہ کی جگہ اپنے آباء و اجداد کے کارنا مے اور محاسن بیان کرتا تھا، اس پر یہ آیت نازل ہوئی:

﴿فَادْعُوا اللَّهَ كَذِكْرِهِ أَبَأْ كُمْ أَوْ أَشَدَّ ذِكْرًا﴾ (۲۰۰: البقرة)

”جس طرح اپنے باپ و ادوس کا ذکر کرتے ہو، اسی طرح بلکہ اس سے بھی زیادہ بلند آنکھی کے ساتھ خدا کی یاد کرو۔“

② قربانی کرتے تھے تو اس کے خون کو خانہ کعبہ کی دیواروں پر لگاتے تھے کہ خدا سے تقرب حاصل ہو جائے، یہود میں بھی یہ رسم تھی کہ قربانی کے خون کا چھینٹا قربان گاہ پر دیتے تھے اور قربانی کا گوشت جلا دیتے تھے، محمد رسول اللہ ﷺ کے ذریعہ یہ دونوں باتیں مصادی گئیں اور یہ آیت اتری:

﴿لَنْ يَتَأْكَلَ اللَّهُ لُحُومَهَا وَلَا دِمَاؤُهَا وَلِكُنْ يَتَأْكَلُهُ اللَّهُوَ مِنْكُمْ﴾ (۳۷: الحج)

”خدا کے پاس قربانیوں کا خون اور گوشت نہیں پہنچتا، اس کے پاس صرف تمہارا تقویٰ پہنچتا ہے۔“

اور آگے چل کر یہ بھی بتا دیا کہ اس قربانی کا مقصد یہ ہے کہ غریبوں کی ضیافت کی جائے اور اس جن ابرا یہی کے موقع پر ان کو شکم سیر کیا جائے۔

③ اہل یمن کا دستور تھا کہ جب حج کی غرض سے سفر کرتے تھے تو زادراہ لے کر نہیں چلتے تھے اور کہتے تھے کہ ہم متوكل علی اللہ ہیں، نتیجہ یہ ہوتا تھا کہ جب مکہ میں پہنچتے تھے تو بھیک مانگنے کی نوبت آتی تھی، اس پر یہ آیت نازل ہوئی:

﴿وَتَزَوَّدُوا فَإِنَّ خَيْرَ الرَّازِدِ الْتَّقْوَىٰ﴾ (۱۹۷: البقرة)

”زادراہ ساتھ لے کر چلو کیوں کہ بہترین زادراہ پر ہیز گاری ہے۔“

* بخاری، کتاب الحج، باب قول اللہ: و تزودوا...: ۱۵۲۳

④ قریش نے عرب کے دوسرے قبیلوں کے مقابل میں جو امتیازات قائم کر لیے تھے ان کی بنا پر قریش کے سوات تمام قبیلے نگے ہو کر خانہ کعبہ کا طواف کرتے تھے۔ اس غرض سے خانہ کعبہ میں لکڑی کا ایک تختہ رکھا ہوا تھا، جس پر تمام لوگ کپڑے اتارتا رکھ دیتے تھے۔ ان لوگوں کی ستر پوشی صرف قریش کی فیاضی کر سکتی تھی، یعنی اس موقع پر قریش کی طرف سے حسبہ للہ کپڑا تقسیم کیا جاتا تھا اور مرد مردوں کو اور عورتوں کو خاص طواف کے لیے کپڑا مستعار دیتی تھیں اور وہ لوگ اسی کپڑے میں طواف کرتے تھے، لیکن جو لوگ اس فیاضی سے محروم رہ جاتے تھے، ان کو برہنہ طواف کرنا پڑتا تھا۔ ﴿اسلام نے اس بے حیائی کے کام کو قطعاً موقوف کر دیا اور یہ آیت اتری:

﴿خُذْ وَا زِينُوكُمْ عِنْدَ مَسْجِدٍ﴾ (الاعراف: ۳۱)

”ہر عبادت کے وقت اپنے کپڑے پہنو۔“

اور ۹^۹ ہر کے موسم حج میں آنحضرت ﷺ نے حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ کو اس اعلان کے لیے بھیجا کہ آئندہ کوئی نگاہ کو کر طواف نہ کرنے پائے، چنانچہ اس کا اعلان کیا گیا اور اس وقت سے یہ رسم اٹھ گئی۔ ﴿

⑤ قریش کی ایک امتیازی خصوصیت یہ تھی کہ اور تمام قبائل عرفات میں قیام کرتے تھے، لیکن وہ خود حدود حرم کے اندر سے باہر نکلا اپنے مذہبی منصب کے خلاف بکھتے تھے، اس لیے مزدلفہ میں ظہرتے تھے، اسلام نے قریش کے اس امتیاز کا خاتمہ کر دیا۔ چنانچہ یہ آیت اتری:

﴿لَهُ أَفِيضُوا هُنَّ حَيْثُ أَفَاضَ النَّاسُ﴾ (البقرة: ۱۹۹)

”کوچ و بیس سے کرو جہاں سے تمام لوگ کرتے ہیں۔“

⑥ صفا اور مروہ کے درمیان میں جو وادی ہے، اس سے تیزی کے ساتھ دوز کر گزرتے تھے اور یہ ایک مذہبی سنت تراپاگئی تھی، لیکن اسلام نے اس کو کوئی سنت نہیں قرار دیا۔ یعنی اس کو کوئی خاص اہمیت نہیں دی۔

⑦ جالمیت کے زمانہ میں حج کی مذہبی حیثیت تو یوں ہی سی رہ گئی تھی، ورنہ اس نے درحقیقت ایک بڑے میلے کی حیثیت اختیار کر لی تھی، جس میں ہر طرف سے ہر تماش کے لوگ جمع ہوتے تھے اور وہ سب کچھ ہوتا تھا جو میلیوں میں ہوتا ہے، شور و غل ہوتا تھا، دنگا فساد ہوتا تھا، عورتوں سے چھیر خانی ہوتی تھی، غرض فتن و فخر کا ہر تماشا وہاں ہوتا تھا۔ اسلام آیا تو اس نے یک لخت ان باتوں کو بند کر دیا اور حج کو تقدس، تورع، نیکی اور ذکر الہی کا سرتاپا مرتقب بنادیا، حکم آیا:

.....

❶ طبقات ابن سعد تذكرة حمزة سید الشهداء، القسم الاول، ج ۲، ص: ۶۔

❷ بخاری، کتاب الحج، باب الوقوف بعرفة، ۱۶۶۵۔ ❸ بخاری، کتاب الحج، باب لا يطوف بالبيت عربیان: ۱۶۲۲۔ ❹ بخاری، کتاب الحج، باب الوقوف بعرفة، ۱۶۶۵۔ ❺ صحیح بخاری، کتاب

الحج، باب ما جاء في السعي بين الصفا والمروة: ۱۶۴۴۔

﴿فَمَنْ فَرَضَ فِيهِنَّ الْحِجَّةَ فَلَا رَفَثَ وَلَا فُسُوقٌ لَا جِدَالَ فِي الْحِجَّةِ وَمَا تَعَلَّمُوا مِنْ خَيْرٍ يَعْلَمُهُ اللَّهُ﴾ (١٩٧ / البقرة)

”پھر جس نے ان ہمیں میں حج کی نیت کی تو پھر حج میں عورت سے نہ چھیڑ چھاڑ ہے، نہ فاشی ہے، نہ لڑائی دنگا ہے اور تم جو میکی کرو گے، اللہ کو معلوم ہو گی۔“

⑧ مناسک حج کے بعد جو لوگ واپس آنا چاہتے تھے، ان میں دو گروہ ہو گئے تھے، ایک کہتا تھا کہ جو لوگ ایام تشریق ہی میں واپس آتے ہیں وہ گناہگار ہیں، دوسرا ان لوگوں کو الزام لگاتا تھا، جو دیر میں واپس ہوتے تھے چونکہ ان میں درحقیقت کوئی گروہ گناہگار نہ تھا، اس لیے قرآن مجید نے دونوں کو جائز رکھا:

﴿فَمَنْ تَعَجَّلَ فِي يَوْمَيْنِ فَلَا إِثْمَ عَلَيْهِ وَمَنْ تَأَخَّرَ فَلَا إِنْذِنٌ لَّهُ عَلَيْهِ لِعِنْ أَنْفُسِهِ﴾

(٢٠٣ / البقرة)

”جو شخص عجلت کر کے ایام تشریق کے دو ہی دنوں میں واپس آیا اس پر بھی کوئی گناہ نہیں ہے اور جس نے دریکی اس پر بھی کوئی گناہ نہیں ہے، بشرطیکہ اس نے تقویٰ اختیار کیا۔“

⑨ ایک خاموش حج ایجاد کر لیا تھا، یعنی حج کا احرام باندھتے تھے تو چپ رہتے تھے۔ چنانچہ حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ نے ایک عورت کو خاموش دیکھا تو وہ پوچھی، معلوم ہوا کہ اس نے خاموش حج کا احرام باندھا ہے، انہوں نے اس کو منع کیا اور کہا کہ یہ جا بیت کا کام ہے۔

⑩ خانہ کعبہ تک پیادہ پا جانے کی نذر کرتے تھے اور اس کو بڑا ثواب کا کام سمجھتے تھے۔ چنانچہ آنحضرت ﷺ نے ایک بدھے کو دیکھا کہ اپنے دو بیٹوں کے سہارے پیادہ جا رہا ہے، وجہ پوچھی تو معلوم ہوا کہ اس نے پیادہ پا چلنے کی نذر مانی ہے۔ ارشاد ہوا کہ ”خدا اس سے بے نیاز ہے کہ یہ اپنی جان کو عذاب میں ڈالے۔“ چنانچہ آپ ﷺ نے اس کو سواری پر جانے کا حکم دیا۔ ۲۱۴ اسی طرح عورتیں خانہ کعبہ تک کھلے سر اور برہنہ پا جانے کی نذر مانی تھیں، آپ نے ایک بار اسی قسم کی ایک عورت کو دیکھا تو فرمایا کہ ”خدا اس پر یشان حالی کا کوئی معاوضہ نہ دے گا، اس کو سوار ہونا اور دو پٹہ اور ڈھنچا ہے۔“ ۲۱۵ اسی سبب سے قربانی کے لیے گھر سے جو جانور لاتے تھے، اس پر صرف اس خیال سے کہ وہ قربانی کا جانور ہے، سوار نہیں ہوتے تھے۔ چنانچہ ایک بار آپ نے دیکھا کہ ایک شخص اونٹ ہائکے ہوئے لے جا رہا ہے۔ فرمایا کہ ”اس پر سوار ہولو۔“ اس نے جواب دیا کہ یہ قربانی کا اونٹ ہے، چنانچہ آپ ﷺ نے تین بار اس کو اونٹ پر سوار ہونے کی تاکید کی۔

۱۱ انصار حج کر کے واپس آتے تھے تو دروازے کی راہ سے گھر میں نہیں داخل ہوتے تھے، بلکہ پچھوڑائے

۲۱۴ بخاری، کتاب مناقب الانصار ، باب ایام الجahلیyah: ۳۸۳۴۔ ۲۱۵ ترمذی، ابواب التذور والایمان، باب ما جاء في من يحلف بالمشى ولا يستطيع: ۱۵۳۷۔

۲۱۶ ایضاً: ۱۵۳۶۔ ۲۱۷ بخاری، کتاب الحج، باب رکوب البدن: ۱۶۸۹، ۱۶۹۰۔

سے کو دکر آتے تھے اور اس کو کارث و ثواب سمجھتے تھے۔ چنانچہ ایک شخص حج کر کے آیا اور دستور کے خلاف دروازے سے گھر میں گھس آیا تو لوگوں نے اس کو بڑی احتہام و ملامت کی، اس پر قرآن مجید کی یہ آیت نازل ہوئی: ﴿وَكَيْسَ الْيَرْبُ إِنَّ تَأْنُوا الْبَيْوَتَ مِنْ ظُهُورُهَا وَلَكِنَّ الْيَرْبَ مِنَ الْقَىٰ وَأَنْوَأُ الْبَيْوَتَ مِنْ أَبُواهُمَا﴾ (۱۸۹/ البقرة)

”گھر کے پچھواؤزے سے آنا کوئی نیکی نہیں ہے، نیکی صرف اس کی ہے جس نے تقویٰ حاصل کیا اور گھروں میں دروازے کی راہ سے آؤ۔“

⑫ بعض لوگ طواف کرتے تھے تو اپنے گھنگا اور مجرم ہونے کی حیثیت کو مختلف نامناسب طریقوں سے ظاہر کرتے تھے، کچھ لوگ ناک میں نکیل ڈالا لیتے تھے اور اس کو پکڑ کر ایک شخص کھینچ پہرتا تھا، آنحضرت ﷺ نے ایک شخص کو دیکھا کہ اسی طریقہ سے طواف کر رہا ہے تو اس کی نکیل کٹوادی۔ ﴿اسی طرح آپ نے ایک شخص کو دیکھا کہ اس نے رسی سے اپنا ہاتھ ایک شخص سے باندھ دیا ہے اور وہ اس کو طواف کر رہا ہے، آپ نے رسی کاٹ دی اور فرمایا کہ ”اس کا ہاتھ کپڑا کر طواف کراؤ۔“ ﴿ایک بار آپ نے دیکھا کہ دو شخص ایک رسی میں جڑے ہوئے ہیں، وجہ پوچھی تو دونوں نے کہا کہ ہم نے یہ نذر مانی ہے کہ اسی طرح جڑے ہوئے خانہ کعبہ کا حج کریں گے، آپ ﷺ نے فرمایا کہ ”اس شکنخ کو دور کرو، یہ نذر نہیں ہے، نذر وہ ہے جس سے خدا کی ذات مقصود ہو۔“

⑬ اہل عرب ایام حج میں عمرہ نہیں کرتے تھے، کہتے تھے کہ جب سواریاں حج سے واپس آ جائیں اور ان کی پیٹھے کے زخم ابھی ہو جائیں اس وقت عمرہ جائز ہو سکتا ہے۔ لیکن رسول اللہ ﷺ نے خاص ایام حج میں عمرہ کیا اور عملاً اس بے ضرورت رسم کو منڈادیا۔

⑭ جاہلیت کے زمان میں کچھ لوگ توحیح کی نیت کرتے تھے۔ وہ ان دونوں تجارت نہیں کرتے تھے اور اس کو طریقہ حج کے خلاف سمجھتے تھے، اس لیے اکثر لوگ جو صرف تجارت اور یوپار کے لیے آتے تھے، وہ حج میں شریک نہیں ہوتے تھے۔ بلکہ وہ صرف میلہ کی خاطر جمع ہوتے تھے، ان کو حج سے کوئی سروکار نہ تھا، وہ عکاظ اور ذوالحجہ وغیرہ بازاروں میں جمع ہو کر صرف تجارت اور یوپار کرتے تھے۔ اسلام آیا تو یہ دونوں طریقے الگ الگ جاری تھے۔ اس کا نقصان یہ تھا کہ حاجی تجارت کے منافع سے محروم رہتے تھے اور غیر حاجیوں کا جو مجمع ہوتا تھا وہ صرف تماشائیوں کی بھیڑ ہوتی تھی، بازاری مقصد کے لوگ ہوتے تھے، جن میں ہر قسم کی برائیاں جاری ہوتی تھیں۔ اسلام نے اس تغیریق کو مٹا دیا اور کہہ دیا کہ تجارت اور یوپار حج کے تقدس و حرمت کے خلاف

❶ بخاری، کتاب الحج، باب قول الله تعالى: وَاتَّوَالْبَيْوَتَ مِنْ أَبُواهُمَا: ۱۸۰۳۔

❷ نسائی، کتاب مناسک الحج، باب الكلام في الطواف: ۲۹۲۲۔

❸ بخاری، کتاب الحج، باب الكلام في الطواف: ۱۶۲۰۔ فتح الباری، ج ۳، ص: ۳۸۶۔

❹ صحیح بخاری، کتاب مناقب الانصار، باب ایام الجاهلیة: ۳۸۳۲۔

نہیں، اس لیے یہ دونوں فریضے ایک ساتھ ادا ہو سکتے ہیں۔ فرمایا:

﴿لَيْسَ عَلَيْنَا مُجَاهٌ أَنْ تَبَقُّوا فَضْلًا مِّنْ رَّبِّكُمْ﴾ (۱۹۸/ البقرة)

”تمہارے لیے یہ کہا نہیں کہ (حج کے زمانہ میں) فصل الہی (تجارت) کی تلاش کرو۔“

اس کا توجیہ یہ ہوا کہ ہر شخص جو اس موقع پر جمع ہوتا تھا، حج کی نیت سے جمع ہوتا تھا، اس سے جامیت کے زمانے کے اجتماعی مفاسد کا خاتمہ ہو گیا اور ساتھ ہی اس اجتماع کے جائز تجارتی مشاغل کی ترقی ہو گی۔

۱۵ صفا و مروہ کے طواف کے متعلق پہلے ہی دو گروہ پیدا ہو گئے تھے۔ انصار مناہ کا احرام باندھتے تھے۔ جو مشتل میں قائم کیا گیا تھا اور طواف نہیں کرتے تھے، ان کے علاوہ تمام عرب صفا و مروہ کا طواف کرتے تھے۔ خدا نے جب پہلے خانہ کعبہ کے طواف کا حکم دیا اور صفا و مروہ کے متعلق کوئی آیت نازل نہیں ہوئی تو آخر الذکر گروہ نے آنحضرت ﷺ سے سوال کیا کہ یہ کوئی ناجائز فعل ہے؟ انصار نے بھی اس کے متعلق استفسار کیا۔ اس پر یہ آیت نازل ہوئی:

﴿إِنَّ الصَّفَا وَالْمَرْوَةَ مِنْ شَعَابِ اللّٰهِ؛ فَمَنْ حَجَّ إِلَيْهِمَا أَوْ أَعْمَرَ فَلَا جُنَاحَ عَلَيْهِ أَنْ يَطْوِفَ بِهِمَا﴾ (۱۵۷/ البقرة)

”صفا و مروہ خدا کا شعار ہیں، پس جو شخص حج یا عمرہ کرے، اس کے لیے ان دونوں کا پھیران گانا گناہ نہیں ہے۔“

حج کے ارکان

اب اس اصلاح ترمیم و اضافہ کے بعد حج کی حقیقت جن ارکان سے مرکب ہوئی، ان کی تفصیل اور ان کی مشروعیت کی مصلحتیں حسب ذیل ہیں:

احرام

تمام اعمال اگرچہ نیت پرمنی ہوتے ہیں، لیکن نیت کا اظہار عمل کے بغیر نہیں ہو سکتا۔ نماز کے لیے تکمیر اسی نیت کا اعلان ہے۔ احرام بھی حج کی تکمیر ہے۔ احرام باندھنے کے ساتھ انسان اپنی معمولی زندگی سے نکل کر ایک خاص حالت میں آ جاتا ہے۔ اس لیے اس پر وہ تمام چیزیں حرام ہو جاتی ہیں، جو دنیوی عیش و نشاط، زیب و زیست اور تفریح طبع کا ذریعہ ٹھیں، وہ شکار نہیں کر سکتا کہ محض کام وہن کی لذت کے لیے کسی جاندار کی

اس آیت کے شان نزول میں روایتیں مختلف ہیں، کچھ روایتوں سے معلوم ہوتا ہے، اہل عرب حج میں تجارت کرنا بر اجانتے تھے اس لیے یہ آیت اتری۔ دوسرا روایتوں میں ہے کہ اہل عرب ان دونوں تجارت کرتے تھے، اسلام جب آیا تو صحابہ نے پس کھا کتاب حج خالص خدا کے لیے ہو گیا، اس لیے اب اس میں تجارت مناسب نہیں یہ آیت اس خیال کی تردید کے لیے اتری، لیکن تمام روایتوں کے جمع کرنے سے وہ حقیقت معلوم ہوتی ہے، جو اپر متن کتاب میں لکھی گئی ہے اور روایتوں کے جمع کرنے سے اس کی تصدیق ہوتی ہے (دیکھو تفسیر طبری، الجزا الثاني، ج ۱۵۸، اوساپ المزول واحدی میں آیت نہ ذکر ہے)۔

صحیح بخاری، کتاب الحج، باب وجوب الصفا و المروہ: ۱۶۴۳

جان لینا بہر حال خود غرضی ہے۔ یوں سے متعین نہیں ہو سکتا کہ یہ نفسانی و شہوانی لذتوں سے احتراز کا موقع ہے۔ سلے ہوئے کچھے نہیں پہن سکتا کہ یہ جاہ و جلال کے اظہار کا ذریعہ ہے۔ اسی بنا پر اہل عرب برہن طوف کرتے تھے۔ لیکن خدا کی بارہ گاہ میں یہ بھی ایک بے ادبی تھی۔ اس لیے اسلام نے اس کو جائز نہیں رکھا اور یہ مقرر کیا کہ حرام کی نیت کے ساتھ شاہ و گدا پنے اپنے سلے ہوئے کچھوں کو اتار دیں اور انسان کے ابتدائی دور کا بن سلا کچڑا زیب بر کیا جائے، ایک چادر کر سے لپیٹ لی جائے اور دوسرا سرکھول کر گردن سے اس طرح لپیٹ لی جائے کہ داہنہا تھوڑی کاموں کے لیے باہر ہے۔ یہ عہد ابراہیم کے لباس کی تمثیل ہے، جو اس لیے اس وقت کے لیے پسند کیا گیا تاکہ اس مبارک عہد کی کیفیت ہماری ظاہری شکل و صورت سے بھی ظاہر ہو، یہ گویا شہنشاہ عالم و عالمیان کے دربار میں حاضری کی وردی ہے جو بالکل سادہ، بے تکلف اور زیب و زینت سے خالی منزروں کی گئی ہے۔

طواف

یعنی خانہ کعبہ کے چاروں طرف گھوم کر اور پھر کر دعا میں مانگنا، اس رسم کو ادا کرنا ہے، جو حضرت ابراہیم علیہ السلام کے عہد میں نذر اور قربانی کی قربان گاہ کے چاروں طرف پھرا کر ادا کی جاتی تھی، چنانچہ حاجی اپنے آپ کو قربان گاہ پر چڑھاتا ہے، اس لیے وہ اس کے چاروں طرف پھرتا ہے اور اس گردش کی حالت میں وہ اپنی مغفرت کی دعا میں اللہ تعالیٰ سے مانگتا ہے جس کا ایک ضروری نکٹوا آخر میں یہ ہوتا ہے کہ «رَبَّنَا أَنِيبَ فِي الدُّنْيَا حَسَنَةً وَّكَفَى الْآخِرَةَ حَسَنَةً وَّقَنَاعَذَابَ النَّاسِ» (۲۰/ البقرة) (۲۰۱) ”خدواندا، ہم کو دنیا میں سنکی دے اور آخرت میں سنکی دے اور ہم کو دوزخ کے عذاب سے بچا۔“

طواف حقیقت میں ایک قسم کی ابراہیمی نماز ہے، جو اس پرانے عہد کی یادگار ہے، اسی لیے آنحضرت ﷺ نے فرمایا کہ ”خانہ کعبہ کا طواف بھی گویا نماز ہے، صرف فرق یہ ہے کہ تم اس میں بول سکتے ہو، مگر نیک بات کے سوا اس حالت میں کچھا اور سب بولو۔“ **﴿وَلَيَطْوَّفُوا إِلَيْبِيِّتُ الْعَتِيقِ﴾** (۲۲/ الحج: ۲۹) اور حکم ہوا کہ **﴿أَوْ لَرْجَمُهُوا كَرِيسَ﴾** (۲۰/ البقرة: ۲۰)

”او اس پرانے گھر کا طواف کریں۔“

حجر اسود کا اسلام

حجر اسود کے لفظی معنی کا لے پھر کے ہیں، یہ کا لے رنگ کا ایک پتھر ہے، جو خانہ کعبہ کی دیوار کے ایک گوشہ میں قد آدم بلند کا دیا گیا ہے۔ خانہ کعبہ میسیوں دفعہ گرا اور بنا کبھی سیلا ب میں بہہ گیا اور کبھی آگ میں

﴿تَرْمِذِيٌّ، أَبُوَابُ الْحَجَّ، بَابُ مَاجِاءِ فِي الْطَّوَافِ فِي الْكَلَامِ فِي الْطَّوَافِ: ۹۶۰؛ نَسَائِيٌّ، كِتَابُ مَنَاسِكِ الْحَجَّ، بَابُ ابْاحَةِ الْكَلَامِ فِي الْطَّوَافِ: ۲۹۲۵؛ دَارِمِيٌّ، كِتَابُ الْمَنَاسِكِ، بَابُ الْكَلَامِ فِي الْطَّوَافِ: ۱۸۴۷؛ مَسْتَدِرِكُ حَاكِمٍ، كِتَابُ الْمَنَاسِكِ، ج ۱، ص: ۴۰۹﴾

جل گیا، اس بنیاد کا جو حضرت ابراہیم علیہ السلام کے ہاتھوں پڑی تھی، ایک پتھر بھی اس میں باقی نہیں، مگر اس عبد حقیق کی یادگار صرف ایک پتھرہ گیا تھا، جس کوابل عرب نے جامیت میں بھی پڑی حفاظت سے قائم رکھا اور سائز ہے تیرہ سو برس سے اسلام میں وہ اسی طرح نصب ہے (الایہ کے ۳۱ میں باطنیہ اس کو پکھ دنوں کے لیے نکال کر لے گئے اور پھر واپس کر گئے) یہ پتھر کعبہ کے اس گوشہ کی دیوار میں لگا ہے، جس کی طرف رخ کر کے کھڑے ہوں تو بیت المقدس سامنے پڑے گا اور اسی لیے ججر اسود کے مقابل گوشہ کا نام رکن شایی ہے، اس گوشہ کی تخصیص سے بیت المقدس کی سمت کا اشارہ مضمرا ہے، اس گوشہ میں اس پتھر کے لگانے سے تقصود یہ ہے کہ خانہ کعبہ کے طواف کے شروع اور ختم کرنے کے لیے وہ ایک نشان کا کام دے، ہر طواف کے ختم کے بعد اس پتھر کو بوسہ بھی دے سکتے ہیں۔ سینہ سے بھی لگاسکتے ہیں، ہاتھ یا کسی لکڑی یا در کسی چیز سے اس کو چھو کر اس چیز کو چوم سکتے ہیں۔ یہ نہ کسی تو اس کی طرف صرف اشارہ پر بھی قاعدت کر سکتے ہیں اور یہ پتھر کہنے کے لیے تو ایک معمولی پتھر ہے، جس میں نہ کوئی آسمانی کرامت ہے نہ کوئی غیری طاقت ہے۔ صرف ایک یادگاری پتھر ہے۔ مگر ایک مشتاق زیارت کی نگاہ میں اس تخلیل کے ساتھ کہ تمام دنیا بدل گئی، شہر مکہ کا ذرہ ذرہ بدل گیا، کعبہ کی ایک ایک اینٹ بدل گئی، مگر یہ پتھر ہے جس پر ابراہیم علیہ السلام خلیل اللہ سے لے کر محمد رسول اللہ علیہ السلام تک کے مقدس لب یا مبارک ہاتھ بالبقین پڑے ہیں اور پھر تمام خلفائے راشدین صحابہ کرام علیہم السلام اعلام، اکابر اسلام اور حکماء عظام ہستیم کے ہاتھوں نے اس کو مس کیا ہے اور آج ہمارے گناہگار لب اور ہاتھ بھی اس کو مس کر رہے ہیں۔ ہمارے دلوں اور آنکھوں میں تاثیر اور کیفیت کی ایک عجیب لہر پیدا کر دیتا ہے اور با ایس ہندہ ہم مسلمان یہی سمجھتے ہیں کہ یہ ایک پتھر ہے جس میں کوئی قدرت نہیں اور جیسا کہ بادہ توحید کے ایک ہشیار متواتر نے اس کو چوم کر کہا: اے کا لے پتھر! میں خوب جانتا ہوں کہ تو ایک معمولی پتھر ہے، نفع پہنچا سکتا ہے اور نہ نقصان، لیکن میں اس لیے تجھے بوسہ دیتا ہوں کہ میں نے محمد رسول اللہ علیہ السلام کو تجھے بوسہ دیتے دیکھا تھا۔ ۲ الغرض یہ بوسہ تعظیم کا نہیں، بلکہ اس محبت کا نتیجہ ہے جو اس یادگار کے ساتھ ابراہیم علیہ السلام اور امام علی علیہ السلام کی روحانی اولاد کو ہے، ورنہ اگر کوئی نہ اس کو چھوئے اور نہ بوسہ دے نہ اشارہ کرے تو اس سے اس کے ادائے حج میں کوئی نقصان لازم نہیں آتا۔

صفا اور مروہ کے درمیان دوڑنا

صفا اور مروہ کعبہ کے قریب دو پہاڑیاں تھیں، جو گواب برائے نام رہ گئی ہیں، تاہم کچھ کچھ ان کے نشانات باقی ہیں، صفا وہ پہاڑی معلوم ہوتی ہے، جہاں حضرت ابراہیم علیہ السلام اپنی سواری کے گدھوں اور نوکروں کو چھوڑ

۲ یعنی حضرت عمر بن خطاب۔ ۲ صحیح مسلم، کتاب الحج، باب استحباب تقبیل الحجر، ۳۰۶۹
ترمذی، ابواب الحج، باب ماجاء فی تقبیل الحجر: ۸۶۰؛ بخاری، کتاب الحج: ۱۵۹۷؛ نسائی: ۲۹۴۰؛ ابن ماجہ: ۲۹۴۳۔

کرا کیلے حضرت اسماعیل کو لے کر آگے بڑھے تھے اور مرد وہ پہاڑی ہے جس پر حضرت ابراہیم علیہ السلام نے حضرت اسماعیل علیہ السلام کی قربانی کرنی چاہی اور آخمنادی غیب کی آواز سے رک گئے اور اسماعیل علیہ السلام کی جگہ مینڈھا قربانی کیا۔ بعض روایتوں میں ہے کہ حضرت حاجہ علیہ السلام حضرت اسماعیل علیہ السلام کو لے کر جب یہاں آئی تھیں اور وہ پیاس سے بے تاب ہو گئے تھے تو حضرت حاجہ علیہ السلام صفا و مردہ کے درمیان پانی کی تلاش میں دوڑتی تھیں اور آخزمہ کا چشمہ ان کو نظر آیا، یہ صفا مردہ کی سعی انہیں کی اس مضطربانہ دوڑ کی یاد گاری ہے، سہر حال حج میں پہلے صفا پر پھر مردہ پر چڑھ کر کعبہ کی طرف منہ کر کے خدا کی حمد کرتے اور دعا مانگتے ہیں، پھر اس سے اتر کر دعا کیں مانگتے ہوئے مردہ پر آتے ہیں۔ وہاں بھی دعا کیں مانگتے ہیں کہ یہ دونوں مقامات ہیں، جہاں ربانی کر شے کے عظیم الشان جلوے حضرت ابراہیم اور بناجرہ علیہ السلام کو نظر آئے۔

﴿إِنَّ الصَّفَا وَالْمَرْوَةَ مِنْ شَعَابِ اللَّهِ فَمَنْ حَجَّ الْبَيْتَ أُو اعْتَمَرَ فَلَا جُنَاحَ عَلَيْهِ أَنْ يَتَّقَوْفَ بِهِمَا﴾ (۲/ البقرة: ۱۵۸)

”بے شک صفا اور مردہ خدا کا شعار ہیں تو جو خانہ کعبہ کا حج کرے یا عمرہ کرے، اس پر اس کا پھیرے لگانا گناہ نہیں۔“

وقوف عرفہ

عرفات میں نویں ذوالحجہ کو تمام حاجیوں کو ظہرنا اور زوال کے بعد سے غروب تک یہاں دعا اور خدا کی حمد میں مصروف رہنا پڑتا ہے اور اصل حج اسی کا نام ہے، یہاں کوسوں تک جہاں تک نظر کام کرتی ہے، ملک ملک کے لوگ ایک طرز اور ایک لباس میں کھڑے ہو کر رورہ کرائپنے لگا ہوں کی معانی مانگتے اور خدا سے اپنا نیا عبد باندھتے ہیں، یہیں جبل رحمت کے پاس کھڑے ہو کر اسلام کا امیر تمام دنیا کے آئے ہوئے حاجیوں کے سامنے خطبہ نام دیتا ہے اور انہیں ان کے فرائض سے آگاہ کرتا ہے۔ عرفات کے اس وقوف میں ایک طرف تو اسلام کی شان و شوکت کی ایک عظیم الشان نمائش ہوتی ہے اور دوسری طرف یہ اجتماع عظیم روز حشر کی یاد دلاتا ہے اور یہی سبب ہے کہ سورہ حج کا آغاز حشر کے بیان سے ہوتا ہے، یہ اجتماع اور اس کے بنے نظیر موثر منظر دلوں میں مغفرت اور رحمت الہی کی طلب کا طوفان انگیز جوش پیدا کرتا ہے، ہر شخص کو داہنے باکیں آگے پیچھے دور تک یہی منظر نظر آتا ہے، تو وہ خود اثر میں ایسا ذوب جاتا ہے کہ زندگی بھراں کی لذت باقی رہ جاتی ہے۔

قیام مزادلفہ

حج کا زمانہ بھیڑ بھاڑ اور دوڑ دھوپ کا ہوتا ہے، عرب مغرب کے بعد عرفات سے روانہ ہوتے ہیں، اسی حالت میں اگر منی کو برداہ راست چلے جاتے تو استکی خشکی سے چور ہو جاتے، اسی لیے انہوں نے ذرا سا سکون اور آرام اٹھانے کے لیے مزادلفہ کو ایک بیچ کی منزل قرار دے لیا تھا، اسلام نے اس کو اس لیے باقی رکھا کہ یہیں

وہ مسجد واقع ہے، جس کو شرحرام کہتے ہیں اور یہ عبادت کا خاص مقام تھا، اس لیے عرفات سے شام کو لوٹ کر رات بھر یہاں قیام کرنا اور طلوع فجر کے بعد تحویلی دری عبادت کرنا ضروری تھا دیا:

﴿فَإِذَا أَنْضَتُمْ مِنْ عَرَفَتِي فَادْكُرُوا اللَّهَ عِنْدَ الْمَشْعَرِ الْحَرَامِ وَإِذْكُرُوهُ كَمَا هَذِهِكُمْ وَإِنْ كُنْتُمْ مِنْ قَبْلِهِ لَمْ يَنْظُرْنَ إِلَيْهِنَّ﴾ (۲/ البقرة: ۱۹۸)

”توجب عرفات سے چلو تو شرحرام کے پاس خدا کو یاد کرو اور اس کو یاد کرو جس طرح اس نے تم کو بتایا اور تم اس سے پہلے حق کی راہ کو جو لو ہوئے تھے۔“

منی کا قیام

یہ معلوم ہو چکا ہے کہ قربانی کا اصل مقام مردہ کی پہاڑی ہے، جہاں حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اپنی قربانی پیش کی تھی، اسی لیے آنحضرت ﷺ نے فرمایا کہ ”قربان گاہ مردہ اور پھر کمکی تمام گلیاں ہیں۔“ رفتہ رفتہ جب مسلمانوں کی کثرت سے حج کے دائرہ نے مکانی و سعت حاصل کی اور قربانیوں کی کوئی حد نہ رہی، ادھر مردہ اور مکہ کا تمام میدان شہر اور آبادی کی صورت میں بدل چکا تھا، اس لیے شہر سے چند میل کے فاصلہ پر ایک میدان کو اس کے لیے منتخب کیا جس کا نام منی ہے، یہاں تمام حاجی دو تین دن ٹھہر کر باہم ملتے جلتے اور ایک دوسرے سے جان پہچان پیدا کرتے ہیں، سیہیں قربانی کی جاتی ہے، بازار لگتے ہیں، بخیری و فروخت ہوتی ہے۔

جامعیت میں عرب کے لوگ یہاں جمع ہو کر اپنے اپنے باپ دادوں کی بزرگی پر فخری کیا کرتے تھے جو اکثر ایسی بھڑائی کی صورت اختیار کر لیتی تھی، اس بیہودہ رسم کے روکنے کا بہترین طریقہ یہ تھا کہ بجائے اس کے خدا کی حمد و عبادت کا حکم دیا جائے اور اس مقام کو قوموں اور خاندانوں کی مفاخرت کی بجائے مسلمانوں کے باہم تعارف، محبت، مساوات اور بھیجنی کا مقام قرار دیا جائے فرمایا:

﴿وَادْكُرُوا اللَّهَ فِي آيَاتِهِ مَعْدُودٍ﴾ (۲/ البقرة: ۲۰۳)

”خدا کو چند گنتی کے دنوں میں یاد کرو۔“

قربانی

یہ حضرت اسماعیل علیہ السلام کے ذبح کی یادگار اور اپنی روحانی قربانی کی تمثیل ہے اور اس کا فائدہ یہ ہے کہ منی کے سہ روزہ قیام میں یہ قوی عید کی عمومی دعوت بن جائے جس میں لوگ ایک دوسرے کو، دوست احباب کو اور فقراء اور مساکین کو کھانا کھلائیں:

﴿وَيَذْكُرُوا اسْمَ اللَّهِ فِي آيَاتِهِ مَعْلُومٌ عَلَى مَا رَزَقَهُمْ مِنْ يَهِيمَةِ الْأَنْعَامِ فَكُلُّوا مِنْهَا وَأَطْعُمُوا الْبَالِسِ الْفَقِيرِ﴾ (۲۲/ الحج: ۲۸)

﴿مَؤْطَا امام مالک، کتاب الحج، باب ماجاء فی التحریف الحج: ۸۹۵؛ ابو داود، کتاب المناک، باب الصلوة بجمع: ۱۹۳۷؛ ابن ماجہ، کتاب مناسک، باب الذبح: ۳۰۴۸۔﴾

”اور مقررہ دونوں میں خدا کا نام اس پر لیا جائے جو جانور خدا نے روزی میں دیا تو اس میں سے کچھ خود کھاؤ اور مصیبت کے مارے فقیر کو کھاؤ۔“

اگر بعض حالات میں قربانی نہ ہو سکتے تو دس روزے رکھ لیں کہ یہ بھی ذاتی اشارتی کی تنشیل ہے:
﴿فَعَنْ تَمَثُّلِ الْعُمَرَةِ إِلَى الْحَجَّ فَمَا أَسْتَيْسَرَ مِنَ الْهُدَىٰ فَمَنْ لَمْ يَجِدْ فَصِيَامُ شَلَّةٍ أَيَّامُهُ فِي الْحَجَّ وَسَبْعَةٌ إِذَا رَجَعَتِهِ﴾ (۲/ البقرة: ۱۹۶)

”تو جو عمرہ اور حج دونوں کا ایک ساتھ فائدہ اٹھائے تو جو قربانی اس سے ممکن ہو وہ کرے جس کو یہ بھی میسر نہ ہو تو تین دن کے روزے حج میں اور سات دن واپس ہو کر۔“

حق راس

منی میں قربانی کے بعد حاجی سر کے بال منڈاتے یا ترشواتے ہیں، یہ اس پرانی رسم کی تعییل ہے کہ نذر دینے، اے جب نذر کے دن پورے کر لیتے تو اپنے بال منڈاتے۔ ﴿ ساتھ ہی اس رسم میں ایک اور پرانی یادگار کا اشارہ چھپا ہے، تمدن کے ابتدائی عہد میں دستور تھا کہ جو غلام بنا کر آزاد کیا جاتا تھا اس کے سر کے بال منڈا دیے جاتے تھے۔ یہ غلامی کی نشانی سمجھی جاتی تھی۔ ﴿ چونکہ حج خدا کی دائمی غلامی اور بندگی کا اقرار و اعتراف ہے۔ اس لیے انسانیت کی یہ پرانی رسم باقی رکھی گئی:

﴿الْمُحْلِقِينَ رَعْوَسَكُمْ وَمُفَقِّرِينَ﴾ (۴۸/ الفتح: ۲۷)

”اپنے سروں کو منڈا کر کر یا بال ترشو کر۔“

﴿وَلَا تُخْلِقُوا رَعْوَسَكُمْ حَتَّىٰ يَسْلُغَ الْهُدَىٰ حِجَّةً﴾ (۲/ البقرة: ۱۹۶)

”اوہ اپنے سرنہ منڈا وجہ تک قربانی اپنی جگہ پر نہ پہنچ جائے۔“

رمی جمار

منی ہی کے میدان میں پھر کے تین ستوں کھڑے ہیں، کہتے ہیں کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام اپنے بیٹے حضرت اسماعیل علیہ السلام کو قربانی کے لیے لے چلے تو شیطان نے ان موقعوں پر ان کے دل میں وسوساً ڈالا انہوں نے اس کو یہاں رجم کیا۔ جس کے لفظی معنی انگریز مارنے کے ہیں اور جو پہلے زمانہ میں لعنت کے اظہار کا طریقہ تھا اور اسی لیے شیطان کو ”رجیم“ یعنی ”انگریز مارا گیا“ کہتے ہیں۔ صاحب نظام القرآن ﴿ کا نظر یہ ہے کہ ابرہہم کے شکر نے مکہ پر جب چڑھائی کی تھی تو چند ندراث قفقی عربوں نے اس کی راہنمائی کی، باقی عربوں نے اس ناگہانی حملہ کا بدویانہ سنگ اندازی سے مقابلہ کیا۔ جس کا ذکر سورہ فیل کی آیت ﴿تَرْمِيْهُمْ﴾

❶ تورات عہد قدیم قاضی اصلاح: ۱۳ آیت: ۵۔ گنتی اصلاح: ص: ۴۰۳، ۶ آیت: ۵، ص: ۲۱۸۔

❷ ابن سعد جز ثانی قسم اول، ص: ۳۷۔ سریہ المنذر بن عمرو و سیرۃ ابن هشام ذکر بیر معونہ واقعہ عمرو بن امیہ و جزنا صیہ واعتفہ، ج ۲، ص: ۱۴۰۔ ❸ مولانا حمید الدین فراہی المتوفی: ۱۹۳۰ء۔

بِرْجَارَةٍ مِنْ سِجِيلٍ ﴿١٠٥﴾ (الفیل: ٤) میں ہے، اس سے اللہ تعالیٰ نے اس لشکر کو تباہ کیا اور وہ غدار بھی بلاک ہوئے یہ لشکر یوں کا چینکنا اسی "تر میہم" کی سُنگ باری کی یادگار ہے۔ خدا کی تسبیح اور حمد پڑھ کر ان لشکر یوں کو ان ستونوں پر پھیلتے ہیں اور شیطان کے وسوسوں سے محفوظ رہنے کی دعائیں لگتے ہیں، چونکہ لشکری مارنا یا چینکنا بظاہر ایک بیکار کام معلوم ہوتا ہے۔ اس لیے آنحضرت ﷺ نے اس کی تصریح فرمادی کہ اس لشکری پھیلتے سے مقصود اس بہانہ سے خدا کی یاد کو قائم رکھنے کے سوا اور کچھ نہیں ہے۔ ﴿قرآن پاک نے بھی اسی حقیقت کی طرف اپنے الفاظ میں اشارہ کیا ہے:

﴿فَإِذَا قَضَيْتُمْ مَنَا سِكْمُ فَأَذْكُرُوا اللَّهَ كَذْ كُمْ أَبَاءَكُمْ أَوْ أَشَدَّ ذُنُرًا﴾

(البقرة: ٢٠٠)

"جب سب ارکان ادا کر چکتو اپنے باپ دادوں کو جیسے یاد کرتے تھے ویسے ہی خدا کو یاد کرو بلکہ اس سے پڑھ کر۔"

اسی روی ہمار پر مراسم حج کا خاتم ہوتا ہے۔

ان رسوم کی غایت

اوپر کی تفصیلات سے واضح ہوتا ہے کہ حج کے تمام مراسم اس پرانے عہد کے طریق عبادت کی یادگار ہیں جس کا باقی رہنا اس لیے ضروری ہے تاکہ انسانیت کے روحانی دور ترقی کا عہد آغاز ہماری نگاہوں کے سامنے ہمیشہ قائم رہے اور ہمارے جذبات و احساسات کو یہ تاریخ کی یاد سے پہلے کے واقعات ہمیشہ متحرک کرتے رہیں اور خدا کی یاد اپنے گناہوں کی مغفرت اور آئندہ اپنی نیک زندگی گزارنے کا عہد ہماری حج سے پہلے اور حج کے بعد کی زندگیوں میں جو زپیدا کر کے تغیری و اصلاح کا ایک نیا باب کھولنے کا موقع دے۔ اسی لیے آنحضرت ﷺ نے نہایت وضاحت کے ساتھ فرمایا کہ "لشکری مارنے، صفا اور مردہ کے درمیان دوڑنے اور خانہ کعبہ کے طواف کرنے کا مقصود خدا کی یاد قائم کرنے کے سوا اور کچھ نہیں ہے۔" ﴿اور قرآن پاک کا اشارہ بھی اسی طرف ہے:

﴿وَيَذْكُرُوا السُّمَرَ الْمُؤْتَمِرَةَ آتَيَا وَمَعْنُومَتِ﴾ (الحج: ٢٨)

"اوہتا کہ ان مقررہ دنوں میں خدا کا نام یاد کرو۔"

حج کے مقابلات عموماً پیغمبر اہل شان اور ربائی نشان کے جلوہ گاہ ہیں جہاں پہنچ کر اور جن کو دیکھ کر وہ خدائی رحمت و برکت کے واقعات یاد آتے ہیں اور اسی لیے قرآن پاک کی اصطلاح میں ان کا نام شعائر اللہ اور

۱) تمدنی، ابواب الحج، باب ماجاء کیف ترمی الجمار: ۹۰۲ قال الترمذی حدیث حسن صحیح۔

۲) تمدنی، ابواب الحج، باب کیف ترمی الجمار: ۹۰۲، دار می، کتاب المناسک، باب الذکر فی الطواف: ۱۸۵۳، مستدرک حاکم، کتاب المناسک، ج ۱، ص: ۴۵۹

حرمت اللہ ہے یعنی خدا کے نشانات اور خدا کی محترم باتیں اور چیزیں اور انہیں شعائر اللہ اور حرمت اللہ کی تعظمیم وزیر انت کا نام ارکان حج ہے۔ سورہ حج میں حج کے بعض ارکان کی تفصیل کے بعد ہے:

﴿وَمَنْ يَعْظِمُ حُرُومَتَ اللَّهِ فَهُوَ خَيْرُهُ عِنْدَ رَبِّهِ﴾ (۲۲/الحج : ۳۰)

”اور جو اللہ کی محترم چیزوں کا ادب کرے تو وہ اس کے پروردگار کے نزدیک بہتر ہے۔“

صفا و مروہ کی نسبت ہے:

﴿إِنَّ الصَّفَا وَالْمَرْوَةَ مِنْ شَعَابِ اللَّهِ﴾ (۲/البقرۃ: ۱۵۸)

”اور صفا اور مروہ خدا کا شعاع ہیں۔“

اور سورہ حج میں فرمایا:

﴿ذَلِكَذَلِكَ وَمَنْ يَعْظِمُ شَعَابَ اللَّهِ فَإِنَّهَا مِنْ تَقْوَى الْقُلُوبِ﴾ (۲۲/الحج: ۳۲)

”یہ ہے اور جو اللہ کے شعاع کا ادب کرے تو یہ لوں کی پرہیز گاری ہے۔“

ان آئیوں سے ظاہر ہوا کہ حج کا ایک بڑا مقصد ان محترم مقامات کا ادب و احترام ہے، تاکہ ان مقامات سے جو مقدس روایتیں وابستہ ہیں ان کی یاد قائم رہے اور لوں میں تاثیر کی کیفیت پیدا کرتا رہے۔

حج کے آداب

حج کے لیے یہ ضروری ہے کہ احرام باندھنے سے لے کر احرام اتارنے تک ہر حاجی نیکی و پاک بازی اور امن و سلامتی کی پوری تصویر یہودہ لڑائی جھگڑا اور دنگا فساد نہ کرے، کسی کو تکلیف نہ دے، یہاں تک کہ کسی جیونٹی تک کوئی نہ مارے، شکار تک اس کے لیے جائز نہیں۔ کیوں کہ وہ اس وقت ہمہ تن صلح و آتشی اور امن و آمان ہوتا ہے:

﴿فَنَفَرَضَ فِيهِنَّ الْحَجَّ فَلَا رَفَثَ وَلَا فُسُوقٌ وَلَا حِدَالَ فِي الْحَجَّ وَمَا تَعَلَّمُوا مِنْ

خَيْرٍ يَعْلَمُهُ اللَّهُ﴾ (۲/البقرۃ: ۱۹۷)

”تو جو ان میبینوں میں حج اپنے اوپر فرض کرے تو حج میں نہ عورت کے ساتھ ہے پرده ہونا اور نہ گناہ کرنا اور نہ جھگڑا کرنا ہے اور جو بھی نیک کام کرو اللہ اس کو جانتا ہے۔“

﴿غَيْرَ مُحِلٍّ الْقَسِيدُ وَأَنْتَمْ حُرُومٌ﴾ (۵/المائدۃ: ۱)

”حلال نہ جانو شکار کو احرام کی حالت میں۔“

اسی طرح جو لوگ حج کی نیت سے روانہ ہوں ان کو راست میں تکمیل دینا یا ان کے مال اور سامان کو لوٹایا چرانا بھی خاص طور سے منع کیا گیا کہ یہ اس خانہ الہی کے پاس ادب کے خلاف ہے، تاکہ عرب جیسے ہے امن ملک میں ان ڈاکوؤں اور بہڑنوں اور بدمعاشوں کی وجہ سے قافلوں کا آنا جانا نہ رکے۔

﴿وَلَا آتَيْنَا الْبَيْتَ الْحَرَامَ يَنْتَهُونَ فَضْلًا مِّنْ رَّبِّهِمْ وَرِضْوَانًا ط﴾ (۵/ المائدة: ۲)

”اور نہ اس ادب کے گھر کے قصد کرنے والوں کو حلال سمجھو جو اپنے پروردگار کی مہربانی اور خوشنودی کو تلاش کرنے لکھے ہیں۔“

اگر کسی حاجی سے کسی جانور کے قتل کی حرکت قصد اس ادارہ ہو تو اس پر اس کا خون بہال لازم آتا ہے، جس کا نام کفارہ ہے یعنی اس مقتول جانور کے برابر کسی حلال جانور کی قربانی یا چند متاجوں کو کھانا کھلانا یا اتنا ہی روزہ رکھنا فرمایا:

﴿يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تَقْتُلُوا الصَّيْدَ وَإِنْمَا حُرْمٌ وَمَنْ قُتِلَهُ مِنْكُمْ مُّعَمِّدًا فِي زَاءٍ مِّنْهُ مَا قُتِلَ مِنَ النَّعْمَ إِنَّهُمْ يَهُوَ ذَوَاعْدُلٍ مِّنْكُمْ هُدًى إِلَيْهِ الْكَعْبَةُ وَلَكُفَّارُهُ طَعَامٌ مَّسْكِينُونَ وَ عَدْلٌ ذُلْكَ صِيَامًا لِّيَدُوقَ وَبَالْأَمْرِهِ﴾ (۵/ المائدة: ۹۵)

”اے ایمان والواجب تم احرام میں ہو تو شکار کو مت مارو اور تم میں جو جان کر مارے گا تو اس کے مارے ہوئے کے برابر بدھ لے ہو میں سے اس کا فیصلہ تم میں سے دو، بہتر آدمی کریں کہ اس کو کعبہ تک پہنچا کر قربانی کی جائے یا اس کے گناہ کا اتار ہے کچھ متاجوں کو کھانا کھلانا یا اسی کے برابر روزے، تاکہ وہ مجرم اپنے جرم کی سزا پچھے۔“

اس سے ثابت ہوا کہ حج تمام تر صلح و سلامتی اور امن و آشتی ہے اس مقصد کے خلاف حاجی سے اگر کوئی حرکت ہو جائے تو اس کا کفارہ اس پر واجب آ جاتا ہے۔
حج کی مصلحتیں اور حکمتیں

محمد رسول اللہ ﷺ نے شریعت کا تکمیلی صحیفہ لے کر آئے اس کی سب سے بڑی خصوصیات یہی ہیں کہ وہ دین و دنیا کی جامع ہے اور اس کا ایک ایک حرف مصلحتوں اور حکمتوں کے دفتروں سے معمور ہے وہ اپنے احکام اور عبادات کے فائدہ و منفعت اور غرض و غایت کے بتانے کے لیے کسی باہر کی امداد کا محتاج نہیں۔ بلکہ اس نے ان اسرار کے چہرہ سے خود اپنے ہاتھ سے پرداہ ہٹایا ہے۔ نماز، زکوٰۃ اور روزہ کی طرح حج کے مقاصد اور فوائد بھی خود اسلام کے صحیفہ ربانی میں مذکور ہیں۔

قرآن نے حضرت ابراہیم ﷺ کی زبان سے خانہ کعبہ کی تعمیر اور اسماعیل ﷺ کی نذر اور مکہ میں ان کے قیام کے سلسلہ میں جو دعا مانگی وہ تمام تر ان فوائد و مقاصد کی جامع ہے۔ آئیں ان آیتوں پر ایک دفعہ اور نظر ڈال لیں:

﴿وَإِذْ جَعَلْنَا الْبَيْتَ مَثَابَةً لِلنَّاسِ وَأَنْنَاطٍ وَأَتْجِدُوا مِنْ مَقَامِ إِبْرَاهِيمَ مُصَلٍّ وَعَهْدَنَا إِلَيْهِمْ وَإِسْمَاعِيلَ أَنْ طَهَرَا بَيْتَنِي لِلطَّاهِرِينَ وَالْعَلَّاقِينَ وَالرَّاعِمَ الشُّجُودُ وَإِذْ قَالَ

إِبْرَاهِيمَ رَبِّ اجْعَلْ هَذَا الْبَلْدَ أَمِنًا وَأَرْزُقْ أَهْلَهُ مِنَ الْقَرَبَاتِ ﴿١﴾

(٢) البقرة: ١٢٥-١٢٦)

”اور جب ہم نے اس گھر (کعبہ) کو لوگوں کا مرجع و مرکز اور امن بنایا اور ابراہیم کے کھڑے ہونے کی جگہ کو نماز کی جگہ بنایا اور ہم نے ابراہیم اور اسماعیل، کے یہ ذمہ کیا کہ تم دونوں میرے گھر کو طواف کرنے والوں اور کھڑے ہونے والوں اور رکوع کرنے والوں اور سجدہ کرنے والوں کے لیے پاک و صاف کرو اور جب ابراہیم علیہ السلام نے کہا: میرے پروردگار! اس کو امن والا شہر بناء اور اس کے رہنے والوں کو بچلوں میں سے روزی دے۔“

﴿رَبَّنَا وَاجْعَلْنَا مُسْلِمِيْنَ لَكَ وَمِنْ ذُرْتِنَا أَمَّهَ مُسْلِمَةَ لَكَ سَوْا نَمَّا سَكَّا وَتُبْ عَلَيْنَا
إِنَّكَ أَنْتَ التَّوَّابُ الرَّحِيمُ ﴾ رَبَّنَا وَابْعَثْ فِيهِمْ رُسُلًا مُّنْهَمُ ﴾ (٢) البقرة: ١٢٨-١٢٩)

”اے ہمارے پروردگار! اور ہم کو اپنا تابع دار گروہ بنانا اور ہماری اولاد میں سے کچھ کو اپنا فرمان بردار گروہ بنانا اور ہم کو ہمارے حج کے دستور بتا اور ہم کو معاف کر، تو بے شک معاف کرنے والا اور حرم کرنے والا ہے اور ان میں انہیں میں سے ایک رسول بھیجنा۔“

﴿وَإِذْ يَأْتَا إِبْرَاهِيمَ مَكَانَ الْبَيْتِ أَنَّ لَا تُشْرِكُ فِي شَيْئًا وَطَهَرَ بَيْتَنِي لَطَّافِينَ وَالْقَائِمِينَ
وَالرَّازِيمَ الشَّاجِدَ وَأَذْنُنَ فِي النَّاسِ بِالْحَجَّ يَأْتُوكَ رِجَالًا وَعَلَى كُلِّ ضَامِرٍ يَأْتِيَنَ مِنْ كُلِّ
فَيْجَ عَمِيقَ ﴾ يَسْهُدُوا مَنَّا فِي لَهُمْ وَيَذْكُرُوا السَّمَاءَ اللَّهُ فِي آيَاتِ مَعْلُومَتٍ عَلَى مَارَّ قَهْمَمْ وَنَنْ
بِهِمَةِ الْأَنْعَامِ ﴾ (٢٢) الحج: ٢٦-٢٧)

”اور جب ہم نے ابراہیم کو یہ گھر کی جگہ کا نادی، کہ میرا شریک نہ بنا اور میرے گھر کو طواف کرنے والوں، کھڑے ہونے والوں، رکوع کرنے والوں اور سجدہ کرنے والوں کے لیے پاک و صاف کرو اور لوگوں میں حج کا اعلان کر دے وہ تیرے پاس پیادہ اور سفر کی ماری دبلی پتلی ہو جانے والی انسنیوں پر سوار ہو کر اور دور دراز راستے سے آئیں گے، تاکہ فائدے کی جگہوں میں آ کر جمع ہوں اور چند مقررہ دونوں میں اس بات پر خدا کا نام یاد کریں کہ ہم نے ان کو جانور روزی کیے۔“

﴿وَإِذْ قَالَ إِبْرَاهِيمَ رَبِّ اجْعَلْ هَذَا الْبَلْدَ أَمِنًا وَاجْنُبْنِي وَبَنِيَّ أَنْ تَعْبُدَ الْأَصْنَامَ ﴾ رَبِّ
إِنَّهُنَّ أَصْلَلُنَّ كَثِيرًا قِنَ النَّاسِ ﴾ فَمَنْ تَبْعَنِي فَإِنَّهُ مِنِي ﴾ وَمَنْ عَصَانِي فَإِنَّكَ غَفُورٌ
رَّحِيمٌ ﴾ رَبَّنَا إِنِّي أَسْلَكْتُ مِنْ ذُرْتِنِي يَوَادَ غَيْرِ ذِي رَزْعٍ عِنْدَ بَيْتِكَ الْمُحَرَّمِ لَرَبِّنَا لِيَقِيمُوا
الصَّلَاةَ فَاجْعَلْ أَفْدَةً ﴾ مِنَ النَّاسِ نَهُوَ إِلَيْهِمْ وَأَرْقُهُمْ قِنَ الْقَرَبَاتِ لَعَلَّهُمْ يَشْكُرُونَ ﴾ ﴾

(۱۴) / ابراهیم: (۳۵-۳۷)

”جب ابراہیم علیہ السلام نے کہا: میرے پروردگار! اس آبادی کو امن والی بنا اور مجھے اور میری اولاد کو اس سے بچا کہ: ہم تو ہوں کی پوچا کریں، میرے پروردگار! ان ہتوں نے بہت سے لوگوں کو گمراہ کیا، تو جس نے میرا کہما ناہد مجھ سے ہے اور جس نے میری نافرمانی کی تو تو مجھشے والا رحم کرنے والا ہے، ہمارے پروردگار! میں نے اپنی کچھ اولاد اس بن کھیتی کی تراوی میں تیرے مقدس گھر کے پاس آباد کی ہے۔ ہمارے پروردگار! تاکہ وہ نمازِ کھڑی رکھیں تو لوگوں کے کچھ دلوں کو ایسا بنا کہ وہ ان کی طرف چکھیں اور ان کو چھپلوں کی روزی دے، تاکہ شکر گزار ہوں۔“

ان آئتوں میں حسب ذیل باتوں کی تصریح ہے:

- ① خانہ کعبہ اہل توحید کا ایک مرکز و مرجع اور ملت ابراہیمی کا موطن و مسکن ہے۔
- ② حضرت ابراہیم علیہ السلام نے یہاں اپنی اولاد کو اس غرض سے بسایا کہ اس مقدس گھر کی خدمت گزاری اور خدائے واحد کی عبادت کرتی رہے اور بت پرست قوموں کے میل جول اور اختلاط سے وہ محفوظ رہے، تاکہ پہلے کی طرح یہ گھر پھر بے نشان نہ ہو جائے اور آخر ان میں وہ رسول مبعوث ہو جس کی صفتیں ایسی ہوں۔
- ③ یہ لوگ ایک دیرانہ میں جس میں کھیتی نہیں آباد ہوئے ہیں اور صرف اس غرض سے آباد ہوئے ہیں کہ تیرے گھر کو آباد رکھیں تو تو اس بے شہر اور شورز میں میں ان کی روزی کا سامان کرنا اور لوگوں کے دلوں کو ان کی طرف جھکانا کہ وہ ان سے محبت کریں۔
- ④ حکم ہوا کہ لوگوں میں اس گھر کے حج کا اعلان عام کر ہر قریب اور دور کے راستے سے لوگ لبیک کہیں گے، تاکہ یہاں آ کر دین و دنیا کا فائدہ حاصل کریں اور چند مقررہ ایام میں خدا کا نام لیں۔
- ⑤ جو لوگ یہاں عبادت اور حج کی نیت سے آئیں خداوند! تو ان کے گناہ معاف کر تو براہم برپا اور رحیم ہے۔
- ⑥ خداوند! میری اولاد ہی ہے جو میرے مشرب و مذہب اور میرے راستے پر چلے، اس لیے تمام وہ لوگ جو ملت ابراہیمی کے پابند ہوں آں ابراہیم ہیں اور وہی حضرت ابراہیم کی دعاوں اور برکتوں کے مستحق ہیں۔ الغرض حج کے بھی منافع اور مقاصد ہیں جن میں سے ہر ایک کے ماتحت متعدد فوائد اور اغراض ہیں۔

مرکزیت

خانہ کعبہ اس دنیا میں عرشِ الہی کا سایہ اور اس کی رحمتوں اور برکتوں کا نقطہ قدم ہے یہ وہ آئینہ ہے جس میں اس کی رحمت و غفاری کی صفتیں اپنا ٹکس ڈال کر تمام کردہ ارض کو اپنی شعاعوں سے منور کرتی ہیں۔ یہہ منع ہے جہاں سے حق پرستی کا چشمہ آبلا اور اس نے تمام دنیا کو سیراب کیا۔ یہ روحاںی علم و معرفت کا وہ مطلع ہے جن

کی کرنوں نے زمین کے ذرہ ذرہ کو درخشاں کیا۔ یہ وہ جغرافیائی شیرازہ ہے جس میں ملت کے وہ تمام افراد بندھے ہوئے ہیں جو مختلف ملکوں اور اقلیتوں میں بنتے ہیں۔ مختلف زبانیں بولتے ہیں۔ مختلف لباس پہننے ہیں۔ مختلف تمنوں میں زندگی بسر کرتے ہیں مگر وہ سب ہی کے سب باوجود ان فطری اختلافات اور طبعی امتیازات کے ایک ہی خانہ کعبہ کے گرد چکر رکھتے ہیں اور ایک ہی مقام کوام القریٰ مان کرو طبیعت، قومیت، تمدن و معاشرت، رنگ روپ اور دوسرے تمام امتیازات کو منا کر ایک ہی وطن ایک ہی قومیت (آل ابراہیم) ایک ہی تمدن و معاشرت (مللت ابراہیم) اور ایک ہی زبان (عربی) میں تحد ہو جاتے ہیں اور یہ وہ برادری ہے جس میں دنیا کی تمام قومیں اور مختلف ملکوں کے بنے والے جو طبیعت اور قومیت کی لعنوں میں گرفتار ہیں ایک الحمد اور ایک آن میں داخل ہوتے ہیں، جس سے انسانیت کی بنائی ہوئی تمام زنجیریں اور قیدیں اور بیڑیاں کٹ جاتی ہیں اور تحفڑے دن کے لیے عرصہ حج میں تمام قومیں ایک ملک میں، ایک لباس احرام میں، ایک وضع میں دوش بدوث ایک قوم بلکہ ایک خانوادہ کی برادری بن کر کھڑی ہوتی ہیں اور ایک ہی بولی میں خدا سے باتیں کرتی ہیں یہی وحدت کا وہ رنگ ہے جو ان تمام مادی امتیازات کو منادیتا ہے جو انسانوں میں جنگ و جدل اور فتنہ و فساد کے اسباب ہیں، اس لیے یہ حرم ربانی نہ صرف اسی معنی میں اس کا گھر ہے کہ یہاں ہر قسم کی خوزیری اور ظلم و ستم ناروا ہے۔ بلکہ اس لحاظ سے بھی اس کا گھر ہے کہ تمام دنیا کی قوموں کی ایک برادری قائم کر کے ان کے تمام ظاہری امتیازات کو جو دنیا کی بد امنی کا سبب ہیں منادیتا ہے۔

لوگ آج یہ خواب دیکھتے ہیں کہ قومیت اور طبیعت کی ستکنائیوں سے نکل کر وہ انسانی برادری کے وسعت آباد میں داخل ہوں، مگر ملت ابراہیم کی ابتدائی دعوت اور ملت محمدی ﷺ کی تجدیدی پکارنے سینکڑوں ہزاروں برس پہلے اس خواب کو دیکھا اور دنیا کے سامنے اس کی تعبیر پیش کی، لوگ آج تمام دنیا کے لیے ایک واحد زبان (اسپرنس) کی ایجاد کو شیش میں مصروف ہیں، مگر خانہ کعبہ کے مرکزیت کے فیصلے نے آل ابراہیم کے لیے مدت دراز سے اس مشکل کو حل کر دیا ہے۔ لوگ آج دنیا کی قوموں میں اتحاد پیدا کرنے کے لیے ایک ورلڈ کانفرنس یا عالمگیری مجلس کے انعقاد کے درپے ہیں لیکن جہاں تک مسلمانوں کا تعلق ہے سارے ہے تیرہ سو برس سے یہ مجلس دنیا میں قائم ہے اور اسلام کے علم، تمدن، ندیہ اور اخلاق کی وحدت کی علمبردار ہے۔ آج دنیا کی قومیں ”بیگ“ (ہولینڈ) میں اقوام عالم کی مشترکہ عدالت گاہ کی بنیاد ڈالتے ہیں لیکن اس کے فیصلوں کو کسی طاقت سے منوہ نہیں سکتیں لیکن مسلمان اقوام عالم کے لیے یہ مشترکہ عدالت گاہ ہمیشہ سے قائم ہے جس کی عدالت کا حقیقی کرسی نہیں خودا حکم الہا کمیں ہے جس کے فیصلے سے کسی کو سرتباں کی بجائی نہیں۔

مسلمان ڈیڑھ سو برس تک جب تک ایک نظم حکومت یا خلافت کے ماتحت رہے یہ حج کا موسم ان کے سیاسی اور یہی ادارہ کا سب سے بڑا عنصر رہا۔ یہ وہ زمانہ ہوتا تھا جس میں امور خلافت کے تمام اہم معاملات

ٹے پاتے تھے۔ اسیں سے لے کر سندھ تک مختلف ملکوں کے حکام اور ولی جمع ہوتے تھے اور خلیفہ کے سامنے مسائل پر بحث کرتے تھے اور طریق عمل طے کرتے تھے اور مختلف ملکوں کی رعایا آ کر اگر اپنے والیوں اور حاکموں سے کچھ شکایتیں ہوتی تھیں تو ان کو خلیفہ کی عدالت میں پیش کرتی تھی اور انصاف پاتی تھی۔

غالباً یہی وجہ ہے کہ مسائل حج کے فرائی بعد اللہ تعالیٰ نے ملک میں فساد اور بے امنی کی برائی کی اور فرمایا:

**«وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يُعَذِّبُكَ قَوْلُهُ فِي الْجَمِيعِ الدُّنْيَا وَيَنْهَا دُلْلَهُ عَلَىٰ مَا فِي قَلْبِهِ وَهُوَ أَلَّا
الْخَاصَامِ وَإِذَا أَتَوْتَىٰ سُعْيَ فِي الْأَرْضِ لِيُفَسِّدَ فِيهَا وَيَهْلِكَ الْحَرَثَ وَالسُّلَّمَ وَاللَّهُ لَا يُحِبُّ
الْفَسَادَ»** (۲۰۵-۰۴ / البقرة)

”بعض آدمی ایسے ہیں کہ ان کی بات دنیا کی زندگی میں بھلی معلوم ہوتی ہے اور جو اس کے دل میں ہے اس پر وہ خدا کو گواہ بنتا ہے ہیں حالانکہ وہ پرے درجہ کے جھگڑا لو ہیں اور جب پیشہ پھیریں تو ملک میں دوڑتے پھرتے ہیں کہ اس میں بے امنی پر پا ہوا اور، تاکہ کھیتیاں اور جانیں تلف ہوں اور اللہ فساد کرنے کو پسند نہیں کرتا۔“

پھر دو آئیوں کے بعد فرمایا:

**«يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا إِذْ خُلُونَ فِي السَّلْوَمِ كَافِهٌ وَلَا تَنْكِحُوا حُطُولَ الشَّيْطَنِ طَإِلَهَ لَكُمْ عَدُوٌّ
مُّبِينٌ»** (۲۰۸ / البقرة)

”اے ایمان والو! تم سب کے سب امن میں داخل ہو جاؤ اور شیطان کے نقش قدم پر مت چلو کہ وہ تمہارا کھلا دشمن ہے۔“

اسلام کے احکام اور مسائل جو دم کے دم میں اور سال بسال دور راز اقليعوں ملکوں اور شہروں میں اس وقت پھیل سکے، جب سفر اور آمد و رفت کا مسئلہ آسان نہ تھا اس کا اصلی راز یہی سالانہ حج کا اجتماع ہے اور خود رسول اللہ ﷺ نے اپنا سب سے آخری حج جو ”حجۃ الوداع“ کہلاتا ہے اسی اصول پر کیا، وہ انسان جو تیرہ برس تک ملک میں ریکھ رہا تھا، اس کے بعد وہ موقع آیا جب اس نے تقریباً ایک لاکھ کے مجمع کو بیک دفعہ خطاب کیا اور سب نے سمیعاً و طاعناً کہا، آپ کے بعد خلفائے راشدین شیعۃ القیم اور دوسرے خلفائے زمانہ صحابہ کرام شیعۃ القیم ائمہ اعلام نے اسی طرح سال بسال جمع ہو کر احکام اسلام کی تلقین و تعلیم کی خدمت ادا کی، اسی کا نتیجہ تھا کہ نئے واقعات اور مسائل کے متعلق دنیا کے مختلف گوشوں میں اسلام کے جوابی احکام اور فتوے پہنچتے رہے اور پہنچتے رہتے ہیں۔

یہ اسی مرکزیت کا اثر ہے کہ بڑے بڑے صحابہ شیعۃ القیم اور عالم، محدث، مفسر اور فرقیہ جو اسلامی فتوحات اور نوآبادیوں کے سلسلہ میں تمام دنیا میں پھیل گئے تھے وہ سال بسال پھر آ کر یہاں سمٹ جاتے تھے اور تمام دنیا کے گوشوں سے آ کر حرم ابراہیم علیہ السلام میں جمع ہو جاتے تھے اور باہم ایک دوسرے سے مل کر اس علم کو جو ابھی

دنیا میں متفرق و پر اگنڈہ تھا ابراہیمی درسگاہ کے صحن میں ایک دفتر میں جمع کر دیتے تھے۔ یہیں آ کر بخارا کا باشندہ اپین اور مرکاش کے رہنے والوں سے، شامی عربی اور مصری جازی سے، بصری کوفی سے، کوفی بصری سے، ہرمذی نیشاپوری سے، انڈسی، سندھی (ہندوستان) سے، روی یمنی سے فیض پاتا تھا اور دم کے دم میں سندھ کا علم اپین میں اور اپین کی تحقیق سندھ میں پہنچ جاتی تھی۔ مصر کی تصنیف و روایت ترکستان میں اور ترکستان کا فیصلہ مصر و شام میں پہنچ جاتا تھا۔ ابن مسعود رضی اللہ عنہ کے شاگرد ابن عمر رضی اللہ عنہ اور عائشہ رضی اللہ عنہا کے تلامذہ سے اور ابن عباس رضی اللہ عنہ کے مسترشد ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کے مستفیدوں سے اور انس رضی اللہ عنہ کے حلقہ کے فیض یا بعلی رضی اللہ عنہ کے شاگردوں سے مستفید و سیراب ہوتے تھے۔ یہی وہ مرکز تھا جہاں ائمہ مجتہدین باہم ایک دوسرے سے ملتے اور ایک دوسرے کے علم سے فیضیاب ہوتے تھے اور یہی تعارف وہ اصلی ذریعہ تھا جس کی بنیار صحابہ کرام اور ان کے تلامذہ اور مستفیدین کے تمام دنیا میں پھیل جانے کے باوجود بھی محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے حالات و واقعات و مقاصی اور احکام و فرمانیں ووصایا کا سارا دفتر پھر سست کرایک ہو گیا اور آپ کے سیر و مغاذی اور احادیث و تعلیمات مرتب و مدد و نہ ہو کر ہر مسلمان کے سامنے آ گئیں اور موتا، صحیح بخاری، صحیح مسلم، جامع ترمذی اور احادیث کے متعدد دفاتر عالم وجود میں آئے اور ائمہ مجتہدین کے لیے یہ ممکن ہو سکا کہ مسائل کے متعلق دوسرے اماموں کے خیالات و معلومات سے مستفید ہو کر اجتماعی مسائل کو الگ کر سکیں اور اس سے پہلے کہ کتابیں مدد و نہ ہوں اور پھیلیں ہر ملک اور ہر شہر کے علاوہ دوسرے ملک اور شہر کے علماء کے خیالات و معلومات سے واقف ہو سکیں اور زمانہ کے حالات کے زیر اثر آج تک کم و بیش یہ سلسہ قائم ہے۔ یہ اسی کی مرکزیت کا نتیجہ ہے کہ عام مسلمان جو اپنے اپنے ملکوں میں اپنے اپنے حالات میں گرفتار ہیں وہ دور دراز مسافنوں کو طے کر کے اور ہر قسم کی مصیبتوں کو جھیل کر دریا، پہاڑ، جنگل، آبادی اور صحراء کو عبور کر کے بیہاں جمع ہوتے۔ ایک دوسرے سے ملتے ایک دوسرے کے دروغ میں سے واقف اور حالات سے آشنا ہوتے ہیں جس سے ان میں باہمی اتحاد اور تعاون کی روح پیدا ہوتی ہے۔ یہیں آ کر چینی مرکاش سے، توںی ہندی سے، تاتاری جوشی سے، فرنگی زنگی سے، عجمی عربی سے، یمنی نجدی سے، ترکی افغانی سے، مصری ترکستانی سے، روی الجزایری سے، افریقی یورپیں سے اور جاوی بلخواری سے ملتا ہے اور سب مل کر باہم ایک قوم، ایک نسل، ایک خاندان کے افراد نظر آتے ہیں۔ اسی کا اثر تھا اور ہے کہ معمولی سے معمولی مسلمان بھی اپنے ملک سے باہر کی کچھ دنیا دیکھتا تھا زمانہ کے رنگ کو پہچاننے اور سیاسیات کی پیچیدگیوں کو سمجھنے لگتا ہے میں الاقوامی معاملات سے اچھی لیتا ہے اور دنیا کے ہر اس گوشہ کے حالات سے جس کے منارہ سے اندھا کبر کی آواز بلند ہو اس کو خاص ذوق ہوتا ہے اور اسی کا اثر ہے کہ ہر مسلمان دنیا نے اسلام اور اسلامی ملکوں کے حالات و واقعات کے لیے بے چین نظر آتا ہے پھر اسی کا نتیجہ ہے کہ ادنی سے ادنی مسلمانوں کی بھی اچھی خاصی تعداد ایسی ملے گی جس کو دنیا کے سفر کا کچھ تجربہ

ہو گا اور دشکشی و ترقی سے اس کو کچھ واقفیت ہو گی دنیا کے جغرافیائی معلومات کے بڑھانے اور ترقی دینے میں سفر حج نے بہت کچھ مدد کی ہے مسلمانوں میں بکثرت ایسے جغرافیہ نویس اور سیاح گزرے ہیں جنہوں نے اصل میں حج کی نیت سے سفر کیا اور بالآخر اس سفر نے دنیا کی ایک عام سیاحت کی حیثیت اختیار کر لی۔ یا قوت روی نے اپنے جغرافیہ تقویم البلدان کے مقدمہ میں مسلمانوں میں جغرافی معلومات کی ترقی کا ایک بڑا ذریعہ اسی سفر حج کو فرا ردیا ہے۔

رزق ثمرات

اس مرکز کو قائم اور آباد رکھنے کے لیے یہ ضروری تھا کہ اس شور ویرانے میں بینے والوں کے لیے رزق کا کوئی سامان کیا جائے۔ اسی لیے حضرت ابراہیم علیہ السلام نے دعا مانگی تھی کہ خداوند امیں نے اپنی اولاد کو اس بے حاصل اور بے آب و گیاہ سرز میں میں آباد کیا ہے، تو لوگوں کے دل ان کی طرف جھکانا اور ان کے رزق کا سامان کرنا اور ان کو پھل کی روزی دینا، اللہ تعالیٰ نے ان کی یہ دعا قبول فرمائی، اس کی ایک صورت یہ ہو سکتی تھی کہ یہاں کے بینے والوں کے لیے زکوٰۃ و خیرات کی کوئی رقم خاص کی جاتی، لیکن یہ ان لوگوں کی اخلاقی پستی اور دون فطرتی کا سبب ہو جاتی، وہ لوگوں کی نظر و خوار ہو جاتے جو ان کے منصب کی عزت اور شرف کے مناسب نہ ہوتا، اس لیے اللہ تعالیٰ نے اس کی یہ تدبیر کی کہ ان کے دلوں میں تجارت کا شوق پیدا کیا اور اس کو ان کی روزی کا سامان بنادیا۔ حضرت اسماعیل کی اولاد کا جہاں کہیں پرانی تاریخوں میں وجود نظر آتا ہے، وہ تجارت اور سوداگری کے بھیس میں ملتی ہے۔ حضرت یعقوب علیہ السلام کے زمانہ میں جو حضرت اسماعیل علیہ السلام کے بھیجے اور حضرت اسحاق علیہ السلام کے بیٹے تھے، بنی اسماعیل کا تجارتی قافلہ عرب سے مصر کو جاتا ہوا نظر آتا ہے۔ (تکوین ۲۸-۳۶ سے تک) تورات کے متعدد مقامات میں عرب سوداگروں اور تاجر دوں کا خاص طور سے ذکر ملتا ہے۔ خود قریش بھی اپنے زمانہ کے بڑے تاجر اور سوداگر تھے۔ جس کا ذکر سورہ یاءُ الدَّفْنِ فِرْيَضٍ میں ہے، وہ ایک طرف یکن اور جو شیک اور دوسری طرف شام و مصر و دم تک جاتے تھے۔ *

لیکن چونکہ یہ تجارت بھی کہ معظمه کے ہر ادنیٰ و اعلیٰ کی شکم سیری کے لیے کافی نہ تھی، اس لیے خود مکہ کی سرز میں کو اور حج کے مقام کو تجارت کی منڈی بنانے کی ضرورت تھی، چنانچہ اسلام سے پہلے بھی حج کا موسم عرب کا ایک بڑا میلہ تھا اور عکاظ وغیرہ کا بڑا بازار لگتا تھا۔ اسلام نے بھی اس کو باتی رکھا کہ یہ دعاۓ ابراہیم کا مصداق اور اس شور و بے حاصل زمین کے بینے والوں کے لیے روزی کا سامان تھا۔ اسلام کے بعد تمام دنیا سے مسلمان یہاں آنے لگے، چنانچہ سال کے دو تین مہینے میں یہاں کے رہنے والے تجارت اور سوداگری سے اس قدر مال کمایتے ہیں کہ وہ سال بھر کھاپی سکیں۔ مکہ سے مدینہ کو جب قافلہ جاتا ہے تو پورے راستہ اور منزاوں

* تفصیل اور حوالوں کے لیے دیکھو میری تالیف ارض القرآن، جلد دوم، باب تجارت العرب قبل الاسلام۔

کے بڑے اپنے پھل اور پیداوار لے کر آتے ہیں اور خرید و فروخت سے اپنی زندگی کا سامان حاصل کرتے ہیں کھانا پینا، مکان، سواری اور دوسری ضروریات اسی شہر اور اس کے آس پاس سے تمام حاجی حاصل کرتے ہیں اور اس کا معاوضہ ادا کرتے ہیں اور آخر یہی زیر معاوضہ الہ مکہ کے قوتِ لا یہوت کا ذریعہ بن جاتا ہے۔

قربانی کی اقتصادی حیثیت

اس ملک کی فطری پیداواروں میں اگر کوئی چیز ہے تو وہ جانوروں کی پیداوار ہے، اس بنا پر قربانی کے فریضہ نے بھی ان اہل عرب اور اہل بادیہ کے لیے ان جانوروں سے اپنی روزی کے پیدا کرنے کا سامان کر دیا۔ ہر سال تقریباً ایک لاکھ حاجی قربانی کرتے ہیں، جن میں سے بعض کئی کئی کرتے ہیں، اس حساب سے سالانہ دو لاکھ جانوروں سے کم کی قربانی نہیں ہوتی اور عموماً نہیں کی قیمت آنحضرت پے اور بکری کی چار روپے وہاں ہوتی ہے ॥ تو اس تقریب سے کم و بیش دس بارہ لاکھ روپے ہر سال اہل بادیہ کو اپنے جانوروں کی فروخت سے ملتے ہیں اور یہ اس بے آب و گیاہ اور دیران ملک کے باشندوں کی بہت بڑی مدد ہے۔

ابراہیمی دعا کی مقبولیت

حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اپنی دعائیں خاص طور سے پھلوں کا ذکر کیا تھا:

﴿وَأَرْزُقُ أَهْلَهُ مِنَ التَّمَرِتِ﴾ (٢/ البقرة: ١٢٦)

”ابراہیم کے رہنے والوں کو پھلوں میں سے روزی دینا۔“

اس دعا کا یہ اثر ہے کہ تجسب ہوتا ہے کہ مکہ مظہرہ کے بازاروں میں ہر وقت تازہ سے تازہ پھل، میوے، سبزی اور ترکاریاں نظر آتی ہیں اور دعائے ابراہیمی کا وہ جلوہ دکھاتی ہیں کہ زبان کے ذائقہ کے ساتھ ایمان کی حلاوت کا مزا بھی ملنے لگتا ہے۔

تجارت

قرآن پاک کے محاورہ میں خدا کا فضل تلاش کرنے سے مقصود تجارت اور روزی حاصل کرنا ہوتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے حج کا ایک صریح مقصود تجارت اور حصول رزق کو بھی قرار دیا ہے، چنانچہ سورہ مائدہ میں ہے:

﴿وَلَا آتَيْنَا الْبَيْتَ الْحَرَامَ يَتَعَفَّونَ فَضْلًا لِّمَنْ يَرِيدُهُ وَرُضُوانًا﴾ (٥/ المائدۃ: ٢)

”اور نہ ان کو (ستاو) جو اس ادب والے گھر کے قصد سے جا رہے ہوں، اپنے پروردگار کا فضل

اور خوشبوی تلاش کرتے ہوئے۔“

۴۔ تجیش میں نے اپنے پہلے سفرج کے تجویز کی بنا پر ۱۳۲۶ھ / ۱۹۰۸ء میں کیا تھا، انگریز کے ۲۲ برس بعد ۱۳۲۹ھ / ۱۹۱۰ء میں جب دوبارہ حج کی توفیق ملی تو مزاد کے اقتصادی تغیرات نے پچھلے تجیش کو یک قلم بدیل دیا، اب ہر چیز کی قیمت گرانی کی طرف مائل ہے جانوروں کی قیمت بھی پوچھی نظر آئی، بکری کی قیمت کم از کم سولہ روپے دنہ کی قیمت تھیں، ہنکس روپے گائے، بغل کی قیمت اسی سے سو روپے تک اور اونٹ کی ڈینہ دو سو تک نظر آئی۔ اب اس تجیش کی بنا پر ہر چیز کی قیمت پوچھی ہو گئی ہے ”س“ ۲۰ محرم ۱۳۰۲ھ اور اب ۱۳۰۳ھ میں تو قیمت کا کچھ تغیر کا ناہی نہیں ہے۔ (ہشر)

یعنی ان کے مال و اسیاب کو لوٹنا جائز نہیں کہ اس بے اطمینانی سے حج کا ایک بڑا مقصد فوت ہو جائے گا۔ تجارت اور روزی حاصل کرنا بظاہر دنیا کا ایک کام معلوم ہوتا ہے، اس لیے اسلام کے بعد بعض صحابہ رضی اللہ عنہم نے اپنے اس خالص مذہبی سفر میں تجارت وغیرہ جیسی کسی دنیاوی غرض کو شامل کرنا اچھا نہیں سمجھا اس پر یہ آیت نازل ہوئی کہ لوگوں سے بھیک مانگ کر حج کرنا اچھا نہیں کہ یہ تقویٰ کے خلاف ہے، بلکہ تجارت کرتے ہوئے چلو تو بہتر ہے اور فرمایا:

﴿وَكُنْدُرَادِيَّاَنْ خَيْرُ الرَّأْوَالشَّقْوَىٰ وَالْقَوْنَ يَأْوِلِي الْأَلْبَابِ ۝ لَيْسَ عَلَيْكُمْ جُنَاحٌ أَنْ تَبْتَغُوا

فضلًاً قِنْ رَيْكُمْ ۝﴾ (۱۹۷-۱۹۸) (البقرة: ۲)

”اور راہ کا تو شر (خرج) لے کر چلو کہ راستہ کا سب سے اچھا تو شہر تقویٰ (بھیک نہ مانگنا) ہے تم پر گناہ نہیں ہے کہ تم اپنے پروڈگار کا فضل تلاش کرتے ہوئے چلو (یعنی یہ پار کرتے ہوئے)۔“
یہ اندیشہ کہ یہ دنیا کا کام ہے سفر میں جائز نہیں۔ درست نہ تھا کہ اول تو طلب رزق ہر حال میں بجائے خود اسلام میں عبادت اور یتیکی کا کام ہے۔ دوسرے یہ کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی دعا کی بنا پر یہ خود حج کے مقاصد میں ہے کہ اس کے بغیر اس شہر کی آبادی کی ترقی اور بقا ممکن نہیں، یعنی حج کا ایک مقصد یہی ہے کہ خانہ کعبہ کی حفاظت اور خدمت کے لیے اس شہر کی آبادی اور رونق قائم رہے۔ جس کا بڑا ذریعہ تجارت ہے۔ یہ مقام گویا مسلمانوں کے علمگیر تجارتی کاروبار کا مرکز اور ممکن اسلامیہ کی صنعتوں کی سالانہ نمائش گاہ ہے۔ جس کا پچھلا بقیہ نمونہ آج بھی موجود ہے، وہ کون سا اسلامی ملک ہے، جہاں کی صنعت کا نمونہ یہاں دیکھنے والے کو نظر نہیں آ سکتا، لیکن افسوس ہے کہ آج کل کے مسلمانوں نے حج کے اس اہم عکت کی اہمیت کو کچھ تو بھلا دیا ہے اور کچھ غیر مسلمانوں کی تجارتی چیزوں دستی سے وہ دبے بھی ہیں اور آج وہ مرکز جو اسلامی ملکوں کا مرکزی بازار تھا، یورپ کے صنوعات کا مرکزی بازار بن رہا ہے۔ اس جنگ عظیم کے بعد سے حالات اور بھی زیادہ انحطاط پذیر ہیں۔

روحانیت

روحانیت سے مقصود وہ تاثرات اور کیفیتیں ہیں جو ان مقامات کی زیارت اور ان اركان حج کے ادا کرنے سے قلب و روح میں پیدا ہوتی ہیں، ان کی ایک حیثیت تو وطنی، دوسری تاریخی اور تیسرا خالص روحانی ہے۔ وطنی ہونے کے یہ معنی کہ گوبلمان دنیا کے ہر ملک میں رہتے ہیں، ہر زبان بولتے اور ہر لباس پہنتے ہیں، تاہم ان کے اندر یہ احساس باقی رہتا ہے کہ وہ جسمانی طور سے کہیں ہوں تاہم روحانی طور سے ان کا ممکن عرب ہی کی سر زمین ہے۔ وہی ملت ابراہیم کا مقنام۔ اسلام کا مولد اور قرآن کی مہیط ہے، اس لیے دور راز مسافتوں سے والوں اور شوق کے بازاروں سے اُز کر جب لوگ یہاں چھپتے ہیں تو اس ریگستان اور پہاڑ کو دیکھ کر ان کی

محبت کا سرچشمہ اپنے لگتا ہے اور ان کے دل میں اسلام کے وطن اور قرآن کی سرزی میں کے مشاہدہ سے ایک خاص کیفیت پیدا ہوتی ہے، مسلمان جس ملک میں بھی ہے، اس کو یہاں اسلام اپنے خالص وطن میں نظر نہیں آتا ہر جگہ اس کو اپنے ساتھ دوسرا قومیں بھی نظر آتی ہیں۔ اپنے مذہب کے ساتھ اس کو دوسرے مذہب بھی دکھائی دیتے ہیں۔ اپنے تمدن کے ساتھ دوسرے تمدنوں کا بھی منظر سامنے ہوتا ہے، لیکن یہاں اسلام اس کو اپنے خالص رنگ میں جلوہ گر معلوم ہوتا ہے، گرد و پیش، آگے پیچھے، دائیں با ایں، ہر طرف اور ہر سمت اس کو اسلام ہی کا بھرم پیکر دکھائی دیتا ہے اور اس وقت سرزی میں جزا اور دنیا کے کل ممالک کا تعلق اس کی نگاہ میں ایسا نظر آتا ہے، جس طرح نوازادیوں کے رہنے والوں کی نگاہ میں اپنی مادر وطن (ملینڈ) کی حیثیت۔ آج انگریز ہندوستان، عراق، مصر، فلسطین، ساپرس، جبل الاطارق، نیوزی لینڈ، سنگاپور، آسٹریلیا، یونان، ہنسوال، زنجبار، افریقہ اور کینڈا (امریکہ) کے مترقب ملکوں میں آباد ہیں، تاہم انگلینڈ کا چھوٹا سا جزیرہ ان کی نگاہ میں اس وضع برطانوی مملکت کا جس میں آفات بخوبی خوب ہوتا مرکز ہے۔ وہ ان کا اصلی آبائی وطن اور مسکن ہے، وہ تمدن، معاشرت، اخلاق، تعلیم، لٹرچر، ہر چیز میں اپنے اس آبائی وطن مسکن کی پیروی کرتے ہیں، جب ان کی آنکھیں اس کے دیدار سے شرف ہوتی ہیں تو اپنی خالص اور بے میل تہذیب اخلاق اور تمدن کے ملک کو دیکھ کر مسروت اور خوشی سے روشن ہو جاتی ہیں، وہ اس کے ایک ایک درود یا وکوع اور عظمت کی نگاہ سے دیکھتے ہیں، اس وقت ان کے دل میں وہ احساسات پیدا ہوتے ہیں جو دوسرے ملکوں قوموں اور تمدنوں میں رہنے کی وجہ سے ان کی فرسودہ اور پژمردہ ہو جانے والی نکار اور عمل کی قوتوں کو بیدار کر دیتے ہیں اور وہ یہاں آ کر اپنی خالص تہذیب و تمدن کے پاک و صاف چشمہ حیات میں نہا کرئے سرے سے پھر جوان ہو جاتے ہیں۔ بلاشبہ اس قسم کی کیفیت اور لذت ان مسلمانوں کی ہے، جو عرب کو اپنا، اپنے مذہب کا، اپنی قومیت کا، اپنے تمدن کا، اپنے علم و فنون کا مولود و مسکن سمجھتے ہیں، ان میں سے جب کسی کو اس ملک اور اس شہر کی زیارت کا موقع ملتا ہے تو اس کا ذرہ اس زائر کے دامن دل سے لپٹ جاتا ہے اور وہ چلا اٹھتا ہے:

فرق تابقدم ہر کجا کہ می نگرم کرشمہ دامن دل می کشد کہ جایں جاست
یہی فلسفہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے یہ وصیت فرمائی کہ اس ملک میں اسلام کے سوا کوئی دوسرا مذہب، کعبہ کے سوا کوئی دوسرا قبلہ اور قرآن کے سوا کوئی دوسرا حجیفہ نہ رہنے دیا جائے اور قرآن نے حکم دیا کہ مشرک و کافر اس ادب والی مسجد کے قریب بھی نہ آنے پائیں، تاکہ یہاں اسلام کا سرچشمہ ہر طرح پاک و صاف اور کفر و مشرک کی ہر قسم کی نجاستوں سے محفوظ رہے، تاکہ ہر گوشت اور ہر سمت سے یہاں آ کر مسلمان خالص پاکیزگی حاصل اور روح ایمانی کوتاہہ کر سکیں۔ قرآن پاک نے کہ معظمه کو امام القریلی یعنی آبادیوں کی ماں کہا ہے، اگر کہہ معظمه تمام دنیا کی آبادیوں کی ماں اور اصل نہ بھی ہو تو اسلامی دنیا کی آبادیوں کی ماں اور اصل و مرجع اور ماوی تو ضرور ہے۔

اسلام کی ابتدائی تاریخ کا حرف حرف اسی عرب اور حرم پاک کے ذرہ ذرہ سے مرتب ہوا ہے آدم علیہ السلام سے لے کر ابراہیم علیہ السلام تک اور ابراہیم علیہ السلام سے لے کر محمد رسول اللہ علیہ السلام تک جو کچھ ہوا ہے اس کا تمام امر تعلق ارض حرم کے کوہ و صحراء درود بیوار سے ہے۔ یہیں حضرت آدم علیہ السلام نے سکونت کی اور عرش کے سامنے میں خدا کا گھر بنایا۔ یہیں حوا علیہ السلام نے آ کر ان سے ملاقات کی۔ یہیں نوح علیہ السلام کی کشتی نے آ کر دم لیا۔ حضرت ہود علیہ السلام اور حضرت صالح علیہ السلام نے یہاں پناہ لی۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے یہاں ہجرت کی۔ حضرت اسماعیل علیہ السلام نے یہیں سکونت اختیار کی۔ حضرت محمد رسول اللہ علیہ السلام نے یہاں ولادت پائی۔ یہیں وہ پہاڑی ہے (صفا) جہاں حضرت ابراہیم علیہ السلام اور حضرت اسماعیل علیہ السلام اپنے گدھے چھوڑ کر اترے، یہیں وہ دوسری پہاڑی ہے (مرودہ) جس پر باپ نے بیٹے کی قربانی کرنی چاہی۔ یہیں وہ چشمہ ہے (زمزم) جو حضرت حاجہ علیہ السلام کو پیاس کے عالم میں نظر آیا۔ یہیں وہ خانہ خدا ہے جس کی چہار بیواری کو ابراہیم و اسماعیل علیہما السلام نے بلند کیا۔ یہیں وہ مقام ہے جہاں کھڑے ہو کر انہوں نے خدا کے آگے سرجھا کئے۔ اسی کے قریب منی، مشعر حرام اور عرفات ہیں، جو شعائر اللہ ہیں۔ یہیں وہ پھر (جھر اسود) ہے جو ابراہیم و اسماعیل علیہما السلام اور محمد رسول اللہ علیہ السلام کے مقدس ہاتھوں سے مس ہوا۔ یہی وہ سرزین ہے جہاں ملت ابراہیم کی بیاناد پڑی، یہی وہ آبادی ہے جہاں اسلام کا آفتاب طلوع ہوا۔ یہی وہ گلیاں اور راستے ہیں، جو برجیں ایمیں کی گز رگاہ تھے، یہیں وہ غار حراء ہے جس سے قرآن کی پہلی کرن پھوٹی تھی، یہی وہ صحن حرم ہے جس میں محمد رسول اللہ علیہ السلام نے ترپن سال بسر کیے اور یہی وہ مقام ہے، جہاں براق کے قدم پڑے تھے اور یہی وہ مکانات ہیں، جن کی ایک ایک ایسٹ اسلام کی تاریخ کا ایک ایک صفحہ ہے، کیا قرآن پاک کا اشارہ انہیں مناظر اور مشاہد کی طرف نہیں، جہاں اس نے کہا:

﴿فِيهِ أَيْتَ بَيْتَ مَقَامٍ إِذْ هُمْ مُهْرِمُونَ﴾ (۹۷/ ال عمران: ۳)

”اس حرم میں کھلے کھلے (ربانی) نشانات ہیں ابراہیم کے قیام کی جگہ۔“

ان مقامات اور مناظر میں کسی زائر کا قدم پہنچتا ہے تو اس کے ادب کی آنکھیں نیچی ہو جاتی ہیں، اس کی عقیدت کا سر جھک جاتا ہے، اس کے ایمان کا خون جوش مارنے لگتا ہے، اس کے جذبات کا سمندر متلاطم ہو جاتا ہے، جگہ جگہ اس کی پیشانی زمین سے لگتی جاتی ہے اور محبت کی روح اس کی رگ رگ اور بیش رویہ میں ترپنے لگتی ہے، جدھر نظر دالتا ہے دل وجد کرتا ہے، آنکھیں اشکپر جوتی ہیں اور زبان تنیج و تنبیل میں مصروف ہو جاتی ہے اور سبی وہ لذت اور لطف ہے جو ایمان کو تازہ، عقیدت کو مضبوط اور شعائر اللہ کی محبت کو زندہ کرتا ہے:

﴿وَمَنْ يَعْصِمُ شَعَالَ اللَّهِ فَإِنَّهَا مِنْ تَقْوَى الْفُلُوبِ﴾ (۲۲/ الحج: ۳۲)

”اور جو خدا کی نشانیوں اور یادگاروں کی عظمت کرتا ہے، تو وہ دلوں کے تقوی کے سبب سے ہے۔“

”اور جو خدا کی حرمتوں کی تعظیم کرتا ہے تو وہ اس کے لیے اس کے خدا کے نزدیک بہتر ہے۔“

﴿وَمَنْ يُعَظِّمْ حُرْمَتَ اللَّهِ فَهُوَ خَيْرٌ لَهُ عِنْدَ رَبِّهِ ط﴾ (الحج: ٢٢) (٣٠)

خلاصه روانیت

حج کی حقیقت میں گزر چکا ہے کہ وہ دراصل اس رسمی قربانی اور اس دوڑ دھوپ کا نام نہیں یہ توجہ کی روانیت کی صرف جسمانی اور مادی شکل ہے۔ حج کے یہ ارکان ہمارے اندر وہی احساسات، کیفیات اور تاثرات کے مظاہر اور تمثیلیں ہیں، اسی لیے سرو رکائیت علیہ السلام نے اصلی اور صحیح حج کا نام صرف حج نہیں بلکہ حج بہرور رکھا ہے، یعنی وہ حج جو سر اپا بیکی ہوا اور یہی حج ان تمام برکات اور رحمتوں کا خزانہ ہے، جو عرفات کے سالکوں کے لیے خاص ہے۔ حج کی روانیت و حقیقت توبہ، انا بت اور گزشتہ ضائع اور کھوئی ہوئی عمر کی حلاني کے عہد اور آنکدہ کے لیے اطاعت اور فرمابرداری کے اعتراف اور اقرار کا نام ہے اور اس کا اشارہ خود دعا نے ابراہیمیں مذکور ہے:

﴿رَبَّنَا وَاجْعَلْنَا مُسْلِمِينَ لَكَ وَمِنْ ذُرْقَيْتَنَا أَمَّةً مُسْلِمَةً لَكَ وَأَرِنَا مَا نَاسَكَنَا وَثِبْ عَلَيْنَا إِنَّكَ أَنْتَ السَّوَابُ الرَّحِيمُ﴾ (١٢٨: الْقَرْآن) (٦: الرَّحِيمُ)

”اے ہمارے پروردگار! ہم کو اپنا فرمائیں دار (مسلم) بنا اور ہماری اولاد میں سے اپنا ایک فرمائیں دار گروہ بناؤ۔ اور ہم کو اپنے حج کے احکام اور دستور سلکھا اور ہم پر بر جو یہ ہو (یا ہم کو معاف کر تو) (بندوں کی طرف) بر جو یہ ہونے والا (یا ناکو معاف کرنے والا) اور جنم کرنے والا ہے۔“

حضرت ابراہیم علیہ السلام کی یہ دعا بھی ان کی دوسری دعاؤں کی طرح ضرور قبول کی گئی ہے، اس سے ظاہر ہوا کہ حج درحقیقت خدا کے سامنے اس سرز میں میں حاضر ہو کر، جہاں اکثر نبیوں، رسولوں اور برگزیدوں نے حاضر ہو کر اپنی اطاعت اور فرمان برداری کا اعتراف کیا، اپنی اطاعت اور فرمانبرداری کا عہد و اقرار کرنا ہے اور ان مقامات میں کھڑے ہو کر اور چل کر خدا کی بارگاہ میں اپنی سیہہ کار بیوں سے توبہ کرنا اور اپنے روٹھے ہوئے مولیٰ کو منانا ہے، تاکہ وہ ہماری طرف پھر رجوع ہو کہ وہ تو اپنے تائب گناہگاروں کی طرف رجوع ہونے کے لیے ہر وقت تیار ہے، وہ تو رحم و کرم، الطف و عنایت کا بحر بکراں ہے۔ یہی سبب ہے کہ شفیع المذاہبین علیہ السلام نے فرمایا کہ ”حج اور عمرہ گناہوں کو اس طرح صاف کر دیتے ہیں جس طرح بھٹی لو ہے، سونے اور چاندی کے میل اور کھوٹ کو صاف کر دیتے ہے اور جو مومن اس دن (یعنی عرفہ کے دن) احرام کی حالت میں گزارتا ہے، اس کا سورج ڈوتا ہے تو اس کے گناہوں کو لے کر ڈوتا ہے۔“ * صحیح مسلم اورنسائی میں حضرت عائشہ علیہ السلام سے روایت ہے کہ آپ علیہ السلام نے پہ بشارت دی کہ ”عرفہ کے دن سے بڑھ کر کوئی دن نہیں جس میں خدا اپنے

بندوں کو دوزخ کے عذاب سے آزاد کرتا ہے، وہ اس دن اپنے بندوں سے قریب ہو کر جلوہ گر ہوتا ہے اور اپنے ان بندوں پر فرشتوں کے سامنے خیر کرتا ہے ॥ اور کہتا ہے جو انہوں نے مانگا (وہ ہم نے قبول کیا)۔ ”موطا امام مالک میں ہے کہ آپ ﷺ نے یہ خوبخبری سنائی کہ ”بدر کے دن کے ساعتِ غفران کے دن سے زیادہ شیطان کی دن ذیلیں، رسوا اور غضنفا کی نیز ہوتا ہے، کیوں کہ اس دن وہ دیکھتا ہے کہ خدا کی رحمت برس رہی ہے اور انہا مغافل ہو رہے ہیں۔ ॥ اسی طرح اور بہت سی حدیثیں ہیں جن میں ملخصانہ حج ادا کرنے والوں کو رحمت اور مغفرت کی نویید سنائی گئی ہے۔ یہ تمام حدیثیں درحقیقت اسی دعائے ابراہیم (وَأَرَأَنَا مَنَاسِكَنَا وَتُبْعَدُ عَلَيْنَا) اور ہمارے حج کے دستور ہم کو سوچنا اور ہماری توبہ قبول فرماء۔ کی تفہیمیں ہیں۔ ان تمام بشارتوں سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ حج درحقیقت توبہ اور انابت ہے، اسی لیے احرام پاندھنے کے ساتھ ((لَيْكَ اللَّهُمَّ لَيْكَ)) ”خدادندا میں حاضر ہوں، میں حاضر ہوں“ کا تاریخ دم بدم اس کی زبان سے بلند ہونے لگتا ہے۔ طواف میں، سعی میں، کوہ صفا پر، کوہ مرود پر، عرفات میں، مزدلفہ میں، منی میں اور ہر جگہ جو دعا میں مانگی جاتی ہیں، ان کا برآ حصہ توبہ اور استغفار کا ہوتا ہے اور اس بنابر کہ ((الثَّانِيُّ مِنَ الدُّنْيَا كَمَنْ لَأَذْنُبَ لَهُ)) ॥ ”گناہ سے بصدق دل توبہ کرنے والا ایسا ہے، جیسا وہ جس کا کوئی گناہ نہیں ہے“ اس لیے حج بہر و دلوں کے تمام پچھلے گناہ مغافل ہو جاتے ہیں۔ گوہ توبہ سے ہر جگہ گناہ مغافل ہو سکتے ہیں، اس کے لیے کعبہ اور عرفات کی کچھ شخصیں نہیں۔ لیکن حج کے مشاعر، مقامات اور اکان اپنے گونا گوں تاثرات کی بنا پر دوسرے فوائد و برکات کے علاوہ جو یہاں کے سوا اور کہیں نہیں صدق توبہ کے لیے بہتر سے بہتر موقع پیدا کرتے ہیں۔ ان مقامات کا جو تقدیس اور عظمت ایک مسلمان کے قلب میں ہے، اس کا نفسیاتی اثر دل پر بردا گہرا پڑتا ہے، وہ مقامات جہاں انہیا ﷺ پر برکتوں اور حجتوں کا نزول اور انوار الہی کی بارش ہوئی، وہ ماحول، وہ فضا، وہ تمام گناہ گاروں کا ایک جگہ اکٹھا ہو کر دعا وزاری، فریاد و بکا اور آہ و نالہ وہ قدم پر نبوی مناظر اور بائی مشاہد جہاں خدا اور اس کے برگزیدہ بندوں کے میسیوں ناز و نیاز کے معاملات گزر چکے ہیں، دعا اور اس کے تاثر اور اس کے قبول کے بہترین موقع ہیں، جہاں حضرت آدم ﷺ و حواتیہؓ نے اپنے گناہوں کی معافی کی دعا کی۔ جہاں حضرت ابراہیم ﷺ نے اپنی بیوی اور اپنی اولاد کے لیے دعا مانگی، جہاں حضرت ہود ﷺ اور حضرت صالحؑ نے اپنی قوم کی ہلاکت کے بعد اپنی پناہ ڈھونڈھی، جہاں دوسرے پیغمبروں نے دعا میں کیس، جہاں محمد رسول اللہ ﷺ نے کھڑے ہو کر اپنی اور اپنی امت کے لیے دعا میں مانگیں، وہی مقامات، وہی مشاہد اور دعاوں کے وہی ارکان، ہم گناہ گاروں کی دعائے مغفرت کے لیے کس قدر مذوقوں اور مناسب ہیں کہ پتھر سے پتھر دل بھی ان حالات اور ان مشاہد کے درمیان موم بننے کے لیے تیار ہو جاتے ہیں اور انسان اس ابرکرم کی چھینتوں سے سیراب ہو جاتا ہے، جو وقایو فتاہ یہاں

-
- صحیح مسلم، کتاب الحج، باب فضل يوم عرفة: ٣٢٨٨، سنائی، کتاب المذاکر، باب ما ذکر في يوم عرفة: ٣٠٦۔
 - موطا امام مالک، کتاب الحج، باب جامع الحج: ٩٦٢۔
 - سنن ابن ماجہ، ابواب الزهد، باب ذکر التوبۃ: ٤٢٥٠۔

برگزیدگان الٰہی پر عرش الٰہی سے برستا رہا ہے اور ہبندوز آن ابر رحمت در فشن اسٹ - انسان کی نفیات (سایہ کا لوچ) یہ ہے اور روزمرہ کا تجربہ اس کا شاہد ہے کہ وہ اپنی زندگی میں کسی بڑے اور اہم تغیر کے لیے ہمیشہ زندگی کے کسی موز اور حد فاصل کی ملادش کرتا ہے۔ جہاں پہنچ کر اس کی گزشتہ اور آئندہ زندگی کے دو متاز حصے پیدا ہو جائیں، اسی لیے لوگ اپنے تغیر کے لیے جائز، اگری یا بر سات کا انتظار کرتے ہیں۔ بہت سے لوگ شادی کے بعد یا صاحب اولاد ہونے کے بعد یا تعلیم سے فراغت کے بعد یا کسی نوکری کے بعد یا کسی بڑی کامیابی یا کسی خاص محروم اور سفر کے بعد یا کسی سے مرید ہو جانے کے بعد بدل جاتے ہیں یا اپنے کو بدل لینے پر قادر ہو جاتے ہیں کیوں کہ ان کی زندگی کے یہ اہم واقعات اور سوانح ان کی الگی اور پچھلی زندگی میں فصل اور امتیاز کا نقطہ ڈال دیتے ہیں، جہاں سے اوہریا اور ہر جانا نمکن ہو جاتا ہے، حج و رحلت اسی طرح انسان کی گزشتہ اور آئندہ زندگی کے درمیان ایک حد فاصل کا کام دیتا ہے اور اصلاح اور تغیر کی جانب اپنی زندگی کو پھیر دیتے کام موقع بھم پہنچاتا ہے، یہاں سے انسان اپنی پچھلی زندگی جیسی بھی ہو اس کو ختم کر کے نئی زندگی شروع کرتا ہے، ان بابرکت مقاموں پر حاضر اور وہاں کھڑے ہو کر جہاں جلیل التقدیر انبیاء کے کرام اور خاصان الٰہی کھڑے ہوئے خدا کے گھر کے سامنے قبلہ کے رو برو جو اس کی نمازوں اور عقیدتوں اور مناجاتوں کی غائبانہ سنت ہے، اپنی پچھلی زندگی کی کوتا ہیوں پر ندامت اور اپنے گناہوں کا اعتراض اور آئندہ اطاعت اور فرمانبرداری کا وعدہ اور اقرار و اشرپیدا کرتا ہے کہ شر سے خیر کی طرف خیر سے اور زیادہ خیر کی طرف زندگی کا رخ بدل جاتا ہے اور زندگی کا گزشتہ باب بند ہو کر اس کا دوسرا باب کھل جاتا ہے۔ بلکہ یوں کہنا چاہیے کہ وہ اس کے بعد اپنے نئے اعمال کے لیے نئے سرے سے پیدا ہوتا ہے، اسی لیے سرور کائنات علیہ السلام نے یہ فرمایا:

((مَنْ حَجَّ لِلَّهِ فَلَمْ يَرْفُثْ وَلَمْ يَفْسُقْ رَجَعَ كَيْوُمٍ وَلَدَتُهُ أَمْمَةٌ)) ﴿۱﴾

”جس نے خدا کے لیے حج کیا اور اس میں ہوں رانی نہ کی اور نہ گناہ کیا تو وہ ایسا ہو کر لوٹتا ہے، جیسے اس دن تھا جس دن اسکی ماں نے اس کو جتنا۔“

یعنی ایک نئی زندگی ایک نئی حیات اور ایک نیا دور شروع کرتا ہے، جس میں دین اور دنیا دونوں کی بھلا بیان جمع اور دونوں کی کامیابیاں شامل ہوں گی، یہ فلسفہ خود قرآن پاک کی ان آیتوں کا خلاصہ ہے جو حج کے باب میں ہیں اور جس کی آخری آیتیں طواف کی دعا کا آخری نکڑا ہیں:

﴿ثُمَّ أَفِيْضُوا مِنْ حَيْثُ أَفَاقَ الشَّاءْسُ وَأَسْتَغْفِرُوا اللَّهَ إِنَّ اللَّهَ غَفُورٌ رَّحِيمٌ فَإِذَا قَضَيْتُمُ تَنَاسِكُمْ فَإِذْكُرُوا اللَّهَ كَذِيرًا كَذِيرًا أَوْ أَشَدَّ ذِكْرًا فَإِنَّ اللَّهَ مَنْ يَقُولُ رَبِّيَّا أَنْتَيَأْنَى﴾

* سنن ابن داود کے ملادہ بیتہ تمام کتب صحاح کی کتاب الحج میں یہ حدیث موجود ہے مثلاً: صحیح بخاری، کتاب الحج، باب فضل الحج المبرور: ۱۵۲۱؛ صحیح مسلم، کتاب الحج، باب فضل الحج وال عمرة: ۳۲۹۱؛ ترمذی، ابواب الحج، باب ماجاه فی ثواب الحج والعمرۃ: ۸۱۱؛ سنن نسائی، کتاب مناسک الحج، باب فضل الحج: ۲۶۲۸؛ سنن ابن ماجہ، ابواب المناسک، باب فضل الحج: ۲۸۸۹۔

الدُّنْیَا وَمَا كَانَ فِي الْآخِرَةِ مِنْ خَلْقٍ وَمَنْ هُنُّ إِلَّا يَقُولُونَ رَبُّنَا فِي الدُّنْیَا حَسَنَةٌ وَفِي
الْآخِرَةِ حَسَنَةٌ وَقِيمَاتُ عَذَابَ النَّارِ أُولَئِكَ لَهُمْ نَصِيبٌ مِمَّا كَسَبُوا وَاللَّهُ سَرِيعُ الْحِسَابِ ۝

(٢٠٢-١٩٩: البقرة)

”پھر طواف کے لیے وہیں سے چلو، جہاں سے لوگ چلے اور خدا سے اپنے گناہ کی معافی مانگو
بے شک خدا معاف کرنے والا اور حرم کرنے والا ہے اور جب حج کے تمام اركان ادا کر چکو تو
اللہ کو اس طرح یاد کرو جس طرح اپنے باپ دادوں کو یاد کرتے ہو، یا ان سے بھی زیادہ تو بعض
لوگ (حج کی دعائیں) کہتے ہیں کہ اے ہمارے پروردگار! ہم کو دنیا میں دے اور ایسوں کے
لیے آخرت میں کوئی حصہ نہیں اور بعض وہ ہیں جو کہتے ہیں کہ اے ہمارے پروردگار! ہم کو دنیا
میں بھلانی دے اور آخرت میں بھی بھلانی دے اور ہم کو دوزخ کے عذاب سے چاہیے وہ ہیں
جن کو اپنی کمائی کا حصہ ملے گا اور اللہ تمہارے اعمال کا تم سے جلد حساب لینے والا ہے۔“

حج کے بعض اور چھوٹے چھوٹے اخلاقی مصالح بھی ہیں، مثلاً:

① حج کے ذریعہ سے انسان اپنی تمام ذمہ داریوں کا احساس کر سکتا ہے۔ حج اس وقت فرض ہوتا ہے جب
اہل و عیال کے نفقة سے کچھ رقم پچھتی ہے، اس لیے آدمی حج کے لیے اس وقت نکلتا ہے جب اہل و عیال کی
ضرورتوں کا سامان کر لیتا ہے، اس لیے اس کو اہل و عیال کے مصارف کی ذمہ داریاں خود بخود محسوس ہو جاتی
ہیں، معاملات میں قرض انسان کے سر کا بو جھ ہے اور حج وہی شخص ادا کر سکتا ہے جو اس سے سبکدوش ہو جائے،
اس لیے معاملات پر اس کا نہایت عمدہ اثر پڑتا ہے۔ عام طرز معاشرت اور دنیوی کاموں میں آدمی اپنے
سینکڑوں دشمن ییدا کر لیتا ہے، لیکن جب خدا کی بارگاہ میں جانے کا ارادہ کرتا ہے تو سب سے بری الذمہ ہو
کے جانا چاہتا ہے، اس لیے رخصت کے وقت ہر قسم کے بعض وحدت سے اپنے دل کو صاف کر لیتا ہے، لوگوں
سے اپنے قصور معاف کرتا ہے، روٹھوں کو مناتا ہے، قرض خواہوں کے قرض ادا کرتا ہے، اس لحاظ سے حج
معاشرتی اخلاقی اور روحانی اصلاح کا بھی ایک ذریعہ ہے۔

② اسلام آج ہر ملک میں ہے، اس لیے ہر ملک کی زبان اس کی زبان ہے تاہم اس کی ایک عمومی زبان
بھی ہے، جو اس ملک کی زبان ہے، جہاں دنیا کے ہر ملک سے مسلمان آتے جاتے رہتے ہیں اور اس زبان
کے بولنے اور سیکھنے پر اس سفر میں کچھ نہ کچھ مجبور ہوتے ہیں، اس کا اثر یہ ہے کہ ہر مسلمان قوم جو کوئی بھی بولی
بولتی، بودہ اس ملک کی زبان سے اور زبان سے سہی تو الفاظ سے آشنا ہوتی ہے اور یہ اسلام کی عالمگیر انوث کی
ایک مضبوط کڑی ہے۔

③ مساوات اسلام کا سانگ بنیاد ہے، اگرچہ نماز بھی محدود طریقہ پر اس مساوات کو قائم کرتی ہے، لیکن پوری
و سعت کے ساتھ اس کی اصلی نمائش حج کے زمانہ میں ہوتی ہے جب امیر و غریب، جاہل و عالم، بادشاہ و رعایا

ایک لباس میں، ایک صورت میں، ایک میدان میں، ایک ہی طرح خدا کے سامنے کھڑے ہو جاتے ہیں، نہ کسی کے لیے جگہ کی خصوصیت ہوتی ہے، نہ آگے پیچھے کی قید۔

④ بہت سی اخلاقی خوبیوں کا سرچشمہ کسب حلال ہے، چونکہ ہر شخص حج کے مصارف میں مال حلال صرف کرنے کی کوشش کرتا ہے، اس لیے اس کو خود حلال و حرام کی تفہیق کرنی پڑتی ہے اور اس کا جواہر انسان کی روحانی حالت پر پڑ سکتا ہے، وہ ظاہر ہے۔

الغرض حج اسلام کا صرف مذہبی رکن نہیں، بلکہ وہ اخلاقی، معاشرتی، اقتصادی، سیاسی یعنی قومی و ملی زندگی کے ہر رخ اور ہر پہلو پر حاوی اور ہر مسلمان کی عالمگیر بین الاقوامی حیثیت کا سب سے بلند منارہ ہے۔

جہاد

﴿وَجَاهُدُوا فِي اللّٰهِ حَقًّا جِهَادًا﴾ (الحج: ٢٢)

عام طور سے اسلام کے سلسلہ عبادات میں جہاد کا نام فقہا کی تحریر دن میں نہیں آتا گر قرآن پاک اور احادیث نبوی میں اس کی فرضیت اور اہمیت بہت سے دوسرے فقہی احکام اور عبادات سے بدر جہازیادہ ہے اس لیے ضرورت ہے کہ اس فرضہ عبادت کو اپنے موقع پر جگہ دی جائے اور اس کی حقیقت پرناواقفیت کے جو تو برتو پر دے پڑے ہیں، ان کو اٹھایا جائے۔

جہاد کے معنی عموماً مقابل اور رائی کے سمجھے جاتے ہیں مگر مفہوم کی تنگی قطعاً غلط ہے۔ جہاد کا لفظ جہد سے نکلا ہے، جہاد اور مجاہدہ فعال اور مفاعت کے وزن پر اسی جہد سے مصدر ہیں اور لغت میں اس کے معنی محنت اور کوشش کے ہیں، اسی کے قریب قریب اس کے اصطلاحی معنی بھی ہیں یعنی حق کی بلندی اور اس کی اشاعت اور حفاظت کے لیے ہر قسم کی جدوجہد، قربانی اور ایسا رگوارا کرنا اور ان تمام جسمانی و مالی و دماغی قوتیں کو جو اللہ تعالیٰ کی طرف سے بندوں کو ملی ہیں اس راہ میں صرف کرنا یہاں تک کہ اس کے لیے اپنی، اپنے عزیز واقارب کی، اہل و عیال کی، خاندان و قوم کی جان تک کو قربان کر دینا اور حق کے مخالفوں اور دشمنوں کی کوششوں کو توڑنا، ان کی تدبیروں کو رایگان کرنا، ان کے حملوں کو روکنا اور اس کے لیے جنگ کے میدان میں اگران سے لڑنا پڑے تو اس کے لیے بھی پوری طرح تیار ہنا، یہی جہاد ہے اور یہ اسلام کا ایک رکن اور بڑی عبادت ہے۔

افسر ہے کہ مخالفوں نے اتنے اہم اور اتنے ضروری اور اتنے وسیع مفہوم کو جس کے بغیر دنیا میں کوئی تحریک نہ کبھی سریز ہوئی ہے اور نہ ہو سکتی ہے، صرف دین کے دشمنوں کے ساتھ جنگ کے شکن میدان میں حصہ کر دیا ہے۔ یہ بات بار بار کہی اور دکھائی گئی ہے کہ محمد رسول اللہ ﷺ جس تعلیم اور شریعت کو لے کر دنیا میں آئے وہ مخفی نظریہ اور فلسفہ نہیں بلکہ عمل اور سرتاپا عمل ہے۔ آپ کے مدھب میں نجات کا اتحقاق گوشہ گیری، رہبانیت، نظری مرائق، دھیان اور الہیات کی فلسفیات خیال آرائی پر موقوف نہیں، بلکہ خدا کی توحید، رسولوں اور کتابوں اور فرشتوں کی سچائی، قیامت اور جزا اور زاد کے اعتقاد کے بعد انہیں کے مطابق عمل نیک کرداری کی جدوجہد پرستی ہے، اسی لیے قرآن پاک میں جہاد کا مقابل لفظ قعود (بیٹھنا یا بیٹھ رہنا) استعمال کیا گیا ہے جس سے مقصد سستی، تعافل اور ترک فرض ہے۔ سورہ نساء میں ہے:

﴿لَا يَسْتَكِي الْقَعِدُونَ مِنَ الْمُؤْمِنِينَ عَيْرُ أُولَى الصَّرَرِ وَالْمُجَاهِدُونَ فِي سَيِّلِ اللّٰهِ يَأْمُوْلَهُمْ وَأَنْفُسِهِمْ طَفَّلَ اللّٰهُ الْمُجَاهِدِينَ يَأْمُوْلَهُمْ وَأَنْفُسِهِمْ عَلَى الْقَعِدِينَ دَرَجَةٌ طَوْلًا وَكُلَّاً وَعَدَ اللّٰهُ الْحُسْنَى طَوْلَةٌ الْمُجَاهِدِينَ عَلَى الْقَعِدِينَ أَجْرًا عَظِيمًا﴾

(النساء: ٩٥ / ٤)

”مسلمانوں میں سے وہ جن کو کوئی جسمانی معدودی نہ ہو اور پھر بیٹھے رہیں اور وہ جو خدا کی راہ میں اپنی جان و مال سے جہاد کر رہے ہوں، برائیں اللہ نے اپنی جان و مال سے جہاد کرنے والوں کو بیٹھنے والوں پر درجہ کی فضیلت عطا کی ہے اور ہر ایک سے خدا نے بھلائی کا وعدہ کیا ہے اور جہاد کرنے والوں کو بیٹھنے والوں پر بڑے اجر کی فضیلت بخشی ہے۔“

اس بیٹھنے اور جہاد کرنے کے باہمی تقابل سے یہ بات کھل جاتی ہے کہ جہاد کی حقیقت بیٹھنے، سستی کرنے اور آرام ڈھونڈنے کے سراسر خلاف ہے۔

یہاں ایک شبہ کا ازالہ کرنا ضروری ہے اکثر لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ جہاد اور قتال دونوں ہم معنی ہیں حالانکہ ایسا نہیں ہے۔ قرآن پاک میں دونوں لفظ الگ الگ استعمال ہوئے ہیں۔ اس لیے جہاد فی سبیل اللہ (خدا کی راہ میں جہاد کرنا) اور قتال فی سبیل اللہ (خدا کی راہ میں لڑنا) ان دونوں لفظوں کے ایک معنی نہیں ہیں، بلکہ ان دونوں میں عام و خاص کی نسبت ہے۔ یعنی ہر جہاد قتال نہیں ہے۔ بلکہ جہاد کی مختلف قسموں میں سے ایک قتال اور دشمنوں سے لڑنا بھی ہے۔ اسی لیے قرآن پاک میں ان دونوں لفظوں کے استعمال میں ہمیشہ فرق ملاحظہ رکھا گیا ہے۔ چنانچہ اسی سورہ نساء کے اوپر کی آیت میں اور دوسری آیتوں میں جہاد کی ووصیت فرمیں بیان کی گئی ہیں: جہاد بالنفس اور جہاد بالمال یعنی اپنی جان کے ذریعہ جہاد کرنا اور اپنے مال کے ذریعہ جہاد کرنا، جان کے ذریعہ جہاد کرنا یہ ہے کہ حق کی حمایت کے لیے ہر قسم کی جسمانی تکلیف بے خطر اٹھائی جائے۔ یہاں تک کہ اپنی جان تک کو جو کھوں میں ڈال دینے، آگ میں جلائے جانے، سولی پر لٹکائے جانے، تیر اور نیزے میں چحمد جانے اور تلوار سے کٹ جانے کے لیے ہر وقت آمادہ اور مستعد رہے، مال سے جہاد کرنا یہ ہے کہ حق کو کامیاب اور سر بلند کرنے کے لیے اپنی ہر ملکیت کو قربان، اپنی ہر دولت کو ثناوار اور اپنے ہر سرمایہ کو وقف کرنے کے لیے تیار رہے۔ اسی جان اور مال کی باطل محبت شخص اور قوم دونوں کی ترقی و سعادت کی راہ میں رکاوٹ ہے۔ اگر یہ دونوں بت ہمارے سامنے سے ہٹ جائیں تو ہم کامل مدد ہو جائیں اور پھر ہماری ترقی کو دنیا کی کوئی طاقت روک نہیں سکتی، جسمانی اور روحانی ہر قسم کی ترقی کا اصل اصول یہی ہے اس کے سوا کچھ اور نہیں۔

ترقی و سعادت کا یہ گر صرف محسوسی اللہ ﷺ کو بتایا گیا اور آپ ہی نے یہ نکتہ اپنی امت کو سکھایا اسی جہاد کا جذبہ اور اسی کے حصول ثواب کی آرزو تھی۔ جس کے سبب سے مکہ میں مسلمانوں نے تیرہ برس تک ہر قسم کی تکلیفوں کا ہبہ اور اسے مقابلہ کیا، ریگستان کی جلتی دھوپ، پتھر کی بھاری سلسلہ، طوق و زنجیر کی گراں باری، بھوک کی تکلیف، پیاس کی شدت، نیزہ کی اپنی، تلوار کی دھار، بال بچوں سے علیحدگی، مال و دولت سے دست برداری اور گھر بار سے دوری کوئی چیز بھی ان کے استقلال کے قدم کو ڈگ کانہ سکی اور پھر دس برس تک مدینہ منورہ میں انہوں نے تلوار کی چھاؤں میں جس طرح گزارے وہ دنیا کو معلوم ہے۔

﴿إِنَّمَا الْمُؤْمِنُونَ الَّذِينَ آمَنُوا بِاللَّهِ وَرَسُولِهِ ثُمَّ لَمْ يَرَوْا إِيمَانَهُ وَاجْهَدُوا بِأَمْوَالِهِمْ وَأَنفُسِهِمْ فِي سَبِيلِ اللَّهِ أُولَئِكَ هُمُ الصَّادِقُونَ ﴾ (٤٩ / الحجرات: ١٥)

”مومن وہی ہیں جو اللہ اور اس کے رسول پر ایمان لائے اور پھر اس میں وہ ڈگ کاٹے نہیں اور خدا کے راستے میں اپنی جان سے اور اپنے مال سے جہاد کیا، یہی سچے اترنے والے لوگ ہیں۔“

﴿فَالَّذِينَ هَاجَرُوا أَخْرِجُوهُمْ مِنْ دِيَارِهِمْ وَأَوْذِنُوا فِي سَيِّئِيٍّ وَقَتَّلُوا وَقُتِلُوا لَا يَكُونُنَّ عَنْهُمْ سَيِّئَاتُهُمْ وَلَا دُخْلَتْهُمْ جَنَّتٍ - الایہ ۳۲ /آل عمران: ۱۹۵﴾

”پھر جنہوں نے اپنا گھر بارچھوڑا اور اپنے گھروں سے نکالے گئے اور میری راہ میں ستائے گئے اور لڑے اور مارے گئے، میں ان کے گناہوں کو اتار دوں گا اور ان کو بہشت میں داخل کروں گا۔“

جہاد کی فتنہ میں

① جب جہاد کے معنی محنت، سی لیغ اور جدوجہد کے ہیں تو ہر نیک کام اس کے تحت میں داخل ہو سکتا ہے۔ علمائے ول کی اصطلاح میں جہاد کی سب سے اعلیٰ قسم خود اپنے نفس کے ساتھ جہاد کرنا ہے اور اسی کا نام ان کے ہاں جہاد اکبر ہے۔ خطیب نے تاریخ میں حضرت جابر صحابی رضی اللہ عنہ سے روایت کی ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان صحابہ سے جو ابھی لڑائی کے میدان سے واپس آئے تھے فرمایا: ”تمہارا آنا مبارک تم چھوٹے جہاد (غزوہ) سے بڑے جہاد کی طرف آئے ہو کہ بڑا جہاد بندہ کا اپنے ہواۓ نفس سے لڑنا ہے۔“ حدیث کی دوسری کتابوں میں اس قسم کی اور بعض روایتیں بھی ہیں۔ ② چنانچہ ابن نجارتے حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ سے روایت کی ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ ”بہترین جہاد یہ ہے کہ انسان اپنے نفس اور اپنی خواہش سے جہاد کرے۔“ یہی روایت دلیلی میں ان الفاظ میں ہے کہ ”بہترین جہاد یہ ہے کہ تم خدا کے لیے اپنے نفس اور اپنی خواہش سے جہاد کرو۔“ یہ تینوں روایتیں گوفن کے لحاظ سے چندال مستند نہیں ہیں مگر وہ درحقیقت بعض حدیثوں کی تائید اور قرآن پاک کی اس آیت کی تفسیر ہیں:

﴿وَالَّذِينَ جَاهَدُوا فِي نَّهَارٍ يَكُنُّهُمْ سُبْلًا وَإِنَّ اللَّهَ لَمَّا مُهُوسِنِينَ ﴾

(٦٩ / العنكبوت: ٢٩)

”اور جنہوں نے ہمارے بارے میں جہاد کیا (یعنی محنت اور تکلیف اٹھائی) ہم ان کو اپناراستہ آپ دکھائیں گے اور بے شبہ خدا نیکو کاروں کے ساتھ ہے۔“

اس پوری سورہ میں اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو حق کے لیے ہر مصیبت و تکلیف میں ثابت قدم اور بے خوف رہنے کی تعلیم دی ہے اور اسکے پیغمبروں کے کارنا موں کا ذکر کیا ہے کہ وہ ان مشکلات میں کیسے ثابت قدم

بحوالہ کنز العمال، کتاب الجہاد، ج ۲، ص ۲۸۵ حیدر آباد دکن۔

رہے اور بالآخر خدا نے ان کو کامیاب اور ان کے دشمنوں کو ہلاک کیا۔ سورہ کے آغاز میں ہے:

﴿وَمَنْ جَاهَدَ فِي أَنْمَاءِ يُجَاهِدُ لِنَفْسِهِ إِنَّ اللَّهَ لَغَنِيٌّ عَنِ الْعَلَمِينَ ﴾ ۵۰﴾

(٦) / العنكبوت: ٢٩)

”اور جو کوئی جہاد کرتا ہے (یعنی محنت اٹھاتا ہے) وہ اپنے ہی نفس کے لیے جہاد کرتا ہے، اللہ تو جہان والوں سے بے نیاز ہے۔“

اور سورہ کے آخر میں فرمایا کہ ہمارے کام میں یا خود ہماری ذات کے حصول میں یا ہماری خوشنودی کی طلب میں جو جہاد کرے گا اور محنت اٹھائے گا ہم اس کے لیے اپنے تک پہنچنے کا راستہ آپ صاف کر دیں گے اور اس کو اپنی راہ آپ دکھائیں گے۔ یہی مجاہدہ، کامیابی کا زینہ اور روحانی ترقیوں کا وسیلہ ہے، سورہ حج میں ارشاد ہوا:

﴿وَجَاهُدُوا فِي اللَّهِ حَقَّ چَاهِدَةٍ هُوَ اجْتَبَيْكُمْ وَمَا جَعَلَ عَيْنَكُمْ فِي الدِّينِ يُنْهِيْ هُجُّ مِلَّةٍ أَبِيْنَكُمْ إِبْرَاهِيمَ ط﴾ (٧٨) / الحج: ٢٢)

”اور محنت کرو اللہ میں پوری محنت، اس نے تم کو چنا ہے اور تمہارے دین میں تم پر کوئی تنقی نہیں کی، تمہارے باپ ابراہیم کا دین۔“

”یہ اللہ کی راہ میں محنت اور جہاد کرنا“، وہی جہاد اکبر ہے جس پر ملت ابراہیم کی بناتے یعنی حق کی راہ میں عیش و آرام، اہل و عیال اور جان و مال ہر چیز کو قربان کر دینا۔ ترمذی، طبرانی، حاکم اور صحیح ابن حبان میں ہے، کہ آنحضرت ﷺ نے صحابے سے فرمایا کہ: ((المجاهد من جاهد نفسه)) یعنی ”جہاد وہ ہے جو اپنے نفس سے جہاد کرے۔*) صحیح مسلم میں ہے ایک دفعہ آپ ﷺ نے صحابے سے پوچھا کہ ”تم پہلوان کس کو کہتے ہو؟“ عرض کیا، جس کو لوگ پچھاڑنہ سکیں۔ فرمایا: ”نہیں پہلوان وہ ہے جو غصہ میں اپنے نفس کو قابو میں رکھے۔“*) یعنی جو اس پہلوان کو پچھاڑ سکے اور اس حریف کو زیر کر سکے جس کا اکھاڑہ خود اس کے سینے میں ہے۔

② جہاد کی ایک اور قسم جہاد بالعلم ہے، دنیا کا تمام شر و فساد جہالت کا نتیجہ ہے، اس کا دور کرنا ہر حق طلب کے لیے ضروری ہے، ایک انسان کے پاس اگر عقل و معرفت اور علم و انش کی روشنی ہے تو اس کا فرض ہے کہ وہ اس سے دوسرا تاریک دلوں کو فائدہ پہنچائے، تکوار کی دلیل سے قلب میں وہ طہانتی نہیں پیدا ہو سکتی جو دلیل و برہان کی قوت سے لوگوں کے سینوں میں پیدا ہوتی ہے۔ اسی لیے ارشاد ہوا کہ:

﴿أَدْعُ إِلَى سَيِّلِ رَبِّكَ يَا الْكَوَافِرُ وَالْمَوْعِظَةِ الْحَسَنَةِ وَجَادَ لَهُمْ يَا أَيُّهُنَّ هُنَّ أَخْسَنُ ط﴾

* ترمذی، ابواب فضائل الصحابة، باب ما جاء في فضل من مات مرابطا: ١٦٢١؛ صحيح ابن حبان، كتاب السير، باب فضل الجهاد: ٤٦٠٥؛ طبراني كبير: ١٥١٩٢؛ كنز العمال كتاب الایمان، ج ١، ص: ٣٩۔

** صحيح مسلم، كتاب البر والصلة، باب فضل من يملك نفسه عند الغضب: ٦٦٤١۔

(١٢٥ / التحلیل)

”تو لوگوں کو اپنے پروگار کے راستے کی طرف آنے کا بلا واحکمت و دانائی کی باتوں کے ذریعہ سے اور اچھی طرح سمجھا کر دے اور مناظرہ کرنا ہو تو وہ بھی اپنے اسلوب سے کر۔“

دین کی یہ تبلیغ و دعوت بھی جو سراسر علمی طریق سے ہے۔ جہاد کی ایک قسم ہے اور اسی طریقہ دعوت کا نام ”جہاد بالقرآن“ ہے کہ قرآن خود اپنی آپ دلیل اپنی آپ موعظت اور اپنے لیے آپ مناظرہ ہے۔ قرآن کے ایک سچے عالم کو قرآن کی صداقت اور سچائی کے لیے قرآن سے باہر کی کسی چیز کی ضرورت نہیں۔ محمد رسول اللہ ﷺ کو روحانی جہاد یعنی روحانی یماریوں کی فوجوں کو شکست دینے کے لیے اسی قرآن کی تلوار ہاتھ میں دی گئی اور اسی سے کفار و منافقین کے شکوک و شبہات کے پروں کو ہزیرت دینے کا حکم دیا گیا۔ ارشاد ہوا:

﴿فَلَا تُطِعِ الْكُفَّارُ إِنَّ وَجَاهَهُمْ يَهُجَّهَا دَيْرَبَرِيزَ﴾ (٥٢ / الفرقان)

”تو کافروں کا کہانہ مان اور بذریعہ قرآن کے توان سے جہاد کر برواجہاد۔“

بذریعہ قرآن کے جہاد کر یعنی قرآن کے ذریعہ سے توان کا مقابلہ کر، اس قرآنی جہاد و مقابلہ کو اللہ تعالیٰ نے جہاد کبیر ”براجہاد“ اور برازور کا مقابلہ فرمایا ہے، اس سے اندازہ ہو گا کہ اس جہاد بالعلم کی اہمیت قرآن پاک کی نظر میں کتنی ہے، علمانے بھی اس اہمیت کو محسوس کیا ہے اور اس کو جہاد کا مہتمم بالشان درجہ قرار دیا ہے، امام ابو بکر رازی خلیٰ نے احکام القرآن میں اس پر طیف بحث کی ہے اور لکھا ہے کہ جہاد بالعلم کا درجہ جہاد بالنفس اور جہاد بالمال دونوں سے بڑھ کر ہے **﴿إِنَّ أَكْثَرَ رُوَّافِدَ الْمُؤْمِنِينَ لَيَرْجِعُونَ إِلَى أَهْمَالِهِمْ﴾** ایک مسلمان کا فرض ہے کہ حق کی حمایت اور دین کی نصرت کے لیے عقل، فہم، علم اور بصیرت حاصل کرے اور ان کو اس راہ میں صرف کرے اور وہ تمام علوم جو اس راہ میں کام آسکتے ہوں، ان کو اس لیے حاصل کرے کہ ان سے حق کی اشاعت اور دین کی مدافعت کا فریضہ انجام پائے گا، یہ علم کا جہاد ہے، جو اہل علم پر فرض ہے۔
جہاد بالمال

انسان کو اللہ تعالیٰ نے جو مال و دولت عطا کی ہے اس کا منشأ بھی یہ ہے کہ اس کو خدا کی مرغی کے راستوں میں خرچ کیا جائے، یہاں تک کہ اس کو اپنے اور اپنے اہل و عیال کے آرام و آسائش کے لیے بھی خرچ کیا جائے تو اسی کی مرغی کے لیے، دنیا کا ہر کام روپیہ کا تھانج ہے، چنانچہ حق کی حمایت اور نصرت کے کام بھی اکثر روپے پر موقوف ہیں، اس لیے اس جہاد بالمال کی اہمیت بھی کم نہیں ہے، دوسری اجتماعی تحریکوں کی طرح اسلام کو بھی اپنی ہر قسم کی تحریکات اور جدوجہد میں سرمایہ کی ضرورت ہے، اس سرمایہ کا فراہم کرنا اور اس کے لیے مسلمانوں کا اپنے اوپر ہر طرح کا ایثار گوارا کرنا جہاد بالمال ہے، آنحضرت ﷺ کی تعلیم و صحبت کی برکت سے صحابہ کرام نے اپنی عام غربت اور نادری کے باوجود اسلام کی سخت سے سخت گھڑیوں میں جس

﴿الْحُكْمُ لِلَّهِ الْعَلِيِّ قَسْطَنْطِنْطِيْهِ، ج ۲، ص: ۱۱۹﴾

طرح مالی جہاد کیا ہے، وہ اسلام کی تاریخ کے روشن کارنا مے ہیں اور انہیں سیر ایوں سے دین حق کا باغ چھن آ رائے نبوت کے ہاتھوں سر بزرو شاداب ہوا اور اسی لیے اسلام میں ان بزرگوں کا بہت بڑا رتبہ ہے:

﴿إِنَّ الَّذِينَ أَمْنَوْا وَهَا جَرُوا وَجَهَدُوا إِيمَانُهُمْ وَأَنْفُسُهُمْ فِي سَيِّلِ اللَّهِ﴾

(٧٢/ الانفال)

”بے شک وہ جو ایمان لائے اور تحریت کی اور اپنے مال اور جان سے جہاد کیا۔“

قرآن پاک میں مالی جہاد کی تنبیہ و تاکید کے متعلق بکثرت آیتیں ہیں، بلکہ یہ مشکل کہیں جہاد کا حکم ہو گا، جہاں اس جہاد بالمال کا ذکر نہ ہو اور قبل خاطر یہ امر ہے کہ ان میں سے ہر ایک موقع پر جان کے جہاد پر مال کے جہاد کو تقدم بخشنا گیا ہے، جیسے:

﴿إِنْفُرُوا أَخْفَافًا وَيَقَالُوا وَجَاهُدُوا إِيمَانُهُمْ وَأَنْفُسُهُمْ فِي سَيِّلِ اللَّهِ ذَلِكُمْ خَيْرُ الْكُمَانِ﴾

کنْتُمْ تَعْلَمُونَ ﴿٤١﴾ (٩/ التوبہ)

”مکے یا بھاری ہو کر جس طرح ہو نکلو اور اپنے مال اور اپنی جان سے خدا کے راستے میں جہاد کرو، یہ تمہارے لیے بہتر ہے، اگر تم کو معلوم ہو۔“

﴿إِنَّمَا الْمُؤْمِنُونَ الَّذِينَ أَمْنَوْا بِاللَّهِ وَرَسُولِهِ ثُمَّ لَمْ يَرْتَكِبُوا وَجَهَدُوا إِيمَانُهُمْ وَأَنْفُسُهُمْ فِي سَيِّلِ اللَّهِ أُولَئِكَ هُمُ الصَّدِيقُونَ ﴿٥﴾﴾ (٤٩/ الحجرات)

”مومن وہی ہیں، جو اللہ اور رسول پر ایمان لائے، پھر اس میں شک نہیں کیا اور اپنے مال اور اپنی جان سے خدا کے راستے میں جہاد کیا، یہی سچے اترنے والے ہیں۔“

﴿فَضَلَّ اللَّهُ الْمُجْهِدِينَ إِيمَانُهُمْ وَأَنْفُسُهُمْ عَلَى الْقَعْدِينَ دَرَجَةً﴾

(٩٥/ النساء)

”اپنے مال اور نفس سے جہاد کرنے والوں کو اللہ نے بیٹھ رہے والوں پر ایک درجہ کی فضیلت دی ہے۔“

اس تقدم کے کئی اسباب اور مصلحتیں ہیں۔

میدانِ جنگ میں ذاتی اور جسمانی شرکت ہر شخص کے لیے ممکن نہیں، لیکن مالی شرکت ہر ایک کے لیے آسان ہے، جسمانی جہاد یعنی بڑائی کی ضرورت ہر وقت پیش نہیں آتی ہے، لیکن مالی جہاد کی ضرورت ہر وقت اور ہر آن ہوتی ہے، انسانی کمزوری یہ ہے کہ مال کی محبت، اس کی جان کی محبت پر اکثر غالب آ جاتی ہے۔

گر جان طلبی مضایقہ نیست گر زر طلبی سخن دریں است
اس لیے مال کو جان پر مقدم رکھ کر ہر قدم پر انسان کو اس کی اس کمزوری پر ہشیار کیا گیا ہے،

④ جہاد کی ان اقسام کے علاوہ ہر نیک کام اور ہر فرض کی ادائیں اپنی جان و مال و دماغ کی قوت صرف کرنے کا نام بھی اسلام میں جہاد ہے، عورتیں حضور انور ﷺ کی خدمت میں آ کر عرض کرتی ہیں کہ یا رسول اللہ ﷺ! ہم کو غزوہ وات کے جہاد میں شرکت کی اجازت دی جائے، ارشاد ہوا کہ ”تمہارا جہاد نیک حج ہے۔“ ❶ کہ اس مقدس سفر کے لیے سفر کی تمام صعوبتوں کو برداشت کرنا، صفت نازک کا ایک جہاد ہی ہے، اسی طرح ایک صحابی یمن سے چل کر خدمت اقدس میں اس غرض سے حاضر ہوتے ہیں کہ کسی لڑائی کے جہاد میں شرکت کریں، آپ ﷺ نے ان سے دریافت فرمایا کہ ”کیا تمہارے ماں باپ ہیں؟“ ”عرض کی، جی ہاں، فرمایا: (فَفِيهِمَا فَجَاهُدُدْ) ”تو تم انہیں کی خدمت میں جہاد کرو۔“ ❷ یعنی ماں باپ کی خدمت کرنا بھی جہاد ہے، اسی طرح خطرناک سے خطرناک موقع پر حق کے اظہار میں بے باک ہونا بھی جہاد ہے، آپ ﷺ نے فرمایا:

(اَنْ منْ اَعْظَمُ الْجَهَادِ كَلْمَةً عَدْلٍ عِنْدَ سُلْطَانٍ جَاثِرٍ) ❸

”ایک بڑا جہاد کسی ظالم قوت کے سامنے، انصاف کی بات کہہ دینا ہے۔“

⑤ اس سے ظاہر ہوا کہ جہاد بالنفس، یعنی اپنے جسم و جان سے جہاد کرنا جہاد کے ان تمام اقسام کو شامل ہے، جن میں انسان کی کوئی جسمانی محنت صرف ہو اور اس کی آخری حد خطرات سے بے پرواہ کرنا پنی زندگی کو بھی خدا کی راہ میں شمار کر دینا ہے، نیز دین کے دشمنوں سے اگر مقابلہ آپرے اور وہ حق کی مخالفت پر تسلی جائیں تو ان کو راست سے ہٹانا اور اس صورت میں ان کی جان لیتا یا اپنی جان دینا جہاد بالنفس کا انتہائی جذبہ کمال ہے، ایسے جان شمار اور جان باز بندے کا انعام یہ ہے کہ اس نے اپنی جس عزیزترین متناع کو خدا کی راہ میں قربان کیا، وہ ہمیشہ کے لیے اس کو بخشن دی جائے، یعنی فانی حیات کے بدله اس کو ابدی حیات عطا کر دی جائے، اسی لیے ارشاد ہوا:

﴿وَلَا تَقُولُوا لِيَنْ يُقْتَلُ فِي سَيِّلِ اللَّهِ أَمْوَاتٍ بَلْ أَحْيَاءٌ وَلَكِنْ لَا يَشْعُرُونَ ۚ﴾

(البقرة: ۱۵۴)

”جو خدا کی راہ میں مارے گئے، ان کو مردہ نہ کہو، بلکہ وہ زندہ ہیں، لیکن تم کو اس کا احساس نہیں۔“

آل عمران میں ان جان بازوں کی قدر افزائی ان الفاظ میں کی گئی ہے:

﴿وَلَا تَحْسِنَ الَّذِينَ قُتُلُوا فِي سَيِّلِ اللَّهِ أَمْوَاتٍ بَلْ أَحْيَاءٌ وَنَدَرَ يَهُمْ يُرْزُقُونَ ۖ فَرِحِينٌ

﴿يَمَّا أَنْتُمْ لِهُمْ أَنْفَلُهُمْ مِنْ فَضْلِهِ ۖ وَيَسْتَبْشِرُونَ بِالَّذِينَ لَمْ يَكُنُوا لَهُمْ مِنْ خَلْفِهِمْ ۖ إِلَّا حَوْقَفٌ

﴿عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ بِحَرْثِنَوْنَ ۚ﴾ (آل عمران: ۱۶۹ - ۱۷۰)

❶ صحیح بخاری، کتاب jihad، باب جہاد النساء: ۲۸۷۶۔ ❷ صحیح مسلم، کتاب البر والصلة، باب بر الوالدین: ۶۵۰؛ ابو داود، کتاب jihad، باب فی الرجل بغزو: ۲۵۲۹۔

❸ جامع ترمذی، ابواب الفتنه، باب ما جاء افضل jihad کلمة عدل: ۲۱۷۴۔

”جو خدا کی راہ میں مارے گئے ان کو مردہ گمان نہ کرو، بلکہ وہ زندہ ہیں، اپنے پروردگار کے پاس ان کو روزی دی جا رہی ہے، خدا نے ان کو اپنی جو مہربانی عطا کی ہے، اس پر وہ خوش ہیں اور جواب تک ان سے اس زندگی میں ہونے کی وجہ سے نہیں ملے ہیں، ان کو خوش خبری دیتے ہیں کہ ان کو نہ کوئی خوف ہے، نہ وہ غم میں ہیں۔“

ان جان شاروں کا نام شریعت کی اصطلاح میں ”شہید“ ہے، یعنی عشق و محبت کی راہ کے شہید زندہ وجاوید ہیں۔

ہرگز نہ میردانکہ دلش زندہ شدبعشق ثبت است بر جریدہ، عالم دوام ما یا پسے اسی خونی گلگون پیرا، ان میں قیامت کے دن اٹھیں گے، ﴿وَلِيَعْلَمَ اللَّهُ الَّذِينَ آمَنُوا وَيَكْتُبُ مِنْكُمُ شَهِيدًا إِذَا مَرُوا نَفْسٌ لِّهَا كَمْ تَحْمِلُ هُنَّ مِنْ أَنْفُسٍ مَّا يَمْلِكُونَ﴾ (آل عمران: ۱۴۰) اسی کے ساتھ وہ جانباز بھی جو گواپنا سر ہٹھیلی پر رکھ کر میدان میں اترے تھے، لیکن ان کے سر کا ہدیہ دربارِ الہی میں اس وقت اس لیے قبول نہ ہوا کہ باہمی ان کی دنیاوی زندگی کا کارنامہ ختم نہیں ہوا تھا، وہ بھی اپنے حسن نیت کی بدولت رضائے الہی کی سند پائیں گے، اسی لیے ان کو عام مسلمان ادب و تعلیم کے لیے ”غازی“ کے لقب سے یاد کرتے ہیں:

﴿وَمَنْ يَقْاتِلُ فِي سَبِيلِ اللهِ فَيُقْتَلُ أَوْ يُغْلَبُ فَسَوْفَ تُؤْتَيهِ أَجْرًا عَظِيمًا﴾

(النساء: ۷۴)

”اور جو خدا کی راہ میں لڑتا ہے، پھر وہ مارا جاتا ہے یا وہ غالب آتا ہے، تو ہم اس کو برا بدلہ عنایت کریں گے۔“

﴿فَالَّذِينَ هَاجَرُوا أَوْ خِرْجُوا مِنْ دِيَارِهِمْ وَأُوذُوا فِي سَبِيلِهِمْ وَقَاتَلُوا وَقُتِلُوا لَا يَكُونُنَّ عَنْهُمْ سَيَّأَتِيمٌ وَلَا دُخْلَتْهُمْ جَنَّتٌ تَجْرِي مِنْ تَحْتِهَا الْأَنْهَرُ﴾ (آل عمران: ۱۹۵) (۳/۱۹۵)

”تو جنہوں نے میری خاطر گھر یا رچھوڑا اور اپنے گھروں سے نکالے گئے اور ان کو میری راہ میں تکلیفیں دی گئیں، وہ لڑے اور مارے گئے، ہم ان کے گناہوں کو چھپا دیں گے اور ان کو جنت میں داخل کریں گے، جس کے نیچے نہیں بہتی ہوں گی، خدا کی طرف سے ان کو یہ بدلہ ملے گا اور خدا کے پاس اچھا بدلہ ہے۔“

۱) صحیح مسلم، کتاب الامارة، باب فضل الجهاد والخروج في سبیل الله: ۴۸۶۲ میں یہ الفاظ ہیں: ((لا يكلم احد في سبیل الله، والله اعلم) میں بکلم فی سبیلہ الاجاء يوم القيمة وجرحه ينبع اللون لون دم والريح ريح مسلک)) اور سنن ابو داود، کتاب الجنائز، باب ما يستحب من تطهير ثياب الميت: ۳۱۱۴ میں یہ الفاظ ہیں ((الميت يبعث في ثيابه التي يموت فيها)).

ان آیات کی تفسیر و تشریع میں آنحضرت ﷺ نے جو کچھ فرمایا ہے، وہ احادیث میں مذکور ہے، جس میں شہیدوں کی فضیلتیں اور ان کی اخروی نعمتوں کی تفصیل نہایت موثر الفاظ میں ہے، اسی شہادت اور غزا کے عقیدے نے مسلمانوں میں مشکلات کے مقابلہ اور دشمنوں سے بے خوفی کی وہ روح پیدا کر دی جس کی زندگی اور تازگی کا سائز ہے تیرہ سو برس کے بعد بھی وہی عالم ہے، یہی وہ جذبہ ہے جو مسلمانوں کو دین کی خاطر جان دینے پر اس قدر جلد آنادہ کر دیتا ہے اور اس حیات جاوید کی تلاش میں ہر مسلمان بتا نظر آتا ہے، یہ وہ رتبہ ہے جس کی تمنا خود آنحضرت ﷺ نے ظاہر کی اور فرمایا کہ ”مجھے آرزو ہے کہ میں خدا کی راہ میں مارا جاؤں اور دوبارہ مجھے زندگی ملے اور میں اس کو بھی قربان کر دوں اور پھر تیسرا زندگی ملے اور اس کو بھی میں خدا کی راہ میں شارکر دوں“ ﴿۱﴾، ذرا ان فقرتوں پر ایک بار اور نگاہ ڈال لجئے، ان میں یہ نہیں ہے کہ میں دوسرا کو مارا دوں، بلکہ یہ ہے حق کی راہ میں، میں مارا جاؤں اور پھر زندگی ملے، پھر مارا جاؤں، پھر زندگی ملے اور پھر مارا جاؤں۔

کشتگان خنجر تسليم را بزرمان از غیب جان دیگر است
دائی جہاد

یہ تو وہ جہاد ہے جس کا موقع ہر مسلمان کو پیش نہیں آتا اور جس کو آتا بھی ہے تو عمر میں ایک آدھ ہی دفعہ آتا ہے، مگر حق کی راہ میں دائی جہاد وہ جہاد ہے جو ہر مسلمان کو ہر وقت پیش آ سکتا ہے، اس لیے محمد رسول اللہ ﷺ کے ہر امتی پر یہ فرض ہے کہ دین کی حمایت، علم دین کی اشاعت، حق کی نصرت، غریبوں کی مدد، زیرستوں کی امداد، سیہ کاروں کی ہدایت، امر بالمعروف، نهى عن المنکر، اقامۃ عدل، رد ظلم اور احکامِ الہی کی تعمیل میں ہمہ تن اور ہر وقت لگا رہے، یہاں تک کہ اس کی زندگی کی ہر جنبش و سکون، ایک جہاد بن جائے اور اس کی پوری زندگی جہاد کا ایک غیر منقطع سلسلہ نظر آئے، سورہ آمل عمران کی جس میں جہاد کے مسلسل احکام ہیں آخری آیت ہے:

﴿يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا صُبُرُوا وَصَابِرُوا وَرَأَيْطُوا وَأَنْقُوا اللَّهُ أَعْلَمُ بِمَا تُفْلِحُونَ ﴾

(آل عمران: ۲۰۰)

”اے ایمان والو! مشکلات میں ثابت قدم رہو اور مقابلہ میں مضبوطی دکھاؤ اور کام میں لگے رہو اور خدا سے ڈرو، شاید کہ تم مراد کو پہنچو۔“

یہی وہ جہادِ محمدی ﷺ ہے جو مسلمانوں کی کامیابی کی کنجی اور فتح و نیروزی کا نشان ہے۔

﴿ صحیح مسلم، کتاب الجهاد، باب فصل الجهاد والخروج فی سبیل الله: ۴۸۵۹۔

عبدات قلبی

یہ اسلام کی ان عبادات کا بیان تھا، جو جسمانی و مالی کھلاتی ہیں، گوکر دل کے اخلاص کا شمول ان میں بھی ہے، لیکن اسلام میں بعض ایسی عبادات بھی ہیں، جن کا تعلق تمام ہر قلبی احوال اور نفس کی اندر وہی کیفیتوں سے ہے، پہلے معلوم ہو چکا ہے کہ اسلام میں ہر نیکی کا کام عبادت ہے، اس لیے تمام امور خیر، خواہ وہ جسمانی، یا مالی، قلبی ہوں عبادات کے اندر داخل ہیں، فقہا نے صرف جسمانی و مالی عبادات سے بحث کی ہے، لیکن حضرات صوفیا نے جسمانی و مالی عبادات کے ساتھ قلبی عبادات کو بھی شامل کر لیا ہے، اصل یہ ہے کہ فقہا نے اپنا فرض منصب صرف جسمانی اور مالی فریضوں تک محدود رکھا ہے اور صوفیا نے ان سارے فریضوں کو سمجھا کیا ہے، جن سے اسلام نے انسان کے قلب و روح کی درستی کا کام لیا ہے، پیش نظر تصنیف ندوتفقد کی کوئی کتاب ہے اور نہ تصوف کی، اس کا مقصود ان فرائض کو بتانا ہے، جن کی تائید و توصیف قرآن پاک نے بار بار کی ہے اور اسی تائید و توصیف سے ہم کو اسلام میں ان کی اہمیت کا پتہ چلتا ہے۔ اس قسم کے چند فرائض جن کا مرتبہ عبادات میگانہ کے بعد قرآن پاک میں سب سے زیادہ نظر آتا ہے، تقویٰ، اخلاص، توکل، صبر اور شکر ہیں، یہ وہ فرائض ہیں، جن کا تعلق انسان کے قلب سے ہے اور اسی لیے ان کا نام ”قلبی عبادات“ رکھا جا سکتا ہے، یہ وہ فرائض یا قلبی عبادات ہیں جو اسلام کی روح اور ہمارے تمام اعمال کا اصلی جوہر ہیں، جن کے الگ کر دینے سے وہ عبادات میگانہ بھی جن پر اسلام نے اس قدر رزور دیا ہے، جسد بے روح بن جاتے ہیں، یہ بات گویہاں بے محل ہے، مگر کہنے کے قابل ہے، کہ فقہ اور تصوف کی ایک درسے سے علیحدگی نے ایک طرف عبادات کو خشک و بے روح اور دوسرا طرف اعمال تصوف کو آزاد اور بے قید کر دیا ہے۔ ہر اچھے کام کے کرنے اور برائی سے بچنے کے لیے یہ ضروری ہے کہ ضمیر کا احساس ہیدار اور دل میں خیر و شر کی تمیز کے لیے خلش ہو، یہ تقویٰ ہے اور پھر کام کو خداۓ واحد کی رضا مندی کے سوا ہر غرض و غایت سے پاک رکھا جائے، یہ اخلاص ہے، پھر اس کام کے کرنے میں صرف خدا کی نصرت پر بھروسہ رہے، یہ توکل ہے، اس کام میں رکاوٹیں اور دقتیں پیش آئیں، یا نتیجہ مناسب حال برآمدہ ہو تو دل کو مضبوط رکھا جائے اور خدا سے آس ندوڑی جائے اور اس راہ میں اپنے براچاہنے والوں کا بھی برانہ چاہا جائے، یہ صبر ہے اور اگر کامیابی کی نعمت ملے، تو اس پر مغرور ہونے کے بجائے اس کو خدا کا فضل و کرم سمجھا جائے اور جسم و جان و زبان سے اس کا اقرار اکیا جائے اور اس قسم کے کاموں کے کرنے میں اور زیادہ انہما ک صرف کیا جائے یہ شکر ہے۔
ذیل کی سطروں میں اسی اجمالی کی تفصیل آتی ہے۔

تقویٰ

تقویٰ سارے اسلامی احکام کی غایت ہے

اگر محمد رسول اللہ ﷺ کی تمام تعلیمات کا خلاصہ ہم صرف ایک لفظ میں کرنا چاہیں تو ہم اس کو تقویٰ سے ادا کر سکتے ہیں، اسلام کی ہر تعلیم کا مقصد اپنے ہر عمل کے قابل میں اسی تقویٰ کی روح کو پیدا کرنا ہے، قرآن پاک نے اپنی دوسری ہی سورہ میں یہ اعلان کیا ہے کہ اس کی تعلیم سے وہی فائدہ اٹھا سکتے ہیں، جو تقویٰ والے ہیں:

﴿هُدًى لِّلْمُتَكَبِّرِينَ﴾ (۲: ۲۰) (البقرة)

”یہ کتب تقویٰ والوں کو راہ دکھاتی ہے۔“

اسلام کی ساری عبادتوں کا منشاء اسی تقویٰ کا حصول ہے:

﴿يَا أَيُّهَا النَّاسُ اعْبُدُوا رَبَّكُمُ الَّذِي خَلَقَكُمْ وَالَّذِينَ مِنْ قَبْلِكُمْ لَعَلَّكُمْ تَتَّقَوْنَ﴾

(۲: ۲۱) (البقرة)

”اے لوگو! اپنے اس پروردگار کی جس نے تم کو اور تمہارے پہلوں کو پیدا کیا، عبادت کرو، تاکہ

تم تقویٰ پاو۔“

روزہ سے بھی یہی مقصد ہے:

﴿كُلُّ بَنَاءٍ عَلَيْهِمُ الصِّيَامُ كُلُّ أَثْبَتٍ عَلَى الَّذِينَ مِنْ قَبْلِكُمْ لَعَلَّكُمْ تَتَّقَوْنَ﴾

(۲: ۱۸۳) (البقرة)

”تم پر روزہ اسی طرح فرض کیا گیا، جس طرح تم سے پہلے لوگوں پر فرض کیا گیا تھا، تاکہ تم تقویٰ حاصل کرو۔“

جج کا منشاء بھی یہی ہے:

﴿وَمَنْ يَعْصِمُ شَعَابِرَ اللَّهِ فَإِلَهًا مِنْ تَقْوَى الْقُلُوبِ﴾ (۲۲: ۳۲) (الحج)

”اور جو اللہ کے شعابر (جج کے ارکان و مقامات) کی عزت کرتا ہے، تو وہ دلوں کے تقویٰ سے ہے۔“

قربانی بھی اسی غرض سے ہے:

﴿كُنْ يَئَالَ اللَّهَ تُؤْمِنُهَا وَلَا دِمَاؤُهَا وَلِكُنْ يَئَالَهُ التَّقْوَى مِنْكُمْ﴾ (۲۲: ۳۷) (الحج)

”خدا کے پاس قربانی کا گوشت اور خون نہیں پہنچتا، لیکن تمہارا تقویٰ اس کو پہنچتا ہے۔“

ایک مسلمان کی پیشانی جس جگہ خدا کے لیے جھکتی ہے، اس کی بنیاد بھی تقویٰ پر ہوئی چاہیے۔

﴿أَفَمَنْ أَسْسَ بُنْيَانَهُ عَلَى تَقْوٰيٍ مِّنَ اللّٰهِ﴾ (٩/ التوبۃ: ۱۰۹)

”جس نے اس کی عمارت خدا سے تقوی پر کھڑی کی۔“

﴿لَمْ يَجِدْ أَسْسَ عَلَى التَّقْوٰ﴾ (٩/ التوبۃ: ۱۰۸)

”البتہ وہ مسجد جس کی بنیاد تقوی پر قائم کی گئی۔“

حج کے سفر اور زندگی کے مرحلہ میں راست کا تو شہ مال دو لوت اور ساز و سامان سے زیادہ تقوی ہے:

﴿وَلَزَّدُوا فِيَّا خَيْرَ الرِّزَادِ التَّقْوٰ﴾ (٢/ البقرۃ: ۱۹۷)

”اور سفر میں زیر راہ لے کر چلو اور سب سے اچھا زادہ تقوی ہے۔“

ہمارے زیب وزیست کا سامان ظاہری لباس سے بڑھ کر تقوی کا لباس ہے:

﴿وَلَيَأْسُ التَّقْوٰ ذَلِكَ خَيْرٌ﴾ (٧/ الاعراف: ۲۶)

”اور تقوی کا لباس، وہ سب سے اچھا ہے۔“

اسلام کا تمام اخلاقی نظام بھی اسی تقوی کی بنیاد پر قائم ہے:

﴿وَأَنْ تَعْفُوا أَقْرَبُ لِلتَّقْوٰ﴾ (٢/ البقرۃ: ۲۳۷)

”اور معاف کر دینا تقوی سے قریب تر ہے۔“

﴿إِذْدُلُوا هُوَ أَقْرَبُ لِلتَّقْوٰ﴾ (٥/ المائدۃ: ٨)

”انصار کرنا تقوی سے قریب تر ہے۔“

﴿وَلَنْ تُصِيرُوا وَتَنْقُوا فِيَّا ذَلِكَ مِنْ عَزِيمِ الْأُمُورِ﴾ (٣/آل عمران: ١٨٦)

”اور اگر صبر کرو اور تقوی کرو تو یہ بڑی ہمت کی بات ہے۔“

﴿وَتَنْقُوا وَصُصِّلُوا بَيْنَ النَّاسِ﴾ (٢/ البقرۃ: ٢٢٤)

”اور تقوی کرو اور لوگوں کے درمیان صلح کرو۔“

﴿وَلَنْ تُحِسِّنُوا وَتَنْقُوا فِيَّا اللّٰهُ كَانَ يٰمَا تَعْمَلُونَ خَيْرًا﴾ (٤/ النساء: ١٢٨)

”اور اگر اچھے کام کرو اور تقوی کرو، تو انہم تمہارے کاموں سے خبردار ہے۔“

اہل تقوی تمام اخروی نعمتوں کے مستحق ہیں

آخرت کی ہر قسم کی نعمتوں ایکس انہیں تقوی والوں کا حصہ ہے:

﴿إِنَّ الْمُتَّقِينَ فِي مَقَامِ أَمِينٍ﴾ (٤٤/ الدخان: ٥١)

”بے شرہ تقوی والے امن و امان کی جگہ میں ہوں گے۔“

﴿إِنَّ الْمُتَّقِينَ فِي جَنَّتٍ وَّعِيْمٍ﴾ (٥٢/ الطور: ١٧)

”بے شک تقویٰ والے باغوں میں اور نعمت میں ہوں گے۔“

﴿إِنَّ الْمُتَّقِينَ فِي جَنَّتٍ وَّعِيُونَ﴾ (۵۱/ الذاریات: ۱۵)

”شک نہیں کہ تقویٰ والے باغوں میں اور چشموں میں ہوں گے۔“

﴿إِنَّ الْمُتَّقِينَ فِي جَنَّتٍ وَّنَهَرٍ﴾ (۵۴/ القمر: ۵۴)

” بلاشبہ تقویٰ والے باغوں میں اور نہروں میں ہوں گے۔“

﴿إِنَّ الْمُتَّقِينَ فِي ظَلَالٍ وَّعِيُونَ﴾ (۷۷/ المرسلات: ۱)

” بلاشک تقویٰ والے سایوں میں اور چشموں میں ہوں گے۔“

﴿إِنَّ الْمُتَّقِينَ عِنْدَ رَبِّهِمْ جَنَّتُ التَّعْبُوْنَ﴾ (۲۴/ القلم: ۲۴)

” یقیناً تقویٰ والوں کے لیے ان کے پروردگار کے پاس نعمت کے باغ ہیں۔“

﴿إِنَّ الْمُتَّقِينَ مَفَازٌ إِلَّا﴾ (۷۸/ البان: ۳۱)

” بے شک تقویٰ والوں کے لیے کامیابی ہے۔“

﴿وَإِنَّ الْمُتَّقِينَ لَحُسْنَ مَأْبَدٍ﴾ (۴۹/ ص: ۴۹)

” لاریب تقویٰ والوں کے لیے بازگشت کی اچھائی ہے۔“

کامیابی اہل تقویٰ کے لیے ہے

گو ظاہر ابتدا میں اہل تقویٰ کو کسی قدر مصیبتیں اور بلا کمیں پیش آئیں، یا بہت سی حرام اور مشتبہ یکن
ظاہر بہت سی عمدہ چیزوں سے محروم ہونا پڑے، ظاہری کامیابی کی بہت سی ناجائز کوششوں اور ناروا راستوں
سے پرہیز کرنا پڑے اور اس سے یہ سمجھا جائے کہ ان کو مال و دولت، عزت و شہرت اور جاہ و منصب سے محروم
ہی، لیکن دنیا کے تنگ نظر صرف فوری اور عاجل کامیابی ہی کو کامیابی سمجھتے اور یہ خیال کرتے ہیں کہ اسی دنیا
کے ظاہری ثروتوں کی بنا پر کام کے اچھے برے نتیجوں کا فیصلہ کر لینا چاہیے، حالانکہ جو جتنا دور ہیں ہے، اسی قدر
وہ اپنے کام کے فوری نہیں بلکہ آخری نتیجہ پر نگاہ رکھتا ہے، حقیقی دور ہیں اور عاقبت اندیشہ وہ ہیں، جو کام کی
اچھائی برائی کا فیصلہ دنیا کے ظاہری چند روزہ اور فوری فائدہ کے لحاظ سے نہیں، بلکہ آخرت کے دامنی اور دریپا
فائده کی بنا پر کرتے ہیں اور جب ان کی نظر آخرت کے ثروتوں پر رہتی ہے، تو دنیا بھی ان کی بن جاتی ہے اور
یہاں اور وہاں دونوں جگہ کامیابی اور فوز و فلاح انہیں کی قسمت میں ہوتی ہے، فرمایا:

﴿وَالْعَاقِبةُ لِلْمُتَّقِينَ﴾ (۷/ الاعراف: ۱۲۸)

” اور آخری انجام تقویٰ والوں کے لیے ہے۔“

﴿إِنَّ الْعَاقِبةَ لِلْمُتَّقِينَ﴾ (۱۱/ هود: ۴۹)

”بے شبہ انجام کا رتوی والوں کے لیے ہے۔“

﴿وَالْأُخْرَةُ عِنْدَ رَبِّكَ لِلْمُتَّقِينَ ۚ﴾ (٤٣: الزخرف)

”اور آخرت تیرے پر درگار کے نزدیک رتوی والوں کے لیے ہے۔“

﴿وَالْعَاقِبَةُ لِلْتَّقِيُّ ۚ﴾ (٢٠: ظہیر)

”اور انجام کا رتوی والوں کے لیے ہے۔“

اہل رتوی اللہ کے محبوب ہیں

یہی متقی اللہ تعالیٰ کی محبت اور دوستی کے سزاوار ہیں، جب وہ ہر کام میں خدا کی مرضی اور پسندیدگی پر نظر رکھتے ہیں اور اپنے کسی کام کا بدل کسی انسان سے تعریف، یا انعام یا ہر لمحہ زیریزی کی صورت میں نہیں چاہتے، تو اللہ تعالیٰ ان کو اپنی طرف سے اپنے انعام اور محبت کا صلحہ عطا فرماتا ہے اور اس کا اثر یہ ہوتا ہے کہ ہندوؤں میں بھی ان کے ساتھ عقیدت، محبت اور ہر لمحہ زیریزی پیدا ہوتی ہے:

﴿إِنَّ أَوْلَيَادَهُ إِلَّا مُتَّقُونَ﴾ (٨/ الانفال: ٣٤)

”رتوی والے ہی خدا کے دوست ہیں۔“

﴿فَإِنَّ اللَّهَ يُحِبُّ الْمُتَّقِينَ ۝﴾ (٣/ آل عمران: ٧٦)

”تو اللہ بے شک رتوی والوں کو پیار کرتا ہے۔“

﴿إِنَّ اللَّهَ يُحِبُّ الْمُتَّقِينَ ۝﴾ (٩/ التوبہ: ٧)

”اللہ بلاشبہ رتوی والوں کو پیار کرتا ہے۔“

﴿وَاللَّهُ وَلِيُّ الْمُتَّقِينَ ۝﴾ (٤٥/ الحجۃ: ١٩)

”اور اللہ رتوی والوں کا دوست ہے۔“

معیتِ الہی سے سرفراز ہیں

یہ لوگ اللہ تعالیٰ کی معیت کے شرف سے ممتاز اور اس کی نصرت و مدد سے سرفراز ہوتے ہیں اور جس کے ساتھ اللہ ہواں کو کون شکست دے سکتا ہے:

﴿وَاعْلَمُوا أَنَّ اللَّهَ مَعَ الْمُتَّقِينَ ۝﴾ (١٩٤: البقرۃ: ٢)

”اور جان لو کہ بے شبہ اللہ رتوی والوں کے ساتھ ہے۔“

قبولیت اہل رتوی ہی کو حاصل ہے

ایک کام ہزاروں اغراض اور سیکڑوں مقاصد کو سامنے رکھ کر کیا جا سکتا ہے، مگر ان میں اللہ تعالیٰ صرف انہیں کے کاموں کی پیشکش کو قبول فرماتا ہے، جو رتوی کے ساتھ اپنا کام انجام دیتے ہیں، فرمایا:

﴿إِنَّمَا يَتَقْبَلُ اللَّهُ مِنَ الْمُتَّقِينَ﴾ (٥ / المائدة: ٢٧)

”اللَّهُ تَوَلَّ تَقْوَىٰ وَالْوَلِيٰ سَيِّدُ قَوْلِ فَرِماتاً هے۔“

اسی لیے انہیں کے کاموں کو دنیا میں بھی بقا، قیام اور ہر دعیری نصیب ہوتی ہے اور آخرت میں بھی۔

تقویٰ والے کون ہیں

یہ جان لینے کے بعد کہ تقویٰ ہی اسلام کی تعلیم کی اصلی غایت اور وہی ساری اسلامی تعلیمات کی روح ہے اور دین و دنیا کی تمام نعمتیں اہل تقویٰ ہی کے لیے ہیں، یہ جانتا ہے کہ تقویٰ والے کون ہیں، قرآن پاک نے اس سوال کا بھی جواب دے دیا ہے، چنانچہ اس کا مختصر جواب تودہ ہے جو سورہ زمر میں ہے:

﴿وَالَّذِي جَاءَ بِالْصَّدْقَ وَصَدَقَ بِهِ أَوْلَئِكَ هُنَّ الْمُتَّقُونَ لَهُمْ مَا يَسْأَلُونَ عِنْدَ رَبِّهِمْ

﴿ذُلِّكَ جَزَاءُ الْمُحْسِنِينَ﴾ (٣٩ / الزمر)

”اور جو سچائی لے کر آیا اور اس کو سچ مانا، وہی لوگ ہیں تقویٰ والے، ان کے لیے ان کے رب کے پاس وہ ہے، جو وہ چاہیں، یہ ہے بدلمبکی والوں کا۔“

یعنی تقویٰ والا وہ ہے جو اپنی زندگی کے ہر شعبہ اور کام کے ہر پہلو میں سچائی لے کر آئے اور اس ابدی سچائی کو سچ مانے، وہ کسی کام میں ظاہری فائدہ، فوری ثمرہ، مال و دولت اور جادہ و عزت کے نقط پر نہیں، بلکہ سچائی کے پہلو پر نظر رکھتا ہے اور خواہ کسی قدر بظاہر اس کا نقصان ہو مگر وہ سچائی اور راست بازی کے جادہ سے بال بھرنا نہیں چاہتا لیکن اہل تقویٰ نہ یہ راحیلہ سورہ القرہ میں ہے:

﴿وَلِكُنَ الْبَرَّ مَنْ أَمَنَ بِاللَّهِ وَالْبَيْوَهُ الْآخِرِ وَالْمَلِكَةِ وَالْيَكْبَيِ وَالثَّجَبَيِ وَأَنِ الْمَالَ عَلَىٰ حُصُبِهِ ذُو الْقُرْبَىٰ وَالْيَمِيٰ وَالسَّكِينَيٰ وَابْنَ الشَّبَيْبِيٰ وَالسَّلَّابِيْنَ وَفِي الْتِقَالِيٰ وَأَقَامَ الصَّلَوةَ وَأَنِ الرِّزْكُوَهُ وَالْمُؤْفُونَ بِعَهْدِهِمْ إِذَا عَاهَدُوْهُ وَالصَّابِرِيَنَ فِي الْبَأْسَاءِ وَالضَّرَاءِ وَجِئِنَ الْأَيْسَ أَوْلَئِكَ الَّذِيْنَ صَدَقُوا وَأَوْلَئِكَ هُنَّ الْمُتَّقُونَ﴾ (٢ / البقرۃ: ١٧٧)

”لیکن نیکی یہ ہے کہ جو خدا پر اور بچھلے دن پر اور فرشتوں پر اور کتاب پر اور پیغمبروں پر، ایمان لایا اور اپنا مال اس کی محبت پر رشتہ داروں، تیمور، مکینوں، مسافروں اور مانگنے والوں اور گردنوں کے آزاد کرنے میں دیا اور نماز کو برپا کیا اور زکوٰۃ ادا کی اور جو وعدہ کر کے اپنے وعدہ کو ایفا کرنے والے ہیں اور سختی، تکلیف اور رڑائی میں صبر کرنے والے ہیں، یہی وہ ہیں، جو سچے ٹھہرے اور بھی تقویٰ والے ہیں۔“

ان آئیوں میں تقویٰ والوں کا نہ صرف عام حلیہ، بلکہ ایک ایک خط و خال نمایاں کر دیا گیا اور بتا دیا گیا ہے کہ یہی خدا کی نگاہ میں سچے ٹھہرے نے والے اور تقویٰ والے ہیں۔

تقویٰ کی حقیقت کیا ہے

تقویٰ اصل میں وقویٰ ہے، عربی زبان میں اس کے لغوی معنی بچنے، پرہیز کرنے اور لحاظ کرنے کے ہیں، لیکن وحی محمدی ﷺ کی اصطلاح میں یہ دل کی اس کیفیت کا نام ہے، جو اللہ تعالیٰ کے ہمیشہ حاضر و ناظر ہونے کا یقین پیدا کر کے دل میں خیر و شر کی تیزی کی خلش اور خیر کی طرف رغبت اور شر سے نفرت پیدا کر دیتی ہے، دوسرے لفظوں میں ہم یوں کہہ سکتے ہیں کہ وہ ضمیر کے اس احساس کا نام ہے، جس کی بنا پر ہر کام میں خدا کے حکم کے مطابق عمل کرنے کی شدید رغبت اور اس کی مخالفت سے شدید نفرت پیدا ہوتی ہے، یہ بات کہ تقویٰ اصل میں دل کی اس کیفیت کا نام ہے، قرآن پاک کی اس آیت سے ظاہر ہے جو اکابر حج کے بیان کے موقع پر ہے:

﴿وَمَنْ يَعْظِمْ شَعَابَرَ اللَّهِ فَإِنَّهَا مِنْ تَقْوَى الْقُلُوبِ﴾ (۲۲ / الحج: ۳۲)

”اور جو شعابِ اللہ کی تعظیم کرتا ہے، تو وہ دلوں کے تقویٰ سے ہے۔“

اس آیت سے واضح ہوتا ہے کہ تقویٰ کا اصلی تعلق دل سے ہے اور وہ سلبی کیفیت (بچنا) کے بجائے ایجادی اور شجوتی کیفیت اپنے اندر رکھتا ہے، وہ امور خیر کی طرف دلوں میں تحریک پیدا اور شعابِ اللہ کی تعظیم سے ان کو معمور کرتا ہے، ایک اور آیت کریمہ میں ارشاد ہے:

﴿إِنَّ الَّذِينَ يَغْضُبُونَ أَصْوَاتُهُمْ عِنْدَ رَسُولِ اللَّهِ أُولَئِكَ الَّذِينَ إِذَا تَحَنَّنَ اللَّهُ قُلُوبُهُمْ

لِلتَّقْوَىٰ لَهُمْ مَغْفِرَةٌ وَّأَجْرٌ عَظِيمٌ﴾ (۴۹ / الحجرات: ۳)

”بے شک جو لوگ رسول اللہ کے سامنے دلی آواز سے بولتے ہیں، وہی ہیں، جن کے دلوں کو اللہ نے تقویٰ کے واسطے جانچا ہے، ان کو معافی ہے اور برآبدلہ۔“

اس آیت میں بھی تقویٰ کا مرکز دل ہی کو قرار دیا ہے اور بتایا ہے کہ رسول کی تعظیم کا احساس تقویٰ سے پیدا ہوتا ہے، ایک اور تیسرا آیت میں تقویٰ کے فطری الہام ہونے کی طرف اشارہ ہے:

﴿فَالْلَّهُمَّ إِنَّا نُجُورُهَا وَنَتَقْوِيَهَا﴾ (۹۱ / الشمس: ۹)

”توہنس میں اس کا نبور اور اس کا تقویٰ الہام کر دیا۔“

نور تو ظاہر ہے کہ گناہ گاری اور نافرمانی کی جڑ ہے، ٹھیک اسی طرح تقویٰ تمام نیکیوں کی بنیاد اور اصل الاصول ہے اور دونوں بندہ کو فطرت اور دیعت ہیں، اب بندہ اپنے عمل اور کوشش سے ایک کوچھ وڑتا اور دوسرے کو اختیار کرتا ہے، مگر بہر حال یہ دونوں الہام ربانی ہیں اور سب کو معلوم ہے کہ الہام کا ربانی مرکز دل ہے، اس لیے یہی تقویٰ کا مقام ہے۔

تقویٰ کا لفظ جس طرح اس دلی کیفیت پر بولا جاتا ہے، اس کیفیت کے اثر اور نتیجہ پر بھی اطلاع پاتا

بے، صحابہؓ نے کفار کے اشتعال دلانے اور ان سے بدلہ لینے پر پوری قوت رکھنے کے باوجود حدیبیہ کی صلح کو تسلیم کر لیا، تو اللہ تعالیٰ نے ان کی اس نتیجہ روش کو تقوی فرمایا:

﴿إِذْ جَعَلَ الَّذِينَ كَفَرُوا فِي قُلُوبِهِمُ الْجَمِيْعَةَ حَمِيْدَةَ الْجَاهِلِيَّةِ فَأَنْزَلَ اللَّهُ سَيِّدَنَّتَهُ عَلَى رَسُولِهِ وَعَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ وَالْأَزْمَهُمْ كَلِمَةَ التَّقْوَى وَكَانُوا أَحَقُّ بِهَا وَأَهْلَهَا ط﴾

(الفتح: ۴۸)

”اور جب کفار نے اپنے دلوں میں تیج رکھی، نادانی کی تیج، تو اللہ نے اپنا چین اپنے رسول پر اور مسلمانوں پر اتارا اور ان کو تقوی کی بات پر لگا رکھا اور وہی تھے اس کے لائق اور اس کے اہل۔“

یہاں جنگ و خوزیری سے احتراز، خانہ کعبہ کے ادب اور کفار قریش کی جاہلیہ عصیت سے چشم پوشی کو تقوی سے تعمیر کیا گیا ہے، ایک اور دوسری آیت میں دشمنوں کے ساتھ ایسا یعنی عہد اور حق الامکان جنگ سے پرہیز کرنے والوں کو تقوی یعنی تقوی دالے فرمایا ہے اور ان کے ساتھ اپنی محبت ظاہر فرمائی ہے:

﴿فَأَنْتُو إِلَيْهِمْ عَهْدُهُمُ الْمُدْتَبِّهُمْ إِنَّ اللَّهَ يُحِبُّ الْمُتَّقِيْنَ﴾ (التوبہ: ۹)

”تو تم ان کے عہد کو ان کی مقررہ مدت تک پورا کرو، خدا تقوی والوں کو پیار کرتا ہے۔“

﴿فَمَا أَسْتَقْأَمُوا لَكُمْ فَاسْتَقِيْمُوا لَهُمْ إِنَّ اللَّهَ يُحِبُّ الْمُتَّقِيْنَ﴾ (التوبہ: ۹)

”تو وہ جب تک تم سے سید ہے رہیں، تم بھی ان کے ساتھ سید ہے رہو، خدا تقوی والوں کو پیار کرتا ہے۔“

جس طرح انسان کا بغور، بری تعلیم، بری محبت اور برے کاموں کی مشق اور کثرت سے بڑھتا جاتا ہے، اس طرح ابھی کاموں کے شوق اور عمل سے نیکی کا ذوق بھی پرورش پاتا ہے اور اس کی قلبی کیفیت میں ترقی ہوتی ہے:

﴿وَالَّذِينَ اهْتَدَوا زَادُهُمْ هُدًى وَالَّذِهُمْ لَنْ تَقُوْهُمْ﴾ (محمد: ۱۷)

”جو لوگ راہ پر آئے، خدا نے ان کی سوچھا اور بڑھائی اور ان کو ان کا تقوی عنایت کیا۔“

اس سے عیاں ہے کہ ”تقوی“ ایک ایجادی اور ثبوتوں کیفیت ہے، جو انسان کو خدا عنایت فرماتا ہے اور جس کا اثر یہ ہوتا ہے کہ اس کوہداشت پر ہدایت اور فطری تقوی پر، مزید دلیلت تقوی مرحمت ہوتی ہے۔

تقوی کی یہ حقیقت کہ وہ دل کی خاص کیفیت کا نام ہے، ایک صحیح حدیث سے تصریحاً معلوم ہوتی ہے،

صحابہؓ کے مجمع میں ارشاد فرمایا:

((التقوی ہلھنا))

 صحیح مسلم، کتاب البر والصلة، باب تحريم ظلم المسلم و خذله..... ۶۵۱

”تقویٰ یہاں ہے۔“

اور یہ کہہ کر دل کی طرف اشارہ فرمایا، جس سے بے شک و شبہ یہ واضح ہو جاتا ہے کہ تقویٰ دل کی پاکیزہ ترین اور اعلیٰ ترین کیفیت کا نام ہے، جو تمام نبیوں کی محرك ہے اور وہی مذہب کی جان اور دینداری کی روح ہے، یہی سبب ہے کہ وہ قرآن پاک کی راہنمائی کی غایت، ساری رہنمائی عبادتوں کا مقصد اور تمام اخلاقی تعلیمیوں کا حصل قرار پایا۔

اسلام میں برتری کا معیار

اسلام میں تقویٰ کو جو اہمیت حاصل ہے، اس کا اثر یہ ہے کہ تعلیمِ محمد ﷺ نے نسل، رنگ، وطن، خاندان، دولت، حسب نسب، غرض نوع انسانی کے ان صد بآخذ ساختہ اعزازی مرتبوں کو منا کر صرف ایک ہی امتیازی معيار قائم کر دیا، جس کا نام تقویٰ ہے اور جو ساری نبیوں کی جان ہے اور اس لیے وہی معياری امتیاز بننے کے لائق ہے، چنانچہ قرآن پاک نے بدآواز بلند یہ اعلان کیا:

﴿وَجَعَلْنَاكُمْ شُعُوبًا وَّقَبَائلَ إِنَّعَارِفُوا إِنَّ أَكْرَمَكُمْ عِنْدَ اللَّهِ أَنْفَكُمْ﴾

(۱۳) الحجرات

”هم نے تم کو مختلف خاندان اور قبیلے صرف اس لیے بنا�ا کہ باہم شناخت ہو سکے، تم میں سے خدا کے نزدیک سب سے محترم زادہ ہے، جو تم میں سب سے زیادہ تقویٰ والا ہے۔“
اس اعلان کو آنحضرت ﷺ نے ان دو محقق لفظوں میں ادا فرمایا، الکرم ، التقویٰ ① یعنی بزرگی و شرافت تقویٰ کا نام ہے اور اسی کے لیے جنتہ الوداع کے اعلان عام میں پکار کر فرمایا کہ ”عرب کو عجم پر اور کالے کو گورے پر کوئی برتری نہیں، برتوہ ہے، جس میں سب سے زیادہ تقویٰ ہے۔“ ②

① ترمذی، کتاب التفسیر، باب ومن من سورۃ الحجرات: ۳۲۷۱؛ مسند احمد، ج ۵، ص: ۱۰؛ مستدرک حاکم، کتاب الرفاق، ج ۴، ص: ۳۲۵۔ ② مسند احمد، ج ۵، ص: ۱۱۔

اخلاص

﴿خُلِّصَ اللَّهُ الدِّينُ﴾ (۳۹ / الزمر)

نہب کا سب سے بڑا امتیاز یہ ہے کہ وہ انسان کے دل کو مخاطب کرتا ہے، اس کا سارا کاروبار صرف اسی ایک مضغہ گوشت سے وابستہ ہے، عقائد ہوں یا عبادات، اخلاق ہوں یا معاملات، انسانی اعمال کے ہر گوشہ میں اس کی نظر اسی ایک آئینہ پر رہتی ہے، اسی حقیقت کو آنحضرت ﷺ نے ایک مشہور حدیث میں یوں ظاہر فرمایا ہے:

((اَلَا وَإِنَّ فِي الْجَسَدِ مَضْعَةً إِذَا صَلَحَتْ صَلْحَةُ الْجَسَدِ كَلَهُ وَإِذَا فَسَدَ فَسَدَ
الْجَسَدُ كَلَهُ اَلَا وَهِيَ الْقُلُوبُ))

”ہشیار ہو کہ بدن میں گوشت کا ایک لکڑا ہے، جب وہ درست ہو تو سارا بدن درست ہوتا ہے
اور وہ خراب ہو تو سارا بدن خراب ہوتا ہے، ہشیار ہو کہ وہ دل ہے۔“

دل ہی کی تحریک انسان کے ہر ایجھے اور برے فعل کی بنیاد اور اساس ہے، اس لیے نہب کی ہر عمارت اسی بنیاد پر کھڑی ہوتی ہے، اسلام کی تعلیم یہ ہے کہ جو نیک کام بھی کیا جائے، اس کی محک کوئی دنیاوی غرض نہ ہو اور نہ اس سے مقصود ریا و نمائش، جلب منفعت، طلب شہرت یا طلب محاواضہ وغیرہ ہو، بلکہ صرف اللہ تعالیٰ کے حکم کی بجا آؤ اور خوشنودی ہو، اسی کا نام اخلاص ہے، رسول کو حکم ہوتا ہے:

﴿فَاعْبُدُ اللَّهَ خُلِّصَ اللَّهُ الدِّينُ أَلَا إِلَهُ اللَّهُ الدِّينُ الْخَالِصُ﴾ (۳۹ / الزمر)

”تو اللہ کی عبادت کر خالص کرتے ہوئے اطاعت گزاری کو اسی کے لیے، ہشیار ہو کہ اللہ ہی کے لیے ہے، خالص اطاعت گزاری۔“

مقصود یہ ہے کہ خدا کی اطاعت گزاری میں خدا کے سوا کسی اور چیز کو اس کا شرک نہ بنا لیا جائے، وہ چیز خواہ پتھر، یا منی کی مورت، یا آسمان و زمین کی کوئی مخلوق، یا دل کا تراشا ہو کوئی باطل مقصود ہو، اسی لیے قرآن پاک نے انسانی اعمال کی نفسانی غرض و غایت کو بھی بت پرستی قرار دیا ہے، فرمایا:

﴿أَرَعِيهِ مَنِ اتَّخَذَ إِلَهَهَ هَوَاهُ﴾ (۴۲ / الفرقان)

”کیا تو نے اس کو دیکھا جس نے اپنی نفسانی خواہش کو پانچھا بنا لیا ہے۔“

چنانچہ اسلام کی یہ اہم ترین تعلیم ہے کہ انسان کا کام ہر قسم کی ظاہری و باطنی بت پرستی سے پاک ہو، رسول کو اس اعلان کا حکم ہوتا ہے:

﴿فُلِّ إِنِّي أَمْرُتُ أَنْ أَعْبُدَ اللَّهَ خُلِّصَ اللَّهُ الدِّينُ وَأَمْرُتُ لِأَنْ أَكُونَ أَوَّلَ الْمُسْلِمِينَ﴾

* صحیح بخاری، کتاب الایمان، باب من فضل استبراء الدينہ: ۵۲؛ صحیح مسلم، کتاب المساقاة، باب اخذ الحلال و ترك الشبهات: ۴۹۴۔

فُلْ إِنِّي أَخَافُ إِنْ عَصَيْتُ رَبِّي عَذَابَ يَوْمٍ عَظِيمٍ ۝ قُلْ اللَّهُ أَعْبُدُ مُخْلِصًا لَّهُ دِينِي ۝
قَاعِدُ وَأَمَا يَشْتَمِ مِنْ دُوَيْهِ ۝ (١٥-١١ الزمر)

”کہہ دے کہ مجھے حکم دیا گیا ہے کہ میں اطاعت گزاری کو اللہ کے لیے خالص کر کے اس کی عبادت کروں اور مجھے حکم دیا گیا ہے کہ میں پہلا فرمانبردار بنوں، کہہ دے کہ میں ڈرتا ہوں اگر اپنے پروردگار کی نافرمانی کروں، بڑے دن کے عذاب سے، کہہ دے کہ اللہ ہی کی عبادت کرتا ہوں، اپنی اطاعت گزاری کو اس کے لیے خالص کر کے تو تم (اے کفار) خدا کو چھوڑ کر جس کی عبادت چاہے کرو۔“

قرآن پاک کے سات موقعوں پر یہ آیت ہے:
﴿مُخْلِصًا لَّهُ الدِّينُنَ ۝﴾

”اطاعت گزاری کو خدا کے لیے خالص کر کے۔“

اس سے معلوم ہوا کہ ہر عبادت اور عمل کا پہلا رکن یہ ہے کہ وہ خالص خدا کے لیے ہو، یعنی اس میں کسی ظاہری و باطنی بت پرستی اور خواہش نفسانی کو خل منہ ہو اور ﴿إِلَّا إِتْبَاعَهُ وَجْهُرَتِهِ الْأَعْلَى ۝﴾ (٩٢/الليل: ٢٠) یعنی خدا نے برتر کی ذات کی خوشنودی کے سوا کوئی اور غرض نہ ہو۔

انبیاء ﷺ نے اپنی دعوت اور تبلیغ کے سلسلہ میں ہمیشہ یہ اعلان کیا ہے ہم جو کچھ کر رہے ہیں، اس سے ہم کو کوئی دنیاوی غرض اور ذلتی معاوضہ مطلوب نہیں:

﴿وَمَا أَسْلَكْمُ عَلَيْهِ مِنْ أَجْرٍ إِنْ أَجْرِيَ إِلَّا عَلَىٰ رَبِّ الْعَالَمِينَ ۝﴾

(٢٦/الشعراء: ١٤٥، ١٦٤، ١٨٠، ١٠٩)

”اور میں اس پر کوئی مزدوری تم سے نہیں چاہتا، میری مزدوری تو اسی پر ہے، جو ساری دنیا کا پروردگار ہے۔“

حضرت نوح عليه السلام کی زبان سے بھی یہی فرمایا گیا:

﴿وَيَقُولُ لَا أَسْلَكُمْ عَلَيْهِ مَالًا إِنْ أَجْرِيَ إِلَّا عَلَى اللَّهِ ۝﴾ (١١/ہود: ٢٩)

”اے میری قوم! میں تم سے اس پر دولت کا خواہاں نہیں، میری مزدوری تو خدا ہی پر ہے۔“ خود ہمارے رسول ﷺ کو یہ کہہ دینے کا فرمان ہوا، میں تم سے اپنے لیے کوئی مزدوری و اجرت نہیں چاہتا، اگر چاہتا بھی ہوں تو تمہارے ہی لیے:

﴿فُلْ مَا سَأَلَنَّاهُ مِنْ أَخْرِيٍّ هُوَ لَكُنْ مِنْ أَخْرِيٍّ إِلَّا عَلَى اللَّهِ وَهُوَ عَلَىٰ كُلِّ شَيْءٍ شَهِيدٌ ۝﴾

(٤٧/سبا: ٣٤)

”کہہ دے کہ میں نے تم سے جو اجرت چاہی تو وہ تمہارے ہی لیے، میری اجرت تو اللہ پر ہے، وہ ہر بات پر گواہ ہے۔“

یعنی وہ ہر بات کا عالم اور نیتوں سے واتفاق ہے، وہ جانتا ہے کہ میری ہر کوشش بے غرض اور صرف خدا کے لیے ہے، دوسری جگہ فرمایا:

﴿لَا أَنْسَلْكُمْ عَلَيْهِ أَجْرًا إِلَّا مُؤْكَدَةٌ فِي الْقُرْبَىٰ﴾ (۴۲/ الشوری: ۲۳)

”میں اس پر تم سے کوئی مزدوری نہیں چاہتا، مگر قرابت داروں میں محبت رکھنا۔“

یعنی رسول نے اپنی بے غرض کوششوں سے امت کو جو دینی و دنیاوی فائدے پہنچائے، اس کے لیے وہ تم سے کسی ذاتی منفعت کا خواہاں نہیں، اگر وہ اس کے معاوضہ میں کچھ چاہتا ہے تو یہ ہے کہ قرابت داروں کا حق ادا کرو اور آپس میں محبت رکھو، اسی قسم کی بات ایک اور آیت میں ظاہر کی گئی ہے:

﴿فُلْ مَا أَنْسَلْكُمْ عَلَيْهِ مِنْ أَجْرٍ إِلَّا مَنْ شَاءَ أَنْ يَتَكَبَّدَ إِلَى رَبِّهِ سَيِّلَادُ﴾

(۵۷/ الفرقان)

”کہہ دے کہ میں تمہاری اس راہنمائی پر تم سے کوئی معاوضہ نہیں مانگتا، مگر یہی کہ جو چاہے اپنے پروردگار کی طرف راست پکڑے۔“

یعنی میری اس محنت کی مزدوری یہی ہے کہ تم میں سے کچھ لوگ حق کو قبول کر لیں۔

دنیا میں بھی اخلاص ہی کامیابی کی اصل بنیاد ہے، کوئی بظاہر یتکی کا کتنا ہی بڑا کام کرے، لیکن اگر اس کی نسبت یہ معلوم ہو جائے کہ اس کا مقصد اس کام سے کوئی ذاتی غرض، یا مغضض دکھادا اور نہماش تھا، تو اس کام کی قدر و قیمت فوراً نگاہوں سے گرجائے گی، اسی طرح روحاںی عالم میں بھی خدا کی نگاہ میں اس چیز کی کوئی قد نہیں جو اس کی بارگاہ بے نیاز کے علاوہ کسی اور کے لیے پیش کی گئی ہو، مقصود اس سے یہ ہے کہ یتکی کا ہر کام دنیاوی لحاظ سے بے غرض و بے منت اور بلا خیال مزدو اجرت اور تحسین و شہرت کی طلب سے بالاتر ہو، یہ تحسین و شہرت کا معاوضہ بھی دین تو الگ رہا دنیا بھی انہیں کو عطا کرتی ہے، جن کی نسبت اس کو یقین ہوتا ہے کہ انہوں نے اپنا کام انہیں شرائط کے ساتھ انجام دیا ہے۔

ہم جو کام بھی کرتے ہیں، اس کی دو شکلیں پیدا ہوتی ہیں، ایک مادی جو ہمارے ظاہری جسمانی اعضا کی حرکت و جنبش سے پیدا ہوتی ہے، دوسری روحانی، جس کا ہیولی ہمارے دل کے ارادہ و نیت اور کام کی اندر ورنی غرض و غایت سے تیار ہوتا ہے، کام کی بقا اور برکت دین اور دنیادونوں میں اسی روحانی پیکر کے حسن و فیض اور ضعف و قوت کی بنا پر ہوتی ہے، انسانی اعمال کی پوری تاریخ اس دعوی کے ثبوت میں ہے، اسی لیے اس اخلاص کے بغیر اسلام میں نہ تو عبادت قبول ہوتی ہے اور نہ اخلاق و معاملات عبادت کا درجہ پاتے ہیں، اس لیے

ضرورت ہے کہ ہر کام کے شروع کرتے وقت ہم اپنی نیت کو ہر غیر مخلصانہ غرض و غایت سے بالا اور ہر دنیاوی مزدوجت سے پاک رکھیں، تورات اور قرآن دونوں میں ہاتھ اور قاتل آدم کے دو بیٹوں کا قصہ ہے، دونوں نے خدا کے حضور میں اپنی اپنی پیداوار کی قربانیاں پیش کیں، خدا نے ان میں سے صرف ایک کی قربانی قبول کی اور اسی کی زبان سے اپنا یہ ابدی اصول بھی ظاہر فرمادیا:

﴿إِنَّمَا يَتَّقِبَ إِلَهُ مِنَ الْمُتَّقِينَ﴾ (۵ / المائدۃ: ۲۷)

”خدا تو متقویوں ہی سے قبول کرتا ہے۔“

متقی بھی وہی ہوتے ہیں، جو دل کے اخلاص کے ساتھ رب کی خوشنودی کے لیے کام کرتے ہیں، انہیں کام قبول ہوتا ہے اور ان کو دین و دنیا میں فوز و فلاح بخشنا جاتا ہے، ان کو خدا کے ہاں محبوبیت کا درجہ حاصل ہوتا ہے اور دنیا میں ان کو ہر لعزمی ملتی ہے، ان کے کاموں کو شہرت نصیب ہوتی ہے اور ان کے کارناموں کو زندگی بخشی جاتی ہے، وہ جماعتوں اور قوموں کے محسن ہوتے ہیں، لوگ ان کے ان کاموں سے نسلابعد نسل فیضیاب ہوتے ہیں اور ان کے لیے رحمت کی دعائیں مانگتے ہیں، حضرت موسیٰ علیہ السلام کے عہد میں فرعونیوں کو ایک پیغمبر اور جادوگر کے درمیان کوئی فرق نظر نہیں آتا تھا، کہ ان دونوں سے انہوں نے عجائب و غرائب امور کا یکساں مشاہدہ کیا، خدا نے فرمایا ان دونوں کے عجائب و غرائب میں ظاہری نہیں، باطنی صورت کا فرق ہے، ایک کے کام کی غرض صرف تماشا اور بازی گری ہے اور دوسرے کا نتیجہ ایک پوری قوم کی اخلاقی و روحانی زندگی کا انقلاب ہے، اسی لیے یہ فیصلہ ہے کہ

﴿وَلَا يُقْلِمُ الشَّاجِرُ حَيْثُ أُتِيَ﴾ (۶۹ / طہ: ۲۰)

”اور جادوگر جدھر سے بھی آئے فلاخ نہیں پائے گا۔“

چنانچہ دنیا نے دیکھ لیا کہ مصر کے جادوگروں کے جیرات انگیز کرتب صرف کہانی بن کر رہ گئے اور موسیٰ علیہ السلام کے مجزات نے ایک نئی قوم، ایک نئی شریعت، ایک نئی زندگی، ایک نئی سلطنت پیدا کی، جو مدوں تک دنیا میں قائم رہی۔ غرض عمل کا اصلی پیکر وہی ہے، جو دل کے کارخانہ میں تیار ہوتا ہے، اسی لیے اس بات کی ضرورت ہے کہ ہر کام سے پہلے دل کی نیت کا جائزہ لے لیا جائے، اس مسئلہ کو اچھی طرح سمجھ لینے کے بعد یہ نکتہ خود بخود حل ہو جائے گا کہ اسلام نے ہر عبادت کے صحیح ہونے کے لیے ارادہ اور نیت کو کیوں ضروری قرار دیا ہے۔

توکل

﴿فَتَوَكَّلْ عَلَى اللَّهِ﴾ (۳/آل عمران: ۱۵۹)

توکل قرآن پاک کی اصطلاح کا اہم لفظ ہے، عام لوگ اس کے معنی یہ سمجھتے ہیں کہ کسی کام کے لیے جدو جہد و کوشش نہ کی جائے، بلکہ چپ چاپ ہاتھ پاؤں توڑے کسی جھرہ یا خانقاہ میں بیٹھ رہا جائے اور یہ سمجھا جائے کہ خدا کو جو کچھ کرنا ہے، وہ خود کر دے گا، یعنی تقدیر میں جو کچھ ہے وہ ہو رہے گا، اسباب اور تدبیر کی ضرورت نہیں، لیکن یہ سراسر وہم ہے اور مذہبی اپا جھوں کا دل خوش کن فلسفہ ہے، جس کو اسلام سے ذرہ بھر بھی تعلق نہیں۔ توکل کے لفظی معنی بھروسہ کرنے کے ہیں اور اصطلاح میں خدا پر بھروسہ کرنے کو کہتے ہیں، لیکن کس بات میں بھروسہ کرنا، کسی کام کے کرنے میں یا ان کرنے میں؟ جھوٹے صوفیوں نے توکل عمل، اسباب و تدبیر سے بے پرواہی اور خود کام نہ کر کے دوسروں کے سہارے جینے کا نام توکل رکھا ہے، حالانکہ توکل نام ہے کسی کام کو پورے ارادہ و عزم اور تدبیر و کوشش کے ساتھ انعام دینے اور یہ یقین رکھنے کا کہ اگر اس کا سہیں بھلانی ہے، تو اللہ تعالیٰ اس میں ضرورتی ہم کو کامیاب فرمائے گا۔

اگر تدبیر اور جدو جہد و کوشش کا ترک ہی توکل ہوتا، تو دنیا میں لوگوں کے سمجھانے کے لیے اللہ تعالیٰ پیغمبروں کو میبوث نہ کرتا اور نہ ان کا پتی تبلیغ رسالت کے لیے جدو جہد اور عسی و درگری کی تاکید فرماتا اور نہ اس راہ میں جان و مال کی قربانی کا حکم دیتا، نہ بدر و أحد اور خندق و حجین میں سواروں، تیر اندازوں، زرہ پوشوں اور تبغ آزماؤں کی ضرورت پڑتی اور نہ رسول کو ایک ایک قبیلہ کے پاس جا جا کر حق کی دعوت کا پیغام سنانے کی حاجت ہوتی۔ توکل مسلمانوں کی کامیابی کا اہم راز ہے، حکم ہوتا ہے کہ جب اڑائی یا کوئی اور مشکل کام پڑیں آئے، تو سب سے پہلے اس کے متعلق لوگوں سے مشورہ لے لو، مشورہ کے بعد جب رائے ایک لفظ پر تکہر جائے تو اس کے انعام دینے کا عزم کرلو اور اس عزم کے بعد کام کو پوری مستعدی اور تندی ہی کے ساتھ کرنا شروع کر دو اور خدا پر توکل اور بھروسہ رکھو کہ وہ تمہارے کام کا حساب خواہ تبیح پیدا کرے گا، اگر ایسا تبیح نہ لکے تو اس کو خدا کی حکمت و مصلحت اور مشیت سمجھو اور اس سے مایوس اور بودے نہ ہو اور جب تبیح خاطر خواہ نہ لکے تو یہ غور نہ ہو کہ یہ تمہاری تدبیر اور جدو جہد کا تبیح اور اثر ہے، بلکہ یہ سمجھو کہ خدا تعالیٰ کام پر فضل و کرم ہوا اور اسی نے تم کو کامیاب اور بامراکیا، آل عمران میں ہے:

﴿وَشَاءُوهُمْ فِي الْأَمْرِ فَإِذَا عَزَّمْتَ فَتَوَكَّلْ عَلَى اللَّهِ إِنَّ اللَّهَ يُبْتُ الْمُتَوَكِّلِينَ ۝ إِنْ يَنْدِرُكُمُ اللَّهُ فَلَا يَأْلِمُمْ ۝ وَإِنْ يَعْذِلْكُمْ فَمَنْ ذَا الَّذِي يَنْصُرُكُمْ مِنْ بَعْدِهِ ۝ وَعَلَى اللَّهِ كُلُّ الْمُؤْمِنُونَ ۝﴾ (۳/آل عمران: ۱۵۹ - ۱۶۰)

”اور کام (یا اڑائی) میں ان سے مشورہ لے لو، پھر جب پکا ارادہ کرلو تو اللہ پر بھروسہ رکھو، بے

شک اللہ (اللہ پر) بھروسہ رکھنے والوں کو پیار کرتا ہے، اگر اللہ تمہارا مددگار ہو تو کوئی تم پر غالب نہ آ سکے گا اور اگر وہ تم کو چھوڑ دے تو پھر کون ہے جو اس کے بعد تمہاری مدد کر سکے اور اللہ ہی پر چاہیے کہ ایمان والے بھروسہ رکھیں۔“

ان آیات نے توکل کی پوری اہمیت اور حقیقت ظاہر کر دی، کہ توکل بے دست و پائی اور ترک عمل کا نہیں، بلکہ اس کا نام ہے کہ پورے عزم و ارادہ اور مستعدی سے کام کو انجام دینے کے ساتھ اثر اور نتیجہ کو خدا کے بھروسہ پر چھوڑ دیا جائے اور یہ سمجھنا چاہیے کہ خدا مددگار ہے، تو کوئی ہم کو ناکام نہیں کر سکتا اور اگر وہ ہی نہ چاہے تو کسی کی کوشش و مدد کا آدمی نہیں ہو سکتی، اس لیے ہر مومن کا فرض ہے کہ وہ اپنے کام میں خدا پر بھروسہ رکھے۔ منافق اسلام اور مسلمانوں کے خلاف سازشیں اور اتوں کو جوڑ توڑ کرتے ہیں، حکم ہوتا ہے کہ ان کی ان مخالفانہ چالوں کی پرواہ کرو اور خدا پر بھروسہ رکھو، ہی تمہارے کاموں کو بنائے گا:

﴿فَاعْرُضْ عَنْهُمْ وَتَوَكّلْ عَلَى اللّٰهِ طَوْكَفٰ بِاللّٰهِ وَكَيْلًا﴾ (۴ / النساء: ۸۱)

”تو ان منافقوں سے درگر کرو اور خدا پر بھروسہ رکھو اور اللہ ہے کام بنانے والا۔“

آغاز اسلام کے شروع میں تین برس کی مخفی دعوت کے بعد جب اسلام کی علامیہ دعوت کا حکم ہوتا ہے، تو مخالفوں کی کثرت اور دشمنوں کی قوت سے بے خوف ہونے کی تعلیم دی جاتی ہے اور فرمایا جاتا ہے کہ ان مشکلات کی پرواہ کیے بغیر خدا پر توکل اور بھروسہ کر کے کام شروع کرو:

﴿وَأَنذِرْ عَشِيرَتَكَ الْأَقْرَبَيْنَ ۝ وَاخْفُضْ جَنَاحَكَ لِيَنَ الْبَكَّعَ مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ ۝ فَإِنْ عَصَوْكَ فَقُلْ إِنِّي بَرِيٌّ عَمِيَّا تَعْمَلُوْنَ ۝ وَتَوَكّلْ عَلَى الْعَزِيزِ الرَّحِيمِ ۝ الَّذِي يَرِكَ جِئْنَ تَقْوَمٍ ۝ وَتَقْبِلَكَ فِي الشَّجِيدِيْنَ ۝﴾ (۲۶ / الشُّعْرَاء: ۲۱۹-۲۱۴)

”اور اپنے قربی رشتہ داروں کو هشیار کرو اور مومنوں میں سے جو تیری پیروی کرے اس کے لیے اپنی (شفقت) کا بازو جھکا، پھر اگر وہ تیر کاہنا نہ مانیں تو کہہ دے کہ میں تمہارے کاموں سے الگ ہوں اور اس غالب رحمت والے پر بھروسہ رکھ جو تھوڑدی کہتا ہے، جب تو (رات کو) الھتا ہے اور نمازیوں میں تیری آمد و رفت کو ملاحظہ کر رہا ہے۔“

دشمنوں کے زخم میں ہونے کے باوجود آنحضرت ﷺ تہائی میں راتوں کو اٹھاٹھ کر عبادت گزار مسلمانوں کو دیکھتے پھرتے تھے، یہ جرأت اور بے خوفی اسی توکل کا نتیجہ تھی، مشکلات میں اسی توکل اور اللہ پر اعتقاد کی تعلیم مسلمانوں کو دی گئی ہے، احزاب میں منافقوں اور کافروں کی مخالفانہ کوششوں سے بے پرواہ ہو کر اپنے کام میں لگے رہنے کا جہاں حکم دیا گیا ہے، وہاں اسی توکل کا سبق پڑھایا گیا ہے:

﴿يَا أَيُّهَا الَّذِي أَنْتَ إِلَهٌ وَلَا تُطِيعُ الْكُفَّارُ وَالْمُنْفِقُيْنَ ۝ إِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَلَيْهَا حَلِيْمًا ۝ وَإِنَّهُ مَا

يُوْحَنِي إِلَيْكَ مِنْ رَبِّكَ طَإَنَّ اللَّهَ كَانَ بِمَا تَعْمَلُونَ خَيْرًا وَتَوَكَّلْنَ عَلَى اللَّهِ وَكَفَى بِاللَّهِ وَكِيلًا» (الاحزاب: ۳۲-۳۳)

”اے پیغمبر! خدا سے ڈراور کافروں اور منافقوں کا کہانہ مان، بے شک اللہ جانے والا اور حکمت والا ہے اور جو تیرے پاس تیرے پر درگار کی طرف سے وحی کی جاتی ہے، اس کے پیچھے چل، بے شک خدا تمہارے کاموں سے خبردار ہے اور اللہ پر بھروسہ رکھ اور اللہ کام بنا نے کو کافی ہے۔“
کفار سے مسلسل رُثائیوں کے پیش آنے کے بعد یہ ارشاد ہوتا ہے کہ اگر اب بھی یہ لوگ صالح کی طرف جھکیں تو تم جھک جاؤ اور مصالحت کرلو اور یہ خیال نہ کرو کہ یہ بد عہد کہیں دھوکا نہ دیں، خدا پر بھروسہ رکھو تو ان کے فریب کا داؤ کا میرا ب نہ ہوگا:

«وَلَنْ جَنَّعُوا لِلَّسْلِيمِ فَاجْتَمَعُوا هَا وَتَوَكَّلْنَ عَلَى اللَّهِ طَإَنَّهُ هُوَ السَّمِيعُ الْعَلِيمُ وَإِنْ يُرِيدُوْا

أُنْ يَجْعَدُ عُوْكَ فَإِنَّ حَسْبَكَ اللَّهُ طُهُولَذِي أَيَّدَكَ بِنَصْرِهِ وَبِالْمُؤْمِنِيْنَ»

(الانفال: ۶۱-۶۲)

”اور اگر وہ صالح کے لیے بھکیں، تو تو بھی جھک جاؤ اور خدا پر بھروسہ رکھ، بے شک وہ سننے والا اور جانے والا ہے اور اگر وہ تجھے دھوکا دینا چاہیں تو پیکھے پرانیں کہ تجھے اللہ کافی ہے، اسی نے تجھے کو اپنی اور مسلمانوں کی نصرت سے تیری تائید کی۔“

یہود جن کو اپنی دولت، ثروت اور علم پر ناز تھا، ان سے بھی بے خوف و خطر ہو کر اللہ کے بھروسہ پر مسلمانوں کو حق کی تائید کے لیے کھڑے ہو جانے کا حکم ہوتا ہے:

«إِنْ هَذَا الْقُرْآنُ يَقْصُّ عَلَى بَنِي إِسْرَائِيلَ الْكَرَّالَذِي هُمْ فِيهِ يَخْتَلِفُونَ وَإِنَّهُ لَهُدُىٰ

وَرَحْمَةٌ لِلْمُمْدُنِيْنَ إِنَّ رَبَّكَ يَقْضِي بِمِنْهُمْ مُحْكِمٌ هُوَ الْعَزِيزُ الْعَلِيمُ فَتَوَكَّلْنَ عَلَى

اللَّهِ طَإَنَّكَ عَلَى الْحَقِيقِ الْمُبِينِ» (النمل: ۷۶-۷۹)

”بے شک یہ قرآن بنی اسرائیل سے اکثر وہ باتیں ظاہر کر دیتا ہے، جن میں وہ مختلف ہیں اور بے شک یہ قرآن مسلمانوں کے لیے ہدایت اور رحمت ہے، بے شک تیرا پر درگار ان کے درمیان اپنے حکم سے فیصلہ کر دے گا اور وہی غالب اور جانے والا ہے، تو تو خدا پر بھروسہ رکھ بے شک تو کھلے حق پر ہے۔“

اسلام کی تبلیغ اور دعوت کی مشکلوں میں بھی خدا ہی کے اعتماد اور بھروسہ پر کام کرنے کی ہدایت ہے کہ وہ ایسی طاقت ہے جس کو زوال نہیں ادا رہی، ہستی ہے جس کو فنا نہیں، فرمایا:

«وَمَا أَرْسَلْنَاكَ إِلَّا مُبَشِّرًا وَنَذِيرًا قُلْ مَا أَسْأَلْكُمْ عَلَيْهِ مِنْ أَخْرَى إِلَّا مَنْ شَاءَ أَنْ يَتَكَبَّرْ

إِلَى رَبِّهِ سَيْلًا وَتَوَكَّلْنَ عَلَى أَنْجَى الَّذِي لَا يَمُوتُ» (الفرقان: ۵۶-۵۸)

”اور میں نے تو (اے رسول) تجھے خوشخبری سنانے والا اور ہشیار کرنے والا بنا کر بھیجا ہے، کہہ دے کہ میں تم سے اسکے سوا (اپنے کام کی) کوئی مزدوری نہیں مانگتا کہ جو چاہے اپنے پروردگار کا راستہ قبول کرے اور اس زندہ رہنے والے پر بھروسہ کر جس کو موت نہیں۔“

رسول کو ہدایت ہوتی ہے کہ تم اپنا کام کیے جاؤ، مخالفین کی پرواہ کرو اور خدا پر بھروسہ رکھو، جس کے سوا کوئی دوسرا با اختیار نہیں:

﴿فَإِنْ تُوَلُوا فَقْنُ حَسِيَّ اللَّهُ ۚ لَا إِلَهَ إِلَّا هُوَ طَعَّنَهُ تَوْكِلْتُ وَهُوَ رَبُّ الْعَرْشِ الْعَظِيمِ ۝﴾

(التوبۃ: ۱۲۹)

”تو اگر یہ (مخالفین) کہانہ مانیں، تو (ان سے) کہہ دو کہ مجھے اللہ بس ہے، نہیں کوئی معبد، لیکن وہی، اسی پر میں نے بھروسہ کیا، وہ بڑے تخت کا مالک ہے۔“

آپس کے اختلافات میں اللہ کا فیصلہ چاہیے، اسی حالت میں بھی اسی پر بھروسہ ہے:

﴿وَمَا أَخْتَلَفُتُمْ فِيهِ مِنْ شَيْءٍ ۖ فَعَلَيْكُمُ الْأَئِمَّةُ ۖ ذِلِّكُمُ اللَّهُ رَبِّيْ ۖ عَلَيْهِ تَوْكِلْتُ ۝ وَإِلَيْهِ أُنِيبُ ۝﴾

(الشوری: ۴۲)

”اور جس چیز میں تم میں رائے کا اختلاف ہے، تو اس کا فیصلہ خدا کی طرف ہے، وہی اللہ ہے میرا پروردگار، اسی پر میں بھروسہ کرتا ہوں اور اسی کی طرف رجوع کرتا ہوں۔“

رسول کو خدا کی آیتیں پڑھ کر اپنی نادان قوم کو سنانے کا حکم ہوتا ہے اور تسلی وی جاتی ہے کہ ان کے کفر و نافرمانی کی پرواہ کرو اور اپنی کامیابی کے لیے خدا پر بھروسہ رکھو:

﴿كَذَلِكَ أَرْسَلْنَا فِي أَمَّةٍ قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِهَا أُمَّمٌ لِتَتَلَوَّ عَلَيْهِمُ الَّذِي أَوْحَيْنَا إِلَيْكُمْ وَهُمْ يَكْفُرُونَ بِالرَّحْمَنِ ۖ فَلْ هُوَ رَبُّ الْأَلَّا هُوَ عَلَيْهِ تَوْكِلْتُ وَإِلَيْهِ مَنِّيَابُ ۝﴾

(آل عمرہ: ۳۰)

”ایسا ہی ہم نے تجھے اس قوم میں بھیجا ہے جس سے پہلے بہت سی قومیں گزر چکیں، تاکہ تو ان کو وہ پیام سنائے جو میں نے تجھ پر دھی کیا ہے اور وہ حرج کے مانے سے انکار کرتے ہیں، کہہ دے کہ وہ میرا پروردگار ہے کوئی معبد نہیں لیکن وہی، اسی پر میں نے بھروسہ کیا اور اسی کی طرف میرا الوٹا ہے۔“

الله تعالیٰ کی رحمت اور کرم پر ہمیشہ ایک مسلمان کو بھروسہ رکھنا چاہیے اور گمراہوں کی ہدایت کا فرض ادا کرنے کے بعد ان کی شرارتوں سے پرانے خاطر نہ ہونا چاہیے، کفار کو یہ آیت سنادی ہی چاہیے:

﴿فَلْ هُوَ الرَّحْمَنُ أَمَّا إِلَيْهِ وَعَلَيْهِ تَوْكِلْنَا ۖ فَسَتَعْلَمُوْنَ مَنْ هُوَ فِي ضَلَالٍ مُّبِينٌ ۝﴾

(الملک: ۶۷)

”کہہ دے وہی رحم والا ہے، ہم اس پر ایمان لائے اور اسی پر بھروسہ کیا، تو تم جان لو گے کہ کون کھلی گمراہی میں ہے۔“

جس طرح ہمارے رسول ﷺ کو اور عام مسلمانوں کو ہر قسم کی مصیبتوں، خالقوں اور مشکلوں میں خدا پر توکل اور اعتناد کرنے کی ہدایت بار بار ہوئی ہے، آپ سے پہلے پیغمبروں کو بھی اس قسم کے موقعوں پر اسی کی تعلیم دی گئی ہے اور خود اولو العزم رسولوں کی زبان سے عملًا اس تعلیم کا اعلان ہوتا رہا ہے، حضرت نوح ﷺ جب تن تہا سالہ سال تک کافروں کے نزد میں پھنسے رہے، تو انہوں نے پوری بلند آنکھی کے ساتھ اپنے دشمنوں کو یہ اعلان فرمادیا:

«وَاثْلَ عَلَيْهِمْ نَبَأً تُوحِّي إِذَا قَالَ لِقَوْمِهِ يَقُولُ مَنْ كَانَ كَبِيرٌ عَلَيْكُمْ مَقْامٌ وَتَذَكَّرُنِي بِإِيمَانِي اللَّهُ أَعْلَى اللَّهِ تَوْكِيدُنِي فَاجْعَوْهُ أَمْرَكُمْ وَسُرْكَاءُكُمْ ثُمَّ لَا يَكُنْ أَمْرَكُمْ عَلَيْكُمْ غُصَّةٌ ثُمَّ افْضُلُوا إِلَيَّ وَلَا تُنْظِرُونِي» (۱۰/ یونس: ۷۱)

”(اے پیغمبر)! ان کو نوح کا حال سن اجب اس نے اپنی قوم سے کہا، اے میرے لوگو! اگر میرا رہنا اور اللہ کی نشانیوں کے ساتھ میرا نصیحت کرنا، تم پرشاقد گزرتا ہے تو اللہ پر میں نے بھروسہ کر لیا ہے، تو تم اپنی تدبیر کو اور اپنے شرکیوں کو خوب مضبوط کر لو پھر تم پر تمہاری تدبیر چھپی نہ رہے، پھر اس کو مجھ پر پورا کرلو اور مجھے مہلت نہ دو۔“

غور کیجئے کہ حضرت نوح ﷺ کے دشمنوں کے ہر قسم کے مکروہ فریب، سازش اور لڑائی بھڑائی کے مقابلہ میں استقلال اور عزیزیت کے ساتھ خدا پر توکل اور اعتناد کا اظہار کس پیغمبرانہ شان سے فرمائے ہیں۔ حضرت ہود ﷺ کو ان کی قوم جب اپنے دیوبناؤں کے تہر اور غصب سے ڈراہی ہے، تو وہ جواب میں فرماتے ہیں:

«إِنِّي أَشْهُدُ اللَّهَ وَأَشْهُدُ دُوَّاً أَنِّي بَرِيءٌ مِّمَّا تُشَرِّكُونَ ۝ مِنْ دُونِهِ فَقِيلَ دُونِي جَيْعاً مُهْلِكًا تُنْظِرُونِي إِلَيْنِي تُوكِلْتُ عَلَى اللَّهِ رَبِّي وَرَبِّكُمْ» (۱۱/ ہود: ۵۴-۵۶)

”میں اللہ کو گواہ کرتا ہوں اور تم بھی گواہ رہو کہ میں ان سے بیزار ہوں جن کو تم خدا کے سوا شرکیک نہیں رہتے ہو، پھر تم سب مل کر میرے ساتھ داؤ کرلو، پھر مجھے مہلت نہ دو، میں نے اللہ پر جو میرا پر در دگار اور تمہارا پر در دگار ہے بھروسہ کر لیا ہے۔“

حضرت شعیب ﷺ اپنی قوم سے کہتے ہیں کہ مجھے تمہاری خالقوں کی پرانیں، مجھے جو اصلاح کا کام کرتا ہے، وہ کروں گا، میرا تکی خدا پر ہے:

«إِنِّي أَرِيدُ إِلَيْكُمْ إِلَيْكُمْ مَا سَتَطِعْتُ ۝ وَمَا تَوْفِيقُنِي إِلَيْكُمْ تُوكِلْتُ وَإِلَيْهِ أُرِيبُ» (۱۱/ ہود: ۸۸)

”میں توجہ تک مجھ میں طاقت ہے، کام سدھارنا چاہتا ہوں، میری توفیق اللہ ہی سے ہے، اسی پر میں نے بھروسہ کیا ہے، اسی کی طرف رجوع کرتا ہوں۔“

ان پیغمبروں کی اس استقامت، صبراً و توکل کے واقعات سننے کے بعد رسول اللہ ﷺ کو تسلی دی جاتی ہے، کہ آپ کو بھی اپنے کاموں کے مشکلات میں اسی طرح خدا پر توکل کرنا چاہیے:

﴿وَقُلْ لِلّٰهِ دِيْنُ لَا يُؤْمِنُونَ اعْمَلُوا عَلٰى مَكَانِتَكُمْ طَإِنَّا عَلِمُوْنَ وَالْنَّظَرُ طَإِنَّا مُنْتَظَرُوْنَ وَإِنَّ اللّٰهَ عَيْنُ السَّمَوَاتِ وَالْأَرْضِ وَالْيَوْمِ جُمَّ الْأَمْرُ كُلَّهُ فَاعْبُدُهُ وَتَوَكَّلْ عَلَيْهِ طَ﴾

(۱۲۱-۱۲۲ / ہود)

”کہہ دہان سے جو ایمان نہیں لاتے کہ تم اپنی جگہ کام کرو، ہم بھی کرتے ہیں اور تم بھی (نتیجہ کا) انتظار کرو، ہم بھی کرتے ہیں اور اللہ ہی کے قبضہ میں ہے، آسمانوں کا اور زمین کا چھپا بھید اور اسی کی طرف سارے کاموں کا فیصلہ لوٹایا جاتا ہے، پھر اس کی عبادت کر اور اس پر بھروسہ کر۔“ مسلمانوں کے سامنے حضرت ابراہیم علیہ السلام اور ان کے پیروں کا نمونہ پیش کیا جا رہا ہے، کہ وہ صرف خدا کے بھروسہ پر عزیز و اقارب سب کو چھوڑ کر الگ ہو گئے اور خدا کی راہ میں کسی کی روشنی اور محبت کی پرواہ نکی:

﴿قَدْ كَانَتْ لَكُمْ أُسْوَةٌ حَسَنَةٌ فِي إِبْرَاهِيمَ وَالَّذِينَ مَعَهُ إِذْ قَالُوا لِقَوْمِهِمْ إِنَّا بُرَءَوْا مِنْكُمْ وَمِنَّا تَعْبُدُوْنَ هُنْ دُوْنُنَ اللّٰهِ لَكُفَّارًا يَكْمُدُوْنَ وَيَبْدَا يَبْيَنُوْنَ وَيَبْيَنُوْنَ الْعَدَاوَةَ وَالْبُغْضَاءَ أَبْدًا حَتَّىٰ تُؤْمِنُوا بِاللّٰهِ وَحْدَهُ إِلَّا قَوْلُ إِبْرَاهِيمَ لَآتِيَهُ لَا سُتْغَفِرَنَ لَكَ وَمَا أَمْلِكُ لَكَ مِنَ اللّٰهِ هِنْ شَيْءٌ وَرَبِّنَا عَلَيْكَ تَوَكَّلْنَا وَإِلَيْكَ أَنْبَنَا وَإِلَيْكَ الْمُصِيرُ﴾ (۶۰ / الممتتحنہ: ۴)

”تمہارے لیے ابراہیم علیہ السلام اور ان کے ساتھیوں میں پیروی کا اچھا نمونہ ہے، جب انہوں نے اپنی قوم سے کہا کہ ہم تم سے اور خدا کے سوا جن کو تم پوچھتے ہو ان سے بیزار ہیں، ہم نے تمہارے سلک کا انکار کر دیا اور ہم میں اور تم میں دشمنی اور نفرت ہمیشہ کے لیے کھل گئی، جب تک تم ایک خدا پر ایمان نہ لے آؤ، مگر ابراہیم علیہ السلام کا اپنے باپ سے یہ کہنا کہ میں تمہارے لیے خدا سے دعا کروں گا اور مجھے خدا کے کام میں کوئی اختیار نہیں، اے ہمارے پروردگار! تجھی پر ہم نے بھروسہ کیا اور تیری ہی طرف ہم نے رجوع کیا اور تیرے ہی پاس لوٹ کر جانا ہے۔“

حضرت یعقوب علیہ السلام اپنے عزیز بیٹوں کو مصر بھیجتے ہیں، لیکن فرط محبت سے ڈرتے ہیں کہ یوسف کی طرح ان کو بھی کوئی مصیبت نہ پیش آئے، بیٹوں کو کہتے ہیں کہ تم سب شہر کے ایک دروازہ سے نہیں، بلکہ متفرق دروازوں سے اندر جانا، اس ظاہری تدبیر کے بعد خیال آتا ہے کہ کار ساز حقیقی تو خدا ہے، ان تدبیروں سے اس کا حکمل تھوڑا ہی سکتا ہے، اس لیے بھروسہ تدبیر پر نہیں، بلکہ خدا کی کار سازی پر ہے:

﴿وَقَالَ يَهُوَيَ لَا تَدْخُلُوْنَ مِنْ بَأْپٍ وَّاَحِدٍ وَّاَدْخُلُوْنَ مِنْ آبَاؤُكُمْ مُتَفَرِّقُوْنَ وَمَا آغْنَيْتُ عَنْكُمْ﴾

ٖإِنَّ اللَّهَ مِنْ شَيْءٍ عَلَيْهِ مَا لَا يَلِدُ وَعَلَيْهِ مَا لَا يُوكِلُ ۚ وَكُلُّ الْمُتَوَكِّلُونَ ۝

(٦٧/يوسف: ١٢)

”اور (یعقوب علیہ السلام نے) کہا، اے میرے بیٹو! ایک دروازہ سے نہ جانا، بلکہ الگ الگ دروازوں سے جانا اور میں تم کو خدا سے ذرا بھی بچانیں سکتا، فیصلہ اسی کا ہے، اسی پر میں نے بھروسہ کیا اور اسی پر چاہیے کہ بھروسہ کرنے والے بھروسہ کریں۔“

حضرت یعقوب علیہ السلام کے اس عمل سے یہ بھی ظاہر ہو گیا کہ ظاہری تدبیر شان توکل کے منافی نہیں۔

حضرت شعیب علیہ السلام کی دعوت کے جواب میں جب ان کی قوم ان کو زبردست بنت پرست بن جانے پر مجبور کرتی ہے، ورنہ ان کو گھر سے باہر نکال دینے کی دھمکی دیتی ہے، تو اس کے جواب میں وہ پوری استقامت کے ساتھ فرماتے ہیں:

«قَدْ أَفْتَرَنَا عَلَى اللَّهِ كَذِبًا إِنْ عُذْنَا فِي مِلْكِكُمْ بَعْدَ إِذْ تَجْنَبَنَا اللَّهُ مِنْهَا طَوَّافًا وَمَا يَكُونُ لَنَا أَنْ تَعُودَ فِيهَا إِلَّا أَنْ يَتَأَمَّلَ اللَّهُ طَرِيقًا وَيَسِّرْ رَبِّنَا مُكْلِمًا شَيْءًا عَلَيْهِ مَا عَلَى اللَّهِ تَوْكِلَنَا ۖ رَبِّنَا أَفْتَمَ بَيْنَنَا وَبَيْنَ قَوْمَنَا بِالْحَقِّ وَأَنَّتَ خَيْرُ الْفَاتِحِينَ ۝» (٨٩/الاعراف: ٧)

”اگر ہم پھر تمہارے ندھب میں آ جائیں جب ہم کو خدا اس سے بچا چکا، تو ہم نے خدا پر جھوٹ باندھا اور یہ ہم سے نہیں ہو سکتا کہ ہم پھر اس میں لوٹ کر جائیں، مگر یہ کہ ہمارا پروردگار خدا ہی چاہے، ہمارا پروردگار اپنے علم سے ہر چیز کو سامائے ہے، ہم نے خدا پر بھروسہ کیا، اے ہمارے پروردگار! ہمارے اور ہماری قوم کے بیچ میں تحقیق کا فیصلہ کر دے اور تو ہی سب فیصلہ کرنے والوں میں سے بہتر فیصلہ کرنے والے۔“

حضرت موسیٰ علیہ السلام نے فرعون کے دل بادل لشکر اور شاہزاد و روتوت کے مقابلہ میں بنی اسرائیل کو خدا ہی پر توکل کی تعلیم دی، فرمایا:

«يَقُولُونَ إِنْ كُنْتُمْ أَمْنَثُمْ بِاللَّهِ فَعَلَيْهِ تَوْكِلُونَ إِنْ كُنْتُمْ مُّسْلِمُينَ ۝» (٨٥/یونس: ١٠)

”اے میرے لوگو! اگر تم خدا پر ایمان لا جکے ہو، تو اسی پر بھروسہ کرو، اگر تم فرمابردار ہو،“

ان کی قوم نے بھی پوری ایمانی جرأت کے ساتھ جواب دیا:

«عَلَى اللَّهِ تَوْكِلُنَا رَبِّنَا لَا تَجْعَلْنَا فِتْنَةً لِلْقَوْمِ الظَّالِمِينَ ۝» (٨٦/یونس: ١٠)

”ہم نے خدا ہی پر بھروسہ کیا، ہمارے پروردگار ہم کو ظالم قوم کے لیے آزمائش نہ بنا۔“

اس کے بعد اللہ تعالیٰ نے بنی اسرائیل کی ہر تدبیر کو جس طرح کامیاب بنایا اور ان کو اپنی خاص نوازوں سے جس طرح سرفراز کیا، اس سے ہر شخص دائمی ہے، یہ سب کچھ ان کے اسی توکل کے صدقہ میں

ہوا، چنانچہ اللہ تعالیٰ نے قرآن پاک میں اپنا یہ اصول ہی ظاہر فرمادیا ہے:
 ﴿وَمَنْ يَتَوَكَّلْ عَلَى اللَّهِ فَهُوَ حَسِيبٌ﴾ (الطلاق: ۳)

”جو خدا پر بھروسہ کرے گا تو وہ اس کو کافی ہے۔“

یہ آیت پاک خانگی و معاشرتی مشکلات کے موقع کی ہے، کہ اگر میاں یوں میں بناہ کسی طرح نہ ہو سکے اور دونوں میں قطعی علیحدگی (طلاق) ہو جائے تو پھر عورت کو اس سے ڈرنا نہ چاہیے کہ ہمارا سامان کیا ہو گا اور ہم کہاں سے کھائیں گے؟

ع خدا خود میر سامان است ارباب توکل را
 توکل کے متعلق قرآن پاک کی جس قدر آیتیں ہیں اور وہ ایک ایک کر کے آپ کے سامنے ہیں، ہر ایک پر غور کی نظر ڈالیے کہ ان میں سے کوئی بھی ان معنوں میں ہے جن میں ہم اپنی جہالت سے اس کو سمجھتے ہیں، ان میں سے ہر ایک کا مفہوم یہ ہے کہ ہم مشکلات کے بھوم، موانع کی کثرت اور پر زور مخالفوں کی تدبیروں سے نذر ہو کر استحکام، عزم اور استقلال کے ساتھ اپنے کام میں لگرہ کر خدا کی مدد سے کام کے حسب خواہ نتیجہ پیدا ہونے کا دل میں یقین رکھیں۔ احادیث میں ہے کہ ایک بدھی اونٹ پر سوار ہو کر آنحضرت ﷺ کی خدمت میں آیا اور سوال کیا کہ یا رسول اللہ ﷺ ایں اونٹ کو یونہی چھوڑ کر خدا پر توکل کروں کہ میرا اونٹ مجھ کو مل جائے گا یا اس کو باندھ کر، ارشاد ہوا: ”اس کو باندھ کر خدا پر توکل کرو۔“ ۱۱ اسی واقعہ کو مولانا راوی نے اس صریح میں ادا کیا ہے:

ع بر توکل زانوے اشتربه بند
 یہ روایت سند کے لحاظ سے قوئی نہیں، تاہم حقیقت کی رو سے اس کا مفہوم قرآن پاک کے عین مشاک مطابق ہے۔

بعض لوگ تعلیم گندہ، غیر شرعی ۱۲ جہاز پھونک، ٹوٹکے اور منتر پر یقین رکھتے ہیں اور سمجھتے ہیں کہ مادی اسباب و مداری کو چھوڑ کر ان چیزوں سے مطلب برآری کرنا ہی توکل ہے، جاہلیت کے وہم پرست بھی یہی عقیدہ رکھتے تھے، لیکن آنحضرت ﷺ نے ان کے اس خیال کی تردید کر دی اور فرمایا کہ ”خدانے وعدہ کیا ہے کہ میری امت سے ستر ہزار اشخاص حساب کتاب کے بغیر جنت میں داخل کر دیے جائیں گے، یہ وہ ہوں گے جو تعزیز گندہ نہیں کرتے، جو بد شکونی کے قائل نہیں، جو داع غنیمیں کرتے، بلکہ اپنے پروردگار پر توکل اور

۱۲ یہ حدیث بالظٹ ”اعقلها و توکل“ ترمذی (آخر ابواب صفة القيامة: ۲۵۱۷) میں اور ”قیدہ و توکل“ شعب الایمان بیہقی میں اور ”قیدہ و توکل“ خطیب کی روایت مالک اور ابن عساکر میں ہے (كتب العمال، ج ۲، ص: ۲۲ حیدر آباد)۔
 ۱۳ شرعی کلمات حقیقت میں اللہ تعالیٰ سے دعا کیں ہیں اور اس کے کلام پاک سے تبرک حاصل کرنا ہے لیکن آیات اور دعاویں کو لکھ کر بدن میں لٹکانا یا گھول کر پینا، یا خاص قیود کے ساتھ اعداد میں ان کو لکھنا بابت نہیں۔

اعتماد رکھتے ہیں۔ ” * ایک دوسری حدیث میں ارشاد فرمایا کہ ”جود غواستے اور تعویذ گندزا کرتے ہیں، وہ توکل سے محروم ہیں۔ ” * اس سے مقصود نفس تدبیر کی ممانعت نہیں، بلکہ جاہلشہ اور ہام کی بخ کرنی ہے، ایک اور موقع پر ارشاد ہوا کہ ”اگر تم خدا پر توکل کرتے جیسا کہ توکل کرنے کا حق ہے تو خدا تم کو دیے روزی پہنچاتا، جیسے پرندوں کو پہنچاتا ہے کہ صحیح کو بھوکے جاتے ہیں اور شام کو سیر ہو کر واپس آتے ہیں۔ ” * اس حدیث سے بھی مقصود ترک عمل اور ترک تدبیر نہیں، کیونکہ پرندوں کو ان کے گھونسلوں میں بیٹھا کر یہ روزی نہیں پہنچائی جاتی ہے، بلکہ ان کو بھی اڑ کر کھیتوں اور باغوں میں جانے اور رزق کے تلاش کرنے کی ضرورت پیش آتی ہے، بلکہ مقصود یہ ہے کہ جو لوگ خدا پر توکل اور اعتماد سے محروم ہیں، وہ روزی کے لیے دل تنگ اور کبیدہ خاطر ہوتے ہیں اور اس کے حصول کے لیے ہر قسم کی بدی اور برائی کا ارتکاب کرتے ہیں، حالانکہ انہیں اگر یہ یقین ہو کہ

﴿وَمَا هُنَّ دَائِبٌ فِي الْأَرْضِ إِلَّا عَلَى اللَّهِ يُرْدُفُهُمَا﴾ (۱۱ / هود: ۶)

”زمیں میں کوئی رینگنے والا نہیں، لیکن اس کی روزی خدا کے ذمہ ہے۔ ”

تو وہ اس کے لیے چوری، ڈاک، قتل، بے ایمانی اور خیانت وغیرہ کے مرتكب نہ ہوتے اور نہ ان کو دلی تیگی اور مالیوں ہوا کرتی، بلکہ صحیح طور سے وہ کوشش کرتے اور روزی پاتے، ان حدیثوں کا یہی مفہوم ہے، جو قرآن پاک کی اس آیت میں ادا ہوا ہے:

﴿وَمَنْ يَكْتَنِ اللَّهُ يَعْلَمُ لَهُ خَفْرَ جَاهَ وَيَرْزُقُهُ مِنْ حَيْثُ لَا يَحْتَسِبُ وَمَنْ يَتَوَكَّلْ عَلَى اللَّهِ فَهُوَ حَسْبُهُ إِنَّ اللَّهَ بِأَلْيُهُ أَمْرِهِ قَدْ جَعَلَ اللَّهُ لِكُلِّ شَيْءٍ قَدْرًا﴾

(الطلاق: ۲-۳ / ۶۵)

”اور جو کوئی اندھے سے ڈرے، وہ اس کے لیے مشکل سے نکلنے کا راستہ کر دے گا اور اس کو وہاں سے روزی دے گا، جہاں سے اس کو گمان نہ ہو گا اور جو اللہ پر بھروسہ کرے گا تو وہ اس کو بس ہے، بے شک اللہ اپنے ارادہ کو پہنچ کر رہتا ہے، اس نے ہر چیز کے لیے ایک اندازہ مقرر کر دیا ہے۔ ”

اوپر کی تفصیلوں سے ہو یہا ہے کہ توکل جس قلبی یقین کا نام ہے، اسی کے قریب قریب آج کل کے اخلاقیات میں ”خدا اعتمادی“ کا لفظ بولا جاتا ہے اور کہا جاتا ہے کہ کامیاب افراد وہی ہوتے ہیں، جن میں یہ جو ہر پایا جاتا ہے، لیکن اس خدا اعتمادی کی سرحد سے بالکل قریب غرور اور فریب نفس کے گڑھے ہیں مار بھی ہیں، اس لیے اسلام نے انسانیت کی خدا اعتمادی کے بجائے ”خدا اعتمادی“ کا نظریہ پیش کیا ہے، جو ان خطروں سے محظوظ ہے۔

* صحيح بخاری، کتاب الطب، باب من لم يرق: ۵۷۵۲ و کتاب الرفاق، باب ومن يتوكل على الله فهو حبيبه: ۶۴۷۲؛ صحيح مسلم، کتاب الایمان، باب الدليل على دخول طائف من المسمىين: ۵۲۴ حامت میں آثیر بیار بیوں کا عالم آگ سے داع کر کرتے تھے۔ * جامع ترمذی، ابواب الطلب باب ماجاء مافقی کراہی الرفیع: ۲۰۵۵۔ اصل الفاظ یہ ہیں، من اکتسوی او استرقی فقدم بريء من التوكيل۔ * جامع ترمذی، ابواب الزهد، باب في التوكيل على الله: ۲۳۴؛ مستدرک حاکم، کتاب الرفاق، ج ۴، ص: ۳۱۸۔

صبر

﴿فَاصْبِرْ كَمَا صَبَرُوا لِوَالْعَزْمٍ مِنَ الرَّسُولِ﴾ (٤٦ / الاحقاف: ٣٥)

صبر کی حقیقت پر عوام کی غلط فہمی نے تو برتاؤ پر دے ڈال رکھے ہیں، وہ ان کے نزدیک بے بس و بے کسی کی تصویر ہے اور اس کے معنی اپنے دشمن سے کسی مجبوری کے سبب سے انتقام نہ لے سکنا ہیں، لیکن کیا واقعی یہی ہے؟ صبر کے لغوی معنی

”صبر“ کے لغوی معنی ”رُدَكَهُ“ اور ”سہارے“ کے ہیں، یعنی اپنے نفس کو اضطراب اور گھبراہٹ سے روکنا اور اس کو اپنی جگہ پر ثابت قدم رکھنا اور یہی صبر کی معنوی حقیقت بھی ہے، یعنی اس کے معنی بے اختیاری کی خاموشی اور انتقام نہ لے سکنے کی مجبوری کے نہیں، بلکہ پامردی، دل کی مضبوطی اور اخلاقی جرأت اور ثبات قدم کے ہیں، حضرت موسیٰ علیہ السلام اور خضر علیہ السلام کے قصہ میں ایک ہی آیت میں تین جگہ یہ لفظ آیا ہے اور ہر جگہ یہی معنی مراد ہیں، حضرت خضر علیہ السلام کہتے ہیں:

﴿إِنَّكَ لَنْ تَسْتَطِعَهُ مَعَ صَبَرًا وَكَيْفَ تَصْبِرُ عَلَى مَا لَمْ تُحِيطُ بِهِ خُرُبًا﴾

(١٨ / الكھف: ٦٨-٦٧)

”تم میرے ساتھ صبر نہ کر سکو گے اور کیسے اس بات پر صبر کر سکتے ہو، جس کا علم تمہیں نہیں۔“

حضرت موسیٰ علیہ السلام جواب میں فرماتے ہیں:

﴿سَتَجْدُلُنِي إِنْ شَاءَ اللَّهُ صَابِرًا﴾ (١٨ / الكھف: ٦٩)

”اگر خدا نے چاہا تو آپ مجھے صابر پائیں گے۔“

اس صبر سے مقصود علمی کی حالت میں غیر معمولی و احتفات کے پیش آنے سے دل میں اضطراب اور بے چینی کا پیدا نہ ہونا ہے۔

کفار، اپنے پیغمبروں کے سمجھانے کے باوجود، پوری تندی اور مضبوطی کے ساتھ اپنی بت پرستی پر قائم رہتے ہیں، تو اس کی حکایت ان کی زبان سے قرآن یوس بیان کرتا ہے:

﴿إِنْ كَادَ لَيُصْلِنَا عَنِ الْهَقَنَأَ لَوْلَا أَنْ صَرَبَنَا عَلَيْهَا طَ﴾ (٤٢ / الفرقان: ٤٥)

”یعنی شخص (پیغمبری کا مدعی) تو ہم کو اپنے خداوں (توں) سے ہٹا دیا چکا تھا، اگر ہم ان پر صابر ثابت (نہ رہتے۔“

یہی مفہوم ایک اور آیت میں ہے، کفار آپس میں کہتے ہیں:

﴿أَنْ امْشُوا وَاصْبِرُوا عَلَى الْهَقَنَمَ﴾ (٣٨ / ص: ٦) ”چلو اور اپنے خداوں پر صبر کرو، (یعنی مضبوطی کے ساتھ قائم رہو۔“

عرب کے بعض گنوار آنحضرت ﷺ کے مجرہ کے سامنے آ کر بد تیزی سے آپ کو پکارتے تھے، ان

سے کہا گیا کہ اتنی گھبراہت کیا تھی اذراٹھر جاتے۔

﴿وَلَوْ أَنَّهُمْ صَبَرُوا حَتَّىٰ يَخْرُجَ الْيَهُودُ لَكَانَ خَيْرًا لَّهُمْ﴾ (۴۹ / الحجرات: ۵)
”اور اگر وہ ذرا صبر کرتے (یعنی خبر جاتے) یہاں تک کہ تم (اے رسول) نکل کر ان کے پاس آتے تو ان کے لیے بہتر ہوتا۔“

قرآن پاک میں صبر کا الفاظ اسی ایک معنی میں مستعمل ہوا ہے، گو حالات کے تغیر سے اس کے مفہوم میں کہیں کہیں ذرا ذرا فرق پیدا ہو گیا ہے، با اس ہمدران سب کا مرچع ایک ہی ہے، یعنی ثابت قدی اور استقامت، صبر کے مختلف مفہوم جن میں قرآن پاک نے اس کو استعمال کیا ہے، حسب ذیل ہیں:

وقت مناسب کا انتظار کرنا

پہلا یہ ہے کہ ہر قسم کی تکلیف اٹھا کر اور اپنے مقصد پر جتے رہ کر کامیابی کے وقت کا انتظار کرنا، آنحضرت ﷺ نے جب شروع میں لوگوں کے سامنے تو حید کی دعوت اور اسلام کی تبلیغ پیش کی، تو عرب کا ایک ایک ذرہ آپ کی مخالفت میں سرگرم جوان ہو گیا، ہر طرف سے عداوت اور دشمنی کے مظاہرے ہونے لگے اور گوشہ گوشہ سے قدم قدم پر مخالفتیں اور رکاوٹیں پیش کی جانے لگیں، تو اس وقت بشریت کے اتفاق سے آپ کو اضطراب ہوا اور کامیابی کی منزل دور نظر آنے لگی اور اس وقت تسلی کا یہ پیام آیا کہ اضطراب اور گھبراہت کی ضرورت نہیں، آپ مستعدی سے اپنے کام میں لگے رہیں، خدا آپ کا نگہبان ہے، خدا کافیسلہ اپنے وقت پر آئے گا، فرمایا:

﴿وَاصْبِرْ لِحَلْمِ رَبِّكَ فَإِنَّكَ بِأَعْيُنِنَا﴾ (۴۸ / الطور: ۵۲)

”اے رسول ﷺ تو اپنے پروردگار کے فیصلہ پر ثابت قدم رہ کر منتظر رہ، کیونکہ تو ہماری آنکھوں کے سامنے ہے۔“

﴿فَاصْبِرْ وَاحَدِيٌّ يَحْكُمُ اللَّهُ بِسِينَاء﴾ (۷ / الاعراف: ۸۷)

”تو ثابت قدم رہ کر منتظر ہو، یہاں تک کہ خدا ہمارے درمیان فیصلہ کر دے۔“

﴿وَاصْبِرْ حَتَّىٰ يَحْكُمَ اللَّهُ وَهُوَ خَيْرُ الْحَكَمِينَ﴾ (۱۰ / یونس: ۱۰۹)

”او رثابت قدم رہ کر منتظر رہ، یہاں تک کہ خدا فیصلہ کر دے، وہ سب فیصلہ کرنے والوں میں بہتر ہے۔“

﴿فَاصْبِرْ إِنَّ الْعَاقِبَةَ لِلْمُتَّقِينَ﴾ (۱۱ / هود: ۴۹)

”ثابت قدم رہ کرو قات کا منتظر رہ، بے شہ آخرا کارکامیابی پر ہیزگاروں ہی کی ہے۔“
اس انتظار کی کلکش کی حالت میں جب ایک طرف حق کی بے کسی، بیچارگی اور بے نی پاؤں کو ڈگ کر رہی ہو اور دوسری طرف باطل کی عارضی شورش اور ہنگامی غلبہ دلوں کو نکزور کر رہا ہو، حق پر قائم رہ کر اس کی کامیابی کی

پوری توقع رکھنی چاہیے:

﴿فَاصْرِفْ إِنَّ وَعْدَ اللَّهِ حَقٌّ﴾ (۳۰/الروم: ۶۰) / المؤمن: ۷۷

”ثابت قدی کے ساتھ منتظرہ، بے شک خدا کا وعدہ سچا ہے۔“

ایسا نہ ہو کہ وعدہ الہی کے ظہور میں اگر ذرا دیر ہو تو مشکلات سے گھبرا کرتن کا ساتھ چھوڑ دا رہ باطل کے گروہ میں مل جاؤ:

﴿فَاصْرِفْ لِلْجَاهِرِ سَبَكَ وَلَا تُنْظِعْ مِنْهُمْ أَثَمًا أَوْ لَفْرَأً﴾ (۲۶/الدھر: ۲۴)

”اپنے پروردگار کے فیصلہ کا ثابت قدی سے منتظرہ اور ان (خائفین میں) سے کسی گناہ گاریا کافر کا کہانہ مان لے۔“

آنحضرت ﷺ کو حضرت یوسف علیہ السلام کا قصہ سنایا گیا کہ ان کو خیال ہوا کہ ان کی نافرمان قوم پر عذاب آئے میں تاخیر ہو رہی ہے، اس لیے وہ بھاگ کھڑے ہوئے، حالانکہ ان کی قوم دل میں مسلمان ہو چکی تھی، اس لیے وہ عذاب اس سے مل گیا تھا، ارشاد ہوا، کہ اے یغیرہ اس طرح تیرے ہاتھ سے صبر کا رشتہ چھوٹئے نہ پائے:

﴿فَاصْرِفْ لِلْجَاهِرِ سَبَكَ وَلَا تَنْكُنْ لَكَ صَاحِبَ الْجُوُوتَ﴾ (۶۸/القلم: ۴۸)

”اپنے پروردگار کے فیصلہ کا ثابت قدی کے ساتھ انتظار کا رجھلی والے (یوسف) کی طرح نہ ہو۔“

بے قرار نہ ہونا

صبر کا دوسرا مفہوم یہ ہے کہ مصیبتوں اور مشکلوں میں اخطراب اور بے قراری نہ ہو، بلکہ ان کو خدا کا حکم اور مصلحت سمجھ کر خوشی خوشی جھیلا جائے اور یہ یقین رکھا جائے کہ جب وقت آئے گا تو اللہ تعالیٰ اپنی رحمت سے خود ان کو دور فرمادے گا، اللہ تعالیٰ نے ایسے لوگوں کی مدد فرمائی:

﴿وَالضَّيْئِنَ عَلَىٰ مَا أَصَابَهُمْ﴾ (۲۲/الحج: ۳۵)

”اور جو مصیبیت میں صبر کریں۔“

حضرت یعقوب علیہ السلام بیٹوں سے یہ جھوٹی خبر سن کر کہ بھیڑیے نے حضرت یوسف علیہ السلام کو کھالیا، فرماتے ہیں:

﴿إِنْ سَوَّلَتْ لَهُمْ أَنفُسُكُمْ أَمْرًا طَفَّالَ فَصِيرْ تَمَيِّلُ طَوَّلَ اللَّهُ الْمُسْتَعَنُ عَلَىٰ مَا تَصْفُونَ﴾

(۱۸/یوسف: ۱۲)

”بلکہ تمہارے دلوں نے ایک بات گھڑی ہے، تو بہتر صبر ہے اور خدا سے اس پر مدد چاہی جاتی ہے، جو تم بیان کرتے ہو۔“

پھر اپنے دوسرے بیٹے کے مصر میں روک لیے جانے کا حال سن کر کہتے ہیں:

﴿بَلْ سَوْلَتْ لِكُمْ أَنفُسُكُمْ أَمْرًا فَصَبَرْتُمْ عَنِ اللَّهِ أَنْ يَأْتِيَكُمْ بِهِمْ حَمِيمًا﴾

(۱۲/ یوسف: ۸۳)

”بلکہ تمہارے دلوں نے گھڑ لیا ہے، تو بہتر صبر ہے، عقریب خدا ان سب کو ساتھ لائے گا۔“

حضرت ایوب علیہ السلام نے جسمانی اور مالی مصیبتوں کو جس رضاوت لیم کے ساتھ پامردی سے برداشت کیا، اس کی مدح خود اللہ تعالیٰ نے فرمائی:

﴿إِنَّا وَجَدْنَاهُ صَابِرًا نِعْمَ الْعَبْدُ إِنَّهُ أَوَّابٌ﴾ (۴۴/ ص: ۳۸)

”ہم نے بے شک ایوب کو صابر پایا، کیسا اچھا بندہ، وہ خدا کی طرف رجوع ہونے والا ہے۔“

حضرت اسماعیل علیہ السلام اپنے شفیق اور مہربان باپ کی چھری کے نیچے اپنی گردن رکھ کر فرماتے ہیں:

﴿يَا أَبَيَ افْعُلُ مَا تُؤْمِنُ سَتَحْدِلُ إِنْ شَاءَ اللَّهُ مِنَ الصَّرِيبِينَ﴾ (۱۰۲/ الصافات: ۳۷)

”اے باپ جو تجھے کہا جاتا ہے، وہ کرگز، خدا نے چاہا، تو تو مجھے صابروں میں سے پائے گا۔“

مشکلات کو خاطر میں نہ لانا

صبر کا تیرا مفہوم یہ ہے کہ منزل مقصود کی راہ میں جو مشکلیں اور خطرے پیش آئیں، دشمن جو تکلیفیں پہنچا جائیں اور خلافیں جو طعن وطنز کریں، ان میں کسی چیز کو خاطر میں نہ لایا جائے اور ان سے بد دل اور پست بہت ہونے کے بجائے اور زیادہ استقلال اور استواری پیدا ہو، بڑے بڑے کام کرنے والوں کی راہ میں یہ روزے اکثر انکائے گئے، مگر انہوں نے استقلال اور مضبوطی کے ساتھ ان کا مقابلہ کیا اور کامیاب ہوئے، آنحضرت ﷺ کو اسی لیے دوسری وحی میں جب تبلیغ اور دعوت کا حکم ہوا، تو ساتھ ہی اس حقیقت سے بھی آپ ﷺ کو باخبر کر دیا گیا:

﴿يَا أَيُّهَا الْمُدَبِّرُ فَهُنَّا نَذِرٌ وَلَرِتَكَ فَاصْبِرْتُمْ﴾ (۷۴/ المدثر: ۱-۷)

”اے چادر پوش اٹھ اور لوگوں کو ہشیار کر..... اور اپنے پروردگار کے لیے پامردی (صبر) کر۔“

اس قسم کے موقع اکثر انبیاء ﷺ کو پیش آئے، چنانچہ خود آنحضرت ﷺ کو نبوت کی اس اعلیٰ مثال کی پامردی کا حکم ہوا:

﴿فَاصْبِرْ لَكُمَا صَبَرَ أَوْلُو الْعَزْمِ مِنَ الرُّسُلِ وَلَا تَسْتَعْجِلْ لَهُمْ﴾ (۴۶/ الاحقاف: ۳۵)

”اے محمد ﷺ! تو بھی اسی طرح پامردی کر جس طرح پختہ ارادہ والے پتغیروں نے کی اور ان (خالفوں) کے لیے جلدی نہ کر۔“

حضرت لقمان علیہ السلام کی زبان سے بیٹھے کو یہ نصیحت سنائی گئی کہ حق کی دعوت و تبلیغ، امر بالمعروف اور نبی عن المنکر کا فرض پوری استواری سے ادا کرو اس راہ میں جو مصیبتوں پیش آئیں ان کا مردانہ وار مقابلہ کرو:

﴿وَأُمْرٌ بِالْمَعْرُوفِ وَإِنَّهُ عَنِ الْمُنْكَرِ وَاصْبِرْ عَلَىٰ مَا أَصَابَكَ طَإِنْ ذَلِكَ مِنْ عَزْمٌ الْمُوْرَّطٌ﴾

(۱۷: لقمان)

”بیکی کا حکم کرو اور برائی سے روک اور جو مصیبت پیش آئے، اس کو برداشت کرو، یہ بڑی بچتہ باقتوں میں سے ہے۔“

کفار عذاب الہی کے جلد نہ آنے، یا حق کی ظاہری بے کسی دبے بسی کے سبب سے آنحضرت ﷺ کو اپنے دل دوز طعنوں سے تکلیفیں پہنچاتے تھے، حکم ہوا کہ ان طعنوں کی پرواہ کرو اور نہ ان سے دل کو ادا کر، بلکہ اپنی دھن میں لگارہ اور دیکھو کہ تجھے سے پہلے یتغیروں نے کیا کیا:

﴿إِصْبِرْ عَلَىٰ مَا يَقُولُونَ وَإِذْلِكُ عَبْدَنَ كَادَأَدَ﴾ (۳۸: ص: ۱۷)

”ان کے کیے پر صبر کرو اور ہمارے بندہ داؤ دکویا دکر۔“

اس قوت صبر کے حصول کا طریقہ یہ ہے کہ خدا سے لوگائی جائے اور اس کی طاقت پر بھروسہ کیا جائے:

﴿فَاصْبِرْ عَلَىٰ مَا يَقُولُونَ وَسَيُئْتُهُمْ مُحَمَّدُ رَبُّكَ قَبْلَ طُلُوعِ الشَّمْسِ﴾

(۲۰: طہ: ۱۳۰ و ۵۰: ق: ۳۹)

”تو ان کے کہنے پر صبر کرو صبح شام اپنے پروردگار کی حمد کرو۔“

نہ صرف یہ کہ خالفوں کے اس طعن و نظر کا دھیان نہ کیا جائے، بلکہ اس کے جواب میں اُن سے لطف و مردوں بردا جائے، فرمایا:

﴿وَاصْبِرْ عَلَىٰ مَا يَقُولُونَ وَأَخْجِرُهُمْ هَجْرًا حَمِيلًا﴾ (۷۳: المزمول: ۱۰)

”تو ان کے کیے پر صبر کرو اور ان سے خوبصورتی سے الگ ہو جا۔“

درگز رکرنا

صبر کا چوتھا مفہوم یہ ہے کہ برائی کرنے والوں کی برائی کو نظر انداز اور جو بد خواہی سے پیش آئے اور تکلیفیں دے، اس کے قصور کو معاف کیا جائے یعنی تحمل اور برداشت میں اخلاقی پامردی و کھدائی جائے۔ قرآن پاک کی کئی آیتوں میں صبر اس مفہوم میں استعمال ہوا ہے، ارشاد ہوتا ہے:

﴿وَإِنْ عَاقِبْتُمْ فَعَاقِبُوا بِمِثْلِ مَا عَوْقَبْتُمْ يٰ طَوَّلُينْ صَبَرْتُمْ لَهُمْ وَخَيْرٌ لِلصَّابِرِينَ وَاصْبِرْ وَمَا صَبَرْتُ إِلَّا بِاللّٰهِ وَلَا تَحْزُنْ عَلَيْهِمْ وَلَا تَكُنْ فِي ضَيْقٍ مِمَّا يَمْكُرُونَ﴾

(۱۶: نحل: ۱۲۶-۱۲۷)

”اور اگر تم سزا دو تو اسی قدر جس قدر تم کو تکلیف دی گئی اور البتہ اگر صبر (برداشت) کرو تو صبر کرنے والوں کے لیے یہ بہتر ہے اور تو صبر کرو اور تیرا صبر کرنا نہیں، لیکن خدا کی مدد سے اور ان کا غم نہ کرو اور ان کی سازشوں سے دل تنگ ہو۔“

یہ صبر کی وہ تمہیں ہے جو غالباً حیثیت سے بہت بڑی بہادری ہے، مسلمانوں کو اس بہادری کی تعلیم بار بار دی گئی ہے اور بتایا گیا ہے کہ یہ صبر و برداشت کمزوری سے یادشمن کے خوف سے، یا کسی اور سبب سے نہ ہو، بلکہ صرف خدا کے لیے ہو:

﴿وَالَّذِينَ صَبَرُوا إِنَّمَا وَجَدُوا رَيْهُمْ وَأَقَامُوا الصَّلَاةَ وَأَنْفَقُوا مِمَّا رَزَقْنَاهُمْ سِرًا وَّعَلَانِيَةً وَكَيْدُرُونَ كَيْدُرَ عَوْنَوْنَ إِلَيْكُمْ أَلْكَ لَهُمْ عُقْبَى الدَّارِ﴾ (الرعد: ۲۲)

”اور جہنوں نے اپنے پروردگار کی ذات کے لیے صبر کیا اور نماز کھڑی کی اور جو ہم نے ان کو روزی دی اس میں سے چھپے اور علانیہ (راہ خدا میں) خرچ کیا اور برائی کو نیکی سے دفع کرتے ہیں، ان کے لیے آخوت کا انجام ہے۔“

فرشتہ ان کو مبارکہ کاہدوں گے اور کہیں گے:

﴿سَلَّمٌ عَلَيْكُمْ بِمَا صَبَرْتُمْ فَتَعَمَّمْ عُقْبَى الدَّارِ﴾ (الرعد: ۲۴)

”تم پر سلامتی ہو کیونکہ تم نے صبر کیا تھا تو آخوت کا انجام کیا اچھا ہوا۔“

ایک خاص بات اس آیت میں خیال کرنے کے لائق ہے، کہ اس کے شروع میں چند نیکیوں کا ذکر ہے، صبر، نماز، خیرات، برائی کی جگہ بھلائی، مگر فرشتوں نے اس مومن کے جس خاص وصف پر اس کو سامنے لی دعا دی، وہ صرف صبر یعنی برداشت کی صفت ہے، کیونکہ یہی اصل ہے، جس میں یہ جو ہر ہوگا، وہ عبادات کی تکلیف بھی اٹھائے گا، مصیبتوں کو بھی جھیلے گا اور دشمنوں کی بدی کا جواب بھی نیکی سے دے گا، چنانچہ ایک اور آیت میں اس کی تشریح بھی کرو دی گئی ہے، کہ درگز را اور بدی کے بدله نیکی کی صفت اس میں ہوگی، جس میں صبر ہوگا:

﴿وَلَا تَسْتَوِي الْحَسَنَةُ وَلَا الشَّيْءَ هُطْ إِذْفَعَ بِالْأَتْقَى هُنَّ أَحْسَنُ فَإِذَا الَّذِي يَنْتَكَ وَبَيْتَهُ عَدَا وَهُوَ كَانَهُ وَلَيْ حَيْمِدٌ وَمَا يُلْقِهَا إِلَّا الَّذِينَ صَبَرُوا وَمَا يُلْقِهَا إِلَّا ذُو حَظٍ عَظِيمٌ﴾

(فصلت: ۴۱ / ۳۵-۳۶)

”بھلائی اور برائی برآبر نہیں، برائی کا جواب اچھائی سے دو، تو یکبارگی جس کے اور تمہارے درمیان دشمنی ہے، وہ قریبی دوست سا ہو جائے گا اور یہ بات اسی کو ملتی ہے جو صبر کرتے ہیں اور یہ اسی کو ملتی ہے جو بڑی قسمت والا ہے۔“

جو لوگوں پر ظلم کرتے پھرتے ہیں اور ملک میں ناحق فساد برپا کرتے رہتے ہیں، ان پر خدا کا عذاب ہو

گا، اس لیے ایک صاحب عزم مسلمان کا فرض یہ ہے کہ دوسرے اس پر ظلم کریں تو بہادری سے اس کو برداشت کرے اور معاف کر دے، فرمایا:

﴿إِنَّمَا السَّيْئُلُ عَلَى الَّذِينَ يَظْلِمُونَ النَّاسَ وَيَبْغُونَ فِي الْأَرْضِ بِغَيْرِ الْحِقْطِ أُولَئِكَ لَهُمْ عَذَابٌ أَلِيمٌ وَلَمَنْ صَرَرَ وَغَفَرَ آتَ ذَلِكَ لَمْنٌ عَزْوَ الْأُمُورِ﴾ (۴۲/ الشوری: ۴۲-۴۳)

”راستہ انہیں پر ہے جو لوگوں پر ظلم کرتے ہیں اور ملک میں ناحق فساد کرتے ہیں، یہی ہیں جن کے لیے پرورد عذاب ہے اور البتہ جس نے برداشت کیا اور بخش دیا، بے شک یہ بڑی ہمت کا کام ہے۔“

ثابت قدمی

صبر کا پانچواں اہم مفہوم بڑائی پیش آجائے کی صورت میں میدانِ جنگ میں بہادرانہ استقامت اور ثابت قدمی ہے، قرآن پاک نے اس لفاظ کو اس مفہوم میں بارہا استعمال کیا ہے اور ایسے لوگوں کو جو اس وصف سے متصف ہوئے، صادق القول اور راستباز تھہریا ہے، کہ انہوں نے خدا سے جو وعدہ کیا تھا پورا کیا، فرمایا:

﴿وَالظَّرِيرُونَ فِي الْبَاسَاءِ وَالضَّرَاءِ وَجِئْنَ الْبَاسِ أُولَئِكَ الَّذِينَ صَدَقُوا وَأُولَئِكَ هُمُ الْمُتَّقِنُونَ﴾ (۱۷۷/ البقرة: ۲)

”اور صبر کرنے والے، ثابت قدمی دکھانے والے مصیبت میں اور نقصان میں اور بڑائی کے وقت، وہی ہیں جو فوج بولے اور وہی پر ہیز گار ہیں۔“

اگر بڑائی آپ کے تو اس میں کامیابی کی چار شرطیں ہیں، خدا کی یاد، امام وقت کی اطاعت، آپ میں اتحاد و موقوفت اور میدانِ جنگ میں بہادرانہ صبر و استقامت:

﴿يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا إِذَا أَقْيَتُمْ فِتْنَةً فَلَا يُشْتُوا وَلَا كُروَ اللَّهُ أَكْبَرُ اللَّهُ أَكْبَرُ الْعَلَمُ لَمْ تُفْجِرُنَّ وَلَا طَبِيعُوا اللَّهُ وَرَسُولُهُ وَلَا تَنَازِعُوْنَ فَتَفَشِّلُوْنَ وَلَا تَذَهَّبَ رِجْمُكُمْ وَاصْبِرُوْا مَا لَكُمْ اللَّهُ مَعَ الصَّابِرِينَ﴾ (۸/ الانفال: ۴۵-۴۶)

”اے ایمان والو اواجب تم کسی دستے سے مقابل ہو، تو ثابت قدم رہو اور اللہ کو بہت یاد کرو، تاکہ فلاح پاؤ اور خدا اور اس کے رسول کی فرمانبرداری کرو اور آپس میں بھگڑو نہیں، ورنہ تم ست ہو جاؤ گے اور تھہاری ہو اکھڑ جائے گی اور صبر دکھاؤ، بے شک اللہ صبر کرنے والوں کے ساتھ ہے۔“

حق کے مددگاروں کی نظاہری قلت تعداد کی تلافی اسی صبر و ثبات کی روحانی قوت سے ہوتی ہے، تاریخ کی نظر سے یہ مشاہدے اکثر گزرے ہیں کہ چند مستقل مزاج اور ثابت قدم بہادروں نے فوج کی فوج کو

شکست دے دی ہے، اسلام نے یہ کتنا اسی وقت اپنے جان شاروں کو سکھا دیا تھا، جب ان کی تعداد تھوڑی اور دشمنوں کی بڑی تھی:

﴿يَا أَيُّهَا الَّذِي حَرَضَ الْمُؤْمِنِينَ عَلَى الْقِتَالِ إِنْ يَكُنْ مِنْكُمْ عِشْرُونَ صَابِرُونَ يَغْلِبُوا مَا تَبَيَّنَ وَإِنْ يَكُنْ مِنْكُمْ مَا تَأْتِهُ يَغْلِبُوا أَلْفًا مِنَ الظَّرِينَ كُفَّرُوا بِأَنَّهُمْ قَوْمٌ لَا يَفْهَمُونَ إِنَّ اللَّهَ خَفَّقَ اللَّهُ عَنْكُمْ وَعَلِمَ أَنَّ فِيهِمْ ضَعْفًا فَإِنْ يَكُنْ مِنْكُمْ مَا تَأْتِهُ صَابِرًا يَغْلِبُوا مَا تَبَيَّنَ وَإِنْ يَكُنْ مِنْكُمْ أَلْفٌ يَغْلِبُوا أَلْفَيْنِ بِإِذْنِ اللَّهِ وَاللَّهُ مَعَ الصَّابِرِينَ﴾ (۱۰)

(۶۵-۶۶/الانفال)

”اے شیخبر! ایمان والوں کو (دشمنوں کی) لڑائی پر ابھاراً اگر یہ بیس صبر کرنے والے (ثابت قدم) ہوں تو دوسو پر غالب ہوں گے اور اگر سو ہوں تو کافروں میں سے ہزار پر غالب ہوں گے، کیونکہ وہ لوگ سمجھتے نہیں، اب اللہ نے تم سے تخفیف کر دی اور اس کو معلوم ہے کہ تم میں کمزوری ہے، تو اگر سو صبر کرنے والے (ثابت قدم) ہوں تو دوسو پر غالب ہوں گے اور اگر ہزار (صبر والے) ہوں تو دو ہزار پر خدا کے حکم سے غالب ہوں گے اور اللہ صبر کرنے والوں (ثابت قدموں) کے ساتھ ہے۔“

میدان کارزار میں مسلمانوں کو حکم دیا گیا کہ وہ اپنی تعدادی قلت کی پرواہ کریں اور صبر و ثبات کے ساتھ اپنے سے دو چند کامقابلہ کریں اور سلسلی دی گئی کہ اللہ کی مدد انہیں لوگوں کے ساتھ ہوتی ہے، جو صبر اور ثبات سے کام لیتے ہیں، حضرت طالوت اور جالوت کے قصہ میں بھی اسی کتنا کوان لفظوں میں ادا کیا گیا ہے:

﴿قَالُوا لَا طَاقَةَ لَنَا يَوْمَ يَجْلَوْتَ وَجَنُودَهُ قَالَ الَّذِينَ يَظْنُنُونَ أَنَّهُمْ مُلْقُوا اللَّهُ لَكُمْ مِنْ فِتْكِهِ قَلِيلٌ غَلَبْتَ فِتْنَةً كَثِيرَةً بِإِذْنِ اللَّهِ وَاللَّهُ مَعَ الصَّابِرِينَ وَلَمَّا بَرَزُوا لِيَ الْأُولَوَهُ وَجَنُودُهُ قَالُوا رَبَّنَا أَفْرِغْ عَلَيْنَا صَبْرًا وَتَبَّتْ أَقْدَامَنَا وَأَنْصَرْنَا عَلَى الْقَوْمِ الْكُفَّارِ﴾

(۲۴۹-۲۵۰/البقرة)

”طالوت کے ساتھیوں نے کہا کہ آج ہم میں جالوت اور اس کی فوج کے مقابلہ کی طاقت نہیں، انہوں نے جن کو خیال تھا کہ خدا سے ملتا ہے، یہ کہا کہ بسا اوقات تھوڑی تعداد کے لوگ خدا کے حکم سے بڑی تعداد کے لوگوں پر غالب آتے ہیں اور خدا صبر و ثبات دکھانے والوں کے ساتھ ہے اور جب یہ جالوت اور اس کی فوج کے مقابلہ میں آئے، تو بولے اے ہمارے پروردگار! ہم پر صبر بہا اور ہم کو ثابت قدمی بخش اور ان کا فاروں کے مقابلہ میں ہم کو فخرت عطا کر۔“

اللہ نے کمزور اور قلیل التعداد مسلمانوں کی کامیابی کی بھی بھی شرط رکھی ہے اور بتا دیا کہ خدا انہیں کا ہے،

جو صبر اور ثبات سے کام لیتے ہیں اور خدا کے بھروسہ پر مشکلات کا ذلت کر مقابلہ کرتے ہیں:

﴿لَمْ يَأْنِ رَبِّكَ لِلَّذِينَ هَاجَرُوا مِنْ بَعْدِ مَا قَيْقَنُوا إِنَّمَا جَهَدُهُو وَصَبَرُوا إِلَّا﴾ (۱۶/الحل: ۱۱۰)

”پھر تیرا پروردگار ان کے لیے ہے، جنہوں نے ایذا پانے کے بعد گھر یا چھوڑا، پھر لڑتے رہے اور صبر اور ثبات کے ساتھ ٹھہرے رہے۔“

دنیا کی سلطنت و حکومت ملنے کے لیے بھی اسی صبر و استقامت کے جو ہر پیدا کرنے کی ضرورت ہے، بنی اسرائیل کو فرعون کی غلامی سے نکلنے کے بعد اطراف ملک کے کفار سے جب مقابلہ آپڑا، تو حضرت موسیٰ علیہ السلام نے ان کو سپلا سبق یہ سکھایا:

«قَالَ مُوسَىٰ لِقَوْمِهِ اسْتَعِنُوْا بِاللَّهِ وَاصْبِرُوْا إِنَّ الْأَرْضَ يَلْوَثُ يُورِثُهَا مَنْ يَشَاءُ مِنْ عِبَادِهِ وَالْعَاقِبَةُ لِلْمُتَّقِينَ ۝» (۱۲۸: الاعراف)

”موسیٰ نے اپنے لوگوں سے کہا کہ خدا سے مدد چاہو اور صبر و استقامت سے کام لو، بے شک زمین خدا کی ہے، وہ جس کو چاہتا ہے اپنے بندوں میں سے اس کا مالک بناتا ہے اور انجام پر ہیز گاروں کے لیے ہے۔“

چنانچہ بنی اسرائیل مصر و شام و کنعان کی آس پاس یعنی والی بت پرست قوموں سے تعداد میں بہت کم تھے، لیکن جب انہوں نے ہمت دکھائی اور بہادرانہ استقامت اور صبر اور ثبات قدی سے مقابلے کیے تو ان کی ساری مشکلیں حل ہو گئیں اور کثیر التعداد دشمنوں کے نزد میں پھنسنے رہنے کے باوجود ایک مدت تک خود مختار سلطنت پر قابض اور دوسری قوموں پر حکومت کرتے رہے، اللہ تعالیٰ نے بنی اسرائیل کی اس کامیابی کا ازالی ایک لفظ صبر میں ظاہر کیا ہے، فرمایا:

«وَأَوْرَثْنَا الْقَوْمَ الَّذِينَ كَانُوا يَسْتَضْعِفُونَ مَشَارِقَ الْأَرْضِ وَمَعَارِيهَا الَّتِي بَرَّنَا فِيهَا وَنَمَّتْ كَلْمَةً رِبِّكَ الْحُسْنَى عَلَى بَقَى إِسْرَاعِيلَ ۝ يِمَّا صَدَرُوا وَدَمْرَنَا مَا كَانَ يَصْنَعُ فِرْعَوْنُ وَقَوْمُهُ وَمَا كَانُوا يَعْرِشُونَ ۝» (۱۳۷: الاعراف)

”اور ان لوگوں کو جو کمزور سمجھے جاتے تھے، اس زمین کی وراشت بخشی جس میں ہم نے برکت نازل کی ہے اور تیرے پروردگار کی اچھی بات بنی اسرائیل کے حق میں ان کے صبر اور ثبات کے سبب سے پوری ہوئی اور ہم نے فرعون اور اس کی قوم کے کاموں کو اور تعمیروں کو برداشت کر دیا۔“

اس سے ظاہر ہوا کہ بنی اسرائیل جیسی کمزور قوم فرعون جیسی طاقت کے سامنے اس لیے سربلد ہوئی کہ اس نے صبر و ثبات قدی سے کام لیا اور اسی کے نتیجے کے طور پر اللہ تعالیٰ نے ان کو شام کی بارکت زمین کی حکومت عطا فرمائی، چنانچہ اسی کی تصریح اللہ تعالیٰ نے ایک دوسرے موقع پر فرمائی:

﴿وَجَعَلْنَا مِنْهُمْ أَبْيَهَةً يَهْدُونَ بِاَمْرِنَا لَكُمْ صَبْرٌ وَّاَنْتُمْ بِالْيَقْنَى يُوقَنُونَ﴾ (۲۴)

(السجدۃ: ۲۴)

”اور بنی اسرائیل میں سے ہم نے ایسے پیشوں باۓ جو ہمارے حکم سے راہ دکھاتے تھے، جب انہوں نے صبر کیا اور ہمارے حکموں پر یقین رکھتے تھے۔“

آیت بالا نے بنی اسرائیل کی گزشتہ پیشوائی کے دو سبب بیان کیے ہیں، ایک احکام الہی پر یقین اور دوسرے ان احکام کی بجا آوری میں صبر اور ثبات قدم، یہی دو باتیں دنیا کی ہر قوم کی ترقی کا سانگ بنیاد ہیں، پہلے اپنے اصول کے صحیح ہونے کا شدت یقین اور پھر ان اصولوں کی تعلیل میں ہر قسم کی تکفیریں اور مصیبتوں کو خوشی خوشی جھیل لینا۔

غزوہ احمد میں مسلمانوں کو فتح نہیں ہوتی، بلکہ ستر مسلمان خاک و خون میں لمحڑ کر راہ خدا میں جانیں دیتے ہیں، بعض مسلمانوں میں اس سے افسردگی پیدا ہوتی ہے اور اللہ تعالیٰ ان کے اس حزن و ملال کے ازالہ کے لیے بیچھے پیغمبروں کی زندگی کی رواداں کو سناتا ہے:

﴿وَكَاتِئِنْ مِنْ نَّبِيٍّ قُتِلَ مَعَهُ رِبِيُّونَ كَثِيرٌ فَمَا وَهَنُوا لِمَا أَصَابَهُمْ فِي سَيِّلِ اللَّهِ وَمَا ضَعْفُوا وَمَا اسْتَكَأْنُوا وَلَلَّهُ يُحِبُّ الصَّابِرِينَ وَمَا كَانَ قُولَهُمْ إِلَّا أَنْ قَالُوا رَبِّنَا أَغْفِرْنَا نَا دُنُوبِنَا وَإِسْرَافِنَا فِي أَمْرِنَا وَتَبَتَّ أَقْدَامُنَا وَأَنْصُرْنَا عَلَى الْقَوْمِ الْكُفَّارِينَ﴾ (۱۶)

(آل عمران: ۱۴۶ - ۱۴۷)

”اور کتنے پیغمبر ہیں، جن کے ساتھ ہو کر بہت سے خدا کے طالب لڑے ہیں، پھر خدا کی راہ میں تکلیف اٹھا کر انہوں نے ہمت نہیں ہاری اور نہ ان کے دل بودے ہوئے اور اللہ تعالیٰ رہنے والوں (صابرین) کو دوست رکھتا ہے اور وہ یہی کہتے رہے کہ اے ہمارے پروردگار! ہمارے گناہوں کو اور کام میں ہماری زیادتی کو معاف کر اور ہمارے قدم ثابت رکھ اور کافروں کے مقابلہ میں ہماری مدد فرم۔“

اس آیت پاک نے غلط فہمیوں کے ان تو برتو پر دوں کو چاک کر دیا ہے جو صبر کی اصل حقیقت کے چیزوں پر ہیں اور بتا دیا کہ صبر دل کی کمزوری، بے بسی کی خاموشی اور بے کسی کے مجبور اور گزر کا نہیں، بلکہ دل کی انتہائی قوت و ہمت کی بندی، عزم کی استواری اور مشکلات اور مصائب کو خدا کے بھروسہ پر خاطر میں نہ لانے کا نام ہے، ایک صابر کا کام یہ ہے کہ مخالف حادثوں کے پیش آ جانے پر بھی وہ دل برداشت نہ ہو، ہمت نہ ہارے اور اپنے مقصد پر جمارے اور خدا سے دعا کرتا رہے کہ وہ اس کی گزشتہ ناکامی کے قصور کو جو اسی کی کمی (ذنب) یا زیادتی (اسراف) سے سرزد ہوا ہے، معاف فرمائے اور اس کو مزید ثبات قدم عطا کر کے حق کے

دشمنوں پر کامیابی بخشنے، اسی لیے اللہ تعالیٰ نے کامیابی کے حصول کے لیے مسلمانوں کو دو باتوں کی تاکید فرمائی، ایک تو خدا کی طرف دل لگانا اور دوسرا مسئلہ مشکلات پر صبر و استقامت سے قابو پانا۔

دنیا کی فتح یا بیان کے ساتھ آخرت کا عیش بھی جس کا نام جنت ہے، انہیں کے حصہ میں ہے، جن کو یہ پامردی، دل کی مضبوطی اور حق پر ثبات قدم کی دولت ملی، حق کی راہ میں مشکلات کے پیش آنے کی ایک مصلحت یہ بھی ہے کہ ان سے کھرے کھوئے کی تمیز ہو جاتی ہے اور دونوں الگ الگ معلوم ہونے لگتے ہیں، چنانچہ فرمایا:

﴿أَمْ حَيْثُمَاً أَنْ تَدْخُلُوا الْجَنَّةَ وَلَمَّا يَعْلَمُ اللّٰهُ الَّذِينَ جَهَدُوا مِنْكُمْ وَيَعْلَمُ الصَّابِرِينَ﴾

(۱۴۲ آل عمران: ۳)

”کیا تم سمجھتے ہو کہ جنت میں چلے جاؤ گے اور ابھی اللہ نے (آزمکر) ان کو الگ نہیں کر دیا جو لڑنے والے ہیں اور جو بابت قدم (صابر) ہیں۔“

ضبط نفس

اشخاص اور قوموں کی زندگی میں سب سے نازک موقع وہ آتا ہے، جب وہ کسی بڑی کامیابی یا ناکامی سے دوچار ہوتی ہیں، اس وقت نفس پر قابو رکھنا اور ضبط سے کام لینا مشکل ہوتا ہے، مگر یہی نفس کا اصلی موقع ہوتا ہے اور اسی سے اشخاص اور قوموں میں سنجیدگی، متانت، وقار اور کیر کٹر کی مضبوطی پیدا ہوتی ہے۔ دنیا میں غم و مسرت اور رنج و راحت تو ام ہیں، ان دونوں موقعوں پر انسان کو ضبط نفس اور اپنے آپ پر قابو کی ضرورت ہے، یعنی نفس پر اتنا قابو ہو کہ مسرت اور خوشی کے نشانہ میں اس میں فخر و غرور پیدا نہ ہو اور غم و تکلیف میں وہ اداں اور بدول نہ ہو، دل کے ان دونوں عیوبوں کا علاج صبر و ثبات اور ضبط نفس ہے، انسانی فطرت کے رازدار کہنا ہے:

﴿وَلَئِنْ أَذْفَنَ الْإِنْسَانَ وَنَأَرَ حَمَّةً لَمْ يَرْعِنْهَا فِنَّهُ إِنَّهُ لَيُؤْسِنْ كَفُورٌ وَلَئِنْ أَذْفَنَهُ نَعْمَاءً

بَعْدَ صَرَاءَ مَسْتَهُ لَيَقُولَنَّ ذَهَبَ الشَّيْطَانُ عَيْنِ طِ إِنَّهُ لَفَرِيعَمْ كَفُورٌ إِلَّا الَّذِينَ صَبَرُوا

وَعَمِيلُوا الصَّلِحَاتِ أُولَئِكَ لَهُمْ مَغْفِرَةٌ وَأَجْرٌ بِيْرٌ﴾ (۱۱/ ۹-۱۱ هود:)

”اور اگر ہم انسان کو اپنے پاس سے کسی مہربانی کا مزہ پچھائیں، پھر اس سے اس کو اتار لیں تو وہ نا امید اور ناشکرا ہو جاتا ہے اور اگر کوئی مصیبت کے بعد اس کو نعمت کا مزہ پچھائیں، تو کہتا ہے کہ برائیاں مجھ سے دور ہو گئیں، بے شک وہ شاداں اور نزاں ہے، لیکن وہ جنہوں نے صبر (یعنی نفس پر قابو) رکھا اور اپنے کام کیے، یہ لوگ ہیں جن کے لیے معافی اور بڑا انعام ہے۔“

ہر طرح کی تکلیف اٹھا کر فرض کو بھیشہ ادا کرنا

ہنگامی واقعات اور وقتی مشکلات پر صبر و پامردی سے ایک معنی بڑھ کر وہ صبر ہے جو کسی فرض کو عمر بھر پورے استقلال اور مضبوطی سے ادا کرنے میں ظاہر ہوتا ہے، اسی لیے مذہبی فرانپ و احکام کو جو بہر حال نفس پر

سخت گزرتے ہیں، عمر بھر پوری مضبوطی سے ادا کرتے رہنا بھی صبر ہے، ہر حال اور ہر کام میں خدا کے حکم کی فرمائی داری اور عبودیت پر ثبات، نفس انسانی کا سب سے بڑا متحان ہے، اسی لیے حکم ہوا:

﴿رَبُّ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ وَمَا بَيْنَهُمَا فَاعْبُدُهُ وَاصْطَبِرْ لِعَبَادِهِ﴾ (۱۹ / مریم: ۶۵)

”آسمانوں کا پروردگار اور زمین کا اور جوان دونوں کے بیچ میں ہے سب کا، تو اس کی بندگی کر اور اس کی بندگی پر تھہراہ (صبر کر)۔“

ایک اور آیت میں نماز پڑھتے رہنے اور اپنے اہل و عیال پر بھی اس کی تائید رکھنے کے سلسلہ میں ہے:

﴿وَأَمْرَأَهُلَكَ بِالصَّلَاةِ وَاصْطَبِرْ عَلَيْهَا﴾ (۲۰ / طہ: ۱۳۲)

”اور اپنے گھر والوں کو نماز کا حکم کر اور آپ اس پر قائم رہ۔“

یعنی تمام عمر یہ فریضہ پابندی کے ساتھ ادا ہوتا رہے۔

حسب ذیل آیتوں میں غالباً صبراً اسی مفہوم میں ہے، وہ لوگ جو خدا کے سامنے حاضری کے دن سے ڈرا کرتے تھے، اللہ تعالیٰ ان کو خوب خبری سناتا ہے:

﴿فَوَقِيمَا لَهُ شَرَّ ذِلِّكَ الْيَوْمِ وَلَقَهُمْ نَضْرَةٌ وَسُرُورٌ وَّجَزَّهُمْ بِمَا صَبَرُوا جَنَّةٌ وَحَرِيرٌ﴾

(۱۱-۱۲ / الدھر: ۷۶)

”تو اللہ نے ان کو اس دن کی برائی سے بچالیا اور ان کو تروتازگی و شادمانی سے ملایا اور ان کے صبر کرنے (یعنی احکامِ الہی پر تھہراہ رہنے) کے سبب سے باغ اور ریشمی بس بدله میں دیا۔“

وہ لوگ جو خدا کی بارگاہ میں توبہ کریں، ایمان لائیں، نیک کام کریں، فریب کے کاموں میں شریک نہ ہوں، بے ہودہ اور لغو کاموں کے سامنے سے ان کو گزرنا پڑے تو بزرگی کے رکھ رکھاؤ سے گزر جائیں اور خدا کی باتوں کو سن کر اطاعت مندی سے اس کو قبول کریں اور اپنی اولاد کی بہتری اور پیشوائی کی دعا کیں مانگیں، ان کے لیے اللہ تعالیٰ اپنے فضل و کرم کی یہ بشارت سناتا ہے:

﴿أُولَئِكَ يُجِزُّونَ الْفُرْفَةَ بِمَا صَبَرُوا﴾ (۲۵ / الفرقان: ۷۵)

”ان کو ہشت کا جھروکہ بدله میں ملے گا کہ وہ صبر کرتے رہے۔“

ان دونوں آیتوں میں صبراً کا مفہوم یہی ہے کہ نیک کاموں کو بار خاطر، خلاف طبع اور تکلیف و مشقت ہونے کے باوجود خوشی خوشی عمر بھر کرتے رہے اور بری باتوں سے باوجود داس کے کہ ان میں ظاہری خوشی اور آرام ہے، بچتے رہے، راتوں کو زرم بستروں سے اٹھ کر خدا کے آگے سرخود ہونا، صبح کو خواب بحر کی لذت سے کنارہ کش ہو کر دو گانہ ادا کرنا، الوان نعمت کی لذتوں سے محروم ہو کر روزے رکھنا، تکلیف و مشقت ہونے کے باوجود خطرناک موقعوں پر بھی سچائی سے بازنہ آنا، قبول حق کی راہ میں شدائد کو آرام دراحت جان کر جھیل لینا،

سود کی دولت سے ہاتھ اٹھایا، حسن و جمال کی بے قید لذت سے متعین نہ ہونا، غرض شریعت کے احکام کی بجا آوری اور پھر اس پر عمر بھر، استواری اور پائیداری، صبر کی بہت ہی کڑی منزل ہے اور اسی لیے ایسے صابروں کی جزا بھی خدا کے ہاں بھاری ہے۔

ان آیات پاک کی اس تشریع میں وہ حدیث یاد آتی ہے، جس میں آنحضرت ﷺ نے فرمایا:

(حجَّبَتْ (حُقْتَ) الْجَنَّةِ بِالْمَكَارِهِ وَحُجَّبَتْ (حُفَّتَ) النَّارُ بِالشَّهْوَاتِ).

”جنت ناخوشی کے کاموں اور دوزخ نفسانی لذتوں کے کاموں سے ڈھانپی گئی ہے۔“

یعنی نیکی کے ان کاموں کا کرنا جن کا معاوضہ جنت ہے، اس وقت دنیا میں نفس پر شاق گزرتا ہے اور گناہوں کے وہ کام جن کی سزا دوزخ ہے، اس وقت دنیا میں بڑے پُر لطف اور لذت بخش معلوم ہوتے ہیں اور اس عارضی و ہنگامی ناخوشی کی پرواکے بغیر احکام الہی کرنا بڑے صبر اور برداشت کا کام ہے، کسی قارون کے خزانہ، مال و دولت کی فراوانی اور اسباب عیش کی بہتات کو دیکھ کر، اگر کسی کے منہ میں پانی نہ بھر آئے اور اس وقت بھی مالِ حرام کی کثرت کے لامبے کے بجائے، مالی حلال کی قلت کو صبر کر کے خوشی کے ساتھ برداشت کر لے، تو یہ بڑی قوت کا کام ہے، جو صرف صابروں کو ملی ہے۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام کے زمانہ میں جو قارون تھا، اس کے مال و دولت کو دیکھ کر بہت سے ظاہر پرست لامبے میں پڑ گئے، لیکن جن میں صبر و برداشت کا جو ہر تھا، ان کی چشم میں اس وقت بھی کھلی ہوئی تھی اور ان کو نظر آتا تھا کہ یہ فانی اور آنی جانی چیز کے دن کی ہے، خدا کی وہ دولت جو نیکو کاروں کو بہشت میں ملے گی، وہ لا زوال، غیر فانی اور جاودا نی ہے:

﴿قَالَ الَّذِينَ يُرِيدُونَ الْحَيَاةَ الدُّنْيَا لِلَّيْلَتِ لَنَا مِثْلُ مَا أَوْقَى قَاتِلُونَ لَا إِلَهَ لَدُوْحَطَّ عَظِيمٌ﴾

﴿وَقَالَ الَّذِينَ أُتُوا الْعِلْمَ وَيَلْكُمُ تَوَابُ اللَّهِ خَيْرٌ لِمَنْ أَمْنَ وَعَمِلَ صَالِيًّا وَلَا يُلْقِهَا إِلَّا

الصَّيْرُونَ﴾ (القصص: ٢٨-٧٩)

”جو لوگ حیات دنیاوی کی آرائش کے خواہاں تھے، وہ بولے اے کاش! ہمارے پاس بھی وہ ہوتا جو قارون کو دیا گیا، وہ بڑا خوش قسمت ہے اور جنہیں علم ملا تھا، انہوں نے کہا، تمہارا اُب اے، اللہ کی جزاں کے لیے جو ایمان لائے اور نیک کام کیے سب سے اچھی چیز ہے اور اس حقیقت کو وہی پاسکتے ہیں جو صابر ہیں۔“

یہ اجر اور جزا بہتر سے بہتر ہو گی، کیونکہ یہ اس خزانے سے ملے گی جو لازوال اور باقی ہے:

﴿مَا عِنْدَهُمْ يَنْفَدُ وَمَا عِنْدَ اللَّهِ بَاقِيٌّ وَلَنَعْرِيْنَ الَّذِينَ صَبَرُوا أَجْرُهُمْ بِأَحْسَنِ مَا كَانُوا

* صحیح بخاری، کتاب الرفاقت، باب حجت النار بالشهوات: ٦٤٨٧؛ مسند احمد، ج ٢، ص: ٣٣٣۔

يَعْلَمُونَ ۝ (١٦/النحل: ٩٦)

”جو تمہارے پاس ہے، وہ ختم ہو جائے گا اور جو خدا کے پاس ہے وہ رہ جانے والا ہے اور یقیناً ہم ان کو جنہوں نے صبر کیا ان کی مزدوری ان کے بہتر کاموں پر دیں گے۔“

ایک اور جگہ فرمایا کہ نمازیں ادا کیا کرو، کہ نیکیاں بدیوں کو دھو دیتی ہیں، اس پیغام میں نصیحت قبول کرنے والوں کے لیے نصیحت اور یادو بانی ہے، اس کے بعد ہے:

﴿وَاصْبِرْ فَإِنَّ اللَّهَ لَا يُضِيعُ أَجْرَ الْمُحْسِنِينَ ۝﴾ (١١٥/ہود: ١١٥)

”اور صبر کر کر کے شبہ اللہ نیک کام کرنے والوں کی مزدوری ضائع نہیں کرتا۔“

صبر کے فضائل اور انعامات

یہ مزدوری کیا ہوگی؟ یہ حد اور شمار سے باہر ہوگی:

﴿إِنَّمَا يُؤْثِرُ الصَّابِرُونَ أَجْرُهُمْ بِغَيْرِ حِسَابٍ ۝﴾ (٣٩/الزمیر: ٣٩)

”صبر کرنے والوں کو تو ان کی مزدوری بے حساب ملے گی۔“

جن محاسن اور حمدِ صفات اور اعلیٰ اخلاق کا درجہ اس دنیا اور آخرت میں سب سے زیادہ ہے، ان میں

صبر و برداشت کا بھی شمار ہے:

﴿إِنَّ الْمُسْلِمِينَ وَالْمُسْلِمَاتِ وَالْمُؤْمِنِينَ وَالْمُؤْمِنَاتِ وَالْفَتَنِينَ وَالْقَنِينَ وَالصَّدِيقِينَ وَالصَّدِيقَاتِ وَالصَّابِرِينَ وَالصَّابِرَاتِ وَالْحَشِيعِينَ وَالْخَيْثِعِينَ وَالْمُتَصَدِّقِينَ وَالْمُتَصَدِّقَاتِ وَالصَّابِرِيْنَ وَالصَّابِرَاتِ وَالْحَفِظِيْنَ فَرُوجَهُمْ وَالْحَفِظِيْنَ وَالذِّكْرِيْنَ اللَّهُ كَثِيرًا وَالذِّكْرِيْتَ أَعَدَ اللَّهُ لَهُمْ مَغْفِرَةً وَأَجْرًا عَظِيمًا ۝﴾ (٣٥/الاحزاب: ٣٥)

”بے شک مسلمان مرد اور مسلمان عورتیں اور ایماندار مرد اور ایماندار عورتیں اور بندگی کرنے والے مرد اور بندگی کرنے والی عورتیں اور سچے مرد اور سچی عورتیں اور محنت سہنے والے مرد (صابرین) اور محنت سہنے والی عورتیں (صابرات) اور (خدا کے سامنے) بھکنے والے مرد اور بھکنے والی عورتیں اور خیرات کرنے والے مرد اور خیرات کرنے والی عورتیں اور روزہ دار مرد اور روزہ دار عورتیں اور اپنی شرمگاہوں کی حفاظت کرنے والے مرد اور حفاظت کرنے والی عورتیں اور خدا کو بہت یاد کرنے والے مرد اور بہت یاد کرنے والی عورتیں، اللہ نے ان کے لیے تیار رکھی ہے معافی اور بڑی مزدوری۔“

اس آیت سے معلوم ہوا کہ صبر کا مرتبہ بڑی بڑی نیکیوں کے برابر ہے، اس سے انسان کی بچپن غلطیاں حرف غلط کی طرح مت جاتی ہیں اور دین دنیا کی بڑی سے بڑی مزدوری اس کے معاوضہ میں ملتی ہے، یہی

بشارت ایک اور آیت میں بھی ہے:

﴿الَّذِينَ يَقُولُونَ رَبَّنَا إِلَّا أَنَا أَمْنَى فَأَغْفِرْ لَنَا ذُنُوبَنَا وَقَنَا عَذَابَ النَّارِ إِلَّا الصَّابِرُونَ وَالصَّدِيقُونَ وَالْقَنِيْتُونَ وَالْمُنْفِقُونَ وَالْمُسْتَغْفِرُونَ بِالْأَسْحَارِ﴾ (آل عمران: ۱۶-۱۷)

”(جنت اور خدا کی خوشنودی ان کو حاصل ہوگی) جو کہتے ہیں کہ اے ہمارے پروردگار! ہم ایمان لا چکے، ہمارے گناہوں کو معاف کر اور ہم کو وزخ کے عذاب سے بچا اور صبر کرنے والے (یعنی مشکلات کی محنت کو اٹھایئے والے) اور سچ بولنے والے اور بندگی میں لگے رہنے والے اور (خدا کی راہ میں) خرچ کرنے والے اور بچھلی راتوں کو خدا سے اپنے گناہوں کی معافی مانگنے والے۔“

اس آیت میں ایک عجیب نکتہ ہے، اس خوش قسمت جماعت کے اوصاف کا آغاز بھی دعا سے اور خاتمه بھی دعا پر ہے اور ان دونوں کے بین میں ان کے چار اوصاف گنانے ہیں، جس میں پہلا درجہ صبر، یعنی محنت سہارنے، تکلیف جھیلنے اور پامردی دکھانے کا ہے، دوسراست اسی اور راست بازی کا، تیسرا خدا کی بندگی و عبودیت کا اور چوتھا راه خدا میں خرچ کرنے کا۔

فتح مشکلات کی بخشی صبراً و دعا

بعض آیتوں میں ان تمام اوصاف کو صرف دلفظوں میں سمیٹ لیا گیا ہے، دعا اور صبراً و فرمایا گیا ہے کہ یہی دو چیزیں مشکلات کے طلبہ کی بخشی ہیں، پہلو جو آنحضرت ﷺ کے پیغام کو قبول نہیں کرتے تھے، اس کے دو سبب تھے، ایک یہ کہ ان کے دلوں میں گداز اور تاشر نہیں رہا تھا اور دوسرا یہ کہ پیغام حق قبول کرنے کے ساتھ ان کو جو جانی و مالی دشواریاں پیش آئیں، یہ عیش و عشرت اور ناز و نعمت کے خواہ ہو کر، ان کو برداشت نہیں کر سکتے تھے، اسی لیے محمد رسول اللہ ﷺ کی طب روحانی نے ان کی بیماری کے لیے یہ نسخہ تجویز کیا:

﴿وَاسْتَعِينُوا بِالصَّبْرِ وَالصَّلْوةِ﴾ (۴۵/ البقرة)

”او صبراً (محنت اٹھانے) اور دعا مانگنے سے قوت پکڑو۔“

دعا سے ان کے دل میں اثر اور طبیعت میں گداز پیدا ہوگا اور صبراً کی عادت سے قبول حق کی راہ کی مشکلیں دور ہوں گی، ہجرت کے بعد جب قریش نے مسلمانوں کے برخلاف تلواریں اٹھائیں اور مسلمانوں کے ایمان کے لیے اخلاص کی ترازو میں تلنے کا وقت آتا تو یہ آئیں نازل ہوئیں:

﴿يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا اسْتَعِينُوا بِالصَّبْرِ وَالصَّلْوةِ إِنَّ اللَّهَ مَمْنَعُ الصَّابِرِينَ وَلَا تَقُولُوا لِمَنْ يُفْكِلُ فِي سَبِيلِ اللَّهِ أَمْوَالَهُ بَلْ أَحْيِاءَ وَلَكِنْ لَا تَشْعُرُونَ وَلَكِنْ يُؤْتَمْ يُكَيِّعُ مِنْ الْخُوفَ وَالْجُوعَ وَنَقْصِنَ مِنَ الْأَمْوَالِ وَالْأَنْفُسِ وَالثَّمَرَاتِ وَبَقِيرُ الصَّابِرِينَ الَّذِينَ إِذَا

أَصَابَتْهُمْ مُّصِيبَةٌ ۝ قَاتَلُوا إِنَّا لِلّٰهِ وَإِنَّا إِلَيْهِ رَجُعُونَ ۝ أُولَئِكَ عَلَيْهِمْ صَلَوةٌ مِّنْ رَّبِّهِمْ
وَرَحْمَةٌ ۝ وَأُولَئِكَ هُمُ الْمُهَتَّدُونَ ۝ (٢/١٥٣-١٥٧)

”اے ایمان والو! صبر (ثابت قدی) اور دعا سے قوت پکڑو، بے شک اللہ صبر والوں (ثابت
قدم رہنے والوں) کے ساتھ ہے اور جو خدا کی راہ میں مارے جاتے ہیں، ان کو مردہ کہو، بلکہ
زندہ ہیں، لیکن تم کو خبر نہیں اور ہم تم کو کسی قدر خطرہ اور بھوک اور مال و جان اور پیداوار کے کچھ
نقسان سے آزمائیں گے اور صبر والوں (یعنی ثابت قدم رہنے والوں) کو خوش خبری سنادو، جن
کو جب کوئی مصیبت پیش آئے تو کہیں کہ ہم اللہ کے ہیں اور ہم کو اللہ ہی کے پاس لوٹ کر جانا
ہے، یہ لوگ ہیں، ان پر ان کے پروردگار کی شabaشیں اور مہربانیاں ہیں اور یہی ہیں ٹھیک راہ پر۔“
ان آیات نے بتایا کہ مسلمانوں کو کیونکر زندہ رہنا چاہیے، جان و مال کی جو مصیبت پیش آئے اس کو صبر،
ضبط نفس اور ثابت قدی سے برداشت کریں اور یہ سمجھیں کہ ہم خدا کے حکوم ہیں، آخ رہا زگشت اسی کی طرف ہو
گی، اس لیے حق کی راہ میں مرنے اور مال و دولت کو لٹانے سے ہم کو دریغ نہ ہونا چاہیے، اگر اس راہ میں موت
بھی آجائے تو وہ حیات جاوید کی بشارت ہی ہے۔

شکر

﴿وَكُنْ مِّنَ الشَّاكِرِينَ﴾ (۷/الاعراف: ۱۴۴)

لغت میں شکر کے اصلی معنی یہ ہیں کہ ”جانور میں تھوڑے سے چارہ ملٹے پر بھی تروتازگی پوری ہوا ور دوہر زیادہ وے“۔ اس سے انسانوں کے محاورہ میں یہ معنی پیدا ہوئے کہ کوئی کسی کا تھوڑا سا بھی کام کر دے تو وہ اس کی پوری قدر کرے، یہ قدر شناسی تین طریقوں سے ہو سکتی ہے۔ دل سے، زبان سے اور ہاتھ پاؤں سے یعنی دل میں اس کی قدر شناسی کا جذبہ ہو۔ زبان سے اس کے کاموں کا اقرار ہو اور ہاتھ پاؤں سے اس کے ان کاموں کے جواب میں ایسے افعال صادر ہوں جو کام کرنے والے کی براہمی کو ظاہر کریں۔

شکر کی نسبت جس طرح بندوں کی طرف کی جاتی ہے۔ خدا نے قرآن پاک میں اپنی طرف بھی کی ہے اور اس سے مقصود یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کے ذرا ذرا سے نیک کاموں کی پوری قدر کرتا ہے اور ان کو ان کا پورا بدلہ عطا فرماتا ہے۔

شکر کا الٹ کفر ہے۔ اس کے لغوی معنی چھپانے کے ہیں اور محاورہ میں کسی کے کام یا احسان پر پردہ ڈالنے اور زبان و دل سے اس کے اقرار اور عمل سے اس کے اظہار نہ کرنے کے ہیں، اسی سے ہماری زبان میں ”کفر ان نعمت“ کا لفظ استعمال میں ہے۔

یہی کفر وہ لفظ ہے جس سے زیادہ کوئی برالفاظ اسلام کی لغت میں نہیں، اللہ پاک کے احسانوں اور نعمتوں کو بھلا کر دل سے اس کا احسان مند نہ بنتا، زبان سے ان کا اقرار اور عمل سے اپنی اطاعت شعاری اور نرمانبرداری ظاہر نہ کرنا کفر ہے، جس کے مرتكب کا نام کافر ہے۔

اس سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ جس طرح کفر اسلام کی نگاہ میں بدترین خصلت ہے، اس کے بالمقابل شکر سب سے بہتر اور اعلیٰ صفت ہے، قرآن پاک میں یہ دونوں لفظ اسی طرح ایک دوسرے کے بالمقابل بولے گئے ہیں:

﴿إِنَّا هَدَيْنَا السَّبِيلَ إِما شَاكِرًا وَإِما كَفُورًا﴾ (۷۶/الدھر: ۳)

”ہم نے انسان کو راستہ بتایا (اب وہ) یا شکر گزار (شکر) ہو یا ناشکر (کافر) ہو گیا۔“

﴿إِنْ شَكَرْتُمْ لَا زَيْدَ تَلَمُّدُ وَإِنْ كَفَرْتُمْ لَأَنَّ عَذَابَنِي شَدِيدٌ﴾ (۱۴/ابراهیم: ۷)

”اگر تم نے شکر کیا تو ہم تمہیں بڑھائیں گے اور اگر ناشکری (کافر) کی تو بے شک میرا عذاب بہت سخت ہے۔“

اس مقابل سے معلوم ہوا کہ اگر کفر اللہ تعالیٰ کے احسانوں اور نعمتوں کی ناقدری کر کے اس کی نافرمانی کا نام ہے تو اس کے مقابلہ میں شکر کی حقیقت یہ ہو گی کہ اللہ تعالیٰ کے احسانات اور نعمتوں کی قدر جان کر اس کے

احکام کی اطاعت اور دل سے فرمانبرداری کی جائے، حضرت ابراہیم علیہ السلام کی نسبت اللہ پاک کی شہادت ہے:

﴿إِنَّ إِبْرَاهِيمَ كَانَ أُمَّةً قَانِتًا لِّلَّهِ حَنِيفًا وَلَمْ يَكُنْ مِّنَ الْمُشْرِكِينَ ﴾ شَاکرًا لِّلْأَعْيُمْ

﴿إِحْتَبْرَهُ وَهَدَاهُ إِلَى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيمٍ﴾ (۱۶ / التحلیل: ۱۲۰-۱۲۱)

”در اصل ابراہیم دین کی راہ ڈالنے والا اور اللہ کا فرمانبردار اس کو ایک ماننے والا تھا اور شرک کرنے والوں میں سے نہ تھا۔ اللہ کے احسانوں اور نعمتوں کا شکرگزار اللہ نے اس کو جن لیا اور اس کو سیدھی راہ دکھائی۔“

اس آیت سے معلوم ہوا کہ اللہ تعالیٰ کی نعمتوں اور احسانوں کی شکرگزاری یہ ہے کہ دین کی راہ اختیار کی جائے، احکام الہی کی پیروی کی جائے اور شرک سے پر بیز کیا جائے۔ اس کا نتیجہ یہ ہو گا کہ خدا ہم کو قبول فرمائے گا اور ہر علم و عمل میں ہم کو سیدھی راہ دکھائے گا۔

اس تفصیل سے پتہ چلا کہ شکر ایمان کی جڑ، دین کی اصل اور اطاعت الہی کی بنیاد ہے۔ یہی وجہ ہے جس کی بنا پر بندہ کے دل میں اللہ تعالیٰ کی تదرویج و عظمت اور محبت پیدا ہوئی چاہیے اور اسی تدرویج و عظمت اور محبت کے قوی و عملی اظہار کا نام شکر ہے، اسی لیے اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

﴿مَا يَفْعَلُ اللَّهُ بِعَدِ إِلَكُمْ إِنَّ شَكْرَهُمْ وَأَمْنَتْهُمْ وَكَانَ اللَّهُ شَاكِرًا عَلَيْهِمَا﴾

(۱۴۷ / النساء: ۴)

”اگر تم شکر کرو اور ایمان لاو تو خدا تم کو عذاب دے کر کیا کرے گا اور اللہ تو قدر پہچانے والا اور علم رکھنے والا ہے۔“

یعنی اللہ تعالیٰ اپنے بندوں سے صرف دو باتیں چاہتا ہے۔ شکر اور ایمان، ایمان کی حقیقت تو معلوم ہے۔ اب رہا شکر تو شریعت میں جو کچھ ہے، وہ شکر کے دائرہ میں داخل ہے۔ ساری عبادتیں شکر ہیں۔ بندوں کے ساتھ حسن سلوک اور نیک برداشت کی حقیقت بھی شکر ہی ہے۔ دولت مندا اگر انہی دولت کا کچھ حصہ خدا کی راہ میں دیتا ہے تو یہ دولت کا شکر ہے۔ صاحب علم اپنے علم سے بندگانِ اللہ کو فائدہ پہنچاتا ہے تو یہ علم کی نعمت کا شکر ہے۔ طاقتوں کمزوروں کی امدادر اور اعانت کرتا ہے تو یہ بھی قوت و طاقت کی نعمت کا شکرانہ ہے۔ الغرض شریعت کی اکثر باتیں اسی ایک شکر کی تفصیلیں ہیں، اسی لیے شیطان نے جب خدا سے یہ کہنا چاہا کہ تیرے اکثر بندے تیرے حکموں کے نافرمان ہوں گے تو یہ کہا:

﴿وَلَا تَجِدُ الْكُثُرُهُمْ شَكِيرِينَ﴾ (۱۷ / الاعراف: ۷)

”تو ان میں سے اکثر کوشکر نے والا نہ پائے گا۔“

خود اللہ تعالیٰ نے اپنے نیک بندوں کو جزا دیتے ہوئے اسی لفظ سے یاد فرمایا:

﴿وَسَجَّنَى الشَّكِيرِينَ ﴾ (۱۴۵) /آل عمران:

”اور ہم شکر کرنے والے کو حزادیں گے۔“

پوری شریعت کا حکم اللہ تعالیٰ ان افظุوں میں دیتا ہے:

﴿تَلِّيَ اللَّهُ فَأَعْبُدُ وَكُنْ تِنْ الشَّكِيرِينَ ﴾ (۳۹) / الزمر:

”بلکہ اللہ کی بندگی کر اور شکرگزاروں میں سے ہو۔“

شکر۔ اس جذبہ کو ہم کبھی زبان سے ادا کرتے ہیں، کبھی اپنے ہاتھ پاؤں سے پورا کرتے ہیں، کبھی اس کا بدله دے ل راس قرض کو اتارتے ہیں، زبان سے اس فرض کے ادا کرنے کا نام اللہ تعالیٰ کے تعلق سے قرآن میں اصطلاح میں ہے۔ جس کے مطالبے سے پورا قرآن بھرا ہوا ہے اور یہی سبب ہے کہ محدثین میں اللہ تعالیٰ کے ان صفات کاملہ کا ذکر ہوتا ہے جو ان احسانوں اور فتوؤں کی پہلی اور اصلی محک ہیں اور اسی لیے یہ کہنا چاہیے کہ جس طرح سارے قرآن کا نچوڑ سورہ فاتحہ ہے، سورہ فاتحہ کا نچوڑ خدا کی حمد ہے، اسی بنا پر قرآن پاک کا آغاز سورہ فاتحہ سے اور سورہ فاتحہ کا آغاز الحمد سے ہے:

﴿الْحَمْدُ لِلَّهِ رَبِّ الْعَالَمِينَ ﴾ (۱) / الفاتحة:

”سارے جہان کے پروردگار کی حمد ہے۔“

جہان اور جہان میں جو کچھ رنگ برنگ کی مخلوقات اور جیسا بات ہیں، سب کی پروردش اور زندگی اور بقا اسی ایک کام ہے، اسی کے سہارے وہ جی رہے ہیں اور نکھر رہے ہیں، اس لیے حمد اسی ایک کی ہے، یہ تو دنیا کے نیزگ قدرت کا آغاز ہے، لیکن دنیا جب اپنی تمام منازل حیات کو طے کر کے فنا ہو چکے گی اور یہ موجودہ زمین اور آسمان اپنا فرض ادا کر کے نئی زمین اور نئے آسمان کی صورت میں ظاہر ہو چکیں گے، پہلی دنیا کے عمل کے مطابق ہر شخص اس دوسرا دنیا میں اپنی زندگی پا چکے گا۔ یعنی نیک اپنی نیکی کی جزا اور بد اپنی بد کی سزا پا چکیں گے اور اہل جنت، جنت میں اور اہل دوزخ دوزخ میں جا چکیں گے، وہ، وقت ہو گا جب دنیا اپنے اس نظام یادورہ کو پورا کر چکی ہو گی، جس کے لیے خدا نے اس کو بنایا تھا۔ اس وقت عالمِ امکان کے ہر گوشے سے یہ سریلی آواز بلند ہو گی:

﴿وَقَيْلَ الْحَمْدُ لِلَّهِ رَبِّ الْعَالَمِينَ ﴾ (۷۵) / الزمر:

”سارے جہان کے پروردگار کی حمد ہے۔“

حمد کا ترانہ موجودہ دنیا کے ایک ایک ذرہ سے آج بھی بلند ہے:

﴿وَلَهُ الْحَمْدُ فِي السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ ﴾ (۲۰) / الروم:

”اسی کی حمد آسمانوں میں ہے اور زمین میں ہے۔“

فرشتے بھی اسی حمد میں مشغول ہیں:

﴿الَّذِينَ يَجْهَلُونَ الْعُرْشَ وَكُنْ حَوْلَهُ يُسْجُونُ بِمُهْمَدٍ رَّبِّهِمْ﴾ (۴۰/ المؤمن: ۷)

”جو عرش کو اٹھائے ہیں اور جو اس کے چاروں طرف ہیں، وہ اپنے پروردگار کے حمد کی تسبیح کرتے ہیں۔“

بلکہ عرصہ وجود کی ہر چیز اسی کی حمد و تسبیح میں لگی ہوئی ہے:

﴿وَإِنْ قَنْ شَفَعَ إِلَّا يُسْتَحْمَدُ بِمُهْمَدِهِ﴾ (۱۷/ بنی اسراء: ۴۴)

”اور کوئی چیز نہیں جو اس (خدا) کی حمد کی تسبیح نہ کرتی ہو۔“

یہی شکرانہ کی حمد و تسبیح ہے، جس کا مطالبہ انسانوں سے ہے:

﴿سَيِّدُهُمْ مُهَمَّدُ رَبِّكُمْ﴾ (۴۰/ المؤمن: ۵۲، ۵۵/ الطور: ۸)

”اپنے پروردگار کی حمد کی تسبیح کر۔“

آنحضرت ﷺ کے سنن اور شاہکل میں ہر وقت اور ہر موقع کی اس کثرت سے جودا میں ہیں۔ مثلاً: کھانا کھانے کی، نئے کپڑے پہننے کی، سونے کی، سوکر جانے کی، نئے پھل کھانے کی، مسجد میں جانے کی، طہارت خانہ سے نکلنے کی، وغیرہ وغیرہ، ان سب کا نشاۃ اللہ تعالیٰ کی ان نعمتوں کی حمد اور زبان سے اس کا شکر یہ ادا کرتا ہے، لیکن زبان کا یہ شکر یہ دل کا ترجمان اور قبلی کیفیت کا بیان ہونا چاہیے۔

اللہ تعالیٰ نے ہم کو جسمانی نعمتیں عنایت فرمائی ہیں، ان کا شکر یہ یہ ہے کہ ہم اپنے ہاتھ پاؤں کو خدا کے حکموں کی تعییں میں لگا رکھیں اور ان سے ان کی خدمت کریں جو اس جسمانی نعمت کے کسی جزو سے محروم ہیں مثلاً: جو اپنی اور معدود رہوں، بیمار ہوں، کسی جسمانی قوت سے محروم ہوں یا کسی عضو سے بیکار ہوں، مالی نعمتوں کا شکر یہ یہ ہے کہ جو اس نعمت سے بے نصیب ہوں ان کو اس سے حصہ دیا جائے۔ بھوکوں کو کھانا کھلایا جائے۔ پیاسوں کو پانی پلایا جائے۔ نگلوں کو کپڑا اپہنایا جائے، بے سر ماہوں کو سر ماہی دیا جائے۔

قرآن پاک کی مختلف آیتوں میں مختلف نعمتوں کے ذکر کے بعد شکرانہ کا مطالبہ کیا گیا ہے، اس لیے ہر آیت میں اس شکر کے ادا کرنے کی نوعیت اسی نعمت کے مناسب ہوگی، مثلاً: ایک بچہ کا ارشاد ہے:

﴿تَبَرَّكَ الَّذِي جَعَلَ فِي السَّمَاوَاتِ بِرُوْجًا وَجَعَلَ فِيهَا سِرَاجًا وَقَمَرًا مُنِيرًا وَهُوَ الَّذِي

جَعَلَ الْيَنِسَ وَالنَّهَارَ خَلْفَةً لِّيَنْ أَرَادَ أَنْ يَذَّكَّرَ أَوْ أَرَادَ شُكُورًا﴾ (۲۵/ الفرقان: ۶۱-۶۲)

”بڑی برکت اس کی ہے، جس نے آسمان میں برج بنائے اور اس میں ایک چراغ اور اجالا کرنے والا چاند رکھا اور اسی نے رات اور دن بنایا کہ ایک کے بعد ایک آتا ہے، اس کے واسطے جو دھیان رکھنا یا شکر کرنا چاہے۔“

اس میں اپنی قدرت کی نعمتوں کا ذکر کر کے شکر کی ہدایت ہے۔ یہ شکر اسی طرح ادا ہو سکتا ہے کہ اس قدرت والے کی قدرت تسلیم کریں اور دن کی روشنی اور چاند کے اجائے اور رات کے سکون میں ہم وہ فرض ادا کریں جس کے لیے یہ چیزیں ہم کو بنا کر دی گئی ہیں، دوسرا آئیوں میں ہے:

﴿الَّذِي أَخْسَنَ عَلَىٰ خَلْقَهُ وَبَدَا خَلْقُ الْإِنْسَانِ مِنْ طِينٍ ثُمَّ جَعَلَ نَسْلَةً مِنْ سَلَّةٍ مِنْ مَاءٍ مَهِينٍ ثُمَّ سُوْلُهُ وَنَفَخَ فِيهِ مِنْ رُوْحِهِ وَجَعَلَ لَكُمُ التَّثْمِةَ وَالْأَبْصَارَ وَالْأَفْيَدَةَ قَلِيلًا مَا تَشْكُرُونَ﴾ (۸۲/ السجدة)

”بڑے رحم والا جس نے خوب بنائی جو چیز بنائی اور انسان کی پیدائش ایک گارے سے شروع کی، پھر اس کی اولاد کو بے قدر پختے ہوئے پانی سے بنایا، پھر اس کو درست کیا اور اس میں اپنی روح سے کچھ پھونکا اور تمہارے کان اور آنکھیں اور دل بنائے تم کم شکر کرتے ہو،“

﴿وَاللَّهُ أَخْرَجَكُمْ مِنْ بَطْنِ أُمَّهَاتِكُمْ لَا تَعْلَمُونَ شَيْئًا وَجَعَلَ لَكُمُ التَّثْمِةَ وَالْأَبْصَارَ وَالْأَفْيَدَةَ لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُونَ﴾ (۷۸/ النحل)

”اور اللہ نے تم کو تمہاری ماوں کے پیٹوں سے باہر نکالا، تم کچھ جانتے نہ تھے اور تمہارے لیے کان اور آنکھیں اور دل بنائے۔“

ان آئیوں میں خلقت جسمانی کی نعمت کا بیان اور اس پر شکر کرنے کی دعوت ہے۔ یعنی دل سے خدا کے ان احسانات کو مان کر اس کی ربوہیت و کبریائی اور یکتاںی کو تسلیم کریں اور یہ سمجھیں کہ جس نے یہ زندگی دی اور اس زندگی میں ہم کو یوں بنادیا۔ وہ ہمارے مرنے کے بعد دوسری زندگی بھی ہم کو دے سکتا ہے اور اس میں بھی ہم کو یہ کچھ عنایت کر سکتا ہے اور پھر ہاتھ پاؤں سے اور آنکھ کان سے اس کے ان احسانات کا جسمانی حق ادا کریں، بعض اور آئیوں میں ہے:

﴿فَكُلُوا مِنْهَا وَأَطْبِعُوا الْقَانِمَ وَالْمُعْتَرَطَ كَذَلِكَ سَعْرَدُهَا لَكُمْ لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُونَ﴾

(۳۶/ الحج)

”تو ان جانوروں کے گوشت میں سے کچھ آپ کھاؤ اور کچھ ان کو کھلاو جو صبر سے بیٹھا ہے یا محتاجی سے بے قرار ہے، اسی طرح ہم نے وہ جانور تمہارے قابو میں دیے ہیں، تاکہ تم شکر کرو۔“

﴿يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا كُلُوا مِنْ طَيْبَاتِ مَا رَزَقْنَاكُمْ وَاشْكُرُوا﴾ (۲/ البقرة)

”اے ایمان والو! ہم نے تم کو جو روزی دی پاک چیزوں میں کھاؤ اور خدا کا شکر کرو،“

﴿فَكُلُوا مِنْ أَرْزَاقِكُمُ اللَّهُ حَلَالًا طَيْبًا مَا شَكُرُوا نِعْمَتَ اللَّهِ إِنْ كُنْتُمْ إِيمَانًا تَعْبُدُونَ﴾

(۱۶/ النحل)

”تو خدا نے تم کو جو حلال اور پاک چیزیں روزی کیں، ان کو کھاؤ اور اس کی نعمت کا شکر کرو اگر تم اسی کو پوچھتے ہو۔“

یہ مالی نعمت کا بیان تھا، اس کا شکر یہ بھی خدا کو مال کے ذریعہ ادا کریں۔

دنیا میں شکر یہ کی تیسری قسم یہ ہے کہ کسی محض نے جس قسم کا احسان ہمارے ساتھ کیا ہو، اسی قسم کا احسان ہم اس کے ساتھ کریں۔ ظاہر ہے کہ اللہ تعالیٰ کی بے نیاز ذات کے ساتھ اس قسم کا کوئی شکر یہ ادا نہیں کیا جاسکتا اس تیسری قسم کے شکر یہ کی صورت یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ہمارے ساتھ جو احسان فرمایا ہو۔ اسی قسم کا احسان ہم اس کے بندوں کے ساتھ کریں۔ اسی نکتہ کو اللہ تعالیٰ نے قومِ موسیٰ علیہ السلام کے ان لفظوں میں ادا فرمایا ہے:

﴿وَأَخْيُونَ كَمَا آهَانَ اللَّهُ إِلَيْكُمْ﴾ (۲۸/القصص: ۷۷)

”اور جس طرح اللہ نے تیرے ساتھ بھلائی کی تو بھی بھلائی کر۔“

اسی کا نام خدا کو قرضہ دینا بھی ہے۔ ظاہر ہے کہ خدا نہ بذالت محتاج نہیں کہ اس کو کوئی قرض دے۔ خدا کو قرض دینا بھی ہے کہ اس کے ضرورت مند بندوں کو یا قابل ضرورت کاموں میں روپیہ دیا جائے، ارشاد ہوتا ہے:

﴿مَنْ ذَا الَّذِي يُقْرِضُ اللَّهَ قُرْضاً﴾ (۵۷/الحدید: ۱۱)

”کون ہے جو خدا کو اچھا قرض دیتا ہے۔“

﴿وَأَفْرِضُوا اللَّهَ قُرْضاً حَسَناً﴾ (۷۳/المزمول: ۲۰)

”اور خدا کو قرض حسنہ دو۔“

﴿إِنْ تُقْرِضُوا اللَّهَ قُرْضاً حَسَناً﴾ (۶۴/التغابن: ۱۷)

”اگر خدا کو قرض حسنہ دو گے۔“

خدا کو قرض حسنہ دینے کی جو تفسیر اور پر کی گئی، اس کی روشنی میں اس حدیث کو پڑھنا چاہیے۔

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ آنحضرت ﷺ نے فرمایا کہ ”قیامت کے دن خدا فرمائے گا: اے آدم کے بیٹے! میں بیمار پڑا تو نے میری بیمار پرسی نہ کی، بندہ کہے گا: اے میرے پروردگار! تو، تو، جہاں کا پروردگار ہے میں تیری بیمار پرسی کیسے کرتا، فرمائے گا کہ تجھے خبر نہ ہوئی کہ میرا افلان بندہ بیمار تھا تو نے تجھے اس کی پرسش نہ کی اور اگر کرتا تو، تو مجھے اس کے پاس پاتا۔ پھر خدا فرمائے گا: اے آدم کے بیٹے! میں نے تجھے سے کھانا مانگا تو نے مجھے نہیں کھلایا، بندہ عرض کرے گا: اے میرے پروردگار! تو، تو سارے جہاں کا رب ہے میں تجھے کیسے کھلاتا، فرمائے گا تجھے معلوم نہ ہوا کہ میرے فلاں بندہ نے تجھے سے کھانا مانگا تو نے اس کو نہیں کھلایا اگر تو اس کو کھلاتا تو اس کا بدل آج میرے پاس پاتا، اے آدم کے بیٹے! میں نے تجھے سے پانی مانگا تو تو نے مجھے پانی نہیں پلایا، بندہ کہے گا: اے میرے پروردگار! تو، تو سارے عالم کا پروردگار ہے، میں تجھے کیسے پانی پلاتا،

فرمائے گا: میرے فلاں بندہ نے تجھ سے پانی مانگا تو نے اس کو نہیں پلایا، اگر تو اس کو پلاتا تو آج تو اس کو میرے پاس پاتا۔“ * اس تشریح سے معلوم ہو گا کہ خدا کی دی ہوئی نعمتوں کا جانی اور مالی شکر یہ ہم کو کس طرح ادا کرنا؟ اور اس کا قرض ہم کو کیوں کر اتا رنا چاہیے۔

اللّٰہ تعالیٰ نے اپنی نعمتوں کے شکر ادا کرنے کا بار بار تقدیماً اس لیے بھی کیا ہے کہ ہم یہ نہ سمجھنے لیں کہ خدا کے فضل و کرم کے سوا ہم ان نعمتوں کا کوئی استحقاق خود بھی رکھتے تھے۔ حالانکہ ان کے لیے نہ کوئی ہمارا خاندانی استحقاق تھا ان کوئی ہمارا ذاتی علمی یا عملی۔ جو کچھ ملا اس کے فضل و کرم سے ملا اور جو کچھ ملے گا، وہ اسی کی عطا اور بخشش ہو گی۔ انسان اپنی روزمرہ کی متواتر بخششوں کو جو زمین سے آسان تک پہلیں ہیں، دیکھ کر اور ان کے دیکھنے کا عادی ہو کر یہ سمجھتا ہے کہ ہمارے ساتھ اللہ کی یہ کوئی بخشش نہیں۔ بلکہ فطرت کی عام بخشش ہے، جس کے شکر یہ کی کوئی ضرورت نہیں۔ مگر خوب سمجھنا چاہیے کہ یہی وہ بیج ہے جس سے کفر اور الحاد کی کوٹلیں نکلتی ہیں۔ اسی لیے اللّٰہ تعالیٰ نے قرآن پاک میں اپنی ایک ایک عنایت اور بخشش کو نویا ہے اور اس پر شکر ادا کرنے کی تاکید فرمائی ہے، تاکہ ربوبیت الٰہی کا یقین اس کے ایمان کے بیچ کو سیراب کرے اور بار آور بنائے۔ دولت و نعمت پانے کے بعد انسان یہ سمجھنے لگتا ہے کہ وہ عام انسانوں سے کوئی بلند تر ہے اور جو اس کو ملا ہے، وہ اس کا خاندانی حق تھا یا اس کے یہ ذاتی علم و هنر کا نتیجہ تھا۔ جیسا کہ قارون نے کہا تھا، یہی غرور ہے، جو ترقی کر کے بخل اور ظلم کی صورت اختیار کر لیتا ہے، اللّٰہ تعالیٰ نے اس کی ممانعت فرمائی اور ارشاد ہوا:

﴿وَلَا تُفْرِحُوا بِمَا أَشْكَمْۚ وَاللّٰهُ لَا يُجِبُّ مُكَلَّسَ فَخْتَالَ فَحْوَرَةَ إِلَّذِينَ يَبْخَلُونَ وَيَأْمُروْنَ
الثَّالِسَ يَأْبُخْلُ ۖ وَمَنْ يَتَّوَكَّلَ فَإِنَّ اللّٰهَ هُوَ الْعَنْتَ الْحَمِيدُ﴾ (۵۷) (الحدید: ۲۳-۲۴)

”(اور تاکہ) جو خدا نے تم کو دیا اس پر اتراؤ نہیں اور اللہ کسی اترانے والے، جو ای مارنے والے کو پیر نہیں کرتا جو خود کنجوس ہیں اور لوگوں کو بھی کنجوس بننے کو کہتے ہیں اور جو (اللہ کی بات سے) منہ موڑے گا (تو اللہ کو کیا پردا) وہ تو دولت سے بھر پا اور حمد (یعنی حسن و خوبی) سے مالا مال ہے۔“

وہ اپنی ذات سے نہ تو انسانوں کی دولت کا بھوکا ہے کہ وہ تو غنی ہے اور نہ ان کے شکرانہ کی حمد کا ترسا ہے کہ وہ توحید یعنی حمد سے بھرا ہوا ہے۔ خدا نے انسانوں پر جو تو برتو نعمتیں اتنا ری ہیں اور اپنی راگتا بخششوں سے ان کو جو نواز اے، اس سے یہی مقصود ہے کہ وہ اپنے اس محسن کی قدر پہچانے، اس کے مرتبہ کو جانے، اس کے حق کو مانے اور اس کی نعمت و بخشش کامناسب شکر اپنے جان و مال و دل سے ادا کرے:

﴿وَرَزَقَمْ مِنَ الطَّيِّبَاتِ لَعَلَّمُ تَشَكَّرُونَ﴾ (۲۶: ۸) (الانفال)

”اور اس نے تم کو پاک چیزیں روزی دیں، تاکہ تم شکر کرو۔“

* صحیح مسلم، کتاب البر والصلة، باب فضل عبادة المريض: ۶۵۵۶۔

﴿وَهُوَ الَّذِي سَعَى الْبَعْرَلَاتِ أَكْلَهُ وَنَهَى لَهُمَا طَرِيًّا وَسَتَغْرِحُوا مِنْهُ حَلِيلَةً تَلْبِسُهُمَا وَتَرَى

الْفُلْكَ مَوَاقِيرَ فِيهِ وَلَيَتَبَعُوا مِنْ فَضْلِهِ وَلَأَعْلَمُ لَمْ تَشْرُكُونَ﴾ (١٦ / النحل)

”اور اسی نے سمندر کو تمہارے بس میں کر دیا کہ تم اس سے تازہ گوشت (چھل) کھاؤ اور اس سے آرائش کی وہ چیز نکالو جس کو تم پہنچتے ہوں (یعنی موتو) اور تم جہاڑوں کو دیکھتے ہو کہ وہ اس میں پانی کو پھاڑتے رہتے ہیں اور، تاکہ تم خدا کی مہربانی ڈھونڈو اور، تاکہ تم شکر کرو۔“

﴿كَذَلِكَ سَخَرُوهَا الَّذِي لَعَلَمَ لَتَشْرُكُونَ﴾ (٢٢ / الحج: ٣٦)

”اور اسی طرح ہم نے ان جانوروں کو تمہارے بس میں کر دیا کہ تم شکر کرو۔“

﴿وَمِنْ رَحْمَتِهِ جَعَلَ لَكُمُ الْيَوْمَ وَالنَّهَارَ لِتَسْكُنُوا فِيهِ وَلَيَتَبَعُوا مِنْ فَضْلِهِ وَلَعَلَّكُمْ تَشْرُكُونَ﴾ (٢٨ / القصص: ٧٣)

”اور اس کی رحمت سے یہ ہے کہ اس نے تمہارے لیے رات اور دن بنایا کہ تم (رات کو) آرام اور (دن کو) اس کے فضل و کرم کی تلاش کرو اور، تاکہ تم شکر کرو۔“

ان کے علاوہ اور بھی بہت سی آئیں ہیں، جن میں اللہ تعالیٰ نے یہ ظاہر فرمایا ہے کہ ان ساری نعمتوں کا منشاء ہے کہ بندہ اپنے آقا کو پہچانے اور دل سے اس کے احسان کو مانے، لیکن گناہ گرانسان کا کیا حال ہے:

﴿إِنَّ اللَّهَ لَذُو فَضْلٍ عَلَى النَّاسِ وَلَكِنَّ أَكْثَرَهُمْ لَا يَشْكُرُونَ﴾ (١٠ / یونس: ٦٠)

”اللہ نے انسانوں پر بڑے بڑے فضل کیے، لیکن ان میں سے بہت کم شکر کرتے ہیں۔“

﴿وَلَقَدْ مَلَكَتْمُ فِي الْأَرْضِ وَجَعَلَنَا الَّذِي فِيهَا مَعَايِشَ قَلِيلًا مَا تَشْكُرُونَ﴾

(١٠ / الاعراف: ٧)

”اور ہم نے تم کو زمین میں قوت بخشی اور اس میں تمہارے لیے بساوات کے بہت سے ذریعے بنائے، تم بہت کم شکر کرتے ہو۔“

ایک موقع پر تو اللہ تعالیٰ نے انسان کی اس ناشکری پر، پرمجحت غصب کا اظہار بھی فرمایا:

﴿فَيُلَمَّلُ الْأَنْسَانُ مَا أَكْفَرَهُ﴾ (٨٠ / عبس: ١٧)

”مارے جائیو، انسان کتنا برا ناشکرا ہے۔“

شکر کے باب میں ایک بڑی غلط فہمی یہ ہے کہ لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ ہم نے زبان سے الحمد للہ پڑھ دیا تو ماں کا شکر ادا ہو گیا۔ حالانکہ یہ صحیح نہیں ہے شکر دراصل دل کے اس لطیف احساس کا نام ہے، جس کے سب سے ہم اپنے محسن سے محبت رکھتے ہیں، ہر موقع پر اس کے احسان کا اعتراف کرتے ہیں اور اس کے لیے سرپا پاس بنتے ہیں اور کوشش کرتے ہیں کہ ہم اس کو خوش رکھ سکیں اور اس کی فرمائشوں کو پورا کرتے رہیں، اگر ہم

صرف زبان سے شکر کا لفظ ادا کریں، لیکن دل میں احسان مندی اور منت پذیری کا کوئی اثر اور کیف نہ ہو اور اس اثر کے مطابق ہمارا عمل نہ ہو تو ہم اس محسن کی احسان مندی کے اظہار میں جھوٹے ہیں اور وہ شکر خدا کی بارگاہ میں قبول نہیں، اسی لیے اللہ تعالیٰ نے حضرت واو اور سلیمان علیہما السلام کو اپنے پے در پے احسانات سے جس طرح نواز، اس کے بیان کرنے کے بعد ان کو خطاب کر کے فرماتا ہے:

﴿إِعْمَلُوا أَلَّا دَاؤَدَ شَكْرًا﴾ (۳۴/ سیا: ۱۲)

”اے داؤد کے گھر والو! شکر ادا کرنے کے لیے نیک عمل کرو۔“

اس آیت پاک نے بتایا کہ شکر کا اثر زبان تک محدود نہ ہو، بلکہ عمل سے بھی ظاہر ہونا چاہیے۔ اسی لیے حضرت سلیمان علیہ السلام خدا سے دعا کرتے ہیں:

﴿رَبِّ أَوْزَعْنِي أَنْ أَشْكُرْ يَغْتَكَ الَّتِيْ أَنْعَمْتَ عَلَيْهِ وَكُلَّيْ وَالِدَيْ وَأَنْ أَعْمَلْ صَالِحًا﴾

توضیح (۲۷/ النمل: ۱۹)

”اے میرے پروردگار! مجھے نصیب کر کہ میں تیرے اس احسان کا جو تو نے مجھ پر اور میرے ماں باپ پر کیا ہے، شکر کروں اور وہ نیک کام کروں جو تجھے پسند ہو۔“

اس دعا میں یہ بھی اشارہ ہے کہ شکر میں شکر کے دلی جذبہ کے ساتھ اسی کے مطابق اور مناسب نیک عمل بھی ہو۔

دل میں یہ بات آتی ہے کہ خدا نے اپنے شکر گزار بندوں کے حق میں جو یہ فرمایا ہے کہ وہ جیسے جیسے شکر کرتے جائیں گے، میں ان کے لیے اپنی نعمتوں کی تعداد اور کیفیت بھی بڑھاتا جاؤں گا، اس کی تاویل یہ ہے کہ بندہ جیسے جیسے ماں کے شکر کے لیے اپنے عمل میں سرگرم ہوتا جاتا ہے، اس کی طرف سے شکر انہے عمل کی ہر نئی سرگرمی کے جواب میں اس کو کوئی نئی نعمتیں عنایت ہوتی جاتی ہیں، اسی لیے فرمایا:

﴿لَئِنْ شَكَرْتُمْ لَا زِيدَ تَلَمُّ وَلَئِنْ كَفَرْتُمْ إِنْ عَدَلِيْ لَشَكِيدُدْ﴾ (۱۴/ ابراہیم: ۷)

”اگر تم شکر ادا کرو گے تو میں تم کو اور بڑھاؤں گا اور اگر ناشکری کرو گے تو میرا عذاب بڑا ہی سخت ہے۔“

﴿كَذَلِكَ تَعْزِيزُ مَنْ شَكَرَ﴾ (۵۴/ القمر: ۳۵)

”بھم اسی طرح اس کو جزا دیتے ہیں جس نے شکر کیا۔“

﴿وَسَتَجْوِي الشَّكِيرِينَ﴾ (۱۴۵: ۲/ آل عمران)

”اور ہم شکر کرنے والوں کو جزا دیں گے۔“

حقیقت یہ ہے کہ اگر انسان کے دل میں ایک شکر ہی کا جذبہ پیدا ہو جائے تو دین و دنیا میں بھلائی کے

لیے اس کو کسی اور تعمیر کی ضرورت نہ ہو، وہ خدا کی نعمتوں کی قدر جان کر اس کو مانے گا اور اس کے حکموں پر چلے گا اور اسی کے بندوں کے ساتھ شکرانہ میں بھلانی کرے گا اور خود بندوں کے احسانات کے جواب میں بھی ان کے ساتھ یتکی اور خیر خواہی کرے گا۔ بلکہ آنحضرت ﷺ نے خود آپس میں ایک انسان کی دوسرے انسان کے ساتھ شکرگزاری کے جذبہ کو اللہ تعالیٰ کے احسانات کی شکرگزاری کا معیار مقرر فرمایا ہے، ارشاد ہوا:

((مَنْ لَا يَشْكُرُ النَّاسَ لَا يَشْكُرُ اللَّهَ)) ﴿۱﴾

”جو انسانوں کا شکر ادا نہ کرے گا وہ خدا کا بھی شکر ادا نہ کرے گا۔“

اس حدیث کا ایک اور مطلب یہ ہے کہ جو انسانوں کے احسانوں کا شکر یہ ادا نہ کرے گا تو خدا بھی اپنے احسانوں کا شکر یہ اس سے قبول نہ فرمائے گا۔

جامع ترمذی، کتاب البر والصلة، باب ما جاء في الشكر لمن أحسن إليك: ۱۹۵۴۔

خاتمه

کتاب کی پانچویں جلد جو عبادات کے مباحث پر مشتمل تھی ختم ہو گئی، ان صفحات میں آنحضرت ﷺ کی ان تعلیمات کا بیان تھا، جو عبادات کے باب میں آپ نے فرمائی ہیں، ان تعلیمات کے ایک ایک آیت حرف پر غور کیجئے کہ انہوں نے وہم پرستیوں اور غلط فہمیوں کے کتنے تو برقو پر دے چاک کر دیے اور عبادت جو ہر مذہب کا اہم جزو ہے اس کی حقیقت کتنی واضح کر دی۔ عبادات کے جو طریقہ اللہ تعالیٰ نے آپ کو سکھائے اور آپ نے وہ انسانوں کو بتائے وہ کتنے تکمیل اور ان میں کا ایک ایک آئین آپ کے عمل اور قول کی سند سے کس قدر متعین اور مفصل اور دین دنیا کی مصلحتوں اور فائدوں پر مشتمل ہے اور آپ نے ان کے ذریعہ انسانی دلوں کی کمزوریوں اور روح کی بیماریوں کا کس طرح علاج فرمایا ہے۔

آنحضرت ﷺ کے پیغمبرانہ امتیازات کی کوئی حد نہیں ہے اور انہیں میں سے ایک یہ ہے کہ آپ کی ہر تعلیم جس میں عبادت بھی داخل ہے، عملًا: صاف واضح اور متعین ہے اور زمانہ با بعد میں انسانی تاویلات کی آمیزش اور قیاس آرائیوں سے متبرأ ہے اور اس کا اس طرح ہونا اس لیے ضروری تھا کہ اس پر نوع انسان کی پیغمبرانہ تعلیم کے درس کا خاتمه ہوا ہے۔ اس لیے اس کے ہر پبلو کو ایسا واضح ہونا چاہیے تھا کہ وہ پھر کسی پیغمبر کی آمد اور تشریح و توضیح کی محتاج نہ رہے، بیوت و رسالت کے آخری معلم نے (خدا ان پر اپنی رحمتیں اور برکتیں اتنا رے) اس فرض کو اس خوبی سے انجام دیا جس سے زیادہ کا تصور نہیں ہو سکتا۔

صلواتُ اللَّهِ عَلَيْهِ وَبَرَّ كَاتِبَهُ

مغفرت کا طلبگار
سید سعیید ماندوی
۱۲ جمادی الثانیہ ۱۳۵۴ھ



بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ



سِرِّ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ